

اسلام میں
سنّت وحدیث کا مقام

ترجمہ

السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي

جلد دوم

تالیف
الشیخ مصطفیٰ الحسنی السباعی

ترجمہ
ڈاکٹر مولانا احمد حسن ٹونکی

نظر ثانی وترمیم وتعلیقات
مولانا محمد ادریس میرٹھی

مکتبہ بینات
علامہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی ...۷۴۸

اسلام میں
سُنّت وحدیث کامقام
(حصہ دوم)

ترجمہ

اَلسُّنَّةُ وَمَكَانَتُهَا فِی التّشْرِیْعِ الْاِسْلَامِیْ

—— تالیف ——

الشیخ مصطفیٰ حسنی السباعیؒ

ترجمہ
ڈاکٹر مولانا احمد حسن ٹونکی



ترمیم وتعلیق
مولانا محمد ادریس میرٹھی

ناشر

مکتبۂ بینات

علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی ۷۴۸۰۰

مفصل فہرست مضامین جلد دوم

حضرت ابوہریرہؓ اور مؤلف فجر الاسلام

اب ہم مؤلف فجر الاسلام کی "فصل حدیث" پر اپنی تنقید کے آخری حصہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ حصہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع اور اعتراضات سے متعلق ہے میں بلاخوف تردید اس امر کی شہادت دے سکتا ہوں کہ درحقیقت مؤلف نے حضرت ابوہریرۃ پر اعتراضات و مطاعن کی بوچھار کرنے میں اور اس جلیل القدر صحابی پر معاندانہ حملے کرنے میں نہایت چالاکی اور فریب کاری سے مستشرقین اور مشہور معتزلی نظام کی قدم بقدم پیروی کی ہے اور شاطرانہ انداز میں ان مستشرقین کی اور نظام کے اعتراضات و مطاعن کو خود اپنی تحقیق کے سانچے میں ڈھال کر مختلف مقامات میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ بکھیر دیا ہے (تاکہ واقف حال قارئین بھی یہ نہ سمجھ سکیں کہ مؤلف اپنے ان پیشروؤں کی پیروی کر رہے ہیں) اس لحاظ سے ابوہریرہ کے بارے میں مؤلف کی بحث و تحقیق ایک ایسے چالاک اور سیانے واقف کار کی سی ہے جسے ہر قدم پر یہ ڈر ہے کہ کہیں ابوہریرہ کے بارے میں اس کی بدظنی اور بدعقیدگی کا راز نہ کھل جائے یعنے اس کے دل کا کھوٹ کھل کر سامنے نہ آجائے۔

لیکن استاذ احمد امینؒ کا اسلوب تحقیق اور انداز بیان، ابوہریرہ کی تاریخ کے ذیل میں بعض حقائق کی تحریف و تشویہ میں، اُن کی سچائی میں شکوک و شبہات پیدا کرنے پر، ان کی حرص اور ان کی صداقت کے بارے میں صحابہ کرام کے مفروضہ شک و شبہ کو طشت ازبام کرنے میں ان کی دلچسپی، یہ سب باتیں استاذ احمد امینؒ مرحوم کے دل کے کھوٹ کی غمازی کر رہی ہیں اور

انکے باطن میں چھپے ہوئے عزائم کا پردہ چاک کر رہی ہیں۔ پس بہت بہت درود و سلام ہو اس ذات گرامی ــــ فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم ــــ پر جس کا ارشاد ہے:۔

جس شخص نے (کسی مسلمان کے متعلق) دل میں بات چھپا کر رکھی اللہ تعالیٰ اس کا پردہ ضرور چاک کرے گا۔

بہرحال میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مؤلف نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ زہر اگلا ہے اس پر تنقید کرنے سے پہلے اُن کے مختصر اور اہم حالات زندگی بیان کردوں تاکہ قارئین کو اس بزرگ اور جلیل القدر صحابی کے بارے میں سچی تاریخ کا فیصلہ صحابہ کرام کبار تابعین اور ائمہ حدیث کی رائے معلوم ہو جائے اس کے بعد آپ خود اس دلکش اور روشن تصویر ــــ اصلی سیرت ابو ہریرہ ــــ کو اس مسخ شدہ تصویر سے ملا کر دیکھیں اور موازنہ کریں، جو مؤلف فجر الاسلام نے اپنے مشائخ و اساتذہ یعنے مستشرقین کے اتباع میں حضرت ابو ہریرہ کی پیش کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کا نام اور کنیت (۱)

حضرت ابو ہریرہ اور ان کے والد کے نام کے بارے میں بہت کافی اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے اقوال منقول ہیں۔ قطب حلبی نے ان مختلف اقوال کی تعداد چوالیس بتلائی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور قول یہ ہے:۔

عہد جاہلیت میں یعنے اسلام سے پہلے ابو ہریرہ کا نام عبد شمس بن صخر تھا جب ابو ہریرہ نے اسلام قبول کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدل کر عبد الرحمٰن رکھ دیا۔

ابو ہریرہ یمن کے مشہور قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے ان کی والدہ اُمیمہ بنت صفیح بن الحارث بھی اسی قبیلہ کی تھیں۔ ان کی کنیت ابو ھریرہ کی وجہ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی

---

(۱) یہ معلومات ہم نے حافظ ابن عبد البرؒ کی کتاب الاستیعاب اور حافظ ابن حجرؒ کی کتاب تہذیب الاسماء وغیرہ مستند کتابوں سے لئے ہیں۔

میں خود ان کی زبانی یہ نقل کی ہے:

میں اپنے گھر کی بکریاں چرایا کرتا تھا، ایک چھوٹی سی بلی میرے پاس تھی، اس کو رات کے وقت ایک درخت کے سوراخ میں رکھ دیتا۔ اور جب دن نکل آتا تو اس کو وہاں سے نکال کر اپنے ساتھ (جنگل) لے جاتا اور دن بھر اس کے ساتھ کھیلا کرتا۔ اس لئے لوگ مجھے ابوھریرۃ۔۔ بلی کا باپ۔ کہنے لگے۔

حضرت ابوہریرہ کا قبول اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی ہمہ وقتی مصاحبت

ابوہریرۃ ۷ھ میں صلح حدیبیہ اور غزوۂ خیبر کے درمیانی زمانہ میں اسلام لائے۔ اس وقت ان کی عمر تیس ۳۰ سال کے لگ بھگ تھی۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر سے مدینہ تشریف لائے تو ابوہریرہ بھی آپ کے ہمراہ مدینہ آگئے اور (مسجد نبوی کے اندرہی) صفہ میں رہنے لگے۔ ابوہریرۃ (کا کوئی گھر بار نہ تھا اسی لئے وہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ہر وقت موجود رہتے تھے جہاں کہیں آپ تشریف لے جاتے ابوہریرہ بھی ساتھ ہوتے اکثر وبیشتر آپ ہی کے ساتھ کھانا بھی کھاتے (غرض آپ سفر میں ہوں یا مدینہ میں، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت آپ کی خدمت میں موجود رہتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک ان کا یہی حال رہا۔

ابوہریرۃ کا حلیہ اور اوصاف وخصائل

ابوہریرہ کا رنگ گہرا گندمی تھا۔ دونوں کاندھوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا (یعنے سینہ کافی چوڑا تھا) سر کے بالوں کے دو حصے تھے (یعنے سر کے بال کافی گھنے اور زیادہ تھے اس لئے مانگ نکالتے تھے) دانتوں کے درمیان ریخیں تھیں (یعنی دانت ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے نہ تھے) داڑھی کافی گھنی اور گنجان تھی مونچھیں خوب باریک کاٹا کرتے تھے۔

ابوہریرۃ بڑے ہی راست باز، خوش مزاج اور سبک روح آدمی تھے، ان کے مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ صحابہ کرام ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔

ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب المزاح میں زبیر بن بکّار کے واسطہ سے نقل کیا ہے :-

ایک شخص نے حضرت ابوہریرہ سے کہا : صبح میں نے روزہ رکھا تھا۔ (اتفاق سے) میں اپنے باپ کے پاس گیا تو وہاں میں نے روٹی اور گوشت ان کے سامنے (دسترخوان پر) رکھا دیکھا تو میں نے خوب پیٹ بھر کھا (کھایا اور یہ بالکل بھول گیا کہ میں روزہ سے ہوں۔ ابوہریرۃ نے کہا (شکر کرو) خدا نے تمہیں خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا۔ اس نے کہا : پھر وہاں سے چل کر (اپنے) فلاں (دوست) کے گھر گیا وہاں میں نے اپنے دوست کو ایک دُنبی کا دودھ دوہتے ہوئے دیکھا تو میں نے وہاں خوب سیر ہو کر دودھ پی لیا۔ ابوہریرۃ نے کہا : (شکر کرو) خدا نے تمہیں خوب دودھ پلایا، اس نے کہا پھر میں وہاں سے اپنے گھر واپس آیا اور دوپہری میں خوب سویا اور جب سو کر اٹھا تو (پیاس لگ رہی تھی) میں نے پانی منگوا کر خوب پیا۔ اس پر ابوہریرۃ نے فرمایا : بھتیجے ! دراصل تمہیں روزہ رکھنے کی عادت نہیں۔"

ابن قتیبہ نے اپنی کتاب المعارف میں نقل کیا ہے :-

خلیفہ مروان بن عبدالملک نے (ایک زمانہ میں) ابوہریرہ کو مدینہ کا حاکم بنا کر بھیجا تو ابوہریرۃ ایک گدھے پر سوار جس پر نمدا کسا ہوا تھا اور اس کے سر پر کھجور کی پتیوں کا ایک چھوٹا سا رکھا ہوا تھا، مدینہ میں آئے تو جو شخص بھی راستہ میں ان سے ملتا تو وہ خود آواز لگاتے : "لوگو اِدھر ہو (بچو) راستہ چھوڑ دو امیر مدینہ آرہے ہیں"

حضرت ابوہریرہ پر اعتراضات کے دلدادہ مشہور مستشرق گولڈ تسیہر جیسے لوگوں نے ابوہریرہ کے اس مزاح سے جو اس واقعہ میں کار فرما ہے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے[1] اس سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

---

(۱) ملاحظہ کیجئے دائرۃ المعارف الاسلامیہ عربی کی ج ۱ ص ۴۰۸ پر گولڈ تسیہر کا بیان ابوھریرۃ کے عنوان کے تحت۔

"ابوہریرہ عقل سے بالکل کورے (نرے بدھو) تھے"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف فجر الاسلام کو بھی گولڈ کی یہ تضحیک بہت پسند آئی ہے اسی لئے انہوں نے ابوہریرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس واقعہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے جس کو ابن قتیبہ نے ابوہریرہ کے نوادرات (انوکھے واقعات) کے ذیل میں نقل کیا ہے اس کے معنٰی تو یہ ہوئے کہ مؤلف کو ابوہریرہ کے حالات و واقعات، اخلاق و عادات اور اوصاف و خصائل میں اس واقعہ کے سوا، اور کوئی ایسی خوبی نظر ہی نہیں آئی جو قابل ذکر ہوتی۔

بلاشبہ یہ حضرت ابوہریرہ پر انتہائی معاندانہ حملہ ہے، ان کے فضائل کی حقیقی اور اصلی تصویر کو بغیر کسی بنیاد کے اس طرح بگاڑ کر دکھانا قطعاً چھچھوراپن اور سوقیانہ انداز ہے، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی اختیار کرنے سے کسی بھی ہر دل عزیز آدمی کی قدر و منزلت نہیں گھٹ جاتی اور نہ ہی وہ سبک عقلی کا مظہر بن جاتا ہے ورنہ اس کے معنٰی تو یہ ہوئے کہ ہر سبک روح، خوش مزاج، بذلہ سنج اور ہنس مکھ آدمی عقل سے کورا اور بدھو ہوتا ہے۔ اور ہر درشت مزاج، تند خو اور اکھڑ آدمی بڑا عقلمند اور مفکر ہوتا ہے، (حالانکہ یہ مسلمات کے خلاف بلکہ برعکس ہے)

حضرت ابوہریرۃ کا زہد و تقوٰی اور عبادت

یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ ابوہریرۃ اہل صفّہ میں سے تھے (جنہوں نے اہل و عیال اور کسب معاش کی فکر سے آزاد ہو کر طلب علم دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا تھا) اور بیشتر اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود رہتے تھے اور آپ ہی کے پاس جو میسر آتا کھا پی لیتے تھے اور بسا اوقات صرف اس طمع میں بھوک پیاس کی تکلیفیں بھی اٹھاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ان سے چھوٹ نہ جائے، (یعنی جس دن آپ کے پاس کچھ نہ ہوتا اس دن بھی آپ کی احادیث سے محرومی کے خوف سے آپ کی رفاقت ایک لمحہ کے لئے نہ چھوڑتے اور پیٹ بھرنے کی فکر مطلق نہ کرتے اور بھوکے پیاسے آپ کی خدمت میں موجود رہتے)۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں:۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ (بعض اوقات) میں

بھوک کی شدت سے پیٹ کے بل زمین پر پڑا رہتا اور اپنے پیٹ پر پتھر
باندھ لیا کرتا تھا۔

نیز فرماتے ہیں:۔

(بعض اوقات) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور حضرت عائشہؓ
کے حجرہ کے درمیان بھوک کی شدّت سے بے حال پڑا ہوتا لوگ کہتے
ابوہریرہ پر مرگی کا دورہ پڑا ہے حالانکہ (مرگی ورگی کچھ نہ ہوتی بلکہ) بھوک
کی شدت سے ایسی حالت ہو جاتی تھی۔

بخدا جن لوگوں نے اس روایت کے کلمہ "صرع" کی بنا پر یہ کہا ہے کہ: ابوہریرہ پر مرگی کے
دورے پڑا کرتے تھے" درحقیقت انھوں نے حق گوئی کو بالائے طاق رکھ کر ابوہریرہ پر
سراسر طوفان باندھا ہے اس لئے کہ ابوہریرہ نے تو خود ہی اس صَرَع (مرگی) کی حقیقت بتا
دی ہے کہ "محض بھوک کی شدت اور پے در پے فاقوں کی وجہ سے میری ایسی حالت ہو جاتی
تھی نہ کہ مرگی کی بیماری کی وجہ سے"۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان مورخین میں سے جن لوگوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی کے
حالات لکھے ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ ابوہریرہ مرگی کے مریض تھے۔
آخر یہ مستشرقین یہ جھوٹ کہاں سے گھڑ لائے؟ دراں حالیکہ ان کے پاس سوائے اس تاریخ
کے جو مسلمان مورخین نے ابوہریرہ کی زندگی کے متعلق لکھی ہے اور کوئی ماخذ نہیں اور نہ
ہو سکتا ہے۔

ابوہریرہ کی پرہیزگاری اور عبادت گذاری کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ جریری
عن ابی نضرۃ عن رجل من الطفاوۃ کی سند سے نقل کرتے ہیں:۔

قبیلۂ طفاوۃ کے ایک شخص نے بیان کیا کہ:۔ (ایک مرتبہ) میں حضرت
ابوہریرۃ کے ہاں بطور مہمان اترا۔ اس لئے کہ میں نے صحابہ کرام میں سے کسی بھی
شخص کو نہ مہمان نوازی میں ابوہریرہ سے بڑھ کر چست پایا اور نہ ان سے
زیادہ مہمان کی خدمت کرنے والا کسی کو پایا۔

امام احمدؒ ابوعثمان نہدی سے روایت کرتے ہیں :-

میں ابوہریرہ کے ہاں سات دن مہمان رہا، وہ خود، ان کی بیوی اور ان کا خادم تینوں (میری دیکھ بھال کے لئے) رات کے تین حصے کر لیا کرتے تھے ایک نماز پڑھتا تھا (ایک مہمان کی دیکھ بھال کرتا ایک سوتا) پھر وہ دوسرے کو جگا دیتا۔ (اسی طرح باری باری تینوں رات بھر نماز بھی پڑھتے اور مہمان کی خبر بھی لیتے رہتے)

ابن سعد نے عکرمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ :-

ابوہریرہ روزانہ بارہ ہزار تسبیح پڑھا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ: میں اپنے گناہوں کے بقدر تسبیح پڑھتا ہوں۔"

عبدالرزاق نے محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے کہ :-

حضرت عمرؓ نے (ایک مرتبہ) ابوہریرہ کو بحرین کا گورنر بنا دیا۔ ابوہریرہ دس ہزار درہم (از رفتہ) اپنے ساتھ لے کر واپس مدینہ پہونچے تو حضرت عمر نے (اُن سے باز پرس کی اور) پوچھا: تم نے یہ مال اپنی ذات کے لئے حاصل کیا ہے؟ یہ مال تمہارے پاس آیا کہاں سے؟ ابوہریرہ نے جواب دیا: کچھ مال میں نے اپنے گھوڑوں کی نسل کشی (اور ان کی فروخت) سے حاصل کیا اور کچھ عطیوں سے اور کچھ اپنے مملوک غلام کی (محنت مزدوری کی) آمدنی سے۔ حضرت عمر نے ابوہریرہ کے اس بیان کی تحقیق اور جانچ پڑتال کی تو ایسا ہی پایا جیسا انھوں نے بیان کیا تھا۔ پھر (دوبارہ) حضرت عمر نے گورنر بنانے کے لئے ابوہریرہ کو بلایا تو انہوں نے انکار کر دیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: جو تم سے بہت بہتر ہوئے ہیں (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام) انھوں نے بھی حکومت حاصل کرنے کی خواہش کی ہے، ابوہریرہ نے جواب دیا، حضرت یوسف علیہ السلام تو اللہ جل شانہ کے نبی تھے۔ اللہ کے نبی کے بیٹے تھے اور میں

تو آمیمہ کا جایا ابوہریرۃ (دل میں تین چیزوں سے ڈرتا ہوں (۱) ایک اس سے کہ بغیر علم کے کوئی بات کہہ بیٹھوں (۲) دوسرے اس سے کہ (نادانستہ) کوئی ناحق فیصلہ کردوں (۳) تیسرے اس سے کہ (خیانت کے جرم میں) میری پیٹھ پر کوڑے بھی پڑیں۔ آبروریزی بھی ہو اور میرا مال بھی چھنے۔

حضرت ابوہریرۃؓ کا حافظہ اور قوت یادداشت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت موجود رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابوہریرۃؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے بہت سے اقوال واعمال واحوال سے واقف اور باخبر تھے جن سے دوسرے صحابہ (ہر وقت موجود نہ رہنے کی وجہ سے) واقف نہ ہوتے تھے، ابوہریرہ جب مسلمان ہوئے تھے اس وقت ان کا حافظہ اچھا نہ تھا (اکثر باتیں بھول جاتے تھے) چنانچہ (ایک موقعہ پر) انھوں نے اس حافظہ کی خرابی کی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو اس پر آپ نے فرمایا: تم اپنی کمبلی پھیلاؤ! ابوہریرہ نے کمبلی پھیلادی، آپ نے دعا فرمائی اور کہا: "اب اس کمبل کو اپنے سینہ سے لگالو" چنانچہ ابوہریرہ نے اس کو سینے سے لگالیا۔ تو اس کے بعد (حافظہ اتنا قوی ہوگیا کہ) وہ کبھی کوئی بات نہیں بھولے۔

یہ کمبل پھیلانے کا واقعہ امام بخاری، مسلم، احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابویعلیٰ اور ابونعیم وغیرہ تمام جلیل القدر ائمہ حدیث نے نقل کیا ہے اس کے باوجود یہودی مستشرق گولڈتسیہر کا یہ دعویٰ کہ: یہ "قصہ گھڑا ہوا ہے، لوگوں نے ابوہریرہ کی کثرت روایت حدیث کی وجہ جواز کے طور پر اس کو گھڑا ہے"۔ محض افترا اور بہتان ہے اور ایسی قیاس آرائی ہے جس کا جواز علم اور تحقیق کی دنیا میں ہرگز نہیں مل سکتا۔

درحقیقت محض تعصب اور حدیث دشمنی نے اس یہودی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے جلیل القدر صحابی پر حملے کرنے پر مجبور کیا ہے جو سب سے بڑا راویۃ الحدیث یعنے سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا حافظ اور روایت کرنے والا ہے، میں نہیں سمجھتا اس یہودی کے پاس وہ کون سے علمی اور تحقیقی دلائل ہیں جن کی بنیاد پر وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ قصہ

گھڑا ہوا ہے کیا ابوہریرہؓ کے متعلق کچھ ایسی انوکھی تاریخی تصریحات اس کو ملی ہیں (جو آج تک علمی دنیا کی نظر سے اوجھل رہیں) جن سے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے اور ان کی بنیاد پر وہ اُن تمام ائمہ حدیث کو جھٹلانے کی جرأت کرتا ہے جنہوں نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور اس کے روایت کرنے والوں کو ثقہ اور قابلِ اعتماد بتلایا ہے؟ (ہرگز نہیں محض بہتان طرازی اور مفروضہ قیاس آرائی ہے)

مستشرقین اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے اہلِ قلم، حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کے اس حیرتناک قوت یادداشت پر انکار آمیز تعجب کا مظاہرہ کرتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس مسئلہ کو انصاف کی نظر سے دیکھتے اور علم نفسیات اور علم الاجتماع کی روشنی میں اس کو پرکھتے تو اُنھیں اس معاملہ میں کوئی بھی تعجب اور استبعاد وانکار کی وجہ نظر نہ آتی، اس لئے کہ علم الاجتماع اور علم النفس کی رو سے ہر قوم کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت ہوا کرتی ہے جو دوسری قوموں سے اس کو ممتاز کرتی ہے۔

قوت حافظہ عربوں کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے (جس کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی) صحابہ کرام، کبار تابعین اور اُن کے بعد کے لوگوں میں بھی ایسے حضرات ہوئے ہیں جو سرعتِ حفظ اور قوت یادداشت میں قدرت خداوندی کا ایک عجیب وغریب نمونہ بلکہ شاہکار ہوئے ہیں۔ جس شخص کو اس حقیقت کا علم ہو کہ امام بخاریؒ کو تین لاکھ حدیثیں اُن کی اسنادوں کے ساتھ یاد تھیں، امام احمد کو سات لاکھ سے زیادہ حدیثیں سندوں کے ساتھ اور امام ابوزرعہ کو سات لاکھ حدیثیں سندوں سمیت یاد تھیں۔ اُس کو حضرت ابوہریرہ کی حفظ کی ہوئی حدیثوں کی تعداد پر (جو ساڑھے چار ہزار کے لگ بھگ ہے) ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔

اُن احادیث کی تعداد جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں مسند بقی بن مخلد کے بیان کے مطابق پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے۔ (۵۳۷۴) یہ تو رہے، قدیم وجدید علماء عربیت اور بڑے بڑے شعراء کو اتنے اشعار اور نثر عبارتیں یاد ہوتی تھیں کہ ان کے مقابلہ میں ابوہریرہ کی یاد کی ہوئی حدیثیں کسی شمار میں نہیں آتیں۔ یہ لیجئے عربیت کے امام اصمعی کو جیسا کہ راوی بیان کرتے ہیں عرب کے پندرہ ہزار اُرجوزے (گیت اور مقولے) یاد تھے۔

ہمارے ایک دوست استاذ محب الدین الخطیب نے شیخ شنقیطی رحمہ اللہ کے حافظہ کے بارے میں جو اپنے مشاہدات بیان کئے ہیں انسان ان کو سنکر دنگ رہ جاتا ہے، ہم یہاں خود

محب الدین کی عبارت نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں :۔

علامہ شیخ احمد بن الامین الشنقیطی رحمہ اللہ کی شخصیت (اور ان کے فوق العادہ کمالات) کو ہم ذاتی طور پر خوب اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں عہد جاہلیت کے تمام اشعار ان کو ازبر یاد تھے، ابوالعلاء المعری کے تمام اشعار ان کو حفظ تھے۔ ان کی محفوظات ـــ یاد کردہ چیزوں ـــ کو اگر ہم شمار کرنے لگ جائیں تو ایک عظیم الشان کارنامہ یعنی ضخیم کتاب تیار ہو جائے انھوں نے اپنی پوری کتاب الوسیط فی تراجم علماء وادباء شنقیط ہمارے شیخ طاہر الجزائری کی خواہش پر اول سے آخر تک صرف اپنی یادداشت سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں تمام اہل شنقیط کے مرد ہوں یا عورت پورے نسب نامے لکھے ہیں ان کے قبائل کا تفصیلی بیان کیا ہے، نیز ان کے اشعار، نظمیں اور ان کی وہ تمام تالیفات اور تاریخی واقعات جو ان سے مروی ہیں سب کا تفصیلی بیان موجود ہے ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا کتاب الوسیط سے پہلے، جس کو موصوف احمد بن الامین الشنقیطی نے تالیف کیا ہے، ان تمام انساب، قبائل اور علمی و ادبی کارناموں سے واقف ہونے کے لئے کوئی ماخذ ـــ تصنیف ـــ موجود نہ تھا جس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔

تو ایسی صورت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے سوا پانچ ہزار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ـــ آپ کے ساتھ طویل صحبت، رفاقت اور معیت کی بنا پر ـــ جو یاد کر لی ہیں وہ شیخ شنقیطی کے محفوظات کے مقابلہ میں جو ہمارے سامنے کی بات ہے کسی گنتی میں نہیں آتیں چہ جائیکہ شیخ موصوف کے علاوہ اُمت کے اور بہت سے جید علماء و فضلاء جو حافظہ کی پختگی اور قوت یادداشت میں ممتاز ہوئے ہیں (۱)، (اور ان کے حیران کن

(۱) ماہنامہ الفتح (عربی)، شمارہ ۲۵۔

کارنامے ضرب المثل کے طور پر مشہور و معروف ہیں)

صحابہ کرام نے (جن کے سامنے ابوہریرہ کی پوری اسلامی زندگی گذری ہے) خود ابوہریرہ کے کثرت حفظِ حدیث کا اعتراف کیا ہے جیسا کہ آپ آگے چل کر پڑھیں گے۔

(مدینہ طیبہ کے اموی حکمران) مروان نے تو ابوہریرہ کی قوت حافظہ کا امتحان بھی لیا ہے اور اس امتحان میں وہ کماحقہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کو حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں مروان کے سکرٹری (ابوالزعیزعہ) سے نقل کیا ہے کہ :-

> (ایک مرتبہ) مروان نے حضرت ابوہریرہ کو بلوایا (اور حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی) تو ابوہریرہ مروان کے سامنے حدیثیں بیان کرنے لگے مروان نے ابوالزعیزعہ کو پہلے سے پردہ کے پیچھے بٹھا دیا تھا کہ جو حدیثیں ابوہریرہ بیان کریں وہ لکھتا جائے، اس کے بعد پورا ایک سال گذرنے پر پھر ابوہریرہ کو بلایا اور پھر انہی حدیثوں کو دریافت کیا تو ابوہریرہ نے ان تمام احادیث کو اسی طرح دہرایا (جیسے پہلی مرتبہ بیان کیا تھا) مروان نے ان حدیثوں کو پہلی لکھی ہوئی حدیثوں سے ملایا تو ایک حرف کی بھی تبدیلی نہ پائی۔

ہمارے خیال میں یہ واقعہ حدیث دشمن متعصب مستشرقین اور ان کے دم چھلے مسلمان مؤلفین کے بہتانوں کی تردید اور تکذیب کے لئے بہت کافی ہے جو حضرت ابوہریرہ کی قوت یادداشت میں کیڑے نکالتے ہیں اور ان کی صداقت میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔

اس بہتان طرازی اور ہنگامہ آرائی کا باعث خود ابوہریرہ سے ان کی کوئی ذاتی رنجش اور خاص دشمنی نہیں ہے بلکہ یہ ان کی اسلام دشمنی اور اسلام کو زک پہونچانے کی اور اس کی تعلیمات خصوصاً احادیث کی صحت و سلامتی میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی ناپاک سازشوں میں سے ایک سازش ہے[1]

---

[1] اس لئے کہ صحابہ میں احادیث کے سب سے بڑے راوی جن کی روایتوں سے حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں ابوہریرہ ہیں ان کو مجروح اور ناقابل اعتماد قرار دینے کے بعد اسلامی شریعت جس کی تعمیر و تکمیل (باقی ص۱۶ پر)

صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث کی رائے حضرت ابوہریرہ کے متعلق!

مشہور صحابی طلحہ بن عبید اللہ فرماتے ہیں:۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ابوھریرۃ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی وہ حدیثیں سُنی ہیں جو ہم نے نہیں سُنیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں:۔

ابوہریرۃ مجھ سے بہت بہتر ہیں اور جو حدیثیں وہ بیان کرتے ہیں ان کو وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں

ایک شخص حضرت زید بن ثابت کے پاس آیا اور کوئی حدیث دریافت کی تو زید بن ثابت نے اس سے کہا:۔

تم ابوہریرہ کا دامن تھام لو (اور انہی سے حدیثیں دریافت کیا کرو) اس لئے کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں، ابوہریرۃ اور فلاں شخص مسجد نبوی میں اللہ سے دُعا مانگنے اور اس کا ذکر کرنے میں مصروف تھے کہ اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہمارے قریب بیٹھ گئے اور فرمایا: جن دعاؤں اور ذکر و اذکار میں تم مصروف تھے ان کو میرے سامنے دہراؤ" چنانچہ میں نے اور میرے ساتھی نے وہی دُعائیں پھر مانگیں اور آپ نے ہماری دُعاؤں پر آمین فرمایا اس کے بعد ابوہریرۃ نے دعا مانگی کہ اے اللہ میں تجھ سے وہ بھی مانگتا ہوں جو میرے دونوں ساتھیوں نے تجھ سے مانگا ہے اور وہ علم بھی تجھ سے مانگتا ہوں جو کبھی نہ بھولوں " اس پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین فرمایا تو اس پر زید بن ثابت اور ان کے ساتھی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ہم بھی اللہ سے ایسے علم کا سوال کریں جیسے

(بقیہ حاشیہ ص۱۵ حدیث یہاں سے ہوتی ہے ——— کی طویل و عریض اور محکم عمارت آپ سے آپ منہدم ہو جاتی ہے یہی معاملہ ان دشمنان اسلام نے کبار تابعین میں سے امام زہری کے ساتھ کیا ہے جیسا کہ آپ آگے پڑھیں گے۔ (از مترجم)

کبھی نہ بھولیں تو آپ نے فرمایا: اس دعا مانگنے میں تو یہ دَوسی لڑکا (ابوہریرہ)
تم سے سبقت لے گیا (اب تو تم اس کے دیکھا دیکھی کہہ رہے ہو)

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ابوہریرہ سے فرمایا:
بے شک تم ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے
تھے (اسی لئے) ہم میں سب سے زیادہ آپ کی حدیثیں بھی تمہیں ہی یاد ہیں

حضرت اُبَیّ بن کعبؓ فرماتے ہیں:
ابوہریرہ کو (ہر وقت ساتھ رہنے کی وجہ سے) ایسی باتیں دریافت
کرنے کی ہمت ہو جاتی تھی جو دوسروں کو نہ ہوتی تھی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:
ابوہریرہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے حافظ حدیث ہوئے ہیں۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں:
تقریباً آٹھ سو محدثین نے ابوہریرہ سے حدیثیں روایت کی ہیں (اور ان
کے شاگرد ہوئے ہیں) (اس لئے کہ) ابوہریرہ اپنے زمانہ کے سب سے
بڑے حافظ حدیث تھے۔

ابو صالحؒ فرماتے ہیں:
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سب سے زیادہ حدیثیں ابوہریرہ کو
یاد تھیں

سعید بن ابی الحسن (حضرت حسن بصری کے بھائی) فرماتے ہیں:
تمام صحابۂ کرام میں ابوہریرہ سے زیادہ حدیثوں کا جاننے (اور یاد رکھنے والا
اور کوئی نہ تھا۔

حاکم فرماتے ہیں:
صحابہ کرام میں سب سے زیادہ حدیثیں ابوہریرہ کو یاد تھیں (اس لئے کہ) وہی
سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے، جو

مل جاتا اسی سے پیٹ بھر لیتے مگر آپ کا ساتھ نہ چھوڑتے چنانچہ آپ کے ساتھ ہی کھاتے پیتے اُٹھتے بیٹھتے، جہاں آپ تشریف لے جاتے وہ سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ہوتے۔ آخر تک ان کا یہی معمول رہا اسی لئے ان کی حدیثوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

ابونعیم فرماتے ہیں :-

صحابہ کرام میں ابوہریرہ کو سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور واقعات یاد تھے آپ نے ابوہریرہ کے لئے یہ دُعا بھی فرمائی تھی : اے اللہ تو اہل ایمان کے دلوں میں ابوہریرہ کی محبت ڈالدے۔ اسی لئے ہر مومن مسلمان ابوہریرہ سے محبت کرتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :-

محدثین کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ ابوہریرہ کو صحابہ کرام میں سب سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں "کمبلی پھیلانے" کا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں : یہ حدیث اور واقعہ نبوت کی علامات اور معجزات میں سے ہے کیونکہ (اسی دُعا کی برکت سے) ابوہریرہ کو اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں

اُن حضرات کے نام جن سے حضرت ابوہریرہ نے حدیثیں روایت کیں اور ان محدثین کے نام جنھوں نے حضرت ابوہریرہ سے حدیثیں روایت کیں۔

حضرت ابوہریرہ نے بہت سے صحابہ سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں ان میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، فضل ابن عباس، اُسامہ بن زید اور حضرت عائشہ رضوان علیہم اجمعین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح بہت سے صحابہ نے بھی ابوہریرہ سے حدیثیں روایت کی ہیں ان میں حضرت ابن عمر، ابن عباس، جابر، انس اور واثلہ ابن الاسقع رضی اللہ عنہم کے نام سر فہرست ہیں۔ تابعین میں خاص طور پر قابل ذکر سعید بن المسیب، جو ابوہریرہ کے داماد بھی تھے، عبداللہ بن ثعلبہ، عروۃ بن الزبیر، قبیصۃ بن ذویب، سلمان الاغر،

سلمان بن یسار، عراک بن مالک، سالم بن عبداللہ بن عمرۃ، ابوسلمہ اور حمید جو عبدالرحمن بن عوف کے بیٹے ہیں، محمد بن سیرین، عطار بن ابی رباح ، .... عطار بن یسار اور ایسے ہی بیشمار علما اور فقہا ہیں جن کی تعداد امام بخاری کے بیان کے مطابق آٹھ سو تک پہونچتی ہے۔

یقیناً ان آٹھ سو کبار علماء و فقہا کا ابوہریرہ سے حدیثیں اخذ کرنا — جن میں کبار صحابہ اور تابعین بھی شامل ہیں — اور اُن پر اور اُن کی حدیثوں پر اعتماد کرنا، ابوہریرۃ کی جلالت شان اور سچائی و راست بازی پر آٹھ سو دلیلوں کا وزن رکھتا ہے اور یہی آٹھ سو کبار صحابہ و تابعین اور فقہا و محدثین کا اعتماد اُن مستشرقین اور اُن کے مسلمان خوشہ چینوں کے جھوٹا اور مفتری ہونے کی کھلی دلیلیں ہیں (بلکہ منہ توڑ دلیلیں) جن کے دلوں کو حسد، عداوت، اسلام دشمنی اور تعصب کی آگ کھا چکی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی علالت اور وفات

ابن ابی الدنیا نے صحیح سند کے ساتھ ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں :-

> میں ابوہریرہ کے پاس اس وقت گیا جبکہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے تو میں نے ان کو گود میں لے لیا اور خدا سے دُعا کی : اے اللہ! تو ابوہریرہ کو شفا عطا فرما اس پر وہ بولے : اے خدا ! تو اس دعا کو قبول نہ کریو" دو مرتبہ یہی کہا اس کے بعد کہنے لگے : اگر تم بھی مر سکتے ہو تو مر جاؤ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں ابوہریرہ کی جان ہے لوگوں پر ایسا وقت آکر رہے گا جب ایک شخص اپنے بھائی کی قبر کے پاس سے گذرے گا اور کہے گا اور تمنا کرے گا کہ کاش میں بھی اس کا ساتھی ہوتا اور مر جاتا (یعنے اب زندہ رہنے کا زمانہ نہیں رہا)

امام احمدؒ اور امام نسائیؒ نے صحیح سند کے ساتھ عبدالرحمن بن مہران سے روایت کیا ہے کہ :-

> حضرت ابوہریرہ نے مرتے وقت فرمایا : دیکھو مجھ پر یعنی میری قبر پر خیمہ نہ لگانا میرے (جنازہ) کے پیچھے آگ لیکر نہ چلنا اور مجھے جلدی قبر میں پہونچا دینا۔

(دیر نہ لگانا)

امام بغوی نے خود ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ:

جب ابوہریرہ کی وفات کا وقت آیا تو وہ رونے لگے، ان سے اس رونے کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا: زادِ راہ کی کمی اور سفرِ آخرت کی سختی کے سبب سے رو رہا ہوں۔

(حاکم مدینہ) مروان ابوہریرہ کے مرض الوفات میں ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: اللہ پاک تمہیں شفا دیں، ابوہریرہ نے اس پر کہا: اے اللہ! میں تو تجھ سے ملنا چاہتا ہوں تو بھی مجھ سے ملنا پسند فرما، اس کے بعد مروان چلا گیا ابھی بازار میں ہی تھا کہ ابوہریرہ کا انتقال ہو گیا۔

ولید بن عقبہ بن ابی سفیان نے عصر کی نماز کے بعد ابوہریرہ کے جنازے کی نماز پڑھائی اور ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں ابوہریرہ کی وفات ہوئی ان کی عمر اٹھتر یا اناسی برس کی تھی۔

حضرت معاویہ کو ابوہریرہ کے انتقال کی خبر پہنچی تو مدینہ میں اپنے گورنر کو حکم دیا کہ ابوہریرہ کے ورثا کو (بیت المال سے) دس ہزار درہم دیدو اور ان کے ساتھ اچھے پڑوسیوں کا سا معاملہ کرو" حضرت ابوہریرہ نے باغیوں کے حملے کے دوران محاصرہ کے دنوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کی تھی۔

اللہ تعالیٰ ابوہریرہ پر رحمت فراواں نازل فرمائیں! وہ ان سے راضی ہوں اور بھرپور ثواب عطا فرمائیں، آمین

حضرت ابوہریرہ پر مؤلف فجر الاسلام کے اعتراضات و شبہات

اور ان کے جوابات

یہ تو ابوہریرہ کی وہ سچی اور واقعی "تصویر" ہے جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس سے ہمارے علماء و محدثین آشنا ہیں اس کے ہوتے اب دیکھیے مؤلف فجر الاسلام نے یہ "تصویر" کس طرح پیش کی ہے۔

فجر الاسلام کے مؤلف احمد امین المصری نے اپنی کتاب کی "فصل حدیث" کے ابتدائی حصہ میں حضرت ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے وہ اعتراضات نقل کئے ہیں جو انھوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی ہوئی بعض احادیث پر کئے ہیں۔ اس کے بعد ہی ان کا دعویٰ ہے کہ انھیں ابوہریرہ کے حالات پر قلم اٹھانے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے صرف

ان کے نسب، ان کی اصل، اور ان کے اسلام لانے کی کچھ تاریخ بیان کرنے پر اکتفا کیا اور ان کی بذلہ سنجی اور خوش طبعی سے متعلق روایات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اس سے آپ احمد امین کی غرض سمجھ گئے ہوں گے۔ حالانکہ علمی امانت کا حق تو ان پر یہ تھا کہ وہ اس سلسلہ میں ابوہریرہ کا صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث کے نزدیک مرتبہ ومقام بیان کرتے۔ اور ان حضرات سے ان کی جو تعریف منقول ہے اس کا ذکر کرتے۔ اور انھوں نے ابوہریرہ کے حفظ، ضبط اور صداقت کا جو اعتراف کیا ہے اس کو بیان کرتے۔ کیونکہ ان کے حالات کا یہ حصہ ہمارے موضوع میں سب سے زیادہ اہم اور دوسری تمام چیزوں سے زیادہ ان کی سیرت سے متعلق ہے۔ لیکن مؤلف نے ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ ان کے متعلق ایسی باتیں ذکر کی ہیں جو علانیہ ان کے حق میں انتہائی مضر ہیں۔ دراصل یہ حضرت ابوہریرہ پر طعن وتشنیع اور جرح کی ایک مخفی تدبیر اور چھپی ہوئی کوشش ہے۔ جس میں وہ گولڈ تسیہر اور ان جیسے دوسرے مستشرقین کے قدم بہ قدم چلے ہیں فجر الاسلام کے مؤلف احمد امین مرحوم کے دسائس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اول یہ کہ بعض صحابہ نے — جیسے حضرت ابن عباس اور عائشہ — (رضی اللہ عنہما) نے ان کی بعض روایتوں کی تردید کی ہے اور ان کی تکذیب کی ہے۔

دوم یہ کہ وہ حدیث لکھتے نہیں تھے، بلکہ روایت حدیث میں وہ اپنے حافظہ پر اعتماد کیا کرتے تھے۔

سوم یہ کہ انھوں نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا اسی کی روایت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دوسروں سے جو کچھ سنا تھا اس کو بھی آپ کی طرف منسوب کرکے بیان کردیتے تھے۔

چہارم یہ کہ بعض صحابہ نے ان پر سختی سے تنقید کی ہے، اور ان کی صداقت کو مشکوک سمجھا ہے۔

پنجم یہ کہ حنفیہ ان کی حدیث کو قیاس سے تعارض کی صورت میں ترک کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ "ابوہریرہ فقیہ نہیں ہیں"۔

ششم یہ کہ ان کی کثرتِ روایت سے وضاعین حدیث نے فائدہ اٹھایا اور بیشمار احادیث

گھڑ کر ان کی طرف منسوب کر دیں۔

آئندہ بحث میں آپ دیکھیں گے کہ ان تنقیحات میں کس قدر غلطیاں، تحریفیں اور مغالطے کارفرما ہیں اور آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ حضرت ابوہریرہ جیسی جلیل القدر شخصیت کے خلاف اس علمی سازش کا پردہ کس طرح چاک ہوتا ہے۔

(۱) حضرت ابوہریرہ پر بعض صحابہ کے اعتراضات

صحابہ کے بارے میں ایک دوسرے کا موقف بیان کرتے ہوئے مؤلف نے حضرت ابوہریرہ سے بھی تعرض کیا ہے۔ چنانچہ فجر الاسلام کے ص ۲۶۵ پر انھوں نے لکھا ہے:

بیان کیا جاتا ہے کہ ابوہریرہ نے جب یہ حدیث بیان کی:۔

من حمل جنازۃ فلیتوضأ۔ جو شخص جنازہ اٹھائے تو اس کو چاہیئے کہ (اس کے بعد) وضو کرے

تو حضرت ابن عباس نے اس کو قبول نہیں کیا اور یہ کہا: خشک لکڑیاں (یعنے میت کی چارپائی یا مسہری) اٹھانے سے ہمارے لئے وضو کرنا ضروری نہیں۔

اسی طرح ایک روایت یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے ایک حدیث بیان کی جو صحیحین میں اس طرح مذکور ہے:

متیٰ استیقظ احدکم من نومہ فلیغسل یدہ قبل ان یضعھا فی الاناء فان احدکم لایدری این باتت یدہ۔

تم میں سے کوئی جب اپنی نیند سے بیدار ہو تو اس کو چاہیئے کہ اپنا ہاتھ دھولے۔ اس سے پہلے کہ اس کو برتن میں ڈالے۔ کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے کہاں رات گذاری۔

اس حدیث کو حضرت عائشہ نے نہیں مانا اور کہا کہ "مہراس" میں پانی ہونے کی صورت میں ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں؟ مہراس ایک بڑا سا پتھر ہوتا تھا۔ جس کو بیچ میں سے خوب گہرا کھود کر اس میں

پانی بھر لیا کرتے اور اس سے وضو کرتے تھے۔ مؤلف نے اس صفحہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ نقول مسلم الثبوت کی شرح ج ۲ ص ۸ ، اسے ماخوذ ہیں۔

استاد احمد امین نے یہ دو واقعات اس بات کی دلیل میں بیان کئے ہیں کہ صحابہ ایک دوسرے پر تنقید کیا کرتے تھے ، اور ان میں سے بعض کو دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں بلند مرتبہ مانتے تھے

یہ بات میں اس سے پہلے واضح کر چکا ہوں کہ صحابہ جو ایک دوسرے پر تنقید و تردید کرتے تھے دراصل وہ محض علمی مباحثے اور مناظرے ہوتے تھے ، مسائل شرعیہ کے استنباط اجتہاد میں ان کے نقطہ نظر کے اختلاف اور فرق مراتب پر مبنی ہوتے تھے ، یا اس کا سبب یہ ہوتا تھا کہ ان میں سے کوئی شخص حدیث بھول جاتا تو دوسرا اس کو یاد دلا دیتا ۔ اس تنقید کی وجہ شک وشبہ یا ایک دوسرے کی تکذیب ہرگز نہیں تھی۔ حضرت ابوہریرہ اور دوسرے صحابہ کے درمیان بحثوں اور مناقشات کو اسی اصول پر سمجھنا چاہیئے ۔ ان کو کسی بھی دوسرے سبب پر محمول نہیں کیا جا سکتا اس کی وجہ بھی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ ایک دوسرے کی تصدیق و تائید بھی بکثرت کیا کرتے تھے ، خصوصاً ابوہریرہ کی جن کے بارے میں پہلے گذر چکا ہے کہ صحابہ ان پر مکمل اعتماد کرتے اور اُن کے حفظ اور تثبت کا خود اعتراف کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ اور دوسرے صحابہ کے درمیان جو باہمی تنقیدیں اور بحثیں ہوئی ہیں۔ ان کے متعلق یہ ایک اجمالی بیان ہے۔ اب ہم ان احادیث کا جائزہ لیتے ہیں جو مؤلف (فجر الاسلام) نے اس موقعہ پر نقل کی ہیں :

۱۔ پہلی حدیث :

من حمل جنازۃ فلیتوضأ — جو جنازہ اُٹھائے اس کو چاہیئے کہ وضو کرے۔

اس حدیث کے بارے میں ابن عباس کی حضرت ابوہریرہ پر تنقید کئی وجوہ سے بحث طلب ہے:

(۱) اول یہ کہ اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ میں نے حدیث کی کسی کتاب میں نہیں دیکھا نہ ہی فقہ اور فقہی اختلافات کی کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے اور نہ ان میں اس واقعہ کا کوئی تذکرہ ہے جس میں ابن عباس نے ابوہریرہ پر رد یا اعتراض کیا ہو ۔ اگر یہ حدیث اور یہ واقعہ ثابت ہوتا تو محدثین اس کو ذکر کرنے میں تغافل ہرگز نہ برتتے ۔ یہ درست ہے کہ اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ بعض علماء اصول نے بیان کیا ہے جن میں مسلم الثبوت کے مصنف بھی شامل

ہیں۔ اور یہ علماء اصول فقہ وہ گروہ ہے جن میں سے بعض لوگ تو ایسی احادیث کو ذکر کرنے میں جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی یا کچھ اصل ہوتی ہے تو ضعیف سند سے، بحد تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث ان کا فن اور موضوع بحث نہیں ہے بہر حال اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کی کتابیں علم حدیث کا مرجع نہیں بن سکتیں۔ حدیث پر بحث کے سلسلہ میں حدیث کی معتبر کتابوں کو چھوڑ کر ان کی کتابوں کی طرف کوئی حاطب لیل (راتوں کا اچکا) یا صاحب غرض ہی رجوع کر سکتا ہے

(۲) عدم یہ کہ جو روایت کتب حدیث میں موجود ہے وہ اس سے مختلف ہے۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :-

علی من غسّلہٗ	جس نے میت کو غسل دیا اس کو غسل کرنا
الغسلُ ومن حملہ	چاہیئے اور جس نے اس کو اٹھایا اس کو
الوضوء	وضو کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد امام ترمذی نے کہا ہے کہ "اس باب میں حضرت علیؓ اور عائشہؓ سے بھی روایتیں موجود ہیں" پھر ترمذی نے حدیث ابی ہریرہ کے متعلق اپنی محدثانہ تحقیق بیان کی ہے کہ :-

"ابوہریرہ کی حدیث حسن ہے ابوہریرہؓ کی یہ روایت موقوفاً بھی مروی ہے میّت کو جو غسل دے اس کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض صحابہ اور اہل علم کی رائے ہے کہ جس نے میت کو غسل دیا ہو اس پر غسل ضروری ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کو وضو کرنا چاہیئے۔ مالک بن انس فرماتے ہیں کہ جو میت کو غسل دے میں اس کے لئے غسل مستحب سمجھتا ہوں، میرے نزدیک واجب نہیں ہے، یہی امام شافعی کی رائے ہے۔ امام احمدؒ کا قول یہ ہے کہ جو میت کو غسل دے اس کے لئے غسل ضروری نہیں ہے۔ رہا وضو تو وہ بھی کم سے کم درجہ میں ہے۔ اسحاق نے کہا ہے کہ اس کے لئے وضو ضروری ہے۔ عبداللہ بن المبارک سے ان کا یہ قول مروی

ہے کہ جو شخص میت کو غسل دے اس کے لئے نہ غسل ضروری ہے نہ وضو"

یہاں تک امام ترمذی کا بیان تھا۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ اس حدیث کی روایت میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ حضرت علیؓ اور عائشہؓ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور یہ کہ حضرت ابوہریرہ سے یہ حدیث مرفوع و موقوف دونوں طرح مروی ہے۔ ابن عباس کی تردید کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اگر یہ واقعہ (رد و اعتراض) ثابت ہوتا تو وہ (ترمذی) اس کو ضرور نقل کرتے جیسے انھوں نے صحابہ کے ایسے بہت سے واقعات جن میں وہ ایک دوسرے پر رد و قدح کرتے تھے نقل کئے ہیں اور جیسا کہ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اہل علم کا اس میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس تمام تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فجر الاسلام کے مؤلف کا اس مبینہ واقعہ سے استدلال جو ابوہریرہ اور ابن عباس کے درمیان کبھی پیش ہی نہیں آیا، درجۂ اعتبار سے گرا ہوا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ غسل میت کے سلسلہ میں ابوہریرہ نے جو حدیث بیان کی ہے اس میں وہ منفرد نہیں ہیں، بلکہ ان کے ساتھ ـــ جیسا کہ آپ سن چکے ہیں ـــ دوسرے بھی شریک ہیں۔

(۳) سوم یہ کہ فرض کیجئے یہ واقعہ صحیح ہے اور ابن عباس کی تردید بھی ثابت ہے، تب بھی اس رد و اعتراض کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس سے ان کا مقصد حضرت ابوہریرہ کی تکذیب اور ان پر جرح کرنا تھا بلکہ ان کا یہ اختلاف حدیث کا مفہوم اور اس کا فقہی حکم سمجھنے میں ہے چنانچہ ابن عباس نزدیک الفاظ حدیث سے اس صورت میں وضو کا وجوب ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کو استحباب پر محمول کرتے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے یہ کہا کہ "ہم پر وضو لازم نہیں ہے"، چنانچہ ان کے الفاظ "لا یلزمنا" (ہم پر لازم نہیں ہے) صاف طور پر جانبین کے نزاع کی نوعیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی ابوہریرہ کے نزدیک وضو ضروری ہے اور ابن عباس ضروری ہونے کی نفی کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جلیل القدر صحابی، فقیہ اور مجتہد ہے۔ اس لئے حدیث کی مراد سمجھنے اور اس سے فقہی مسئلہ کے استنباط میں اگر ان کے درمیان اختلاف ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ دوسری حدیث: رہی دوسری حدیث جس کے الفاظ ہیں "متیٰ استیقظ احدکم من منامہ ..... الخ" تو یہ تو بالکل صحیح حدیث ہے۔ اس کو بخاری و مسلم وغیرہ ائمۂ حدیث

نے کتب صحاح میں روایت کیا ہے اور یہ حدیث ابن عمر، جابر اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے
جہاں تک حضرت عائشہؓ کی تردید اور ان کے اس قول کا تعلق ہے کہ ہم "مہراس" سے وضو کیسے کرسکتے ہیں؟ تو اس تردید کی صحت کتب حدیث سے مطلق ثابت نہیں ہے اور نہ ان کتب میں اس قول کا کوئی ذکر ہے۔ بلکہ ابن العربی اور حافظ عراقی نے طرح التثریب کی شرح میں بیہقی سے نقل کرتے ہوئے اس کی تصریح کی ہے کہ جس شخص نے ابوہریرہ پر اعتراض کیا تھا وہ قین اشجعی ہے جو عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ میں سے ہیں۔ عراقی کی پوری عبارت (کا ترجمہ) یہ ہے:

"یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ صحیح مسلم کی روایت میں فی وضوئہ کے بجائے فی اناء ہے اور دوسری روایت میں فی الاناء ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سو کر اٹھنے کے بعد پانی میں ہاتھ ڈالنے کے متعلق حدیث کی ممانعت برتنوں کے ساتھ مخصوص ہے (کیونکہ ان میں پانی عموماً تھوڑا ہوتا ہے) حوض، تالاب وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں کیونکہ نجاست آلود ہاتھ ان میں ڈالنے سے پانی خراب ہونے کا اندیشہ نہیں ہے (اس لئے کہ ان میں پانی بہت زیادہ ہوتا ہے) اسی لئے حضرت ابوہریرہ نے جب یہ حدیث بیان کی تو قین اشجعی نے ان سے یہ پوچھا کہ اگر ہم تمہارے اس مہراس (پتھر کا بڑا برتن) سے وضو کریں تو کیسے کریں؟ اس پر ابوہریرہ نے کہا کہ میں تیرے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔" اس واقعہ کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ نے حدیث کے مقابلہ میں قین کا خود ساختہ مثالیں بیان کرنا پسند نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا واقعہ بھی ہے جس کو دارقطنی اور بیہقی نے حضرت ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ اس حدیث کو ابن عمر سے سنکر ایک شخص نے دریافت کیا کہ حوض کی صورت میں کیا کرنا چاہیئے" تو ابن عمر نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مقابلہ میں اس طرح کی مثالیں بیان کرنے کو اور ایسے معارضے کرنے کو ناپسند کیا۔ کیونکہ وہ ہو بہو حدیث پر سختی سے عمل کرنے والوں میں

سے تھے"

اس اقتباس سے یہ بات اور وضاحت سے معلوم ہوگئی کہ حضرت ابوہریرہ اس حدیث کی روایت میں تنہا نہیں ہیں۔ بلکہ اس کو ابن عمر نے بھی روایت کیا ہے اور ترمذی نے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ابن عمر نے جب اس حدیث کو بیان کیا تھا تو ان پر بھی ایسا ہی اعتراض اور خود ساختہ مثالوں سے معارضہ کیا گیا تھا۔ (ابوہریرہ اس معاملہ میں بھی تنہا نہیں ہیں)

نیز یہ کہ ابوہریرہ پر اعتراض کرنے والا قین اشجعی تھا، نہ کہ ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے قین حضرت عبداللہ ابن مسعود کے اصحاب (شاگردوں) میں سے ایک تابعی ہیں ذیل میں ہم قین کے بارہ میں حافظ ابن حجر کی عبارت نقل کرتے ہیں جس سے ہمارے گذشتہ دعوے کی توثیق ہو جائے گی۔

"قین اشجعی عبداللہ بن مسعود کے اصحاب (تلامذہ میں سے) ایک تابعی ہیں۔ ان کے اور حضرت ابوہریرہ کے درمیان ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ اس لئے ابن مندہ نے قین کا ذکر صحابہ میں کر دیا۔ اور یحیٰی بن کثیر عن ابی سلمہ کی سند سے ابوہریرہ سے یہ واقعہ نقل کیا کہ قین اشجعی نے کہا کہ: ہم مہراس سے وضو کرنے کی صورت میں اس حدیث پر عمل کیسے کریں؟ حالانکہ یہ حدیث محمد بن عمرو عن ابی سلمۃ عن ابی ھریرۃ کی سند سے بہت مشہور ہے کہ ابوہریرہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا قام احدکم من النوم .... الخ کہ جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کو ہاتھ دھونا چاہیئے الخ تو اس پر قین اشجعی نے ابوہریرہ سے یہ پوچھا کہ جب ہم تمہارے اس مہراس پر آئیں تو کیسے کریں؟ اور اعمش نے بھی عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ کی سند سے یہ مرفوع حدیث روایت کی ہے۔ اس پر اعمش کہتے ہیں کہ جب میں نے اس کا ذکر ابراہیم سے

کیا تو انھوں نے کہا کہ عبداللہ بن مسعود کے اصحاب نے کہا تھا کہ ابوہریرہ
مہراس سے وضو کرنے کی صورت میں اس حدیث پر عمل کیسے کریں گے (۱)

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابوہریرہ پر حضرت عائشہ کی جو تردید نقل کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور اگر اس کو صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو اس صورت میں یہ اختلاف حدیث کی مراد سمجھنے میں اختلافی مسئلہ بن جاتا ہے۔ یعنی حضرت ابوہریرہ نیند سے جاگنے کے بعد ہاتھ دھونا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور یہی مسلک امام احمد، داؤد ظاہری اور طبری کا بھی ہے۔ اس کے برخلاف حضرت عائشہ اور ابن عباس اس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اور یہی جمہور اہل علم کا مسلک ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں تکذیب و تردید اور شک و شبہ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ مؤلف نے حضرت عائشہ کا ابوہریرہ پر اعتراض اور تردید نقل کرنے کے بعد اس کو "شرح مسلم الثبوت" کی طرف منسوب کیا ہے۔ اصل کتاب شرح مسلم الثبوت کی مراجعت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بے اصل واقعہ کو جس نے ذکر کیا ہے وہ تو خود مسلم الثبوت کا مصنف ہے شارح نے تو مصنف کے اس نقل و بیان کی غلطی پر تنبیہ کی ہے اور صاف طور پر کہا ہے کہ حضرت عائشہ سے ایسی کوئی روایت ہرگز صحیح اور ثابت نہیں ہے۔ شارح کی عبارت یہ ہے۔

قال فی التیسیر لم یثبت هذا منهما۔ ای من عائشة وابن عباس ۔ وانما یثبت من رجل یقال له قین الاشجعی، وفی صحبته اختلاف۔	تیسیر میں لکھا ہے کہ ان دونوں ـــ یعنی حضرت عائشہ اور ابن عباس سے ایسی کوئی روایت ثابت نہیں ہے ـــ یہ روایت ایک شخص سے ثابت ہے جس کو قین الاشجعی کہتے ہیں اور اس کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے

تیسیر کی وہ عبارت جس کی طرف شارح نے اشارہ کیا ہے ابن امیر الحاج کی مشہور تصنیف تقریر سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس اور حضرت عائشہ کے بارے میں جو اتردید و تکذیب

---

(۱) الاصابہ ج ۳ ص ۲۸۵

کی روایت منقول ہے اس کے بارے میں ہمارے شیخ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کی کسی بھی کتاب میں اس کا مطلق وجود نہیں، یہ بات تو ایک اور شخص نے جس کو قین اشجعی کہتے ہیں۔ ابوہریرہؓ سے کہی تھی۔ چنانچہ سعید بن منصور نے ابوہریرہ سے یہ مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نیند سے جاگے تو اس کو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہاتھ دھو لینا چاہیئے الخ تو اس پر قین اشجعی نے پوچھا کہ تمہارے اس مہراس کی صورت میں اس حدیث پر عمل کیسے کریں؟ ابوہریرہ نے جواب دیا کہ میں تیرے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اور قین اشجعی کا ذکر ابن مندہ نے صحابہ میں کیا ہے اور اس کے ثبوت میں کہا ہے کہ قین کا ذکر اُس حدیث میں آیا ہے جو ابوسلمہ نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔" سیخنہ زیر بحث حدیث میں اس پر ابو نعیم نے ابن مندہ پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت قین کے صحابی ہونے کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتی بلکہ ہمارے شیخ حافظ ابن حجرؒ نے تو فرمایا کہ اور نہ اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا بھی ہے (۱)

ان سب گوشوں کی وضاحت کے بعد آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ استاذ احمد امین مرحوم نے اس نقل میں دو جگہوں پر حق سے گریز (اور دانستہ یا نادانستہ غلطی کا ارتکاب) کیا ہے۔

(۱) اول جس بات کو مسلم الثبوت کے مصنف نے نقل کیا ہے اس کو شارح مسلم الثبوت کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ اس کا ذکر خود مسلم الثبوت کے مصنف نے کیا ہے (شارح نے تو اس کی تردید کی ہے)۔

(۲) شارح نے مصنف کی غلطی پر تنبیہ کر کے اصل واقعہ کی جو تصحیح کی ہے ان دونوں سے مؤلف نے جان بوجھ کر چشم پوشی اختیار کی ہے اب ہم مؤلف کے اس فعل کو اس کے علاوہ کس چیز پر محمول کریں کہ وہ صحابہ کی ایک دوسرے کی تکذیب کو ثابت کرنے کے حریص ہیں اور خصوصیت کے ساتھ عام صحابہ کی طرف سے ابوہریرہ کی تکذیب و تردید کو ثابت کرنے کے لئے بے چین ہیں، خواہ اس کوشش میں انھیں کتنی ہی غلطیوں اور تحریفوں کا ارتکاب اور حق سے گریز کرنا پڑے۔ خدا اس عصبیت

---

(۱) التقریر ج ۲۔ ص ۲۰۰

اور ہوا پرستی کا بُرا کرے (اچھے بھلے انسان کو یہ عصبیت اندھا بنا دیتی ہے)

۲۔ حضرت ابوہریرہ کا حدیث نہ لکھنا

باقی مؤلف فجر الاسلام احمد امین مرحوم کی یہ تنقید کہ ابوہریرہ حدیثوں کو لکھا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی یادداشت سے ان کی روایت کرتے تھے۔ جس کو انھوں نے فجر الاسلام کے صفحہ ۲۶۸ پر بیان کیا ہے تو اس تنقید کا جواب تو یہ ہے کہ اس یادداشت سے حدیثیں روایت کرنے کے معاملہ میں ابوہریرہؓ تنہا نہیں ہیں بلکہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ہر اس شخص کا یہی عمل رہا ہے جس نے آپ سے کوئی حدیث روایت کی ہے سوائے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے، جن کے پاس ایک "نوشتہ" تھا جس میں وہ ہر حدیث لکھا لیا کرتے تھے۔ تاریخ حدیث کا علم رکھنے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں اور مؤلف نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے صفحہ ۲۷۰ پہ لکھتے ہیں کہ:

> "بہر حال عصر اول گذر گیا اس میں حدیث کی تدوین اور کتابت عام نہ تھی۔
> اس دور میں لوگ زبانی اور اپنے حافظہ سے حدیثیں روایت کرتے تھے۔ جو
> شخص حدیث مدون کر لیتے لکھتا بھی تھا تو وہ محض اپنی ذات کے لئے
> ایسا کرتا تھا تاکہ یاد کردہ حدیث میں اگر کسی وقت شک ہو تو اپنی تحریر
> سے ملا کر دیکھ لے)

اس عبارت سے مؤلف کا اشارہ اُن تابعین کی طرف ہے جنہوں نے پہلی صدی ہجری میں ہی حدیثیں لکھیں اور مدون کی تھیں۔ صحابہ کے عہد میں تو تمام صحابہ میں سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے اور کوئی دوسرا نہ تھا جس نے کتاب کی شکل میں حدیثوں کو اپنے لئے مدون کیا ہو (اور لکھا ہو) پھر اس تنقید و اعتراض کے لئے حضرت ابوہریرہ کو مخصوص کرنے .... اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کی وجہ کیا ہے؟ اور اس کے تذکرہ سے کیا فائدہ؟ جبکہ یہ چیز تمام صحابہ میں رائج اور معروف و مشہور ہے؟ درحقیقت اس عیب چینی میں اس کے سوائے اور کوئی راز نہیں ..... کہ مؤلف حضرت ابوہریرہ کی احادیث میں شکوک و شبہات پیدا کرنا چاہتے ہیں، (اور پڑھنے والے کے ذہن میں وہ یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ، جب ایک شخص حدیثیں لکھتا نہیں اور صرف اپنی یادداشت سے حدیثیں روایت کرتا ہے درانحالیکہ حافظہ اور یادداشت میں لبسا اوقات غلطیاں اور

کوتاہیاں ہوا کرتی ہیں تو ایسی حالت میں ہم ایسے شخص کی روایت کی ہوئی احادیث کو یقیناً شک و شبہ کی نظر سے دیکھیں گے۔ استاذ احمد امین مرحوم کا مقصد قطعی طور پر یہی ہے، ایسا نہ ہوتا تو وہ ابوہریرہ کی قوت یادداشت صداقت، دیانت اور ورع و تقوی میں صحابہ کی تعریفیں نقل کرنے کو اور علماء کا یہ اعتراف نقل کرنے کو ہرگز نظرانداز نہ کرتے کہ ابوہریرہ کو حدیث کے یاد رکھنے اور بہو بہو روایت کرنے میں تمام صحابہ پر ممتاز مقام اور فوقیت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ ان سے حدیثیں نقل اور روایت کرنے والے اہل علم اور محدثین کی تعداد ــــ بخاری کے بیان کے مطابق ــــ آٹھ سو تک پہونچتی ہے (یہ آٹھ سو محدث ہرگز ایک مشکوک و مشتبہ راوی حدیث صحابی کی احادیث قبول نہیں کر سکتے)

اگر مؤلف یہ تمام حقائق بیان کر دیتے تو ابوہریرہ پر کم از کم اس پہلو سے جرح و تنقید کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوتا ایک ایسا شخص جو حافظ حدیث ہے راست گو اور سچا ہے اس کی یادداشت نہایت پختہ ہے، اور تمام اہل علم اور محدثین اس کی امانت و دیانت اور حفظ و اتقان کے معترف ہیں، اس کے لئے حدیثیں نہ لکھنے اور کتاب سے حدیثیں بیان نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (نہ یہ چیز قابل اعتراض ہے) بلکہ بعض علماء تو ایک ایسے محدث کے مقابلہ میں جو اپنی کتاب سے لکھی ہوئی حدیثیں روایت کرتا ہو، اس محدث کی روایت قبول کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جو اپنے حافظہ سے حدیثیں روایت کرتا ہو، بشرطیکہ وہ پختہ یادداشت کا مالک ہو اور سچا ہو، علماء اصول نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر دو حدیثیں ایک دوسرے سے متعارض ہوں ان میں سے ایک سنی ہوئی ہو اور دوسری لکھی ہوئی، تو سنی ہوئی حدیث مقدم اور قابل ترجیح ہے ــــ آمدی نے الاحکام (۱) میں لکھا ہے کہ:۔

> "جو امور مرویات سے متعلق ہیں ان میں ترجیح کی کئی صورتیں ہیں اول یہ کہ دو روایتوں میں سے ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہو اور دوسری لکھی ہوئی، تو سنی ہوئی روایت مقدم ہے، کیونکہ اس میں تصحیف یعنی کتابت کی غلطی کا (یا لکھا ہوا غلط پڑھنے کا) امکان نہیں ہوتا۔

---

(۱) ج ۴ ص ۳۳۴

اسی وجہ سے سلف صالحین میں سے صحابہ و تابعین کے ایک گروہ نے تو حدیث لکھنے کو ناپسند کیا ہے۔ تاکہ طلبہ کتابت پر ہی بھروسہ نہ کر بیٹھیں جس کے نتیجے میں ملکۂ یادداشت اور حافظہ کمزور پڑ جائے۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم (۱) میں اپنی سند سے ابراہیم نخعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :۔

"لکھو نہیں، ورنہ اسی پر تکیہ کرنے لگو گے"

ابراہیم نخعی نے یہ بھی کہا ہے کہ :۔

"بہت کم لوگ ایسے ہیں جو لکھنے کے بعد اس پر تکیہ نہ کر بیٹھتے ہوں" (اس لئے کہ لکھ لینا آسان ہے اور یاد کرنا اور یاد رکھنا بڑا مشکل کام ہے)۔

اس کے علاوہ ابن عبدالبر نے امام اوزاعیؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ :۔

یہ علم (حدیث) ایک نہایت شریف چیز تھی جب تک کہ اس کو لوگ ایک دوسرے کی زبان سے نقل کرتے اور یاد کرتے کراتے رہے۔ جب یہ علم حدیث کتابوں میں بند ہو گیا تو اس کا نور جاتا رہا اور نااہلوں کے پاس پہونچ گیا"

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ جو لوگ حدیث لکھنے کو ناپسند کرتے تھے ان میں ابن عباس، شعبی، ابن شہاب، نخعی اور قتادہ جیسے اہل علم کے نام سرفہرست ہیں اور ان کے علاوہ وہ محدثین جو ان کے راستہ پہ چلتے اور ان کے مسلک کو اختیار کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ حفظ حدیث ان کی جبلت اور فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ ان میں سے ہر محدث صرف ایک دفعہ حدیث سن لینے پر اکتفا کرتا تھا ذرا آپ امام ابن شہاب زہری کے اس بیان پر غور کیجئے اور ان کے حافظہ کی داد دیجئے وہ فرمایا کرتے تھے :

"میں جب البقیع کے پاس سے گذرتا ہوں تو اپنے کان اس ڈر سے بند کر لیتا ہوں کہ کوئی فحش بات ان میں نہ پڑ جائے۔ خدا کی قسم جو بات کبھی کبھی میرے کان میں پڑ گئی میں اس کو کبھی نہیں بھولا۔

امام شعبی سے بھی ایسا ہی قول مروی ہے یہ تمام حضرات عرب تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :۔

---

(۱) ج ۱ ص ۶۸

نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب — ہم اَن پڑھ لوگ ہیں نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں۔

اور یہ تو معروف ومشہور حقیقت ہے کہ حافظہ کی پختگی عربوں کی قومی خصوصیت تھی۔ ان میں سے ایک ایک فرد پورے کا پورا قصیدہ صرف ایک مرتبہ سُنکر یاد کر لیتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابن عباس نے عمر بن ابی ربیعہ کا یہ قصیدہ "أمن آل نعم أنت غادٍ فمبكر" ایک بار سُنکر حفظ کر لیا تھا۔ یہ واقعہ ادب اور تاریخ کی کتابوں میں مشہور ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا ان روایتوں کو جو اُنھوں نے براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنیں آنحضرت سے منسوب کرکے بیان کرنا

فجر الاسلام کے مؤلف احمد امین مرحوم کا ابوہریرہ پر ایک اعتراض یہ ہے کہ:۔

> وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہوئی روائتیں بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ دوسروں سے سُنی ہوئی روائتیں بھی آپ ہی کی طرف منسوب کرکے بیان کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابوہریرۃ نے ایک حدیث بیان کی۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
>
> من أصبح جنبا فلا صوم له — جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کرے اُس کا روزہ نہیں ہوتا۔
>
> ⁂ ⁂ ⁂
>
> تو اس حدیث کا حضرت عائشہ نے انکار فرمایا اور کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اوقات حالت جنابت میں فجر کا وقت ہو جاتا، اور اس (جنابت) کا سبب احتلام نہیں ہوتا تھا، پھر آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھ لیتے۔ تو یہ بات جب ابوہریرہ سے بیان کی گئی تو اُنھوں نے کہا کہ حضرت عائشہ مجھ سے زیادہ علم رکھتی ہیں، میں نے اس حدیث کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنا، بلکہ اس کو فضل بن العباس سے سُنا ہے (فجر الاسلام ص ۲۶۹)

اس اعتراض کے جواب کے لئے ہم ذیل میں دو پہلوؤں سے گفتگو کریں گے

اول: ہم ابوہریرہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اُن روایتوں کو منسوب کرنے کے معاملہ کو لیتے ہیں جو اُنھوں نے آپ سے براہِ راست نہیں سُنی تھیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں حضرت ابوہریرہ ہی منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ اس میں صغار صحابہ بھی (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کم عمر تھے) ابوہریرہ کے ساتھ شریک ہیں۔ اور وہ صحابہ بھی شریک ہیں جو آخری زمانہ میں اسلام لائے ہیں چنانچہ حضرت عائشہ، انس، براء، ابن عباس، ابن عمر وغیرہ جیسے صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرکے بہت سی ایسی حدیثیں بیان کی ہیں جو اُنھوں نے خود آپ سے نہیں بلکہ آپ کے اور صحابہ سے سُنی تھیں، اور اُن صحابہ نے آپ سے سُنی تھیں۔ اس طرزِ عمل کے جواز میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جب ان کے نزدیک تمام صحابہ کی عدالت اور سچائی ثابت ہوگئی، تو پھر وہ اس عمل میں (یعنے بواسطہ روایت کرنے میں) کچھ حرج نہیں سمجھتے تھے (۱) حضرت ابن عباسؓ نے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے یہ روایت بیان کی:

انما الربا في النسيئة — سود تو صرف اُدھار میں ہوتا ہے

اسی طرح ابن عباسؓ نے ایک اور حدیث بیان کی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنے کے وقت تک تلبیہ کہتے رہے۔ پہلی حدیث کے بارے میں جب ان سے معلوم کیا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ یہ روایت اُسامہ بن زید نے مجھ سے بیان کی تھی (۲) دوسری حدیث کے بارے میں جب اُن سے دریافت کیا گیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ میرے بھائی فضل بن عباس نے مجھ کو یہ روایت بتلائی ہے (۳) ابن عمرؓ نے ایک حدیث روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

---

(۱) اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب بیع الدینار بالدینار نسأً میں روایت کیا ہے۔ مُسلم نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے (۲) آمدی۔ الاحکام۔ ج ۱ ص ۲۰۴، حدیث کی اکثر کتابوں میں یہ روایت (باب تلبیہ میں) ابن عباس سے فضل کے واسطہ سے ہی مروی ہے مسند احمد میں ابن عباس بلا واسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

(۳) ایضاً۔ کتب حدیث میں یہ واقعہ بھی موجود ہے۔

من صلی علی جنازۃ فلہ قیراط — جو شخص جنازہ کی نماز پڑھے اس کو ایک قیراط ثواب ملے گا

اس کے بعد ابن عمرؓ نے اس روایت کو ابو ہریرہؓ کی طرف منسوب کیا۔

اس سے پہلے ہم حضرت انسؓ کا یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ: ہم جو کچھ تم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بیان کرتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ ہم نے آپ سے سنا ہی ہو، لیکن ہم میں سے کوئی کسی کو جھوٹا نہیں سمجھتا تھا۔" اسی طرح حضرت براءؓ کا قول بھی پہلے گذر چکا ہے، انھوں نے فرمایا کہ: ہم نے ہر حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی نہیں سنی، بلکہ آپ کے صحابہ آپ سے سنی ہوئی باتیں ہم سے بیان کیا کرتے تھے اونٹ چرانے وغیرہ کی مشغولیت ہماری راہ میں مانع تھی (کہ ہم ہر حدیث آپ کی زبان سے سن سکیں)۔ ایسی ہی روایتوں کو علماء "مرسل صحابی" کہتے ہیں۔ اہل علم کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اس قسم کی روایتوں سے استدلال درست ہے اور ان کا بھی وہی حکم ہے جو حدیث مرفوع کا حکم ہے۔ البتہ ابو اسحٰق اسفرائینی کی رائے اس سے مختلف ہے وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے صحابی نے اس حدیث کو کسی تابعی سے روایت کیا ہو۔ لیکن اسفرائینی کے قول کی سب ہی نے تردید کی ہے۔ اس قول کے ناقابل اعتبار اور مردود ہونے کے بارے میں اس کی مخالفت پر اہل حدیث اور علماء اصول کا اجماع ہی بہت کافی ہے۔

شیخ ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:-

> ہم نے حدیث کی اس قسم کو جو اصول فقہ میں مرسل صحابی کہلاتی ہے "مرسل" کی اقسام میں شمار نہیں کیا۔ مثلاً ابن عباس یا دوسرے نوعمر صحابہ ایک حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں حالانکہ انھوں نے براہ راست اس کو آپ سے نہیں سنا۔ اس قسم کی حدیث کو مرسل کی انواع میں شمار نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث متصل اور "مسند" روایت ہی کے حکم میں ہے کیونکہ وہ لامحالہ کسی صحابی ہی سے روایت کرتے ہیں (اگرچہ اس کا نام نہیں لیتے) اور صحابی کا نام معلوم نہ ہونے سے روایت کی صحت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی کیونکہ صحابہ سارے کے سارے عدول اور عادل ترین راوی ہیں (۱)

۱؎ ص ۲۶۔

علامہ عراقی نے مقدمہ کی شرح میں مصنف کے قول "ما یسمی فی اصول الفقہ" پر جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ :-

محدثین نے اگرچہ مراسیل صحابہ کا ذکر کیا ہے تاہم اس کو حجت ماننے میں ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں علماء اصول کا اس میں ضرور اختلاف ہے۔ چنانچہ استاذ ابو اسحاق اسفرائینی کی رائے ہے کہ "مراسیل صحابہ" حجت نہیں ہیں۔ لیکن عام اہل اصول نے ان کے اس نظریہ کی شدید مخالفت کی ہے اور اس کو حجت ماننے پر پورے اعتماد و یقین کا اظہار کیا ہے"

مرسل حدیث کے حجت ہونے میں اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد امام نووی فرماتے ہیں کہ:-

یہ سارا اختلاف مرسل صحابی کے سوا دوسری مراسیل (مرسل روایات) کے بارے میں ہے۔ لیکن صحابی کی مرسل حدیث جیسے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کے متعلق خبر دیں یا اسی طرح کے کسی اور واقعہ کی خبر دیں جس کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ صحابی اپنی کم عمری، یا آخر میں اسلام لانے یا کسی اور ایسے ہی سبب سے اس فعل کیا واقعہ کے وقت موجود نہیں تھے تو اس میں صحیح اور مشہور مذہب جس پر ہمارے جمہور اصحاب حدیث اور تمام اہل علم کا قطعی طور پر اتفاق ہے یہ کہ ایسی روایت حجت ہے حتیٰ کہ ان محدثین نے بھی جنہوں نے صحیح حدیث کی شرائط بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ "مرسل روایت حجت نہیں ہے" مرسل صحابی کو متفقہ طور پر حجت مانا ہے اور اس کو صحیح حدیث میں داخل سمجھا ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اس قسم کی بیشمار مثالیں موجود ہیں ہاں ہمارے اصحاب میں سے استاذ ابو اسحٰق اسفرائینی بیشک ایسی مرسل حدیث کو حجت نہیں مانتے اور ان کے نزدیک اس مرسل صحابی کا حکم بھی وہی ہے جو صحابی کے علاوہ کسی دوسرے راوی کی مرسل روایت کا ہے بجز اس صورت کے کہ وہ صحابی خود ہی بیان کر دیں کہ وہ انھیں روایتوں میں ارسال کرتے ہیں جو انھوں نے نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم سے یا کسی صحابی سے سُنی ہیں" آسفرائینی اپنی اس رائے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: یہ اس لئے کہ یہ لوگ (صغار صحابہ) کبھی کبھی صحابی کے علاوہ اوروں سے (یعنی تابعیوں سے) بھی حدیث روایت کرتے ہیں" اس کے بعد امام نووی فرماتے ہیں کہ: صحیح بات وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے کہ مرسل صحابی مطلقاً حجت ہے، کیونکہ صحابہ کی غیر صحابی (یعنی تابعی) سے روایت کرنا بہت ہی نادر ہے جہاں وہ ایسا کرتے بھی ہیں تو اس کو واضح کر دیتے ہیں (کہ یہ حدیث ہم نے فلاں تابعی سے سُنی ہے) اگر وہ اس کا ذکر نہ کریں تو ظاہر یہی ہے کہ کسی صحابی ہی سے روایت کی گئی ہے۔ اور صحابہ سب ہی عادل ہیں (۱)

یہ ہیں ارسال صحابہ کے بارے میں علماء کے اقوال ان سے ہی حضرت ابو ہریرہ کے ارسال کا حکم بھی معلوم ہو جاتا ہے جس کو استاذ احمد امین نے قابل اعتراض بتلایا ہے۔ (بہرحال یہ صرف ابو ہریرہ ہی کا عمل نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے صحابی اس میں شریک ہیں)

اس بحث کا دوسرا پہلو وہ حدیث ہے جو مولف نے حضرت ابو ہریرہ کے ارسال کی شہادت میں پیش کی ہے۔ اس پر بھی ہم کئی حیثیتوں سے گفتگو کریں گے۔

اول یہ کہ حدیث کی کتب صحاح میں حضرت عائشہ کے ابو ہریرہ پر اس انکار کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ بلکہ وہاں مسئلہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ابو ہریرہ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ جو شخص بحالتِ جنابت صبح کرے اس کا روزہ ہوگا یا نہیں؟ انھوں نے یہ فتویٰ دیا کہ اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ اور اُم سلمہ سے یہی مسئلہ پوچھا گیا تو ان دونوں اُمہات المومنین نے یہ فتویٰ دیا کہ روزہ درست ہوگا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ بھی فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت میں صبح کرتے اور روزہ رکھ لیتے۔ یہ بات جب حضرت ابو ہریرہ کو بتلائی گئی تو انھوں نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ: یہ دونوں مجھ سے زیادہ علم رکھتی ہیں۔

---

(۱) المجموع شرح المہذب ج ۱ ص ۶۲

لہٰذا اصل واقعہ صرف فتوے دینے کا ہے جس میں جس کو جو علم تھا، اور جو بات اس کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت تھی اُس کے مطابق اس نے فتویٰ دے دیا۔ اس میں نہ حضرت عائشہ کے انکار کا ذکر ہے۔ اور نہ ابوہریرہ پر اس حدیث کی تردید کا۔ ذیل میں ہم صحیح مسلم کی عبارت نقل کرتے ہیں:

امام مسلم۔۔۔۔۔ نے اپنی سند سے جو ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث تک پہونچتی ہے۔ اس واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت ابوہریرہ کو وعظ کرتے ہوئے سُنا وہ کہہ رہے تھے کہ: جس شخص کو جنابت کی حالت میں فجر کا وقت ہو جائے اس کو روزہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ پس (ابوبکر) نے اس کا ذکر عبدالرحمٰن بن الحارث (یعنی اپنے باپ سے) کیا۔ اُنھوں نے اس مسئلہ کا انکار کیا اس کے بعد عبدالرحمٰن چلنے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا اور حضرت عائشہ اور اُم سلمہ کے پاس پہونچے عبدالرحمٰن نے ان دونوں سے اس مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا۔ ان دونوں نے جواب دیا کہ بعض اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنابت کی حالت میں صبح ہو جاتی تھی اور یہ جنابت احتلام کے سبب نہ ہوتی تھی (بلکہ جماع کرنے کی وجہ سے ہوتی تھی) اس کے بعد بھی آپ روزہ رکھ لیتے تھے۔ اس کے بعد ہم معلّٰی مروان کے پاس پہونچے۔ عبدالرحمٰن نے ان سے اس مسئلہ کا ذکر کیا۔ اس پر مروان نے کہا کہ میں تم سے بتاکید کہتا ہوں کہ تم ابوہریرہ کے پاس جاؤ اور ان کی اس بات (مسئلہ) کی تردید کرو۔ تو ہم ابوہریرہ کے پاس آئے۔ اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث (راوی) ان سب موقعوں پر موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے اس کا ذکر ابوہریرہ سے کیا۔ ابوہریرہ نے پوچھا کہ کیا ان دونوں (حضرت عائشہ اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہا) نے تم سے یہ بات بیان کی ہے؟ اُنھوں نے کہا ہاں! اس پر ابوہریرہ بولے:

انھیں اس کا زیادہ علم ہے" پھر ابوہریرہ نے اس مسئلہ کو جس کے
وہ قائل تھے فضل بن عباس کی طرف منسوب کیا اور فرمایا کہ میں نے تو
یہ حدیث فضل بن عباس سے سُنی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
نہیں سُنی۔ اور اس کے بعد ابوہریرہ نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا

یہ مسلم کی اصل عبارت ہے۔ اس سے قطعی طور پر واضح ہے کہ حضرت عائشہ نے ابوہریرہ پر کوئی انکار اور تردید نہیں کی۔ اور اس کی تصریح مسلم الثبوت کے شارح نے بھی کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے مسلم الثبوت کے مصنف کی اس نقل کی تصحیح کی، جو اُس نے سفرالسعادت سے لی تھی اور اس کے بعد کہا کہ: اس میں اُم المومنین کی ابوہریرہ پر کوئی تردید مذکور نہیں ہے، اور نہ اس تردید کی کوئی سند ہی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مزید بیان کیا کہ مسلم کے حاشیہ میں جو یہ بات لکھی ہے کہ: اُم المومنین نے مخالفت کتاب اللہ کی وجہ سے ابوہریرہ پر تردید کی تھی تو یہ ایک درخت ہے جو کہ وزجیرطیبہ اُگا ہے (یعنی بے بنیاد بات ہے) کیونکہ عائشہ کی تردید کہیں ثابت نہیں انھوں نے تو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل نقل کیا ہے (۱)

اس کو پڑھئے اور مؤلف فجرالاسلام کی اس مجرمانہ حرکت پر تعجب کیجئے کہ شارح مسلم الثبوت نے اس واقعہ کی تصحیح میں جو موقف اختیار کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ پر حضرت عائشہ کی تردید وانکار کی جو نفی کی ہے مؤلف نے نہ صرف اُس سے چشم پوشی کی اور اس پر پردہ ڈالا بلکہ اس پر یہ اضافہ کیا کہ اس انکار اور تردید کی نسبت خود شارح کی طرف کر دی (استغفر اللہ) مؤلف فجرالاسلام کی اس قسم کی مجرمانہ حرکتیں بہت سے مقامات پر پہلے بھی آپ کے سامنے آچکی ہیں۔ بہر حال یہ علمی دیانت و امانت ان کو ہی مبارک ہو۔

دوم: یہ کہ اگر ہم حضرت عائشہ سے اس انکار کا ثابت ہونا تسلیم بھی کرلیں تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ابوہریرہ کی روایت کی تکذیب کر رہی تھیں بلکہ اس کا مطلب تو یہ ہے حضرت عائشہ کو اس حکم کا تو علم نہیں تھا۔ بلکہ اس کے خلاف معلوم تھا تو اس صورت میں تو یہ ایک ایسی ہی نکتہ چینی

---

(۱) شرح مسلم الثبوت ج ۲ ص ۱۷۵

ہے، جیسی نکتہ چینیاں اُم المومنین حضرت عائشہ کبارِ صحابہ پر کیا کرتی تھیں، جن میں حضرت عمر، ان کے صاحبزادے عبداللہ، ابوبکر، علی، ابن مسعود، ابن عباس، زید بن ثابت اور ابو سعید خدری وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہ شامل تھے (ابوہریرۃ کی کچھ خصوصیت نہیں) خود صحابہ کرام ایک دوسرے پر اس قسم کی تنقید اور نکتہ چینی کیا کرتے تھے لیکن وہ اس کو (ایک دوسرے کی تکذیب نہیں سمجھتے تھے) بلکہ یہ تنقید تو وہ علم دین کی تصحیح کی غرض سے اور ہر صحابی کے پاس علم کی جو امانت تھی اس کو ادا کرنے کی نیت سے کیا کرتے تھے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے علم کو چھپایا خدا اس کے منہ کو آگ کی لگام لگائے گا (۱)

سوم: یہ کہ اکثر روایتوں میں اس کا مطلق ذکر نہیں کہ حضرت ابوہریرہ نے اس حدیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا (یعنی مرفوع حدیث کے طور پر روایت کیا) ہے بلکہ یہ بیان کیا ہے کہ یہ ابوہریرہ کا اپنا فتویٰ تھا۔ بہت کم روایات ایسی ہیں جن میں اس حدیث کو مرفوع بتایا گیا ہے۔ اسی طرح بعض روایتوں میں یہ آیا ہے کہ ابوہریرہ نے اس کی نسبت فضل کی طرف کی ہے، اور بعض میں آیا ہے کہ اسامہ بن زید کی طرف ــ ایک روایت میں یہ ہے کہ ابوہریرۃ نے کہا کہ مجھے فلاں فلاں لوگوں نے بتلایا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے فضل اور اسامہ دونوں سے سُنا تھا۔ لیکن کسی راوی نے صرف اسامہ کے ذکر پر اکتفا کیا (اور کسی نے صرف فضل کے ذکر پر) راویوں سے اکثر و بیشتر ایسا ہوتا رہتا ہے۔

چہارم: یہ کہ علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ:

> حضرت ابوہریرہ نے اپنے اس فتوے سے رجوع کر لیا تھا خواہ اس وجہ سے کہ اُم المومنین کی روایت ــ جس سے بصراحت جنابت کی حالت میں روزہ رکھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے ــ دوسروں کی روایت کی بہ نسبت ان کے نزدیک راجح تھی۔ جبکہ ان دوسروں کی روایت میں اس کا احتمال بھی ہے کہ غیر فرضی روزوں میں اس حکم کو استحباب پر محمول کیا جائے اسی

---

(۱) اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

طرح اُس رمضان روزہ رکھنے کی ممانعت کو بھی استحباب پر محمول کیا جائے اور خواہ اس وجہ سے کہ حضرت ابوہریرہ یہ سمجھتے تھے کہ ام المومنین کی روایت دوسروں کی روایت کے لئے ناسخ ہے اور یہی اکثر علماء کا مذہب ہے۔ اور بعض تابعین تو ابوہریرہ کے اس قول پر ہی قائم رہے ہیں۔ جیسا کہ ترمذی نے نقل کیا ہے۔ تابعین کے عہد کے بعد یہ اختلاف ختم ہوگیا اور ابوہریرہ کی اس رائے کے خلاف پر اجماع قائم ہوگیا، جیسا کہ نووی نے اس پر اپنا الیقین ظاہر کیا ہے۔ الخ (۱)

جو شخص بھی ہوائے نفس اور ذاتی اغراض سے یکسو ہو کر حق کا خواہاں ہو اس کے لئے ابوہریرہ کے اس مسئلہ میں حق کا پہلو یہی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی کثرت روایت حدیث پر صحابہ کا مبینہ انکار و اعتراض اور اس کا جواب:

فجر الاسلام کے مؤلف استاذ احمد امین مرحوم نے بیان کیا ہے کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کثرت کے ساتھ احادیث روایت کرنے کی بنا پر صحابہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر بہت سخت تنقید کی ہے اور شکوک و شبہات ظاہر کئے ہیں اور یہ بات اس روایت سے ظاہر ہے جو امام مسلم نے اپنی صحیح مسلم میں خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ اس روایت میں ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ "تم کہتے ہو ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بہت بیان کرتا ہے"۔ ہم سب کو خدا کے سامنے جانا ہے بات یہ ہے کہ میں ایک غریب آدمی تھا پیٹ بھر کھانے پر قناعت کرکے میں (ہمہ وقت) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا مہاجرین کو تجارتی لین دین بازاروں میں مشغول رکھتا

---

(۱) فتح الباری ج ۴ ص ۱۱۸

تھا۔ (اس لئے وہ ہمہ وقت موجود نہیں رہتے تھے) انصار بھی اپنے اموال
کی دیکھ بھال میں مشغول رہتے تھے (وہ بھی ہمہ وقت موجود رہنے سے قاصر
تھے)۔ صحیح مسلم ہی میں ایک اور روایت بیان کی گئی ہے کہ ابوہریرہ نے کہا؛
لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت روایتیں بیان کرتا ہے۔ خدا کو منہ دکھانا
ہے؛ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار اس (ابوہریرہ) کی طرح کثرت
سے احادیث کیوں نہیں بیان کرتے؟ آؤ میں تمہیں اس کی وجہ بتاتا ہوں۔
میرے بھائی انصار اپنی زمینوں کے کام (کھیتی باڑی) میں معروف رہتے
تھے اور میرے مہاجر بھائی بازاروں میں (تجارتی) کاروبار میں مشغول رہتے
تھے اور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں لگا رہتا، اور
پیٹ بھر کھانے پر اکتفا کرتا (کسب معاش کے کسی بھی دھندے سے
مجھے سروکار نہ تھا) اس لئے جب وہ موجود نہ ہوتے تو میں حاضر ہوتا، وہ
(اپنے کاروبار میں مصروف رہنے کی وجہ سے) اگر کسی بات کو بھول جاتے
تو میں یاد رکھتا تھا۔ ص ۲۶۹ فجر الاسلام

احمد امین مصری مرحوم کی یہ عبارت تو قریب قریب وہی ہے جو کسی قدر ناکشی ہمدردی
کے ساتھ گولڈ تسیہر نے کہی ہے۔ وہ کہتا ہے: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کے وسیع علم نے جو ابوہریرہ کو
ہمیشہ مستحضر رہتا تھا اُن لوگوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کر دیا تھا جنہوں نے براہ راست اس علم
حدیث کو ان سے اخذ کیا تھا۔ (یعنے ان کے شاگرد تھے) اور ان لوگوں کے دلوں میں بھی جنہوں نے اپنے شکوک و
شبہات کو تمسخر کے انداز میں ظاہر کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ (یہ انہیں دو حدیثوں کی طرف
اشارہ ہے جن کو مؤلف فجر الاسلام نے مسلم الثبوت سے نقل کیا ہے (۱) الخ

یہ ہی وہ ماخذ ہے جس پر مؤلف نے ابوہریرہ پر اعتراض اور طعن و تشنیع کی بنیاد رکھی ہے
جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ (احمد امین اور گولڈ تسیہر) دونوں کے اعتراضوں میں بہت معمولی سا

(۱) دائرۃ المعارف الاسلامیہ ترجمہ ابوہریرہ ج ۱ ص ۴۰۸

فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مستشرق نے شک و شبہ کی نسبت ان لوگوں کی طرف کی ہے جنہوں نے ابوہریرہ سے براہِ راست علم حدیث حاصل کیا تھا، یعنی تابعین۔ لیکن مؤلف نے اس شک و شبہ کی نسبت بعض صحابہ کی طرف ہی کر دی[۱]۔ اس لحاظ سے مؤلف کی یہ ڈھکی چھپی جرح گولڈ تسیہر کی کھلی جرح سے زیادہ شدید اور گہری ہے اور یہ ایک ایسا فنی کمال و ہنر ہے جس پر کسی طرح بھی فجر الاسلام کے مؤلف کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

بات کچھ ہی ہو مؤلف نے خود ابوہریرہ سے جو کچھ نقل کیا ہے اور ابوہریرہ نے جو اپنا دفاع کیا ہے اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے ابوہریرہ پر طعن اور ان کی صداقت میں کوئی شک و شبہ پیدا ہوتا ہو۔ کیونکہ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ اُن صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت حدیثیں روایت کی ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ بہت آخر میں اسلام لائے تھے۔ اس کثرت روایت کی وجہ یہ تھی کہ وہ زیادہ تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جہاں کہیں آپ تشریف لے جاتے وہ بھی ساتھ جاتے اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے تو ابوہریرہ کبار صحابہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث دریافت کیا کرتے، جیسا کہ دوسرے کمسن صحابہ مثلاً عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور حضرت انس وغیرہ کا معمول تھا اس کے علاوہ ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث بالاستیعاب یاد کرنے کے بیحد حریص تھے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ کی اس حرص کی شہادت بھی دی تھی کہ ابوہریرہ سارے صحابہ میں حدیث کے سب سے زیادہ حریص ہیں۔ انہی اسباب کی بنا پر حضرت ابوہریرہ کو سب سے زیادہ احادیث یاد تھیں اور وہ ان کو جمع کرنے کا اہتمام بھی بہت کرتے تھے جب خلفاء راشدین کا زمانہ آیا اور صحابہ کرام مختلف شہروں میں پھیل گئے تو ابوہریرہ نے اس امانت کی ذمہ داری کو (خاص طور پر) محسوس کیا کہ جو کچھ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنکر محفوظ کیا ہے

---

[۱] "پدر گر نتواند پسر تمام کند" یعنی جو بات گولڈ تسیہر غیر مسلم ہونے کی وجہ سے کہتے ہوئے ڈرتا تھا اس کے معنوی فرزند مؤلف فجر الاسلام نے مسلمان ہونے کی وجہ سے بے دھڑک کہہ دی کہ نہ صرف تابعین بلکہ صحابہ کے دلوں میں بھی ابوہریرہ کے متعلق شکوک و شبہات تھے۔ ۱۲ مترجم

اُس کو اُمت تک پہونچائیں۔ علاوہ ازیں اگر وہ ان احادیث کو بیان کرنے سے باز رہتے تو انھیں کتمان علم کی سزا، کا بھی خوف تھا۔ ابوہریرہ نے خود بھی اسی کی تصریح کی ہے۔ ایک حدیث میں جس کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ: اگر کتاب اللہ کی یہ دو آتیں نہ ہوتیں تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا اس کے بعد انھوں نے یہ آتیں تلاوت کیں ؎۔

ان الذین یکتمون ما انزلنا	جو لوگ ان کھلی ہوئی باتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں اور
من البینات والھدیٰ من	اس ہدایت کو جو ہم نے اس کتاب میں لوگوں کے لئے بیان
بعد ما بیّنٰہ للناس فی الکتاب	کی ہے، چھپاتے ہیں، ایسے لوگوں پر خدا لعنت کرتا ہے
اولئک یلعنھم اللہ ویلعنھم	اور اُن پر اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں
اللّٰعنون۔ الا الذین	سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے اس سے توبہ کی،
تابوا واصلحوا وبیّنوا فاولئک	اور اپنی اصلاح کی اور پھر (ان چیزوں کو) بیان کردیا
اتوب علیھم وانا التواب	یہی وہ لوگ ہیں جن کی میں توبہ قبول کرتا ہوں، اور
الرحیم	میں تو بہت ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہوں۔

ایسی صورت میں یہ بالکل طبیعی امر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کی روایت کے لئے ابوہریرہ کا اس عجیب انداز میں اُٹھ کھڑا ہونا۔ خصوصاً جبکہ ان کا آخر میں اسلام لانا بھی سب کو معلوم تھا، بعض تابعین کے دلوں میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے بعض ایسے لوگوں کے دلوں میں جو مدینہ کے ماحول سے دور تھے، حیرت و استعجاب کا ہیجان پیدا کردے اور وہ یہ کہنے لگیں کہ: ابوہریرہ کو کیا ہوگیا ہے جو اس کثرت سے حدیث بیان کرتے ہیں، حالانکہ دوسرے صحابہ اس کثرت سے حدیثیں روایت نہیں کرتے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو اُن کے ذہنوں میں بار بار اُبھرتا تھا، اور وہ اس کو ابوہریرہ کے سامنے پیش کرتے تھے، اس لئے نہیں کہ اُنھیں ان کی حدیثوں میں کوئی شک و شبہ تھا یا وہ ان کی تکذیب کرتے تھے، بلکہ اپنے اس تعجب اور حیرانی کو دور کرنے کے لئے وہ یہ سوال کرتے تھے۔ اس کے جواب میں ابوہریرہ ان کے سامنے اس کا سبب واضح کردیتے تھے اور وہ سبب وہی ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا ہے یہ جواب سُنکر وہ مطمئن اور خاموش ہوجاتے اور اپنی رضامندی اور اطمینان کا اظہار کردیتے

تھے۔ آپ ہی غور کیجئے کہ اس واقعہ میں ابوہریرہ کی کثرت روایت حدیث پر صحابہ و تابعین کی تنقید آپ کہاں پاتے ہیں، جس کا فجر الاسلام کے مؤلف احمد امین نے دعویٰ کیا ہے اور پھر ابوہریرہؓ کی صداقت اور حفظ حدیث میں شک وشبہ کہاں ہے؟ (جس کے مؤلف مدعی ہیں) اس حدیث میں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہے وہ محض ایک سوال ہے جو ابوہریرہ کی کثرتِ روایت پر اُن کے استعجاب کو ظاہر کرتا ہے لیکن یہ استعجاب تکذیب کیوں کر بن گیا؟ بعض اوقات آپ کا ایک ایسا دوست جس کی صداقت میں آپ کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا ایک ایسا واقعہ آپ سے بیان کرتا ہے جس میں کوئی تعجب خیز بات ہوتی ہے تو آپ اس پر اپنے تعجب اور حیرانی کا اظہار ضرور کرتے ہیں، مگر نہ اس کی تکذیب آپ کا مقصد ہوتا ہے اور نہ اس کی بات کا انکار، بلکہ آپ کے سوال کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کی حیرانی اور تعجب کو دور کرے، اور واقعہ کی حقیقت آپ سے کھول کر بیان کر دے۔ بعینہ یہی صورت حضرت ابوہریرہ کے ساتھ پیش آئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین نے ابوہریرہ کی اس بات کو جس میں اُنھوں نے دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں اپنی کثرت روایت کا راز بتلایا تھا برضا و رغبت قبول کر لیا تھا اور مطمئن ہو گئے۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر وہ ابوہریرہ کی تکذیب کرتے یا ان کی صداقت اور حفظ میں ان لوگوں کو کچھ بھی شک ہوتا تو کیا ابوہریرہ کا محض یہ کہہ دینا کہ میں نے جو کچھ سنا ہے وہ تم نے نہیں سنا، اور جو مجھے یاد ہے وہ تم بھول گئے ہو" ان کو ابوہریرہ کی تصدیق پر آمادہ اور مطمئن کرنے کے لئے کافی ہو سکتا تھا؟ اس کے ساتھ ہی آپ اس پر بھی غور فرمایئے کہ اگر وہ ابوہریرہ کی حدیث میں شک کرتے تو کیا وہ ابوہریرہ کو ہادیٔ اُمت اور شارح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل حدیثیں روایت کرتے رہنے کی اجازت دے سکتے تھے؟ کیا امیر المؤمنین حضرت عمرؓ جن کی حق کے معاملہ میں درشتی اور صلابت سب کو معلوم ہے، اس معاملہ میں حضرت ابوہریرہ سے کوئی تعرض نہ کرتے؟ کیا حضرت عائشہؓ جو اپنی رائے میں حق کی حمایت کی خاطر گھر سے نکل کر حضرت علی کے مقابلہ میں صف آرا ہوئی تھیں، اس بات پر خاموش رہتیں؟ کیا اکابر اور جمہور صحابہ ان کی اس حرکت پر خاموش رہتے؟ جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان کی وفات ایسے زمانہ میں ہوئی ہے جو عہد صحابہ سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا ...... بلکہ بہت سے صحابہ اس وقت بقید حیات

تھے؟ اور یہ صحابہ وہ تھے جن کی حفاظت شریعت کے متعلق حرص اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ہر اس شخص پر تردید اور اعتراض کر دیا کرتے تھے جو حدیث میں ذرا سی بھی کوئی غلطی کر دیتا تھا۔ خواہ وہ امیر المومنین حضرت عمرؓ یا حضرت عائشہؓ زوجہ رسولؐ (رضی اللہ عنہا و عنہم) جیسی عظیم الشان شخصیتیں ہی کیوں نہ ہوتیں تو ایسے شخص کے متعلق وہ کیوں کر خاموش رہ سکتے تھے جو حدیث میں اپنی طرف سے اضافے کر کے بیان کرتا ہو اور جھوٹ بولتا ہو؟

ابوہریرہؓ کے ناقدین

اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ حدیث میں حضرت ابوہریرہ نے جن ناقدین کا ذکر کیا ہے وہ کون لوگ تھے؟ حدیث کی عبارت میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ حضرات کبار صحابہ، یا فقہاء صحابہ، یا ان میں ممتاز اور نمایاں لوگوں میں سے تھے، یا ایسے لوگوں میں سے تھے جنہیں اسلام میں سابقیت و اولیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زیادہ عرصہ تک صحبت و رفاقت حاصل رہی تھی۔ بلکہ میرے نزدیک راجح یہی ہے کہ یہ لوگ صحابہ تھے ہی نہیں۔ ابوہریرہ کے اس جملہ پر غور کریں کہ: "اور لوگ کہتے ہیں یہ کیا بات ہے کہ مہاجرین اور انصار تو ان (ابوہریرہ) کی طرح حدیثیں بیان نہیں کرتے؟" اگر اعتراض کرنے والے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ، مہاجرین و انصار ہوتے تو کلام کی نسبت بھی اُنھیں کی طرف ہوتی اور وہ اس طرح کہتے: کیا بات ہے کہ ہم تو ان کی طرح (کثرت سے) حدیثیں بیان نہیں کرتے؟ علاوہ بریں آپ ابوہریرہ کے اس جوابی جملہ پر بھی غور کیجیے جس میں وہ فرماتے ہیں: "میرے بھائی مہاجرین، اور میرے بھائی انصار" اگر صحابہ خود ہی تنقید کرتے تو ابوہریرہؓ ان سے اس طرح کہتے کہ "تم تو" تجارت یا زراعت میں مشغول رہتے تھے۔ حدیث کے آخر میں وہ جو بات کہتے ہیں۔ جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے۔ وہ بھی قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہ (ابوہریرہؓ) بہت سی ایسی باتیں بیان کرتے ہیں؟ جو (صحابہؓ) بیان نہیں کرتے، اور اُنھوں نے ایسی بہت سی باتیں یاد رکھی ہیں جو ان (صحابہ) کو محفوظ نہیں رہیں۔ اگر اعتراض کرنے والے صحابہ ہوتے تو وہ اس طرح کہتے "جو تمہیں یاد نہیں رہیں"۔ حدیث میں غور کرنے کے بعد میرے نزدیک تو یہی احتمال راجح ہے (کہ یہ ناقدین صحابہ ہیں ہی نہیں)

اس کے بعد جب میں نے ابوہریرہ کے حالات پر گہری نظر ڈالی تو مجھے وہاں کوئی ایک صحابی

بھی ایسا نہیں ملا جس نے حضرت ابوہریرہؓ پر یہ اعتراض کیا ہو۔ البتہ حافظ ابن حجر کی کتاب "الاصابہ" میں یہ ایک روایت مجھے ضرور ملی ہے کہ:۔

"ابن سعد نے ولید بن رباح کی سند سے نقل کیا ہے کہ جب لوگوں نے حضرت حسن علیہ السلام کو ان کے نانا کے پاس دفن کرنا چاہا تو میں نے ابوہریرہ کو مروان سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ "تم ایسے کام میں دخل دیتے ہو جس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں۔ تم ایک غائب کی خوشنودی چاہتے ہو" اس وقت مروان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مدینہ کا حاکم تھا اس پر مروان نے غصہ ہو کر کہا کہ: لوگ کہتے ہیں: ابوہریرہ حدیثیں بڑی کثرت سے بیان کرتے ہیں الخ۔ اور یہ بات تو کسی سے پوشیدہ ہے ہی نہیں کہ مروان تابعی ہے اور یہ کہ یہ واقعہ کافی بعد کے زمانہ میں پیش آیا ہے۔ اور یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ مروان غصہ اور ناراضگی کی حالت میں (ابوہریرہ کی کثرت روایت پر) گرفت کرتا ہے اور اس کو بھی "لوگوں" کی طرف منسوب کرتا ہے (اپنی طرف نہیں) بہرحال اگر صحابہ کرام کو ابوہریرہ کی روایت حدیث میں شک ہوتا تو وہ ضرور اپنے اس شک کو ابوہریرہ تک پہونچا کر رہتے، یہاں تک کہ یہ بات مروان تک بھی پہونچتی اور وہ ضرور کسی نہ کسی موقعہ پر صحابہ کے اس شک کو ابوہریرہؓ تک پہونچاتے (اور صحابہ کے شک و شبہ کو اُن پر صراحتاً ظاہر کرتے اور عام لوگوں کی طرف منسوب نہ کرتے)

کچھ بھی ہو ہمیں نہ تو اس حدیث میں جو ابوہریرہ نے اپنے بارے میں بیان کی ہے کوئی ایسا قرینہ نظر آیا اور نہ ہمیں کسی اور ہی کی ایسی حدیث ملی جو یہ واضح کرتی ہو کہ ابوہریرہ پر اعتراض اور تنقید کرنے والے صحابہ یا ان میں کے مشہور لوگ تھے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو تاریخ اسی کو ضرور بیان کرتی جیسا کہ تاریخ نے صحابہ کی اسی قسم کی ایک دوسرے پر تنقید کو بیان کیا ہے۔

اب ہم فجر الاسلام کے مؤلف احمد امین مصری، اُن کے شیوخ و اساتذہ مستشرقین اور ان تمام لوگوں کو، جو مستشرقین کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ خواہ وہ روئے زمین کے کسی حصہ میں بھی ہوں پوری بصیرت کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے کوئی ایسی صحیح تاریخی نص پیش کریں جو یہ ثابت کرتی ہو کہ معروف صحابہ میں سے کسی بھی شخص نے اس قسم کی بات کہی تھی، یا یہ کہ ان صحابہ نے کبھی ابوہریرہ کو حدیث بیان کرنے سے روکا تھا یا ان کو صراحتاً جھوٹا کہا تھا یا ان کی حدیثیں سننے

سے لوگوں کو منع کیا تھا۔ اور بہت بعید بلکہ ناممکن ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی ایک روایت بھی پا سکیں بلکہ اس کے برعکس تاریخ کی ثابت شدہ تصریحات تو قطعی طور پر یہ واضح کرتی ہیں کہ صحابہ کرام حضرت ابوہریرہ کے حفظ حدیث کا اقرار کرتے تھے، اور اس بات کا انھیں اعتراف تھا کہ ابوہریرہ کو سارے صحابہ میں حدیث کا زیادہ علم ہے۔ حضرت عائشہ اور ابن عمر وغیرہ (رضی اللہ عنہا وعنہم) نے ان کی بعض احادیث پر تعجب کا اظہار ضرور کیا ہے، لیکن انھوں نے ان کو قبول کرنے میں کبھی توقف نہیں کیا بلکہ حقیقت حال ظاہر ہونے پر اس کا اعتراف کر لیا کہ ابوہریرہ کا علم ان معلومات پر مشتمل اور محیط تھا جن کا خود یہ صحابہ احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرفوع روایت نقل کی کہ آپ نے فرمایا "جو کوئی (جنازہ کی متابعت کی نیت سے) جنازہ کے پیچھے چلے گا اس کو ایک قیراط ثواب ملے گا (۱) جب ابن عمر نے اس حدیث کو سنا تو فرمایا کہ ابوہریرہ بہت زیادہ روایتیں بیان کرتے ہیں، تو حضرت عائشہ نے ابوہریرہ کی بیان کردہ روایت کی تائید کی، اس پر ابن عمر نے فرمایا کہ "تب تو ہم نے بہت سے قیراط کھو دیئے"! اس کے بعد ابن عمر خود اس حدیث کو روایت کرنے لگے اور اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے مرفوعاً روایت کیا کرتے تھے۔ اور جب ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ ابوہریرہ نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کو ابوہریرہ سے یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ آپ ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہتے تھے اور آپ کی حدیث کو ہم سب سے زیادہ جانتے تھے۔

محمد بن عمارہ بن حزم ایک مجلس میں شریک تھے جس میں دس سے زیادہ مشائخ صحابہ موجود تھے حضرت ابوہریرہ ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک حدیث بیان کرنے لگے ان میں سے بعض لوگ اس حدیث سے ناواقف تھے لہٰذا وہ اس کے بارے میں ابوہریرہ سے دریافت کرتے ہیں، تاکہ اس حدیث کا علم حاصل کر لیں۔ پھر اسی طرح وہ ایک اور حدیث بیان کرتے ہیں یہاں تک کہ کئی مرتبہ اسی قسم کی صورت پیش آئی، تو محمد بن عمارہ کہتے ہیں کہ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ ابوہریرہ

---

(۱) اس حدیث پر ہم پہلے بھی مختصر گفتگو کر چکے ہیں۔

لوگوں میں سب سے زیادہ حدیث کے حافظ تھے، اس واقعہ کو امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور بیہقیؒ نے مدخل میں بیان کیا ہے۔

حنفیہ کا ابوہریرہؓ کی روایت کو کبھی کبھی ترک کر دینا | مؤلف فجر الاسلام فرماتے ہیں :-

> حنفیہ بعض اوقات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو جب وہ قیاس کے معارض ہوتی ہے، ترک کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے مُصَرّاۃ کی حدیث میں کیا ہے۔ اس حدیث میں ابوہریرہؓ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اونٹ اور بکری کے تھنوں میں دودھ جمع نہ کرو (تاکہ فروخت کے وقت وہ زیادہ معلوم ہو) جو اس قسم کے جانور کو خریدے تو دودھ دوہنے کے بعد اس کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے، اگر پسند ہو تو اس کو رکھ لے، اگر ناپسند ہو تو اس کو واپس کر دے اور ساتھ ہی ایک صاع کھجور بھی دے"۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ فقیہ ... نہ تھے۔ اور یہ حدیث تمام قیاسوں کے خلاف ہے، کیونکہ دودھ کا دوہنا تعدی (حق تلفی) ہے، اور تعدی کا عوض یا مثل (اس جیسی چیز) سے ہوگا یا (اس کی) قیمت سے، اور ایک صاع کھجور ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے۔ ص ۲۶۹

مؤلف نے یہاں تین باتیں لکھی ہیں :-

(۱) یہ کہ حنفیہ قیاس کو حدیث پر مقدم سمجھتے ہیں جبکہ حدیث قیاس کے معارض (اور مخالف) ہو

(۲) یہ کہ انھوں نے ابوہریرہ کی ان احادیث کے بارے میں جو قیاس کے خلاف میں ایسا ہی کیا ہے (یعنے رد کیا ہے) اور ظاہر یہ ہے کہ حنفیہ کا یہ موقف ابوہریرہ ہی کے حدیثوں کے ساتھ خاص تھا۔

(۳) یہ کہ حنفیہ ابوہریرہؓ کو غیر فقیہ (فقہ سے نابلد) شمار کرتے تھے۔

مؤلف ان تینوں فیصلوں میں غلطی پر ہیں۔ اس کا علم آپ کو ذیل کی بحث سے ہو جائے گا۔

اوّل : حنفیہ قیاس کو حدیث پر مقدم نہیں سمجھتے، بلکہ خود امام ابو حنیفہ، ان کے دونوں شاگرد، (امام ابو یوسف اور امام محمد) اور ان کے تمام متبعین کا مذہب یہ ہے کہ حدیث قیاس پر مطلقاً مقدم ہے، خواہ راوی فقیہ ہو یا نہ ہو۔ یہی امام شافعی، امام احمد اور جمہور اہل اصول کا مذہب ہے فخر الاسلام بزدوی نے بھی اپنا مذہب یہی بیان کیا ہے اور اسی کو ابن ابان اور ابو زید نے اختیار کیا ہے اور یہ سب حنفی ہیں۔ کہ اگر راوی فقیہ ہو تو حدیث قیاس پر مطلقاً مقدم ہو گی (یعنی قیاس کی موافقت مخالفت کو نہیں دیکھا جائے گا) اور اگر فقیہ نہ ہو تو بھی اس کی حدیث قیاس پر مقدم ہو گی الا یہ کہ وہ حدیث تمام شرعی قیاسات (اور اصول) کے مخالف ہو، اور اسکی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بالکل بند ہو جائے۔ اس اصول کی مثال کے طور پر انھوں نے حدیث مصراۃ کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ابن حاجب اور آمدی نے جس مسلک کو اختیار کیا ہے وہی کمال الدین ابن ہمام کا بھی مذہب ہے۔ یعنی یہ کہ جب قیاس کی علتِ حکم کا ثبوت حدیث کے ثبوت پر راجح ہو اور اس علتِ قیاس کا وجود فروع (جزئیات) میں بھی اسی طرح پایا جاتا ہو جس طرح وہ اس اصل میں (یعنی کلیہ میں) موجود ہے (جس پر فرع کو قیاس کیا گیا ہے) تو ایسے قیاس کو راوی غیر فقیہ کی حدیث پر تقدم حاصل ہوگا اور اگر اصل و فرع میں علت کا ثبوت اور حدیث کا ثبوت دونوں ایک ہی درجہ کے ہوں یعنی ظنی ہوں، تو ایسے موقعہ پر توقف کیا جائے گا، ورنہ حدیث مقدم ہو گی۔

قیاس اور حدیث کے تعارض کی صورت میں یہ علماء کے اقوال کی تفصیل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمہور حنفیہ اور اور ان کے سرخیل امام ابو حنیفہ اور اُن کے دونوں شاگرد قیاس پر مطلقاً حدیث کی تقدیم و ترجیح کے قائل ہیں خواہ راوی فقیہ ہو یا نہ ہو، اس لئے مؤلف نے حنفیہ کی طرف جو بات منسوب کی ہے وہ قطعاً صحیح نہیں بلکہ صحیح بات وہی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ اب ہمیں علماء اصول کے مزید اقوال نقل کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ وہ اپنے ماخذ کتب اصول فقہ میں تفصیل مذکور ہیں اور عنقریب ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ہم بھی بعض ایسی تفصیلات بیان کریں گے جو آپ کے لئے مزید اطمینان کا سبب ہوں گی۔

دوم : یہ کہ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھنے کا موقف، جو حضرات بھی اس کے قائل ہیں،

وہ صرف ابوہریرہ کے ساتھ ہی اس موقف کو مخصوص نہیں رکھتے، بلکہ ہر غیر فقیہ راوی کے معاملہ میں ان کا یہ ہی موقف عام ہے۔ ذیل میں ہم مسلم الثبوت کی عبارت اور اس کی شرح نقل کرتے ہیں:

"فخر الاسلام نے کہا ہے کہ اگر راوی حدیث صحابہ مجتہدین میں سے ہو جیسے خلفاء اربعہ یا عبادلہ ثلاثہ (عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر) وغیرہ (رضی اللہ عنہم) تو حدیث بہر حال قیاس پر مقدم ہوگی اور اگر راوی عام راویان حدیث میں سے ہو، اور صرف عدالت میں معروف ہو تفقہ میں معروف نہ ہو۔ جیسے ابوہریرہ اور انس وغیرہ تو ان کی حدیث کو بھی قیاس سے معارض اور مخالف ہونے کی صورت میں مطلقاً ترک نہیں کیا جاتا۔ بجز اس صورت کے حدیث کو اختیار کرنے سے رائے اور اجتہاد کا دروازہ ہی بالکل بند ہو جاتا ہو، جیسا کہ مصراۃ کی حدیث ہے"

ایسی صورت میں اس حکم کو ابوہریرہ کے ساتھ مخصوص رکھنا، جیسا کہ مؤلف کے ظاہر کلام سے معلوم ہوتا ہے ہرگز صحیح نہیں۔

سوم: مؤلف نے حضرت ابوہریرہ کے غیر فقیہ ہونے کے متعلق حنفیہ کی جو رائے نقل کی ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ فخر الاسلام اور ان کے دونوں رفقاء کے سوا اور کوئی حنفی اس کا قائل نہیں ہے۔ جمہور حنفیہ کا مذہب ...... اس کے بالکل خلاف ہے۔ اور سب ہی نے فخر الاسلام اور ان کے رفقا کی اس رائے کو بُرا کہا ہے۔ چنانچہ کمال بن الہمام نے ان کا یہ قول مسلم الثبوت کے حوالہ سے نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ:

"حضرت ابوہریرہ فقیہ ہیں۔"

اس پر مسلم الثبوت کے شارح ابن امیر الحاج نے لکھا ہے کہ:

ابوہریرہ میں اسباب اجتہاد میں سے کوئی چیز بھی مفقود نہیں تھی۔ وہ صحابہ کے زمانہ میں فتویٰ دیتے تھے۔ اور صحابہ کے زمانہ میں تو مجتہد کے علاوہ کوئی اور شخص فتویٰ دیتا بھی نہ تھا۔ اور حضرت ابوہریرہ سے تو آٹھ سو سے

زیادہ لوگوں نے حدیثیں روایت کی ہیں جن میں صحابی اور تابعی سب ہی ہیں حتیٰ کہ ان میں ابن عباس، جابر اور انس رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ بھی شامل ہیں، اور یہی بات صحیح ہے۔(۱)

ہاں یہ صحیح ہے کہ حنفیہ نے اس کے باوجود کہ حدیث اور قیاس کے تعارض کی صورت میں وہ حدیث کو قیاس پر مقدم رکھتے ہیں، اس مسئلہ میں ابو ہریرہ کی حدیث کو ترک کر دیا ہے لیکن نہ اس لئے کہ یہ ابو ہریرہ کی حدیث ہے اور نہ اس معاملہ میں انھوں نے اپنے مقررہ اصول اور قواعد سے انحراف کیا ہے، بلکہ ان کا یہ عمل (اس حدیث کو ترک کرنا) ایک دوسرے قاعدہ پر مبنی ہے جو نہ صرف ان کے نزدیک مسلم ہے، بلکہ تمام علماء اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی حدیث کتاب (قرآن)، سنت (حدیث) اور اجماع کے معارض اور مخالف ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اور تعارضِ دلائل کی صورت میں کسی دلیل کی ترجیح کا ضابطہ یہ ہے کہ قوی تر دلیل کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن، عام احادیث اور اجماع اُمت سے جو چیز ثابت ہو وہ اس سے زیادہ قوی ہے جو خبر واحد سے ثابت ہوتی ہے لہٰذا ان کے نزدیک یہ حدیث کتاب، سنت اور اجماع (تینوں) کے خلاف ہے۔ اس لئے اس حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد انھوں نے اس خبر واحد کے جواب کے بارے میں مختلف مسلک اختیار کئے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان سب کو چھ اقوال میں جمع کیا ہے۔ جن میں یہ جواب صحت سے زیادہ قریب تبلایا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اور یہ خود امام ابو حنیفہ سے بھی مروی ہے۔

بہر حال اس سلسلہ میں حنفیہ کے مسلک میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کا مآل حضرت ابو ہریرہ پر طعن و تنقید ہو، اور فخر الاسلام نے بھی۔ جو ابو ہریرہ کے فقیہ نہ ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی جلالت شان، صداقت اور امانت، کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خدا بچائے اس سے کہ اہل علم و تقویٰ میں سے کوئی شخص بھی اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ اختیار کرے۔

---

(۱) التقریر ج ۲ ص ۲۵۱۔ نیز ملاحظہ ہو التیسیر ج ۳ ص ۵۳

(اور نہ رسول اللہ کے اس جلیل القدر صحابی کی توہین کرے)

غالباً ان تینوں مسائل کی اس تنقیح سے جن میں مؤلف نے بہت بڑی غلطی کی ہے آپ کے سامنے حق پوری طرح واضح ہو گیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فجر الاسلام کے مؤلف احمد امین نے اس مؤقف کو اختیار کیوں کیا، اور ان کی یہ بحث و گفتگو جو آپ پڑھ چکے ہیں وہ کہاں سے لے آئے تو اس سلسلہ میں ذرا آپ ان کی "اس علمی امانت، باریک بینی اور سچی تحقیق" کی طرف توجہ فرمایئے جس سے آپ حیران رہ جائیں گے۔

مسلم الثبوت کے مصنف نے ایک مستقل فصل اس موضوع کے لئے مخصوص کی ہے کہ راوی حدیث میں کن شرائط کا ہونا ضروری ہے اور کونسی شرائط ضروری نہیں ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ

جن امور کا راوی حدیث میں ہونا شرط نہیں ہے ان میں سے ایک اجتہاد ہے چنانچہ انھوں نے کہا ہے:

"اور نہ اجتہاد شرط ہے، لیکن اس صورت میں کہ راوی کی حدیث بہمہ وجوہ قیاس کے مخالف ہو بعض حنفیہ کو اس سے اختلاف ہے (وہ ایسی صورت میں اجتہاد راوی کو ضروری شرط قرار دیتے ہیں)

ان بعض حنفیہ سے ان کی مراد فخر الاسلام اور ان کے موافقین ہیں۔ مسلم الثبوت کے شارح نے ان (بعض احناف) کے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے جس کی بنا پر انھوں نے مجتہد اور غیر مجتہد راویوں میں فرق کیا ہے۔ اور اس کے بعد کہتے ہیں:

"انھوں نے (یعنی فخر الاسلام اور ان کے موافقین نے) اس کی مثال میں "حدیث مصراۃ" کو پیش کیا ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس کو ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے"

اس کے بعد ابو ہریرۃ کی وہ حدیث بیان کی ہے (جو آپ پڑھ چکے ہیں)

شارح نے فخر الاسلام اور ان کے ساتھیوں کے قول کی اس طریقہ پر تقریر کرنے کے بعد کہا ہے کہ:

"ان کے (یعنی فخر الاسلام وغیرہ کے) کلام کے تمام شارحین نے ان کے اس قول کی یہی تقریر کی ہے۔ حالانکہ یہ واضح طور پر قابل غور ہے۔

کیونکہ ابوہریرہ فقیہ اور مجتہد ہیں، ان کی فقاہت میں کوئی شک نہیں
ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کے بعد بھی فتویٰ
دیتے تھے۔ اور وہی تھے جو بعض اوقات ابن عباس کے قول اور
ان کے فتوے کی بھی مخالفت کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ صحیح روایت میں ہے
کہ انھوں نے ایسی حاملہ عورت کی عدت کے بارے میں جس کا خاوند
مرگیا ہو ابن عباس کے فتوے سے اختلاف کیا تھا۔ اس مسئلہ میں ابن عباس
کی رائے یہ تھی کہ دونوں مدتوں (یعنی چار ماہ دس دن اور مدت
وضع حمل) میں سے جو دراز تر ہو اسکو عدت شمار کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ اور ابوہریرہ نے
وضع حمل کا حکم دیا تھا۔ حضرت سلمان فارسی بھی ابوہریرہؓ فتویٰ پوچھا کرتے تھے۔ اسلئے اس
خبر یعنی "حدیث مصراۃ" کا اس موضوع بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے"(۱) (یعنی غیر مجتہد راوی
کی مثال میں ابوہریرہ کی اس روایت کو پیش کرنا صحیح نہیں ہے یہ
موضوع بحث سے غیر متعلق ہے)

یہ شارح مسلم الثبوت کی اصل عبارت ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے کلام میں لفظ قالوا (یعنی انھوں نے کہا ہے) کی ضمیر کا مرجع فخر الاسلام اور ان کے موافقین ہیں۔ لیکن فجر الاسلام کے مؤلف نے شارح مسلم الثبوت کے کلام میں سے بعینہ اس عبارت کو الگ کرکے "قالوا" (انھوں نے کہا) کی ضمیر کو تمام حنفیہ کی طرف لوٹا دیا۔ اور تمام حنفیہ کی طرف یہ منسوب کر دیا کہ وہ ابوہریرہ کے غیر فقیہ ہونے کے قائل ہیں اور اس سے پہلے بطور تمہید حنفیہ کی طرف یہ بات بھی منسوب کر دی کہ وہ قیاس کو خبر پر مقدم سمجھتے ہیں اور شارح مسلم کے اس تعقب (اعتراض) کی طرف سے آنکھیں میچ لیں جو انھوں نے ابوہریرہ کے فقیہ ہونے کا انکار کرنے کے سلسلہ میں فخر الاسلام وغیرہ پر کیا ہے۔

استاذ احمد امین نے ایسا کیوں کیا اس کی دو وجہیں[۲] ہو سکتی ہیں۔

---

(۱) شرح مسلم الثبوت ج ۲ ص ۱۴۵ - ۱۴۶

(۱) ایک یہ کہ وہ مسلم الثبوت کے مصنف اور اس کے شارح کے کلام کو سمجھ نہیں سکے۔ اور اس مسئلہ کی تحقیق میں مذاہب سے بھی انھیں پوری واقفیت نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے مختلف اقوال کے مابین غلط ملط کر دیا اور فخر الاسلام اور ان کے موافقین کے قول کو سارے حنفیہ کی طرف منسوب کر دیا۔ اور شارح کی عبارت سے یہ سمجھے کہ یہ حنفیہ کا قول ہے۔ اور اس کے بعد شارح نے اس قول پر جو تعقب (یا اعتراض) کیا ہے۔ اس کو بھی نہ سمجھ سکے لیکن یہ بات تو ایک مبتدی طالب علم سے بھی بعید ہے۔ استاذ احمد امین جیسے بلند پایہ اور علمی شہرت کے مالک محقق کے بارے میں یہ تصور کیوں کر قائم کیا جا سکتا ہے؟۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فجر الاسلام کے یہ فاضل مؤلف اصل مسئلہ کو تو اچھی طرح سمجھ گئے تھے لیکن انھوں نے اس مسئلہ میں مختلف مذاہب کو ان کے اصل قائلین اور صاحبان مذہب کی طرف منسوب کرنے میں قصداً خلط ملط کیا ہے تاکہ ابوہریرہ کے خلاف سازش کا ایک مضبوط تانا بانا بن سکیں۔ اور پڑھنے والے کو حضرت ابوہریرہ (جیسے محدث اور فقیہ صحابی) سے بدگمان کرنے کے لئے تیار کر سکیں اور یہی دوسری وجہ ان لوگوں کے لئے قابل ترجیح ہو سکتی ہے جو استاذ احمد امین مصری کے علم و فہم کے متعلق حسنِ ظن رکھنا چاہتے ہیں۔ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

ابوہریرۃ کی کثرت روایت سے وضاعین حدیث کا ناجائز استفادہ

رہی یہ بات کہ:۔

ابوہریرہؓ کی کثرت روایت سے موقع پا کر وضاعین (حدیث گھڑنے والوں) نے ان کے نام سے بے شمار حدیثیں گھڑ ڈالی ہیں (ص ۲۷۰)۔

تو ان لوگوں کی یہ حرکت کچھ ابوہریرہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ بلکہ حضرت عمر، عائشہ، ابن عباس، ابن عمر، جابر اور انس وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام پر بھی وضاعین حدیث نے جھوٹ بولا ہے اور ان کی طرف بہت سی حدیثیں منسوب کی ہیں۔ لیکن حدیثیں وضع کرنے والوں کے اس مجرمانہ عمل کا حضرات صحابہ کے حالات زندگی سے کیا تعلق ہے کہ ان حضرات کے حالات زندگی کے ذیل میں اس کو پیش کیا جائے اور کہا جائے کہ۔۔ وضاعین حدیث نے ان کے نام سے بے شمار حدیثیں بنائی ہیں

بلاشبہ یہ کسی طرح بھی درست نہیں کہ کسی صحابی یا تابعی کے حالات زندگی میں اس قسم کی باتیں ذکر کی جائیں، پھر مؤلف فجر الاسلام نے حضرت ابوہریرہ کے حالات میں ان کا ذکر کیوں کیا؟ اور حضرت عائشہ اور ایسے ہی کبار صحابہ کو چھوڑ کر ابوہریرۃ ہی کو نشانہ کیوں بنایا؟

دائرۃ المعارف الاسلامیہ کی مراجعت سے یہ راز بھی فاش ہو جاتا ہے۔ دائرۃ المعارف ہمیں بتلاتی ہے کہ یہودی مستشرق گولڈ تسیہر بھی اپنے مقالہ "ابوہریرہ" کے ذیل میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

بہت سی وہ احادیث جو راویوں نے ابوہریرہ کی طرف منسوب کی ہیں،
وہ آخیر زمانہ میں ان کے نام سے بنائی گئی ہیں۔"

یہ کہہ کر گولڈ حضرت ابوہریرہ کی تمام ہی حدیثوں میں شک و شبہ پیدا کرنا چاہتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے وہ خود (گولڈ تسیہر) بصراحت کہہ چکا ہے کہ:-

"حالات ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم ابوہریرہ کی احادیث میں نہایت ہوشیاری
(احتیاط) اور شک سے کام لیں۔" (ج ا ص ۴۱۸)

جب گولڈ تسیہر نے ابوہریرہ پر اپنے مقالہ کو اس نتیجہ پر ختم کیا ہے تو احمد امین مصری پر بھی اپنے پیشرو کی پیروی میں یہ لازم ہو گیا کہ وہ ابوہریرہ کے حالات کو اسی نتیجہ پر ختم کریں۔

آپ نے دیکھا کہ مؤلف فجر الاسلام کس ہوشیاری کے ساتھ دشمنان اسلام کے نشان ہائے قدم کا تتبع کر رہے ہیں؟ اور اس "وفادارانہ" پیروی میں ہر موقع پر انھوں نے اس یکتا شخصیت (ابوہریرہ) کو کس طرح طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے دیکھئے: (۱) جب انھوں نے صحابہ کرام کی ایک دوسرے پر تنقید کے موضوع پر گفتگو کی تو سب سے پہلے ابوہریرہ پر حضرت عائشہ اور ابن عباس کے اعتراضات ہی سے مثالیں پیش کیں۔ (۲) اور جب ان کے حالات زندگی لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی یادداشت سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ گویا اس معاملہ میں ابوہریرہ ہی سارے صحابہ میں منفرد تھے (۳) اور جب انھوں نے متقدمین کے اس طریقہ کار پر حرف گیری کی کہ وہ متن کو چھوڑ کر صرف سند کو پرکھتے تھے اور اس طرح اپنے زعم میں ان پر یہ افترا باندھا کہ جن احادیث پر محدثین صحیح ہونے کا

حکم لگاتے تھے وہ خلاف واقعہ ہوتی تھیں، تو اس زعم باطل کی تائید میں بھی جو مثال پیش کی تو وہ بھی ابوہریرہ ہی کی حدیث تھی (۴۹)، اسی طرح جب اُنھوں نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ راویوں کی تنقید میں راویوں کے شخصی حالات اور ذاتی عوامل کام کیا کرتے تھے جو اُن کو وضع حدیث پر آمادہ کرتے تھے، اور یہ کہ اس قسم کی تنقید اسلام کے صدر اول میں ہی موجود تھی، تو اس کی مثال کے لئے بھی اُنھیں حضرت ابوہریرہ اور انہی کی حدیث ملی۔

یہ ہے وہ شاطرانہ انداز جس کے ذریعہ استاذ احمد امین کسی تحقیق و ثبوت کے بغیر اس جلیل القدر صحابی پر بڑے لطیف انداز میں سخت ترین حملے کرتے رہے ہیں تاکہ اس مستشرق کی خبیث اور معاندانہ سازش کو کسی نہ کسی طرح بروئے کار لاسکیں جس نے خود غرضی یعنے اسلام دشمنی کے جوش میں ہماری اُن عظیم شخصیتوں کی سیرت کو داغدار بنانے کا جال بچھایا ہے جنہوں نے شریعت مطہرہ کو ہم تک پہونچایا اور اس کو محفوظ رکھا ہے۔ لیکن ہم استاذ احمد مصری کو، ان کے پیش رو اور پیشوا مستشرقین کو اور ہر اس شخص کو جو اس خدا دشمن زمرہ (ٹولہ) میں شامل ہو یہ سنا دینا چاہتے ہیں کہ :-

"ایسا صحابی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سینتالیس ۴۷ سال تک کبار صحابہ اور رسول اللہ سے قریب تر رہنے والوں یعنے ازواج مطہرات اور عام صحابہ کے سامنے رسول اللہ کی حدیثیں مسلسل بیان کرتا رہا ہو اور وہ سب کے سب اس کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے اور روایت حدیث میں اس کی برتری کا اعتراف کرتے رہے ہوں، تابعین اس سے رسول اللہ کی حدیثیں سننے کے لئے جوق در جوق آتے رہے ہوں، علمار تابعین کے سرکردہ، متقی، پرہیزگار اور جری تابعی یعنے امام سعید بن المسیب اس سے نہ صرف علم اور احادیث حاصل کریں بلکہ اپنی دختر نیک اختر کی شادی اس سے کرکے علمی قرابت کی تقویت کے لئے عائلی قربت بھی پیدا کریں، اس سے حدیث حاصل کرنے والے محدثین کی تعداد آٹھ سو تک پہونچ ہو۔ پھر یہ سب کے سب صحابہ و تابعین اس کی جلالت شان اور قابل اعتماد ہونے پر متفق ہوں اور تیرہ صدیوں تک تاریخ اسلام میں اس کا نام سرفہرست رہا ہو یہ تمام باتیں اس کی صداقت و دیانت اور روایت حدیث میں ثقہ اور معتمد ہونے پر وہ سچی اور محکم شہادت دیتیں ہیں جو گواہی دے رہی

ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں اُس مقام پر کوئی بھی صحابی نہیں پہونچا جس پر ابوہریرۃ پہونچے ہوئے ہیں اور آج ایک " بدنام کنندۂ نکونامے چند قسم کا خودساختہ محقق (نہیں محکک) اُٹھتا ہے اور انتہائی بے شرمی کے ساتھ کہتا ہے کہ :

" آج تک تمام صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث میں سے کسی ایک نے بھی ابوہریرہ کی حقیقت کو نہیں پہچانا وہ تو درحقیقت انتہائی جھوٹا، افتراپرداز اور حدیثیں گھڑنے والا انسان تھا۔

جو بھی کوئی شخص اس جیسے جلیل الشان اور عظیم المرتبت صحابی کے متعلق یہ روش اختیار کریگا ــــ جیسا کہ بعض ملحد وزندیق کر رہے ہیں ــــ نہ صرف وہ بلکہ اس کے تمام خواجہ تاشں بھی اور اُن کے تحقیقی (سائنٹفک) علوم وفنون اور عقول بھی ــــ عالم اسلام کی لعنت وملامت تحقیر وتذلیل سے سنگسار کیے جائیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابوہریرہ اور پروفیسر محمود ابوریہ

حضرت ابوہریرۃ اور ان کی احادیث کے متعلق استاذ (پروفیسر) احمد امین مؤلف کتاب "فجر الاسلام" کے پیدا کردہ شکوک وشبہات اور اعتراضات کا جواب دینے کے بعد ہم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعلق اُن اعتراضات پر آتے ہیں جن کو استاذ (پروفیسر) محمود ابوریہ نے اپنی تصنیف " اضواءٌ علی السنۃ المحمدیہ " میں ذکر کیا ہے تاکہ حضرت ابوہریرہ اور ان کی روایات سے متعلق مستشرقین اور ان کے متبعین کے پیدا کردہ شکوک وشبہات اور اعتراضات پر سلسلہ بحث پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے اور حضرت ابوہریرہ کے بارے میں جو کچھ اب تک کہا گیا ہے وہ مکمل طور پر قارئین کے سامنے آجائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعلق استاذ ابوریہ کی طعن وتشنیع مذکورۂ ذیل امور میں منحصر ہے (۱) حضرت ابوہریرہ کی توہین وتحقیر (۲) ان کی شخصیت میں عیب جینی (۳) ان کے اسلام میں اخلاص نہ ہونے کی تہمت (۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرنے میں سچ نہ بولنے کی ان پر تہمت (۵) پیٹ کی (یعنے کھانے پینے کی) حرص اور مال کی محبت کا اہتمام،

(۶) اور بنو امیہ کی حمایت وطرفداری کا الزام وغیرہ۔

ان تمام اعتراضات پر تو ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔ لیکن اس سے قبل میں اس بات کی تو شہادت دیتا ہوں (اور خدا کو حاضر وناظر جان کر کہتا ہوں) کہ معتزلہ، روافض، اور قدیم وجدید مستشرقین میں سے جس نے بھی اب تک حضرت ابوہریرہ اور ان کی روایت حدیث پر طعن وتشنیع اور جرح وتنقید کی ہے، ان میں سب سے زیادہ بدزبان، گستاخ اور بے ادب پروفیسر ابوریہ ہیں۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے ساتھ) ان کا یہ طرز عمل ان کی خرد باختگی (عقل کی خرابی) بدعقیدگی اور فطری خباثت کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے حضرت ابوہریرہ پر جو الزام تراشے ہیں، ان میں جو عیب نکالے ہیں، اور حقائق کو پیش کرنے میں جس مسخ وتحریف سے کام لیا ہے، خدا ہی ان کو (جلد یا بدیر) اس کی سزا دے گا اور جس دن وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہوں گے اس دن اپنے اعمال نامہ میں یہ تمام سیہ کاریاں بچشم خود دیکھ لیں گے۔ باقی رہی ان الزامات اور اعتراضات کی تفصیل، تو ذیل میں ہم ان کو ایک ایک کر کے اپنی مختصر تنقید کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

اول: ابوہریرۃ کے نام میں اختلاف

استاذ ابوریہ اپنی کتاب کے ص ۱۵۲ پر لکھتے ہیں:

"زمانہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں کسی شخص کے نام میں اتنا شدید اختلاف نہیں ہوا جتنا ابوہریرہ کے نام میں اختلاف ہوا ہے۔ چنانچہ پوری تحقیق کے ساتھ کسی مورخ کو بھی اس کا علم نہیں ہو سکا کہ ان کے گھر والوں نے ان کا نام کیا رکھا تھا جس کے ساتھ لوگوں میں ان کو پکارا جاتا ہو۔

اس کے بعد تیس اقوال میں سے انتخاب کر کے امام نوویؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: "ابوہریرہ کا صحیح نام عبدالرحمن بن صخر تھا" اسی کے ساتھ قطب حلبی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ان کے اور ان کے باپ کے نام کے متعلق (مجموعی طور پر) چالیس[۴۴] قول مروی ہیں۔

اس بحث سے استاذ ابوریہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ ابوہریرہ کو اس حد تک ذلیل اور گمنام

ثابت کریں کہ صحابہ کرام کے حلقہ میں ان کی شخصیت اتنی حقیر تھی کہ انکا نام تک بھی معروف نہ تھا۔ اسی لئے ان کے نام میں اس قدر شدید اختلاف ہے۔ اس کا جواب بھی سنئے :۔

(۱) کسی آدمی کے نام میں اختلاف ہونے سے اس کی شان نہیں گھٹ جاتی انسان کی قدر و قیمت تو اس کے اخلاق و کردار اور خدمات سے ہوتی ہے، نہ کہ اس کے اور اس کے باپ دادا کے نام سے، اللہ تعالیٰ نے جنت میں داخل ہونے اور عنداللہ قرب و سعادت کے مرتبوں تک پہونچنے کا دارومدار ناموں کنیتوں اور القاب پر نہیں رکھا اور جس کا یہ زعم بیہودہ درحقیقت اللہ کے دین سے قطعی بے خبر اور جاہل ہے۔ قرآن عظیم کا فیصلہ یہ ہے :

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم — بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

(۲) بہت سے صحابہ ایسے گذرے ہیں جن کے ناموں میں شدید اختلاف تھا، لیکن اس اختلاف کی وجہ سے ان کی قدر و قیمت، ان کی اسلامی خدمات جلیلہ اور مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کی اور ان کے کارناموں کی قدر و منزلت کچھ کم نہیں ہو گئی۔

(۳) حضرت ابوہریرہ کے نام میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جب سے اُنھوں نے اسلام قبول کیا اس وقت سے ابوہریرہ کے نام سے ہی پکارے گئے وہ قریش یا اُن کے حلیف قبائل میں سے کسی قبیلہ تعلق بھی نہیں رکھتے تھے، کہ صحابہ ان کے اصلی نام کو جان سکتے۔ آج بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ بیشتر مسلمان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حقیقی نام سے واقف نہیں اس لئے کہ جب سے وہ بڑے ہوئے اور ہوش سنبھالا ان کی کنیت سے ہی ان کو جانا پہچانا اور پکارا گیا تو اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کی عظمت اور جلالت شان کو کیا نقصان پہونچا حضرت ابوہریرہ قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے، جو مکہ اور مدینہ سے بہت دور آباد تھا۔ اور جس دن سے اسلام لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اسی دن سے ابوہریرہ کے نام سے پکارے گئے تو پھر اس میں تعجب کی کونسی بات ہے کہ لوگ ان کے اصلی نام کو جو ان کے ماں باپ نے رکھا تھا نہیں جانتے۔

(۴) ان کے اور ان کے باپ کے نام میں اختلاف کے بارے میں جو تیس اور چالیس

قول مروی بتلائے گئے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ درحقیقت یہ اختلاف راویوں کے وہم اور لفظوں کی تقدیم و تاخیر کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ حقیقی اختلاف تین قولوں سے آگے نہیں جاتا۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں بیان کیا ہے کہ:

باوجودیکہ اُن ناموں میں سے (جو ابوہریرہ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں) بعض میں یقیناً تصحیف (کتابت کی غلطی) اور تحریف ہوئی ہے۔ جیسے برّ و بریر، یزید، ظاہر یہ ہے کہ یہ کسی راوی کا تصرف ہے۔ اسی طرح سکن و سکین، سعد، سعید وغیرہ ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مآل ایک ہے (یعنے ایک ہی نام کو راوی ادل بدل کر بیان کر رہے ہیں)

اس کے بعد حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ:۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس قسم کے اقوال صرف دس تک پہونچتے ہیں اور صحت نقل کے اعتبار سے ان سب کا مرجع صرف تین نام ہیں۔ عمیر، عبداللہ، اور عبدالرحمٰن (١)

ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں دسیوں صحابہ ایسے ملتے ہیں جن کے ناموں میں چار یا پانچ، یا چھ، قول تک مروی ہیں۔ تو ایسی صورت میں صرف حضرت ابوہریرہ کے خلاف یہ ہنگامہ آرائی اور فتنہ پردازی کیوں ہے؟

صرف اسی لئے کہ مفسدوں کی نیت خراب ہے اور ان کا مقصد حضرت ابوہریرہ کی توہین و تذلیل اور ان کے خلاف ذہنوں میں انتشار پیدا کرنا ہے اور بس۔

دوم: ابوہریرہ کی پیدائش، نشو ونما اور ان کی اصل ونسل

استاذ ابوریہ ص ١٥٣ پر لکھتے ہیں:۔

"لوگوں میں جیسے حضرت ابوہریرہ کے نام کے بارے میں اختلاف ہے اسی طرح ان کی پیدائش، نشو ونما اور اسلام سے پہلے کی تاریخ کے بارے میں بھی انہیں کچھ علم نہیں سوائے اُن واقعات کے جو وہ اپنے بارے

(١) الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۴ ص ٢٠۴ - ١٢

میں خود بیان کیا کرتے تھے مثلاً یہ کہ: وہ ایک چھوٹی سی بلی کے ساتھ کھیلا کرتے تھے (اس لئے لوگ ان کو ابوہریرۃ بلی کا باپ کہنے لگے) اور یہ کہ وہ انتہائی مفلس ونادار تھے، لوگوں کا کام کاج کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے، ان کے نسب کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ قبیلۂ ازدی کی ایک شاخ سلیم بن فہم سے تعلق رکھتے تھے اور خاندان دوس کے ایک فرد تھے۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جو شخص خود کو اتنا لائق احترام محقق سمجھتا ہو، اور علم ومعرفت اور وسعت اطلاع کا دعوے دار ہو، وہ تعصب کے ایسے تاریک گڑھے میں گر جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشہور ومعروف صحابی کو مجروح کرنے کے درپے ہوگا جس کی شہرت نہ اس کے معاصرین سے چھپی ہوئی تھی، اور نہ آنے والی نسلیں اس سے بے خبر رہیں اور اس قسم کے رکیک اور شنیع حملے کرے گا جو ہم نے ابھی نقل کئے، سنئے اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

(۱) ابوہریرۃ عرب کے مشہور ومعروف قبیلہ دوس کے ایک فرد تھے، اور یہ قبیلۂ دوس قبائل عرب میں مخصوص عظمت وشرف اور اعلیٰ مرتبہ ومقام کا مالک تھا۔

(۲) (ابوہریرہ ہی نہیں) چند صحابہ کو چھوڑ کر ـــ جن کی تعداد دس سے اوپر نہیں ہے ـــ باقی تمام صحابہ کا حال یہی ہے کہ ان کے اسلام سے پہلے یعنے عہد جاہلیت کے حالات کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے سارے کا سارا عرب گمنامی اور جہالت کے سمندر میں ڈوبا ہوا، جزیرۃ العرب میں محصور، زندگی بسر کر رہا تھا، نہ دنیا کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی ان کو فکر تھی، اور نہ ہی دنیا کی قوموں کو ان کے حالات معلوم کرنے اور چھان بین کرنے کی طرف توجہ تھی، بجز ان تجارتی حالات اور سرسری معلومات کے جو عرب کے تجارتی قافلوں کے ان متمدن قوموں کے ملکوں سے گذرتے وقت ان کو معلوم ہو جاتے تھے۔ جب اسلام دنیا میں آیا اور اللہ تعالیٰ نے عربوں کو اسلام کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہونچانے کی فرداری سے سرفراز فرمایا، تو پھر عرب کے ہر ہر فرد کی ایک مستقل تاریخ زندگی لکھی جانے لگی، اور ان کے

حالات مورخین کے حلقوں میں زیر بحث آنے لگے، اور راویانِ حدیث ان کے حالات زندگی کا کھوج لگانے لگے، ان کے تلامذہ علم کتاب وسنت اور تعلیمات رُشد وہدایت اُن سے نقل کرنے لگے، تو کیا اس سلسلہ میں حضرت ابوہریرہ کا حال جمہور صحابہ کے احوال سے کچھ مختلف تھا؟ ان کے عہد جاہلیت کے حالات کا پتہ نہ چلنے کی وجہ سے اُن کے مرتبہ ومقام پر کیوں حرف آتا ہے؟ اور عہد اسلام میں ان کی عظمت شان پر اس سے کیوں بٹہ لگتا ہے؟ اور قرآن عظیم کی تعلیمات میں فاضل، استاذ ابوریہ کو ایسی کونسی نص (قرآن کی آیت) ملی ہے کہ جس شخص کے اسلام کے پہلے کے حالات معلوم نہ ہوں اُس کی عظمت وشان کو گرانا اور اس کے مرتبہ ومقام میں عیب نکالنا، اور جو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ روایت کرے اس میں شک وشبہ پیدا کرنا ضروری ہے؟ سبحانك هذا بهتان عظيم (پاک ہے تو، یہ تو بہت ہی بڑا بہتان ہے)

(۳) اگر ہم استاذ ابوریہ سے یہ سوال کریں کہ تبلایئے وہ ہزاروں صحابہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں موجود تھے، جن کی تعداد بعض محققین نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتلائی ہے، کیا اُن میں سے دس بیس کے سوا باقی تمام صحابہ کی اسلام سے پہلے کی تاریخ آپ کو معلوم ہے؟ اور کیا جو کچھ ان کی تاریخی حالات معلوم بھی ہیں ان کی مقدار ایک دو سطروں سے آگے بڑھتی ہے؟ تو کیا ابوریہ کے نزدیک ان دس بیس کے علاوہ (جن کے حالات معلوم ہیں) باقی سارے صحابہ مجروح اور ناقابل اعتماد تھے، حقیر وذلیل تھے، ان کی کوئی قدر وقیمت اور شان ومنزلت نہ تھی؟ کیا یہی وہ علمی اور تاریخی تحقیق (ریسرچ) ہے جس کا خیال تک بھی استاذ ابوریہ سے پہلے کسی مورخ کو نہیں آیا اور نہ اس انداز پر اس سے پہلے احوال رواۃ کی تحقیق کی جا سکی؟ اور صرف استاذ ابوریہ کے سر اس طرز تحقیق کی ایجاد کا سہرا ہے جیسا کہ خود استاذ ابوریہ اس کے مدعی ہیں۔

سوم: حضرت ابوہریرہ کا اَن پڑھ ہونا

ابوریہ ابوہریرہ کے متعلق ص ۱۵۴ پر لکھتے ہیں:۔

"وہ اُمی تھے، نہ لکھ سکتے تھے، نہ پڑھ سکتے تھے"

اسلام کے کسی بھی عہد میں کسی صحابی کا ان پڑھ ہونا اس کی سچائی کے لئے موجب طعن کبھی

نہیں بنا، آج پہلی مرتبہ استاذ ابوریہ میدان تحقیق میں آکر یہ کہتے ہیں کہ ان پڑھ ہونا بھی راوی کی سچائی پر حرف لاتا ہے۔

پھر اُمیّت تو ان عربوں کی ایک عام صفت تھی جن کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، اور یہ بالکل واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت مکہ میں لکھنا پڑھنا جاننے والے لوگ صرف چند افراد تھے جن کو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا تھا، لہٰذا جمہور صحابہ — جن کی تعداد — جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ایک لاکھ چودہ ہزار تک پہونچتی ہے۔ امی تھے، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو پھر صرف حضرت ابوہریرہ کو خاص طور پر اُمیت کے طعن کا نشانہ بنانے میں آخر کیا راز ہے؟ کیا اس کا مقصد اُن کی روایت کردہ احادیث کی صحت میں جن کو وہ لکھے بغیر حفظ کرتے اور اپنے حافظہ سے ہی روایت کیا کرتے تھے، شک و شبہ پیدا کرنا نہیں ہے؟

ہم اس سے قبل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ عام طور پر صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں لکھا کرتے تھے، بجز عبداللہ بن عمرو کے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث بالالتزام لکھا کرتے تھے تو کیا ابوریہ یہ چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تمام احادیث کے ذخیرہ کو جو صحابہ کرام سے پورے ضبط و اتقان کے ساتھ مروی ہے محض اس بنیاد پر قابل اعتراض قرار دیدیں کہ صحابہ اُمی تھے، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے؟ میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کیا یہی نتائج اور اغراض و مقاصد ہیں اُس علمی تحقیق کے، جو بقول ابوریہ آج تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی اور نہ اس انداز پر کبھی ریسرچ کی گئی۔

چہارم: ابوہریرۃ کا فقر و افلاس

اپنی تحقیق کے بیشتر مراحل میں استاذ ابوریہ اس علت کے مریض نظر آتے ہیں کہ وہ حضرت ابوہریرہ کو ایک انتہائی حقیر و ذلیل شخص کی حیثیت سے پیش کریں، اور اسی عنوان کے ساتھ ان کی تشہیر کریں صرف اس لئے کہ وہ واقعی مفلس و نادار تھے، ان کے پاس کچھ نہ تھا، اور اس وجہ سے بھی کہ وہ ہمہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر رہتے تھے

اور آپ کی حدیثیں یاد کرتے تھے، آپ کی بتائی ہوئی رشد و ہدایت کی باتوں کو عملاً سیکھتے تھے (کسب معاش کے لئے ان کے پاس کوئی وقت نہ تھا) وہ اسی پر قناعت کرتے تھے کہ ان کو سیر ہو کر کھانے کو مل جائے۔ نیز استاذ ابوریہ نے اس بات کو بھی بار بار دہرایا ہے کہ ابوہریرہ اپنے قبیلہ میں بھی نہایت ذلیل و حقیر آدمی تھے، نہ .... وہ عرب کے شرفاء میں سے تھے، اور نہ ہی مشہور رؤسا عرب میں ان کا شمار تھا، انہی وجوہ کی بنا پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ استاذ ابوریہ کے نزدیک ذلت و حقارت کے مستحق تھے۔

بیشک ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ایک دولتمند آدمی جو عزت و جاہ اور نفوذ و اقتدار کا مالک ہوتا ہے مفلسوں و ناداروں کو اسی طرح حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتا ہے اور ان کو ذلیل و خوار سمجھتا ہے؟ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دشمن اور ان کی دعوت کے مخالفین، ان پر ایمان لانے والوں کے متعلق وہی کچھ کہتے ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان کے نادار و مفلس متبعین کے متعلق کہا تھا کہ:-

وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ — ہم تو دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیچھے صرف وہی لوگ چل رہے ہیں جو علانیہ طور پر ہم میں ذلیل اور خوار ہیں (۱)

اور ہم یہ بھی خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جو لوگ خدا و رسول اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ دنیا کی نعمتوں اور مال و دولت کو ہی عزت و عظمت کا "پیمانہ" بناتے ہیں۔

ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ عیش پرستی اور سرمایہ داری کے حلقے اور سرمایہ دار طبقے ہی مفلسوں اور ناداروں پر اپنی بڑائی اور برتری جتلایا کرتے ہیں اور ان کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں، ان کی قدر و منزلت کو گراتے ہیں۔ (اگرچہ وہ اخلاق و کردار اور علم و فضل کے اعتبار سے کتنے ہی لائق احترام کیوں نہ ہوں) جاہلوں اور سرمایہ پرستوں کی یہ "نفسیات" ہم خوب اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہیں مگر استاذ ابوریہ جیسے محقق اور فلسفی دانشور سے اس کی توقع ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم استاذ ابوریہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کس نظریہ کے تحت ابوہریرہ کے فقر و افلاس اور

---

(۱) سورہ ہود : ۲۷

قبیلہ ہیں ان کی بے وقعتی کو موجب جرح و تنقیص قرار دیتے ہیں؟ آیا اُن لوگوں کے نظریہ کے پیش نظر جو خدا کے رسولوں کو ہمیشہ جھٹلاتے رہے ہیں؟ اگر استاذ البدریہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر اور اس کی اُتاری ہوئی کتاب (قرآن) کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں تو ہم ان کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی مثال پیش کرتے ہیں، جنہوں نے اپنی قوم کے ان "معزز صفت" لوگوں کو مخاطب کر کے جو اُن کے متبعین میں سے مفلس و نادار ایمان لانے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، فرمایا:-

وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ، وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۱)

میں ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے ہیں اپنی مجلس سے ہرگز نہیں نکال سکتا بیشک وہ تو اپنے رب سے ملنے والے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ ضرور اپنی جہالت کا ثبوت دے رہے ہو۔

اس کے بعد اُن سے فرمایا:-

وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ، اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲)

اور نہ اُن لوگوں کی نسبت جن کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ کہہ سکتا ہوں کہ خدا ان کو کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ ان کے دلوں میں جو (ایمان کی دولت) ہے اُسے خدا خوب جانتا ہے میں اگر ایسا کہوں تو میں یقیناً بے انصافی کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں گا۔

اور اگر وہ اسلامی ماحول میں رہ کر دولتمندوں کی (فرعونی) ذہنیت کے تحت حضرت ابوہریرہ کے فقر و افلاس پر بحث کر رہے ہیں اور اس کو موجب تحقیر و تذلیل قرار دے رہے ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام نے (تو اس ذہنیت کی بڑی شدت کے ساتھ بیخ کنی کی ہے اور) انسانوں کے درمیان ایک دوسرے پر فضیلت حاصل کرنے کے سلسلہ میں جملہ "مادی اقدار" کو ختم کر دیا ہے اس نے تو صرف ایک "قدر" کو تسلیم کیا ہے، اور وہ ہے "تقوی" کی قدر، جس کو

---

(۱) سورۃ ہود ع ۳ ۲۹ (۲) سورۃ ہود ع ۳ - ۳۱

قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (۱) — اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور اگر وہ ملوک زادیوں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ذہنیت اور طرز فکر کے تحت یہ بحث کر رہے ہیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری جدید عرب جمہوریہ کے دور میں ان تمام طبقات کی عظمت و برتری کا زمانہ اس طرح گذر چکا ہے کہ آئندہ کبھی بھی لوٹ کر نہیں آئے گا آج ہم "عمل" اور "قابلیت" کے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ کے فقر و افلاس، ان کی بھوک پیاس، اور تہیدستی کی بناپر ابوریہ نے جس شرمناک اور رسوا کن نظریہ کا مظاہرہ کیا ہے اس کے جواز کے لئے مجھے تو ابوریہ کے لئے کوئی بھی تحلل نہیں مل سکا۔

دیکھئے حضرت بلال حبشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن تھے۔ لیکن یہی سیاہ فام حبشی موذن وہ عظیم تر ہستی ہے جو فتح مکہ کے دن سرداران قریش اور عظماء قریش کے موجود ہوتے ہوئے اسلام کے "کلمۃ" (اذان اور فتح) کا اعلان کرنے کے لئے کعبہ کی چھت پر چڑھے تھے۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق کے عہد میں لوگ جب حضرت عمر سے ملنے کے لئے ان کے پاس حاضر ہونے کی اجازت مانگتے تو وہ ان میں سے حضرت صہیب اور حضرت بلال جیسے فقراء مسلمین کو بڑے بڑے سرداروں پر ترجیح دیتے اور پہلے بلاتے تھے۔

اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے اور آپ کی نبوت پر ایمان لانے والے "سابقین اولین" میں اکثر و بیشتر ایسے ہی بے یار و مددگار، تنگ دست و مفلس قسم کے لوگ اور کنیز و غلام تھے، اور برسوں تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ تو کیا یہ خستہ حالی اور فقر و افلاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ان کے لئے کچھ نقصان دہ تھی؟ یا اسلام کی دعوت، جہاد فی سبیل اللہ اور دفاع عن الاسلام کی تاریخ میں

---

(۱) سورۃ الحجرات - ۱۳۔

اس تہیدستی و بدحالی سے ان کو کوئی ضرر پہونچا؟ (ہرگز نہیں وہ "سابقین اولین" میں شمار ہوئے اور غازیان اسلام کی تاریخ میں سرفہرست ان کے نام لکھے گئے)

یہ بے سروسامان، فاقہ کش خستہ حال مسلمان اور کنیز و غلام جن کو کفار قریش اور آبوریہ جیسے فرعون صفت لوگ حقیر نظروں سے دیکھتے ہیں، کیا تاریخ اسلام نے ان کو اپنے روشن صفحات میں جگہ دے کر ان کے بقاء دوام، ان کی جلالت وعظمت شان، حق کی خاطر ان کے اخلاص اور خدا کے راستہ میں اور اس کے دین کی اشاعت کے سلسلہ میں ان کی "قربانیوں" کو ہمیشہ کے لئے محفوظ نہیں کر دیا؟ کفار قریش اور ابوریہ جیسے فرعون بے سامان لوگ جن کو مالدار شرفا اور آبرومند لوگ کہتے ہیں، کیا ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے، جو ان فقراء کے مرتبہ ومقام کو یا اس کے آس پاس پہونچ سکے؟

پھر یہ "دولت وثروت کا پیمانہ" جس کو ابوریہ نے ابوہریرہ کے حق میں استعمال کیا ہے، کیا خود ان کے حق میں اس کا استعمال نہیں ہو سکتا؟ ایک معترض کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان کو بھی ذلیل وخوار کہے، اور ان کی بھی تحقیر وتذلیل کرے، کیونکہ — جیسا کہ ہمیں معلوم ہے — ابوریہ بھی مفلس ونادار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، دولتمند اور مالدار طبقہ میں سے نہیں ہیں۔ ان کی قوم میں بھی ان کو کوئی شرف وفضیلت اور امتیازی مقام ومرتبہ حاصل نہیں ہے۔

پنجم: ابوہریرہ کا اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر باشی کا سبب

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ابوہریرہ غزوہ خیبر کے موقع پر ۷ھ میں اسلام لائے تھے۔ اس پر اب ہم یہ اضافہ کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ وہ اس تاریخ سے بہت زمانہ پہلے اسلام لا چکے تھے، لیکن انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت اسی سال (۷ھ میں) کی تھی۔ اس ترجیح کی ہمارے پاس دو دلیلیں ہیں:

اول: ابن حجر نے اپنی کتاب "الاصابہ" کے اندر طفیل بن عمرو دوسی کے حالات میں بیان کیا ہے کہ: وہ (طفیل) "ہجرت" سے پہلے اسلام لائے تھے، اسلام لانے کے بعد جب وہ اپنی قوم — یعنی ابوہریرہ کے قبیلہ — میں واپس گئے تو انھیں اسلام کی دعوت دی۔ لیکن ان کی قوم

میں سے بجز ان کے والد اور ابوہریرہ کے اور کسی نے اسلام قبول نہیں کیا اُس بیان سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ابوہریرہ غزوہ خیبر کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے سے بہت پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔

دوم: امام بخاری اور امام مسلم نے ابوہریرہ اور ابان بن سعید بن العاص کے درمیان اُس شدید جھگڑے کا ذکر کیا ہے جو ان کے درمیان "فتح خیبر" کے بعد تقسیم غنیمت کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ (واقعہ یہ تھا کہ) ابان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال غنیمت میں سے اپنا حصہ لگانے کی درخواست کی تو اس پر ابوہریرہ بولے کہ یا رسول اللہ اس کا حصہ نہ لگائیے، اس لئے کہ یہ ابن قوقل کا قاتل ہے۔ ابن قوقل کا نام نعمان بن مالک بن ثعلبہ بن اصرم ہے۔ اور یہ (ابن قوقل کے قتل کا واقعہ) احد کی لڑائی میں پیش آیا تھا۔ ابان اس وقت تک مشرک تھے اور انھوں نے ابن قوقل کو قتل کر دیا تھا۔ (۱)

اس قصہ سے ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ابوہریرہ جب ہجرت کر کے خیبر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ہیں، اُس وقت وہ نئے نئے مسلمان نہ تھے بلکہ اسلام کی جنگوں اور ان کے واقعات کے بارے میں بھی انہیں کافی معلومات تھیں، انھیں معلوم تھا کہ ابان بن سعید بن العاص ہی نے نعمان بن مالک (ابن قوقل) کو غزوہ احد میں قتل کیا تھا۔ حافظ ابن حجر کی رائے بھی یہی ہے[2] ابوریہ نے اس واقعہ کو سمجھنے میں بھی اپنی عادت کے مطابق زیغ سے کام لیا ہے۔ اور اس واقعہ سے وہ نتیجہ اخذ کیا ہے جس کو ایک انصاف پسند محقق سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔

بہر حال صورت حال جو بھی کچھ ہوئی ہو (اس میں شک نہیں کہ) ابوہریرہ بھی اور تمام صحابہ کی طرح خالص خدا کی رضا کے لئے اسلام لائے تھے (اور کوئی بھی دوسری غرض اس میں کارفرما نہ تھی) اسلام کا ذکر اُنھوں نے سب سے پہلے طفیل بن عمرو سے سنا، اور اسی وقت سے

---

(۱) امام بخاری نے اس واقعہ کو اپنی عادت کے مطابق مختلف مقامات میں ذکر کیا ہے۔ لیکن "باب غزوہ خیبر" میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے دیکھو فتح الباری ج ۷ ص ۳۹۵ - ۱۲

(۲) فتح الباری ج ۸ ص ۳۰

وہ اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے تھے اور اسلام کے ممتاز شعائر و احکام پر عمل پیرا بھی ہو چکے تھے اور اسی لمحہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کر کے آنے کا شوق ان کو دامنگیر تھا یہاں تک کہ وہ آپ کے پاس اس وقت پہونچے جبکہ آپ اور عام مسلمان خیبر کی جنگ میں مشغول تھے

بیشتر روایات یہی بتلاتی ہیں کہ ابوہریرہ خیبر کی لڑائی ختم ہونے کے بعد پہونچے ہیں، ہاں مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت وہ ضرور موجود تھے بعض روایات سے ـــ جو زیادہ مستند اور صحیح ہیں ـــ تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ مالِ غنیمت میں سے ابوہریرہ کو بھی حصہ دیا جائے۔

اس کے بعد ابوہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ہمیشہ حاضر رہنے لگے، اس شان سے کہ انہیں دنیا کی کسی چیز کی طرف بھی اصلاً التفات نہ تھا، سوائے اس کے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (احادیث) کان لگا کر سنتے، اور آپ کی زبانی اور عملی تعلیمات کو بعد کے آنے والے مسلمانوں کے لئے محفوظ کرتے، اور آپ کی حدیثیں اُن سے بیان کرتے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ ابوہریرہ کی جگہ "صفہ" میں ہو۔ کیونکہ مسجد نبوی میں صفہ ہی وہ جگہ تھی جہاں صرف وہی لوگ شب و روز رہتے تھے جنہوں نے علم دین حاصل کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کفار سے جہاد کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا، جن کے پاس نہ کوئی دنیا کا مال و منال تھا اور نہ اہل و عیال۔ اس صُفہ میں معزز طبقہ کے صحابہ ہی رہتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان کا اعزاز و اکرام کیا کرتے تھے اور صحابہ کو بھی ان کا احترام کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک ابوہریرہ کا یہی حال رہا کہ وہ آپ کی صحبت میں ہمہ وقت حاضر رہتے، جہاں کہیں آپ تشریف لے جاتے وہ ساتھ جاتے۔ اس طرح ۷ھ سے ۱۱ھ تک ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر و حضر میں ہمیشہ ہمراہ رہے، ابوہریرہ کو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنے ہوئے اقوال طیبہ اور چشم دید اعمال و اخلاق کو محفوظ اور یاد کرنے کے ساتھ ہی ساتھ) اُن صحابہ کی زبان سے احادیث سننے کی بھی شدید حرص تھی جو اُن سے پہلے اسلام لا چکے تھے (اور براہ راست ابوہریرہ کو وہ حدیثیں نہ پہونچ

سکی تھیں) اسی طرح ازواج مطہرات کی زبان سے بھی وہ (آں) احادیث کے سننے کے بے حد شائق رہتے تھے (جو رسول اللہ کی درونِ خانہ زندگی سے تعلق رکھتی تھیں) ان متعدد ... وجوہ کی بنا پر ابوہریرہ کے پاس حدیث کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا جو ایسے دوسرے صحابہ کے پاس نہ تھا ، جو صاحب اہل وعیال اور معاشی وسائل میں معروف ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ابوہریرہ کی طرح رسول اللہ کی احادیث سننے اور یاد کرنے کے لئے فارغ نہیں کرسکتے تھے ، اور وہ ابوہریرہ کی طرح ہمہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ایسے حاضر باش نہ رہ سکتے تھے ، کہ جہاں آپ جائیں وہ بھی جائیں ۔

یہ ہے ابوہریرہ کے اسلام کا واقعہ ، امام بخاری نے اور دولابی (متوفی ۳۱۰ھ) نے الکنی میں ابوہریرۃ کے قبیلہ " دوس " سے مدینہ اور مدینہ سے خیبر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہجرت کر کے آنے کا واقعہ بیان کیا ہے ۔ نیز دولابی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ابوہریرہ عشق رسول کے کیف وسرور میں مست ہو کر راستہ میں کس طرح یہ شعر گنگنایا کرتے تھے :۔

یَا لیلۃً من طولھا وعنائھا	ہائے یہ کیسی دراز اور تکلیف دہ رات ہے ، تاہم اس نے
علیٰ أنّھا من دارۃ الکفر نجّت[1]	(مجھے) دارالکفر سے نجات تو دیدی (یہی اس کا بہت بڑا احسان ہے)

راستہ میں ابوہریرہ کا غلام بھاگ گیا مگر جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے بیعت کی تو اس وقت وہ غلام آموجود ہوا ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : اے ابوہریرہ ، لو تمہارا غلام آگیا " اس پر ابوہریرہ نے عرض کیا : یا رسول اللہ یہ خدا کی راہ میں آزاد ہے (۲) ابوہریرۃ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نصیب ہونے اور اسلام پر آپ سے بیعت کی سعادت حاصل کرنے کی خوشی میں اس غلام کو آزاد کر دیا ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ کے اسلام لانے کا واقعہ ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

(۱) دولابی کی روایت میں ہے تُنَجِّینِیْ ۱۲

(۲) دیکھئے فتح الباری ج ۸ ص ۸۲ ۔ الکنی والاسماء ج ۱ ص ۶۱

ساتھ سچے عشق ومحبت، قبول اسلام میں خلوص وصداقت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ ملاقات اور سعادت بیعت حاصل ہونے پر اللہ تعالیٰ کے اس انعام واحسان کے شکریہ میں اپنے واحد سرمایہ ـــ غلام کو آزاد کر دینے کے لحاظ سے ـــ ایک ایسا مثالی واقعہ ہے جس کی نظیر ہمیں دوسرے صحابہ کے یہاں نہیں ملتی۔ عمرِ عزیز کی قسم! اس مثالی واقعہ میں تو مومنین صادقین کو وہ چیز نظر آتی ہے جس سے اُن کا دل (ابوہریرۃ کے حق میں) پورے اعتماد پسندیدگی اور اطمینان سے لبریز ہو جاتا ہے۔

لیکن استاد ابوریہ کا دل خدا جانے ابوہریرہ کے کینے اور عداوت سے کیسا بھرا ہوا ہے کہ انہیں ابوہریرۃ کے قبول اسلام کا واقعہ ایک فاقہ زدہ بھگوڑے کا سا واقعہ نظر آتا ہے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھاگتا پھرتا ہے۔ اور انھیں ابوہریرۃ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر باشی بھی اس چالباز بھکاری کی سی حاضر باشی نظر آتی ہے جس کو زندگی میں صرف ایک ہی غم ہو کہ جس طرح بھی ہو اپنی بھوک پیاس کو دور کرے اور اپنے پیٹ کی آگ کو بجھائے تعجب ہے (ع: طعنہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے)۔

ہم پوچھتے ہیں: کیا ابوریہ اس صورتِ حال کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں؟ یا اپنی اولاد کے لئے پسند کرتے ہیں؟ اپنے کسی دوست کے لئے پسند کرتے ہیں؟ پھر اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک جلیل القدر صحابی کے لئے اس ذلیل تعارف کو کیسے پسند کیا؟ ابوریہ کی رائے ابوہریرہ کے بارے میں کچھ بھی ہو، بلاشبہ جمہور علماء اسلام تو تابعین کے زمانہ سے آج تک ابوہریرہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "علم" کی امانت کے "حامل" (امین) کی حیثیت سے انتہائی باعزت مثالی شخصیت سمجھتے ہیں۔

ششم: ابوہریرہ کی بھوک پیاس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر باشی کا قصہ

استاد ابوریہ نے ابوہریرہؓ کے فقر وافلاس کو بار بار دُہرایا ہے اور اس بات کا بھی بار بار ذکر کیا ہے کہ:-

ابوہریرہ نے صرف اپنے فقر وافلاس کی وجہ سے "صفہ" میں پناہ لی

تھی، چنانچہ "صفہ" کا قصد کرنے والے مفلس و قلاش لوگوں میں ابوہریرہؓ
سب سے زیادہ مشہور تھے پھر ترقی کر کے وہ ان فاقہ زدہ لوگوں کے جو
صفہ میں پڑے رہتے تھے چودھری بن گئے تھے (ص ۱۵۴)

(۱) نجوائے لا ینحال! ابوریہ کو نہ خدا سے شرم آتی ہے نہ مخلوق سے۔ خدا و رسول کے نظروں میں نہ تو فقر و فاقہ کسی عیب اور رسوائی کا موجب ہے اور نہ صفہ کی رہائش — اور نہ ہی یہ دونوں امر آن کریم الفطرت لوگوں کی نظروں میں نقص و عیب اور ذلت و رسوائی کا موجب ہیں جنہوں نے مکارم اعمال اور معالی اخلاق اور عالی صفات کے آغوش میں پرورش پائی ہے۔

ہاں یہ آن کمینے، پست فطرت اور دنیٔ النفس لوگوں کی نظروں میں ضرور عیب ہیں، جو عزت و شرف صرف مال و جاہ میں ہی سمجھتے ہیں۔

استاذ ابوریہ کی تردید کے سلسلہ میں ہمارے لئے قرآن کریم کے وہ بیانات بہت کافی ہیں جو اُس نے مالداروں اور عیش پرستوں کے طبقہ کی شناعت کے بارے میں ذکر کئے ہیں، اور ان کے فسق و فجور کی نیز انبیاء کی دعوتِ حق اور مصلحین کے پیغام اصلاح کی مخالفت کی جو تفصیلات قرآن نے بیان کی ہیں۔

(۲) ابوریہ فرماتے ہیں اور کس جسارت کے ساتھ فرماتے ہیں:

"ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضرباشی کے اس "سبب" کو ایسی ہی سچائی اور صفائی کے ساتھ (بغیر کسی شرم و حجاب کے) بیان کرتے ہیں" جیسے وہ اپنے نشوونما کا حال سچائی سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے یتیمی کی حالت میں گزاری تھی (ص ۲۴)

گویا ابوریہ کے نزدیک یتیمی بھی ایک عیب ہے — درحقیقت جنہیں کسی کی شرم و حیا کا پاس نہ ہو ان سے ایسی ہرزہ سرائی پر کیا تعجب؟ ابوریہ نے یہ نہیں کہا کہ:

ابوہریرہ رسول اللہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور آپ سے رُشد و ہدایت حاصل کرنے کی غرض سے "صفہ" میں رہتے تھے، جیسے دوسرے اسی قسم کے جاں نثار مسلمان آپ کی خدمت میں صفہ نشین تھے۔

اس کے برعکس وہ فرماتے ہیں:

ابوہریرہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے صفہ میں پڑے رہتے تھے۔

عربی میں اِن کے الفاظ یہ ہیں — اِنہٗ علیٰ ملءِ بطنہٖ — اور حاشیہ میں ابن ہشام نحوی سے نقل کیا ہے کہ علیٰ تعلیل (سبب بیان کرنے) کے لئے آتا ہے

یہ بات تو وہی شخص کہہ سکتا ہے جو کینے اور جذبۂ انتقام میں اندھا ہو چکا ہو، ابوہریرہ کے اس کلام — اِنہٗ علیٰ ملءِ بطنہٖ — کو یہ معنی وہی شخص پہنا سکتا ہے جس کی عقل میں فتور آچکا ہو، یا جس کے دل میں کھوٹ ہو — ورنہ جس کے پاس ذراسی بھی عقل وخرد ہو وہ یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ ابوہریرہ اپنے ملک کو، اپنے قبیلہ کو، اور اپنے وطن کی اس سرزمین کو جس میں اُنھوں نے جنم لیا تھا اور پرورش پائی تھی، ان تمام فطری طور پر محبوب چیزوں کو محض اس لئے چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دور دراز سفر کر کے آسکتے ہیں کہ وہ اپنی بھوک وپیاس کی آگ کو بجھا سکیں اور بس؟

کیا ابوہریرہ کے پاس اپنے قبیلہ میں کھانے پینے کو کچھ نہ تھا؟ کیا قبیلہ دوس کی — جو عرب کا ایک عزت وعظمت کا مالک قبیلہ تھا — سرزمین بالکل خشک، قحط زدہ اور بنجر تھی، جو ابوہریرہ پر اس رجہ تنگ ہو گئی تھی کہ انہیں کھانے پینے کو بھی وہاں میسر نہ تھا؟ پھر ابوہریرہ مدینہ کیوں آئے؟ اور کیا ابوہریرہ مدینہ آکر تجارت وزراعت کے ذریعہ اتنا نہیں کما سکتے تھے جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکتے جیسے مدینہ کے دوسرے تاجر اور زمیندار تجارت یا زراعت کے ذریعہ کھاتے پیتے اور خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے؟ اور کیا دنیا میں "پیشہ ور عالمی بھکاریوں" کے علاوہ بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنا وطن چھوڑ کر دور دراز شہروں کا محض کھانے پینے اور پیٹ بھرنے کے لئے سفر کرتے ہوں؟ پھر ان پیشہ ور عالمی بھکاریوں کو بھی صرف کھانے پینے ہی کی حرص وطمع دامنگیر نہیں ہوتی، بلکہ مال ودولت جمع کرنے کی ہوس بھی ہوتی ہے۔ اور ابوہریرہ پر یہ الزام خود ابوریہ بھی نہیں لگاتے کہ "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال ودولت جمع کرنے کے لئے رہتے تھے"۔ تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ابوریہ کی رائے میں حضرت ابوہریرہ ان پیشہ ور خانہ بدوش عالمی بھکاریوں سے بھی زیادہ گرے ہوئے اور گئے گذرے تھے؟

کیا کور باطنی اور "سیاہ کینہ" انسان کو پستی کے اس درجہ تک بھی پہونچا دیتا ہے؟

(۳) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر باشی کے بارے میں صحیح روایت

اُس طرح نہیں ہے جس طرح ابوریہ نے نقل کی ہے۔ بلکہ صحیح روایت وہ ہے جو امام بخاری نے کتاب البیوع میں بیان کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

كنت الزم رسول الله صلى الله عليه وسلم على ملء بطني	میں ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا پیٹ بھرنے (کو جو بھی مل جائے اُسی) پر قناعت کر لیتا تھا)

ابوہریرہ یہ فقرہ اپنی روایت حدیث کی کثرت کے اسباب کی وضاحت کے سلسلہ میں بیان کرتے ہیں (نہ کہ نفس مصاحبت کی وجہ) اس کو امام مسلم نے بھی "فضائل الصحابہ" میں بیان کیا ہے :

كنت رجلا مسكينا أخدم رسول الله عليه وسلم على ملء بطني۔	میں ایک مسکین آدمی تھا ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لگا رہتا پیٹ بھرنے کو جو بھی مل جاتا (اسی پر قناعت کرتا تھا)

یہاں ابوہریرہ کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر باشی کا ۔۔۔ سبب بیان کرنا مقصود نہیں ہے ـــ جیسا کہ ابوریہ نے سمجھا ـــ بلکہ وہ اس بات کا سبب بیان کرنا چاہتے ہیں۔ کہ وہ سارے صحابہ میں سب سے زیادہ حدیث کیوں بیان کرتے ہیں۔ مہاجرین بازاروں میں تجارتی لین دین میں مصروف رہتے تھے (انھیں اپنے کاروبار سے اتنی فرصت نہ تھی) اور انصار زمین بونے جوتنے میں لگے رہتے تھے (انہیں اپنی کھیتی باڑی سے اتنی فرصت نہ تھی) اس کے برعکس ابوہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ہمیشہ اور ہر وقت حاضر رہتے تھے، آپ جہاں تشریف لے جاتے خادم کی حیثیت سے وہ ساتھ ہوتے (اس لئے کہ وہ اہل وعیال گھر بار اور کھانے کمانے کے جھنجھٹ سے آزاد، نقد دم، ہر وقت پروانہ کی طرح شمع رسالت کا طواف کرنا ان کا مشغلہ تھا)

نہ معلوم ابوریہ نے یہ بات کہاں سے گھڑلی کہ :۔

> ابوہریرہ صاف اور صریح الفاظ میں سچائی کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کی غرض اور "صُفّہ" میں قیام کا سبب بیان کرتے ہیں۔

(۴) ابوریہ نے صرف ابوہریرۃ کے الفاظ میں تحریف کرنے پر ہی بس نہیں کیا، بلکہ اس پر غضب یہ ڈھایا کہ اُن کے قول "علی ملأ بطنی" میں لفظ علیٰ "تعلیل" (سبب بیان کرنے) کے لئے قرار دیا، اور کہا کہ ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ علیٰ کا لفظ تعلیل کے لئے ہی آتا ہے اور دلیل میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی :

ولتذکروا اللہ علیٰ ماھداکم — تاکہ تم خدا کا ذکر کرو اس لئے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی (ص ۱۵۴، حاشیہ نمبر ۲)

یہ دوسرا بہتان ہے اور اس امر کی دوسری دلیل ہے کہ ابوریہ کا منشا رحق گوئی نہیں ہے، بلکہ ابوہریرۃ کو ان کے مقام سے گرانے کی راہیں پیدا کرنا ہے۔

اس لئے کہ ابن ہشام رحمہ اللہ نے تو یہ بیان کیا ہے کہ :-

"علی" نو معنی کے لئے آتا ہے۔ ان میں سے ایک تعلیل (سبب بیان کرنا) بھی ہے

ابوریہ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ یہاں علیٰ ان نو معنی میں سے صرف اسی ایک معنی یعنے تعلیل کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جبکہ ابوہریرہ کے اس قول میں علیٰ کو تعلیل کے علاوہ دوسرے معانی میں بھی لیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن علما کی بصیرت کو ..... علم ومعرفت کے نور سے روشن کیا ہے، اور ان کے سینوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بغض وکینہ کی گندگی سے پاک رکھا ہے۔ انھوں نے ابوریہ کے برخلاف اس لفظ کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھا ہے۔

چنانچہ امام نووی ابوہریرہ کے قول "علی ملأ بطنی" کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

یعنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں شب وروز اور ہر وقت حاضر رہتا ہوں، اور جو بھی پیٹ بھرنے کو مل جائے اسی پر قناعت کرتا ہوں۔

نہ زراندوزی وغیرہ کی غرض سے نہ مال ودولت جمع کرتا ہوں اور نہ بقدر ضرورت سے زیادہ کی جستجو کرتا ہوں، واضح ہو کہ حصول روزی سے ابوہریرۃ کی مراد روزی حاصل کرنے کے جائز ذرائع ووسائل ہیں، نہ کہ اجرت[۱] پر خدمت کرنا یعنے نوکری کرنا "[۱] (یہ حاشیہ ص ۰۰ پر دیکھئے)

(۱) انظر ج ۱۶ ص ۵۳ و ۵۴

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

"علی ملء بطنی" کا مطلب یہ ہے کہ معمولی سی روزی پر قناعت کرتے تھے. یعنے روزی کی "فکر" ان کے لئے آپ کی صحبت سے غیر حاضر (اور محروم) ہونے کا سبب نہیں بنتی تھی (۱)

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:-

"علی ملء بطنی" کا مطلب یہ ہے کہ معمولی سی روزی (جو میسر آجائے اُس) پر اکتفا کرتے تھے (۲)

مختصر یہ کہ ان ائمہ حدیث کی مذکورہ بالا تصریحات سے ابوریہ کی بد باطنی و بدخواہی کا پردہ بخوبی چاک ہو گیا ۔ جو یہ چاہتے تھے کہ ابوہریرہ کے قبول اسلام کے واقعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر باشی کی صداقت اور اخلاص میں شکوک و شبہات پیدا کریں کیونکہ مذکورہ بالا ائمہ حدیث کے بیانات کی روشنی میں تو یہ واقعہ اور یہ محبت ابوہریرہ کے "مفاخر" میں شمار ہو گئی، اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خالص محبت کی قوی ترین دلیل بن گئی کہ ابوہریرہؓ کی اس خالص محبت میں دنیا کی حبت کا ادنیٰ شائبہ، یا مال کی رغبت، یا جاہ کی ہوس کی ذرہ برابر آمیزش نہ تھی۔

جہاں تک "دنیا" کا تعلق ہے تو وہ اس کو تو اُسی وقت خیرباد کہہ چکے تھے جب اُنھوں نے یہ عزم کیا تھا کہ مدینہ میں نہ تو کوئی تجارت کریں گے اور نہ کھیتی باڑی، تاکہ اُنھیں سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر باشی کے اور کوئی "غم" نہ رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث حاصل کر کے آنے والی نسلوں کے لئے اس امانت کو محفوظ کرنے کے سوا اور کوئی "کام" نہ ہو۔

حاشیہ صفحہ ۷۶: یعنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ایک ملازم اور نوکر کے طور پر نہیں کرتا بلکہ علوم و انوار نبوت حاصل کرنے کی غرض سے ہر وقت ساتھ رہتا ہوں اور جو میسر آجاتا ہے اس پر قناعت کرلیتا ہوں۔

(۱) فتح الباری ج ۴ ص ۲۳۱ (۲) عمدۃ القاری ج ۵ ص ۳۹۴

رہا مال، تو خود ابوریہ بھی ــــ اپنی جاہلانہ سفاہت اور نصوص کے معنی بیان کرنے میں زیغ کے باوجود ــــ حضرت ابوہریرہ پر یہ الزام نہ لگا سکے کہ وہ مال کے لالچ میں اسلام لائے تھے۔

ہم تو دیکھتے ہیں کہ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی "تاریخ" میں جو بعض روایات ذکر کی ہیں ان سے تو اہل حق کی نظر میں ابوہریرۃ کی شان اور بھی بلند اور اہل حق کے دلوں میں ان کا مقام اور بھی اعلیٰ و ارفع ہو جاتا ہے۔

ابن کثیر نے اپنی سند سے بروایت سعید بن ھند عن ابی ھویرۃ بیان کیا ہے کہ :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرۃ سے فرمایا: ابوہریرۃ! تم مجھ سے ان غنیمت کے مالوں میں سے کچھ بھی نہیں مانگتے جبکہ تمہارے ساتھی مجھ سے برابر مانگتے رہتے ہیں؟ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے جواب میں عرض کیا کہ: میں تو آپ سے صرف ایک چیز مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو علوم آپ کو سکھائے ہیں ان میں سے کچھ آپ مجھے سکھا دیں (۱)

کیا اس کے بعد بھی "حق" اور "علم" کے لئے ابوہریرہ کے اس اخلاص سے بڑھ کر کوئی حیران کن اخلاص ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ :۔

ابوہریرہ کی صاحبزادی نے ایک دن اُن سے کہا: ابا جان! لڑکیاں مجھے عار دلاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ تمہارے باپ تم کو سونے کا زیور کیوں نہیں پہناتے؟ ابوہریرہ نے جواب دیا کہ بیٹی! ان سے یہ کہہ دینا کہ میرے باپ مجھ کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں سے دور رکھنا چاہتے ہیں (۲)

جہاں تک عزت و جاہ کا سوال ہے تو ایک ایسا شخص جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کر کے پہونچنے کی راہ میں راستہ چلتے قافلوں کی نوکری تک کرنی اختیار کر لی ہو، اور مدینہ پہونچکر "صفہ" میں رہائش پر راضی ہو گیا ہو وہ صفہ جو ایسے لوگوں کا مسکن تھا جن کا نہ گھر تھا نہ بار اور نہ سر چھپانے کا ٹھکانہ۔۔۔ مزید برآں تحصیل علم (حدیث) اور اس کی امانت کا بوجھ اٹھانے

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۱۱ (۲) البدایۃ النہایۃ ج ۸ ص ۱۱۱

کی خاطر مسلسل بھوک پیاس اور فاقوں کی تلخی بھی بخندہ پیشانی برداشت کی ہو، اس کے متعلق توجاہ طلبی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو جب بحرین کا گورنر بنایا، اور وہ وہاں سے کچھ مال لے کر آئے تو حضرت عمر نے اس پر ان کا محاسبہ کیا (کہ یہ مال کہاں سے اور کیسے تمہارے ہاتھ آیا) لیکن فاروق اعظم کو (چھان بین کے باوجود) ان کی کمائی میں گناہ (یا ناجائز آمدنی) کا کوئی شائبہ نظر آیا تو اس کے بعد ابوہریرہ نے حضرت عمر کی دوبارہ فرمائش پر اس عہدہ (بحرین کی گورنری) کی قبولی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ: مجھے اندیشہ ہے کہ میں بغیر علم کے کوئی بات نہ کہہ بیٹھوں، اور بغیر حلم اور بردباری کے کوئی فیصلہ نہ کر دوں (۱) (یعنے گورنری کو چھوڑنے کا سبب کسی مالی بے احتیاطی کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کا اندیشہ مانع ہے)

تو یہ ہے ابوہریرہ کے اسلام کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر باشی کی حقیقت، سمجھ میں نہیں آتا کہ ابوریہ کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ تصنیف و تالیف اور تحقیق (ریسرچ) کے کھلے میدان میں "حقائق" کو توڑ مروڑ کر صریح اور واضح تاریخ کو مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں اور اس طرح بے گناہوں پر صریح جھوٹے الزام لگائیں۔ درآں حالیکہ ابوریہ کا ہی یہ مقولہ ہے کہ "جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو، خواہ جان بوجھ کر جھوٹ بولیں، یہ بے جانے بوجھے"

(۵) ابوریہ کا یہ بھی زعم ہے کہ:-

> ابوہریرہ بڑے "کھاؤ" (پیٹو) تھے، اور کھانے کے بیحد حریص تھے، ہر روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں یا کسی اور صحابی کے گھر میں ....
> ..... جا کر ضرور کھانا کھاتے تھے جس کی وجہ سے بعض صحابہ کو تو ان سے نفرت ہو گئی تھی۔

یہ تاریخ پر ایک اور بہتان اور حق کا حسین چہرہ بگاڑنے کی ایک اور ناپاک کوشش

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۱۳

ہے، یہ کہنا کہ ابوہریرہ پیٹو تھے، کھانے کے بید حریص تھے، یہ کسی بھی صحیح اور قابل احترام واعتماد روایت سے ثابت نہیں بالفرض اگر یہ کسی روایت سے ثابت بھی ہو جائے، تب بھی ابوہریرہ کی عدالت، صداقت اور ان کے مقام روایت پر اس سے ذرہ برابر حرف نہیں آتا۔ کھانے کی زیادتی دکسی مذہب میں، اور نہ ہی کسی شریعت میں انسان کی عدالت وثقاہت کو ساقط کرنے والا عیب ہرگز نہیں سمجھی گئی اور نہ ہی کسی راوی حدیث پر جرح وتنقید کا موجب قرار دی گئی (نہ ہی جرح وتنقید کی دنیا میں آج تک کسی نے کسی راوی کو اس بنیاد پر مجروح اور ناقابل اعتماد قرار دیا ہے کہ وہ بہت کھاتا ہے پیٹو ہے)

ابوہریرہ کو اس ناقابل برداشت سواری پر سوار ہونے اور کانٹوں بھرے راستہ پر چلنے پر لیتے اس بہتان لگانے پر، جس چیز نے آمادہ کیا ہے، وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی کے ساتھ بغض وکینہ اور توہین وتذلیل ہے۔

جہاں تک ابوہریرہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یا کسی صحابی کے گھر کھانے کا تعلق ہے تو ہم بیان ہی کر چکے ہیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ہمیشہ اور ہر وقت حاضر رہتے تھے جو میسر آجائے اور جہاں میسر آجائے اسی پر قناعت کر لیا کرتے تھے، تاکہ ہر وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے صادر شدہ زیادہ سے زیادہ اقوال وافعال واحوال کا احصار واحاطہ کر سکیں اور ان کو حفظ کر کے آپ کی ان احادیث کو دوسروں کے سامنے روایت کر سکیں۔

چنانچہ طلحہ بن عبید اللہ کہتے ہیں کہ:-

> طلحہ سے کسی شخص نے ابوہریرہ کی کثرت..... روایت حدیث کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ: ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ابوہریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چیزیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں، اور انھیں وہ باتیں معلوم ہیں جو ہمیں نہیں معلوم۔ ہم گھر بار، اہل وعیال والے لوگ تھے، ہمارے خاندان اور برادریاں تھیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف صبح شام آتے اور پھر لوٹ جاتے تھے۔ ابوہریرہؓ ایک

مسکین آدمی تھے، نہ ان کے پاس مال و زر تھا نہ اہل وعیال (ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے) ان کا ہاتھ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کے ساتھ رہتا تھا یعنی جب آپ کھانا تناول فرماتے وہ بھی کھاتے اور جہاں آپ تشریف لے جاتے وہ بھی آپ کے ساتھ جاتے تھے۔ اس لئے ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ابوہریرہ کو وہ کچھ معلوم ہے جو ہمیں نہیں معلوم ہے۔ اور انھوں نے آپ سے جو کچھ سنا ہے وہ ہم نے نہیں سنا (۱)

حق بات تو یہی ہے (جو طلحہ نے بتلائی) لیکن غضب خدا کا! استاذ ابوریہ کی عدیم المثال "علمی تحقیق" نے آخر ابوہریرۃ کی اس فضیلت کو عیب بنا کر چھوڑا۔ وہ ابوہریرہ کو ایک "ٹکڑ گدا بھکاری" کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جو در در بھیک کے ٹکڑے مانگتا پھرتا ہے (کوئی دھتکار دیتا ہے اور کوئی ٹکڑا دے دیتا ہے)۔ سچ ہے:

ارادی یا غیر ارادی طور پر جھوٹ بولنے والوں پر خدا کی لعنت (البدیہ)

اس پر مستزادیہ کہ فرماتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نصیحت بھی کی تھی کہ (لوگوں سے) کبھی کبھی ملا کرو اس سے محبت بڑھے گی" ابوریہ فرماتے ہیں:۔

اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کے گھروں پر کثرت سے نہ جایا کریں۔

یہ بھی ابوہریرہ پر ایک شرمناک بلکہ گھناؤنا الزام ہے جس کی تردید خود ابوریہ کے اپنے قول سے ہوتی ہے جس کو انھوں نے ذکر کیا ہے کہ:۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نصیحت اس وقت فرمائی تھی جب ابوہریرہ سے ایک مرتبہ آپ نے یہ سوال کیا تھا کہ: کل تم کہاں رہے؟ تو ابوہریرہ نے جواب دیا کہ میں اپنے خاندان کے لوگوں سے ملنے چلا گیا تھا۔

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۰۹، ۱۱۰ اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں اسکو صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے (فتح الباری ج، ص ۱۱)

ابوہریرہ کا یہ بیان خود ان کے منہ پر چپت رسید کر رہا ہے جو یہاں کہہ رہے ہیں کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ نصیحت لوگوں کے گھروں میں کثرت سے آمد و رفت کی وجہ سے فرمائی تھی؟

علاوہ ازیں اس حدیث کی سند بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک صحیح ثابت نہیں ہے چنانچہ حافظ سخاویؒ نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ہدیہ ناظرین ہے:۔

عقیلی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صرف طلحہ کی سند سے معروف ہے طلحہ جیسے ہی بعض ضعیف راویوں نے طلحہ کی متابعت (تائید) کی ہے۔ درحقیقت اس حدیث کو عطاء بن عبید بن عمیر نے ابوہریرہ کے اپنے قول کے طور پر یعنے موقوفاً روایت کیا ہے الخ عقیلی کا اشارہ عطاء کی روایت سے ابن حبان کی اس روایت کی طرف ہے جس کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں عطاء سے روایت کیا ہے، کہتے ہیں:۔

میں (عطا) اور عبید بن عمیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبید سے فرمایا کہ اب تمہیں وقت مل گیا کہ تم ہمارے پاس آؤ؟ اس پر انھوں نے کہا کہ اماں جان! میں (اس کے جواب میں) وہی بات کہتا ہوں جو مجھ سے پہلے کسی شخص نے کہی ہے کہ "کبھی کبھی ملاقات کیا کرو اس سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے" حضرت عائشہ نے اس پر فرمایا: "ان بے کار باتوں کو چھوڑ دو (یعنے ان حیلہ تراشیوں کو چھوڑ دو اور اپنی کوتاہی کا اقرار کرو)

اس کے بعد سخاوی فرماتے ہیں کہ:۔

یہ حدیث حضرت انس، جابر، حبیب بن مسلمہ، ابن عباس، ابن عمر، علی، معاویہ ابن حیدہ، ابوالدرداء، ابوذر، اور عائشہ نیز دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہے (رضی اللہ عنہم اجمعین) یہاں تک کہ ابن طاہر نے تو یہ کہا ہے کہ ابن عدی نے اپنی کامل میں اس کو چودہ مقامات پر (چودہ طریق سے) روایت کیا ہے اور سب کو معلول (مجروح و ناقابل اعتماد) قرار دیا ہے۔ لیکن (ان تمام طرق کے پیش نظر) مجموعی طور پر یہ حدیث قوی ہو جاتی ہے (یعنے اگرچہ ہر طریق (سند) اپنی جگہ

ضعیف ہے مگر یہ کثرت طرق ہی نفس حدیث کی صحت کو ثابت کرتی ہے۔
اگرچہ بزار نے کہا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے مگر
بزار کا یہ قول اس کے منافی نہیں ہے جو ہم نے کہا ہے (کہ یہ روایت بہت سے
ایسے ضعیف طرق (سندوں) سے ثابت ہے جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے
ہیں (۱)

بہرحال اس حدیث میں — جیسا کہ ابھی آپ سخاوی کے بیان سے معلوم کر چکے — کافی کلام (اور بحث ومباحثہ) کی گنجائش ہے۔ اور اگر بالفرض یہ حدیث ثابت بھی ہو جائے تو اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے خاص طور پر یہ بات فرمائی تھی۔ بلکہ یہ حدیث دس سے زیادہ صحابہ سے مروی ہے۔ (یعنی آپ نے عام طور پر صحابہ کو یہ نصیحت فرمائی ہے ابوہریرہ یا ان کے کسی خاص طرزِ عمل کا اس میں کوئی دخل نہیں) اور ظاہر ہے کہ ابوریہ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ یہ سارے کے سارے صحابہ ہی دوسروں پر بوجھ تھے لوگوں کے گھروں میں جھانکتے پھرتے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو یہ نصیحت فرمائی اور ادب سکھایا۔

ابوریہ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ بعض صحابہ ان سے نفرت کرنے لگے تھے یہ بھی سفید جھوٹ ہے جو عمداً گھڑا گیا ہے اور ہم انھیں چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ایک بھی قابل اعتماد صحیح روایت لا کر دکھائیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو (کہ لوگ ابوہریرۃ سے ان کی حرص وطمع کی بنا پر نفرت کرنے لگے تھے)، بلکہ معاملہ تو اس کے بالکل برعکس ہے کہ ابوہریرہ تمام صحابہ کے درمیان بیحد ہردل عزیز تھے۔ خدا نے ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی تھی، جیسا کہ بخاری وغیرہ کتب حدیث میں مروی ہے۔

(۶) اس کے بعد ابوریہ بیان کرتے ہیں کہ :-
ابوہریرہ کسی شخص سے آیت پڑھواتے جو ان کو آتی ہوتی، اور غرض اس سے ان

---

(۱) المقاصد الحسنۃ ص ۲۳۲

کی یہ ہوتی کہ وہ ابوہریرہ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائے اور کھانا کھلا دے اور جعفر بن ابی طالبؓ کے ساتھ وہ (اکثر) ایسا کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ابوہریرہ جعفر بن ابی طالب کو ابوبکر، عثمان، علی وغیرہ کبار صحابہ سے بھی افضل قرار دیتے تھے (ص ۱۵۵)

ڈاکٹر ابوریہ کے اس بیان میں بھی متعدد الزامات، جھوٹ، بہکاوے اور دھوکے موجود ہیں چنانچہ ابوریہ نے جو یہ بیان کیا ہے کہ: "ابوہریرہ کسی آدمی سے آیت پڑھوالتے حالانکہ وہ ان کو آتی ہوتی" تو اس واقعہ کی اصل عبارت صحیح بخاری میں موجود ہے اور اس لفظ اقرئنی سے ابوہریرہ کا مقصد وہ نہ ہوتا تھا جو سرسری نظر سے سننے والا سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ:۔

إني لأستقرئ الرجل أي أطلب منه القرى فيظن أني أطلب منه القرأة	میں کسی آدمی سے مہمانی کی درخواست کرتا (یعنی اس کا مہمان بننا چاہتا) اور وہ یہ سمجھتا کہ میں اسے آیت پڑھوانا چاہتا ہوں۔

حافظ ابن حجر ابوہریرہ کے کلام کی یہ شرح بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس کی وضاحت حلیۃ میں ابونعیم کی روایت سے ہوتی ہے کہ:۔

ابوہریرہ کی ملاقات ایک مرتبہ حضرت عمر سے ہوئی تو انھوں نے اُن سے کہا کہ اقرئنی (میری مہمانی کیجئے) وہ سمجھے کہ یہ لفظ قرأت سے ماخوذ ہے اور ابوہریرہ کا مطلب یہ ہے کہ مجھے پڑھا دیجئے چنانچہ وہ ان کو قرآن پڑھانے لگے اور کھانا نہیں کھلایا اس پر ابوہریرہ نے بعد میں کہا کہ یہ لفظ اُقرئ تو قری سے ماخوذ

لہ اصل بات یہ ہے کہ اس لفظ "استقرئ" کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں:۔ (۱) اطلب القراءۃ پڑھانے کی درخواست کرنا اور (۲) اطلب القری مہمانی کی درخواست کرنا۔ عام طور پر سننے والے کا ذہن پہلے معنی کی طرف جاتا کہ یہ قرآن کی آیت پڑھوانا چاہتے ہیں اور ابوہریرہ کی مراد دوسرے معنی ہوتے کہ میں آپ کا مہمان بننا چاہتا ہوں پہلے معنی قراءۃ بمعنی پڑھنا سے ماخوذ ہیں اور دوسرے معنی قری بمعنی مہمانی سے ماخوذ ہیں۔ ۱۲ مترجم

تھا اور میری مراد تو یہ تھی کہ آپ مجھے کھانا کھلا دیجیے[1])

رہی حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی مدح تو اس کی حقیقت یہ تھی کہ جب کبھی ابوہریرہ ان سے ضیافت یا آیت پڑھانے کی درخواست کرتے تو وہ ابوہریرہ کو کوئی جواب نہ دیتے اور ساتھ گھر لے جاتے۔ خود ابوہریرہ فرماتے ہیں :۔

وہ ہمیں ساتھ لے کر اپنے گھر واپس آتے اور جو کچھ بھی ان کے گھر میں ہوتا ہمیں کھلاتے حتیٰ کہ بعض اوقات (روٹی کے ساتھ سالن نہ ہوتا تو) وہ گھی کا برتن ہی ہمارے پاس اٹھا لاتے جس میں کچھ نہ ہوتا تو ہم اس کو پھاڑ لیتے اور جو کچھ اس میں ادھر ادھر گھی لگا ہوتا اس کو چاٹ لیتے (امام بخاری نے اس واقعہ کو روایت کیا ہے)

اسی وجہ سے جعفر کے بارے میں ابوہریرہ یہ کہتے ہیں کہ :۔

جعفر مسکینوں کے حق میں سب سے اچھے آدمی تھے۔

اور یہ بات صحیح بھی ہے، کیونکہ حضرت جعفرؓ کا کرم اور جود وسخا اور مساکین سے محبت مشہور تھی (سب جانتے تھے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو بھی اس کا علم تھا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آپ کی کنیت ابوالمساکین رکھی تھی[2]

کیا اس کے بعد بھی کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر کی کنیت "ابوالمساکین" رکھی تھی ان کی مدح کرنے پر ابوہریرہ ملامت کے مستحق ہیں ؟ اور یہی مفہوم ہے اس روایت کا جو ابوہریرہ سے حضرت جعفر کے حق میں مروی ہے کہ :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے شخص نے (آج تک) جوتے نہیں پہنے،

---

(۱) فتح الباری ج ۷ ص ۶۱ (۲) ایضاً ص ۶۲

ؔ حاصل یہ ہے کہ یہ اشتباہ تھا جو اس لفظ کے ذومعنی ہونے کی وجہ سے عموماً پیدا ہو جاتا تھا۔ عام طور پر لوگ ابوہریرہ کو طالب علم سمجھ کر اقرانی کے معنی مجھے پڑھا دیجیے سمجھتے اور پڑھانے بیٹھ جاتے لیکن جو حضرات ابوہریرہ کے فقر و افلاس سے واقف ہوتے اور ان کے چہرہ بشرہ پر بھی نگاہ ڈالتے وہ سمجھ جاتے کہ یہ بھوکے ہیں اور کھانا کھانا چاہتے ہیں وہ ان کو ساتھ لیجاتے اور کھانا کھلا دیتے کچھ بعید نہیں کہ ابوہریرہؓ صراحتاً سوال کرنے سے بچنے کے لئے یہ ذو معنی لفظ تعمداً استعمال کرتے ہوں ۱۲۔

سواریوں پر سوار نہیں ہوا، اور زمین پر قدم نہیں رکھا جو جعفر بن ابی طالب
سے افضل ہو (یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ اور کوئی انسان جعفر بن
ابی طالب سے افضل پیدا نہیں ہوا۔)

اس مفہوم پر اس روایت کو محمول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس بیان سے ابوہریرہ کا مقصد صرف ان لوگوں کا حال بیان کرنا ہے جو فقراء سے محبت کرتے ہوں اور مساکین پر مہربان ہوں (کہ یہی اُن کے حسب حال ہے) نہ یہ کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے درمیان مطلق فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہ میں کمالات وفضائل کے لحاظ سے سب سے افضل کون تھا) جس سے ابوہریرہ یہ بے بنیاد دعویٰ کرسکیں کہ حضرت ابوہریرہ تو جعفر بن ابی طالب کو ابوبکر، عمر اور سارے صحابہ پر فضیلت دیتے تھے؟ اور (ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ) ابوریہ کے دل میں آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی یہ عقیدت اور یہ غیرت و حمیت کا جذبہ کب سے اور کیونکر پیدا ہوگیا اور اُبھر آیا؟ جبکہ وہ خود اپنی کتاب میں صحابہ کرام پر بیشمار الزامات لگاتے چلے آئے ہیں؟ کسی پر غفلت کا، کسی پر کذب کا، کسی پر باطل کی طرف میلان و مداہنت کا؟

ہمارے اس بیان کی کہ "ابوہریرہ کا مقصد صحابہ کرام کے درمیان مطلق افضلیت کا حال بیان کرنا نہ تھا" تائید حافظ ابن حجر کے اس بیان سے ہوتی ہے جو انھوں نے حضرت جعفر کے بارے میں ابوہریرہ کا قول نقل کرنے کے بعد ذکر کیا ہے کہ:

> حضرت جعفر مساکین کے حق میں سب لوگوں سے اچھے تھے" اس مقید (مساکین کے حق میں) ایسا ابوہریرہ کی[1] وہ مطلق روایت محمول کی جائے گی جس کو عکرمہ نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے "کسی شخص نے جوتے نہیں پہنے" الخ (جو اوپر گذر چکی ہے)

---

[1] یعنی اگرچہ عکرمہ والی روایت میں مساکین کی تخصیص نہیں ہے مگر ابوہریرہ ہی کی دوسری روایت میں مساکین کی تخصیص کا ذکر موجود ہے تو اسی پر ان کے بیان کو محمول کرنا چاہیئے مسکین آدمی مسکینوں سے محبت کرنے والوں کا حال ہی بیان کرسکتا ہے۔ ۱۲

(۷) ابوہریرہ کا مضیرہ نامی کھانے کو پسند کرنا۔ اس کے ابوریہ نے ثعالبی اور . . .
بدیع الزماں ہمدانی کا وہ بیان نقل کیا ہے جو ایک قسم کے کھانے "مضیرۃ" سے متعلق ہے نیز یہ بھی کہا ہے کہ:۔

ابوہریرہ اس کھانے مضیرہ کو بہت پسند کیا کرتے تھے یہاں تک کہ ان کو شیخ المضیرہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ابوہریرۃ کے متعلق عبد الحسین شرف الدین کے بیان سے (ابوہریرہ کی لذیذ کھانوں سے محبت و حرص پر) استشہاد کیا ہے کہ: ابوہریرہ کا مقولہ ہے کہ:۔
علی علم میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں، معاویہ چکنائی (خوش خوراکی) میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، اور پہاڑ سلامتی میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے (یعنی سلامتی نہ علی کے پاس ہے نہ معاویہ کے، سلامتی چاہتے ہو تو پہاڑ پر چڑھ جاؤ، سب سے زیادہ سلامتی وہاں پر ہے) (ص ۱۵۶-۱۵۷)

نہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن) میں اور نہ اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت (احادیث) میں کہیں بھی اس جائز و حلال لذت اندوزی سے منع کیا ہے اور نہ ہی قواعد شریعت میں کہیں اس کی ممانعت آئی ہے کہ کوئی شخص حلال اور لذیذ کھانوں میں سے کسی خاص قسم کے کھانے کو پسند کرے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "کدو" پسند فرماتے تھے، بکری کے گوشت میں سے "دست" آپ کو مرغوب تھی، "ثرید"[۱] آپ کو محبوب تھا۔ حالانکہ آپ تو تمام رسولوں کے سردار تھے، عباد و زہاد میں آپ کا مقام فضل و کرم سب سے بلند تھا اور مقتداؤں میں آپ سب سے افضل مقتدا تھے (اس کے باوجود کدو، دست اور ثرید آپ کو مرغوب تھا)
اسلام میں پیٹ (کھانے پینے کی لذتوں) کی بھی اسی طرح رہبانیت (بیزاری) نہیں ہے جس طرح شرم گاہ (جنسی لذت) کی رہبانیت (بیزاری) نہیں ہے (یعنی اسلام راہبوں اور سادھوؤں کی طرح ترک لذائذ اور ترک خواہشات کی نہ تعلیم دیتا ہے نہ اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا

---

[۱] شوربے میں بھیگی ہوئی روٹی ۱۲۔

ہے) پھر ابوہریرہ پر الزام کیسا؟ اگر انھوں نے کھانوں کی مختلف اقسام میں سے کوئی مجرب اور لذیذ کھانا پسند ہی کر لیا، تو اس سے ان کے دین و دیانت، ان کی عزت و کرامت اور ان کی عدالت و ثقاہت میں کیا نقصان اور خلل واقع ہو گیا؟

رہی یہ بات کہ: ابو ہریرہ حضرت معاویہ کے پاس تو "مضیرۃ" کھاتے اور حضرت علی کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے" اور ان دونوں جلیل القدر صحابیوں کے متعلق وہ مقولہ کہا کرتے تھے جو اوپر گذر چکا ہے تو یاد رکھئے اس قسم کی من گھڑت روایتیں یا شیعوں کی کتابوں میں ملتی ہیں، یا پھر تفریح طبع کے لئے تصنیف شدہ ادب کی کتابوں میں ملتی ہیں جن میں واقعات و روایات کی صحت کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا جیسے ثعالبی اور ہمدانی کی کتابیں۔

ہمارے نزدیک تو یہ امر مسلم اور ثابت شدہ ہے کہ ابو ہریرہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے عالمگیر فتنہ و فساد میں کسی طرف بھی شریک نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تلوار کو اور اُن کی تاریخ زندگی کے صفحات کو آلودگی سے پاک رکھا، جیسا کہ اس نے اور بہت سے صحابہ کو جن میں علماء بھی ہیں اور عبّاد و زہاد بھی، اس آلودگی سے پاک رکھا ہے۔

اس بارے میں ابوہریرہ کو صرف وہی لوگ مطعون کرتے ہیں جو اپنے مذہب و مسلک میں کٹر متعصب ہیں۔ پھر ڈاکٹر ابوریہ تو علانیہ اپنے آپ کو شیعہ نہیں کہتے؟ پھر ابو ہریرہ کے خلاف ان کی یہ انتقامی کارروائی کیسی؟ اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو پھر یہ شیعہ جیسی انتقام گیری اور عیب چینی کیوں ہے؟

بات بہر حال جو کچھ بھی ہو، ابو ہریرہ جیسے جلیل القدر صحابی کو محض ان لطیفوں جیسی ہزلیہ روایات کی بناء پر جن سے مقصود صرف ادب کی مجلسوں میں نکتہ آفرینی یا ظرافت کے ذریعہ گرمی پیدا کرنی ہوتی ہے۔ مجروح کرنا اور کیڑے نکالنا اہل علم اور اہل انصاف کی شان سے قطعاً بعید ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہی "وہ بے مثل علمی و تحقیقی اسلوب" اور "انداز تحقیق" (ریسرچ) ہو جس کو پیش کرنے سے اب تک دوسرے محققین عاجز رہے ہیں۔

(۸) ابوہریرۃ پر طعن و تشنیع کا انوکھا طریقہ

اس کے بعد ابوریہ نے ابونعیم اصفہانی کی کتاب حلیۃ الاولیاء سے ابوہریرہ

کے ذمائم و عیوب کے ذیل میں یہ روایت نقل کی ہے کہ :-

> ابوہریرہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے : بُرا ہو میرے اس پیٹ کا جب میں اس کو بھرتا ہوں تو یہ مجھے مغرور و سرکش بناتا ہے اور جب اس کو بھوکا رکھتا ہوں، تو مجھے گالیاں دیتا اور کوستا ہے یا کمزور و نڈھال کر دیتا ہے (ص ۱۵۷)

بلاشبہ ابونعیم کبار محدثین میں سے ہیں لیکن انھوں نے حلیۃ الاولیاء میں صرف صحیح روایتیں درج کرنے کا التزام ہرگز نہیں کیا۔ اس میں کتنی ہی موضوع، کتنی ہی گھڑی ہوئی اور کتنی ہی ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں، اہل علم نے جن کے ضعیف یا موضوع ہونے کی نشاندہی کی ہے۔ انھیں روایتوں میں ابوہریرہ کا یہ قول بھی ہے کیونکہ اس کا راوی فرقد سبخی ہے جس نے ابوہریرہ کا زمانہ نہیں پایا (یقیناً یا وہ ازخود یہ روایت گھڑتا ہے یا درمیانی راوی کو جس نے گھڑا ہے چھوڑ دیا ہے) علاوہ ازیں وہ ثقہ بھی نہ تھا۔

بالغرض یہ اثر (قول) ابوہریرہ سے صحیح روایت سے ثابت بھی ہو، تب بھی اس میں کون سی قابل اعتراض بات ہے؟ کیا ابوہریرہ نے اپنے اس قول سے ایک ایسی حقیقت کا اظہار نہیں کیا جو ہر پیٹ کی فطرت ہے اور ہر پیٹ پر صادق آتی ہے؟ کیا یہ کھلی ہوئی حقیقت نہیں ہے کہ جب انسان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو اس کا نفس اترانے لگتا ہے اور سرکشی پر اُتر آتا ہے، اور جب بھوکا ہوتا ہے تو کمزور و نڈھال ہو جاتا ہے اور خوب کوستا ہے کیا ابوریہ کا پیٹ ایسا نہیں ہے؟ کیا ان کا خیال ہے کہ ان کا پیٹ دونوں حالتوں میں — سیری اور بھوک میں — مطمئن، خوش اور پُرسکون رہتا ہے؟

(۹) ابوہریرہ پر ایک اور نکتہ چینی

ابوریہ نے اسی کتاب حلیۃ الاولیاء سے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ :-

> ایک دفعہ ابوہریرہ سفر میں تھے، جب سب مسافر ایک جگہ اُترے، اور دسترخوان بچھایا گیا تو ابوہریرہ کے پاس پیغام بھیجا: کھانا تیار ہے، وہ نماز پڑھ رہے تھے، اُنھوں نے (سلام پھیر کر) کہہ دیا: میرا روزہ ہے۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو نے

کے قریب تھے کہ اتنے میں ابوہریرہ آدھمکے اور کھانا شروع کر دیا۔ لوگ قاصد کی طرف دیکھنے لگے، اس نے کہا کہ تم میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ خدا کی قسم انھوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ "میرا روزہ ہے"۔ ابوہریرہ نے کہا: یہ سچ کہتا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: پورے رمضان کے روزے اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے "صوم دھر" ہیں[1] میں اس مہینے کے شروع میں تین دن کے روزے رکھ چکا ہوں، لہذا اللہ کی طرف سے دی ہوئی "تخفیف" کی بنا پر (کہ نفلی روزہ رکھنے والے کو اختیار ہے چاہے روزہ رکھے چاہے افطار کرے) میں روزہ افطار بھی کر رہا ہوں، اور اس کے دس گنا اجر دینے کی بنا پر میں آج روزہ سے بھی ہوں۔

(ص ۱۵۸، بحوالہ البدایہ والنہایہ ج ۸، ص ۱۱۲)

عمر عزیز کی قسم! ابوریہ تو حضرت ابوہریرہ کے عیوب کی تلاش و تجسس میں اس ادبی ذوق اور لطافت کو بھی کھو بیٹھے جس کے تحت کسی شخص کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں اور اس کے سنجیدہ اور متین کلام میں فرق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ابوہریرہ کی ظرافت، بذلہ سنجی اور خوش طبعی میں اور ان کی "احادیث" میں فرق نہیں کر سکتے یا از راہ عناد فرق کرنا نہیں چاہتے۔ کیا اس واقعہ میں ابوہریرہ کی یہ نکتہ آفرینی اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ حضرت ابوہریرہ ایسی لطیف خوش طبعی، دل آویز بذلہ سنجی اور دقیق نکتہ چینی کے مالک تھے جس نے ان کو ہر دلعزیز اور سوسائٹی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ الحسنة بعشر امثالها ایک نیکی کا دس گنا ثواب ملتا ہے لہٰذا جس نے ہر مہینہ میں تین روزے رکھ لئے تو پورے مہینے کے روزوں کا ثواب مل گیا، اور میرا آج کا روزہ چونکہ نفلی تھا اس لئے میں نے افطار بھی کر لیا مگر ثواب مجھے آج کے روزہ کا پہلے ہی مل چکا ہے اس لئے میں مفطر بھی ہوں صائم بھی ہوں۔ اسی طرح جو شخص ہر مہینے میں تین روزے رکھتا رہا اور رمضان کے پورے روزے رکھ لئے تو گویا وہ اجر و ثواب کے لحاظ سے پورے سال روزہ دار رہا اور اسی طرح ہر سال کرتا رہا تو اجر و ثواب کے لحاظ سے صائم الدھر (دائمی روزہ دار) ہو گیا۔ ابوہریرہ کا یہی معمول تھا اس لحاظ سے بھی ابوہریرہ افطار کر لینے کے باوجود روزہ دار رہے۔

میں محبوب بنا دیا تھا۔[1]

اس واقعہ میں آخر کونسی ایسی چیز ہے جس سے ابوہریرہ کی عدالت، دیانت اور عظمت و کرامت پر حرف آتا ہے؟ آخر یہاں ابوہریرہ نے کونسی ایسی معصیت کا ارتکاب کیا تھا جس کی بنا پر ابوریہ ان پر طعن و تشنیع اور عیب چینی کر رہے ہیں؟

ابوہریرہ کا سب سے بڑا گناہ اور قصور ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ خوش طبع اور سبک روح واقع ہوئے تھے اور ان کے مزاج میں خوش طبعی بذلہ سنجی اور ظرافت تھی جو غالباً ابوریہ کی درشت فطرت اور سخت گیر مزاج کے ساتھ میل نہیں کھاتی سبحان اللہ، اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی مخلوق کو کس قدر متنوع اور گوناگوں بنایا ہے۔ کجا ابوہریرہ کجا ابوریہ۔

یہ تو ایک بات ہوئی باقی امام احمد نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ بالکل ایسا ہی واقعہ حضرت ابوذر کو بھی پیش آیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے[2] کہ اس واقعہ کی اطلاع پا کر کہیں ابوریہ حضرت ابوذر پر بھی برس پڑیں اور اُن کی بھی ایسی ہی گالیوں سے تواضع نہ کریں جیسی انھوں نے ابوہریرہ کی تواضع کی ہے۔

(۱۰) ایک اور سنئے | اس کے بعد ابوریہ نے ثعالبی کی کتاب خاص الخاص سے

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے محسوس کیا کہ دسترخوان بچھ چکا ہے اور مجھے نماز سے فارغ ہونے میں دیر لگے گی بلاوجہ لوگوں کو میرا انتظار کرنا پڑے گا اس لئے کوئی بات بنانی چاہیئے کہ لوگ میرا انتظار بھی نہ کریں بات بھی سچی ہو، تاکہ جھوٹ بولنا نہ پڑے اس لئے اُنھوں نے بطور توریہ کہہ دیا کہ میرا روزہ ہے اور جب نماز سے فارغ ہو کر دسترخوان پر بیٹھے اور لوگوں نے خادم کو گھورنا شروع کیا تو اس روزہ کی حقیقت بتلادی۔ اس نکتہ چینی کے ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں بھی بیان ہوگئیں۔ سبحان اللہ یک کرشمہ دو کار۔ ایک تیر سے دو شکار۔ ۱۲

[2] یہ اندیشہ بے محل ہے اس لئے کہ ابوہریرہ سے تو ۵۳۷۴ حدیثیں مروی ہیں اور ابوذر سے تو لے دے کے ۲۸۱ حدیثیں مروی ہیں ابوذر کو گالیاں دینے میں اتنا فائدہ نہیں جتنا ابوہریرہ کو گالیاں دینے میں ہے۔ ابوریہ اور ان کے پیر و مرشد تو در حقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے دشمن ہیں۔ اگر ابوہریرہ اتنے بڑے راویۃ الحدیث نہ ہوتے تو اُن کو اور دوسرے صحابیوں کی طرح ابوہریرہ میں بھی کیڑے نظر نہ آتے۔ العیاذ باللہ۔ ۱۲

ابوہریرہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :-

میں سندروٹی کی خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو نہیں سونگھی اور کوئی سوار اس مکھن سے بہتر نہیں دیکھا جو کھجور کے اوپر سوار ہو (لگا ہوا ہو)

ہم فرض کرتے ہیں کہ ثعالبی ہی اس روایت میں حجت اور لائق اعتماد ہیں اور یہ بھی فرض کرتے ہیں کہ انھوں نے اس روایت کو ایسی صحیح سند سے نقل کیا ہے جو ابو ہریرہ تک پہنچتی ہے، تب بھی اس میں کونسی بات ہے جو ابوہریرہ کی عدالت و ثقاہت کے لئے موجب جرح ہے؟ اس میں کونسی ایسی عیب کی بات ہے جو اہل عقل و ارباب فضل کی نظروں میں ابوہریرہ کی قدر و منزلت کو گراتی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ یہ فقرہ بھی ابوہریرہ کی بذلہ سنجی، سنجیدہ، ظرافت، لطیف خوش طبعی اور ادبی ذوق کا شاہکار ہے۔ جس کے وہ عادی تھے۔ عمر عزیز کی قسم ایسا تو اگر کسی انسان کی زبان سے — خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان ہو — یہ فقرہ سنوں تو میں اس کے ادبی ذوق اور بذلہ سنجی کی بیساختہ داد دوں اور فرط مسرت سے جھومنے لگوں، تو جناب شیخ ابوریہ صاحب! سن لیجئے اگر خدا اپنے فضل و کرم سے کسی انسان کو سبک روحی، شیریں بیانی، حسین نکتہ آفرینی کی دولت سے نوازدے، تو اس پر بجز کور ذوق، درشت مزاج لوگوں کے اور کوئی خوش مذاق انسان ناک بھوں نہیں چڑھا سکتا۔

(۱۱) اس کے بعد ابوریہ سعجدی کی جرح و تنقید ابوہریرہ کے حق میں، اسی مذکورۃ الصدر حدیث کی بنا پر جو ابوہریرہ کی طرف منسوب ہے یعنی زر غبا تزدد حبًا نقل کرتے ہیں۔ ہم اس حدیث پر اس سے قبل سیر حاصل بحث کر چکے ہیں اور وہاں آپ کو اس کی تردید بھی ملے گی۔ اور سعجدی اور ان جیسے لوگ ہوتے کون ہیں جن کے اقوال اور تنقید کو ابوہریرہ کے خلاف بطور استشہاد و استدلال پیش کیا جائے؟ علم جرح و تعدیل میں ان کی حیثیت کیا ہے؟ انھیں کون پوچھتا ہے؟

ہفتم: ابوہریرہ کی خوش طبعی اور زیادہ گوئی

بیہودہ گوئی ابوریہ کا دعویٰ ہے کہ: مورخین کا اس پر اجماع ہے کہ ابوہریرہ بڑے ہی دل لگی باز اور بیہودہ گو آدمی تھے۔ اس کے بعد خود ہی ھذار کے معنی بیہودہ، بیکار، ردی اور دراز کلام بتلاتے ہیں۔

ابو ریہ کا یہ دعویٰ کہ اس پر اجماع ہے کہ ابوہریرہ بڑے بیہودہ گو آدمی تھے یہ تو خدا پر، ابوہریرۃ پر، مورخین اور تاریخ پر کھلی ہوئی بہتان تراشی ہے یقیناً کسی ایک ایک شخص نے بھی ابوھریرۃ کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ وہ بیہودہ گو آدمی تھے۔ ہم استاذ ابو ریہ کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اس دعوے کے ثبوت میں کوئی ایک ہی صحیح روایت لا کر دکھائیں۔

ابو ریہ کا یہ دعویٰ کہ: "مہراس" (پانی کا بڑا برتن پتھر کی بڑی ٹب) کے واقعہ میں حضرت عائشہؓ نے ابوہریرۃ کو "بیہودہ گو کہا ہے" تو (یہ تو بالکل ہی سفید جھوٹ ہے) اس پر تو ہم استاذ احمد امین مصری مرحوم پر تنقید کے ضمن میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت عائشہ کا مہراس کے واقعہ میں ابوہریرہ کو بیہودہ گو کہنا تو درکنار ابوہریرۃ پر تردید بھی حضرت عائشہؓ نے نہیں کی بلکہ جس نے اس واقعہ میں ابوہریرہ پر تنقید کی ہے وہ توقین الشجعی ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے ہیں اس تنقیح کے باوجود قین کی زبان سے بھی یہ نہیں نکلا کہ ابوہریرہ بیہودہ گو تھے۔

اور اگر بفرض محال حضرت عائشہ سے یہ روایت صحیح ثابت بھی ہو جائے۔ جس کا ہم چیلنج دے چکے ہیں۔ تو یہ تو ایک گواہ ہوا یعنی وہ تنہا اس کی مدعی ہوئیں اور ایک گواہ سے دعویٰ ثابت نہیں ہوتا) ایسی صورت میں ابو ریہ یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ تمام مورخین کا ابوہریرہ کے بیہودہ گو ہونے پر اجماع ہے اور کیا حضرت عائشہ کا شمار مورخین میں ہوتا ہے؟ اور کیا ان کی اکیلی ذات کو "جمہور مورخین" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

اب آپ ہی بتلایئے جناب ابو ریہ (کہ آپ کو کیا کہا جائے) درآں حالیکہ آپ نے خود اپنی کتاب میں یہ کہا ہے کہ: "جھوٹوں پر خدا کی لعنت! چاہے دانستہ جھوٹ بولیں یا نادانستہ"۔

یہ تو ایک بات ہوئی باقی ہماری طرف سے یہ چیلنج اپنی جگہ پر قائم رہے گا کہ آپ کسی بھی ایک ایسے صحابی، تابعی یا ثقہ مورخ کا نام بتائیں جس نے ابوہریرہ کو بیہودہ گو کہا ہو ورنہ پھر آپ ہی کا شمار ان جھوٹوں میں ہوگا جو (جھوٹے بول بول کر) لوگوں کی عقلوں کے ساتھ کھیلتے اور ان کی توہین کرتے ہیں۔

ظرافت اور خوش طبعی

رہی ابوہریرۃ کی خوش طبعی اور ظرافت تو یہ تو ان کی بہت مشہور صفت ہے یہی تو ابوہریرہ کی وہ خداداد خصلت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ابوہریرہ کو خاص طور پر نوازا اور اسی کے ذریعہ ان کو ہر دلعزیز بنایا تھا۔

خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی خدا کے دین میں یقیناً کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں ہے اگر یہ بات ہوتی تو (اس کے بالمقابل) گراں جانی اور درشت مزاجی اسلام میں پسندیدہ خصلتیں شمار ہوتیں دراں حالیکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کر کے بطور امتنان ارشاد فرمایا ہے:

> اگر تم درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ (عرب) لوگ تمہارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

شرفا کے یہاں بھی ظرافت اور شگفتہ مزاجی کبھی عیب نہیں سمجھی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے صحابہ سے مزاح فرمایا کرتے تھے اور صحابہ آپ سے بھی اور آپس میں بھی مزاح کی باتیں کیا کرتے تھے چنانچہ صحابہ کرام کی جماعت میں بعض لوگ تو خاص طور پر شریعت اور اخلاق کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے پاکیزہ مزاح اور ظرافت وخوش طبعی کے لئے مشہور تھے ابوہریرہ بھی انہی مزاح پسند اور خوش طبع لوگوں میں سے ایک تھے۔

مروان کی نیابت میں اپنی مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں حضرت ابوہریرۃ گدھے پر سوار ہوتے اور کہتے جاتے: (ہٹو، بچو) امیر کے لئے راستہ چھوڑ دو" کیسا شیریں مزاح اور ظرافت وخوش طبعی ہے۔

کاندھے پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے بازار میں داخل ہوتے اور کہتے: لوگوں امیر کے لئے راستہ چھوڑ دو" اس تواضع اور انکساری میں بھی کس قدر مرعوب کن عظمت کا مظاہرہ ہے سبحان اللہ۔ مگر کینہ پرور حاسدوں کی آنکھوں پر بھی کس قدر عجیب پردے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ عظمت وتواضع کے ان ملے جلے مظاہر کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔

حضرت ابوہریرہ کو کھانے پر بلایا جاتا تو وہ کہتے ہیں روزہ دار ہوں اور جب لوگ کھانا

شروع کردیتے تو ان کے ساتھ کھانا کھانے لگتے اور کہتے جاتے: میں روزہ سے ہوں اللہ تعالیٰ کے دس گنا ثواب عطا کرنے کے ضابطہ کے تحت اور بے روزہ ہوں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی تخفیف (آسانی) کے تحت" سبحان اللہ کیا ہی لذیذ، شیریں اور پر لطف ہے یہ خوش طبعی اور دل لگی اور ماشاء اللہ کتنی حلاوت سے بھرپور ہے یہ کریم، عالی ظرف اور خوش طبع شخصیت۔

مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں حضرت ابوہریرہؓ کسی مہمان کو رات کے کھانے پر بلاتے اور اس سے کہتے: "دیکھو گوشت والی ہڈیاں امیر کے لئے چھوڑ دینا" (اس ایہام سے مہمان کو یہ تاثر دینا منظور ہوتا کہ آپ اس کے سامنے گوشت پیش کریں گے تو وہ مہمان گوشت کا منتظر رہتا) اور کھانا سامنے آتا تو وہ زیتون کے تیل سے بنا ہوا "ثرید" ہوتا۔

ایک نوجوان حضرت ابوہریرہ کے پاس آتا ہے اور آپ سے مسئلہ دریافت کرتا ہے کہ میں نے صبح روزہ رکھا تھا لیکن اتفاق سے میں اپنے باپ کے پاس گیا تو انھوں نے روٹی اور گوشت میرے سامنے رکھ دیا، میں نے بھولے سے وہ کھالیا" ابوہریرہ جواب دیتے ہیں: "یہ کھانا خود اللہ نے تمہیں کھلایا ہے تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں" وہ نوجوان اس کے بعد فوراً کہتا ہے: "پھر میں اپنے ایک رشتہ دار کے گھر گیا تو وہاں میرے سامنے ایک اونٹنی کا تازہ دودھ لایا گیا اور میں نے بھولے سے وہ دودھ بھی پی لیا" تو ابوہریرہؓ جواب دیتے ہیں: "اس میں بھی تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا" اس کے بعد وہ نوجوان کہتا ہے "پھر میں سو گیا اور جب سو کر اٹھا تو میں نے بھولے سے (خوب ڈٹ کر) پانی بھی پیا

لہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ضابطہ مقرر کیا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ملتا ہے اس ضابطہ کے تحت جو مسلمان ہر مہینے "ایام بیض" کے یعنی چاند کی ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ تاریخ کے تین روزے رکھے تو اس کو پورے مہینہ کے روزوں کا ثواب ملتا ہے اور اس لحاظ سے وہ پورے مہینے روزہ دار شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا ان تین دنوں کے علاوہ باقی دنوں میں ایسا شخص روزہ دار بھی ہوتا ہے اور بے روزہ بھی ــ یہی اللہ کی عطا کردہ سہولت ہے ۱۲

اور بیوی سے صحبت بھی کرلی تو یہ سنکر شیخ ابوہریرہ جن کے مزاج میں فطرتاً ظرافت اور شگفتگی رچی ہوئی تھی فرماتے ہیں: بھتیجے: سچی بات یہ ہے کہ تمہیں روزے رکھنے کی عادت نہیں ہے"

دنیا میں ایسا کون انسان ہوگا جو اس قسم کی ظرافت وخوش طبعی کو عیب سمجھے سوائے اس شخص کے جو خود ہی اعلیٰ درجہ کا درشت مزاج، سخت گیر اور گراں جاں ہو۔

یہ ہے ابوہریرہ کی وہ فطری شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی جس پر تمام مورخین کا اجماع ہے جیسا کہ خود ابوریہ کا بیان ہے ہاں وہ ایک چیز چھوڑ گئے جس میں انھوں نے. تمام صحابہ، تابعین اور مورخین سے خلاف کیا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح ابوہریرہ کی ظرافت وخوش طبعی پر ان سب کا اجماع ہے اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ ابوہریرہ اپنی اس ظرافت وخوش مزاجی کے ساتھ ہی ساتھ سچائی، قوت، حافظہ، دیانت وامانت، عبادت وزہد اور اعمال حسنہ کے اندر بھی بہت بلند مقام کے مالک تھے (۱) جیسا کہ ابن کثیر نے تصریح کی ہے۔ ابن کثیر ہی نے ابوہریرۃ کی ظرافت وخوش طبعی کے لطیفے اور چٹکلے تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں پھر ابوریہ نے ابوہریرہ کی ان صفات فاضلہ کے بارے میں مورخین کے اجماع کی کیوں مخالفت کی ہے جبکہ وہ اس دوسری خصلت ظرافت وخوش طبعی پر انکا اجماع نقل کر رہے ہیں کیا ابوریہ چاہتے ہیں کہ اللہ جل مجدہ کا اس فرمان کا مصداق بنیں۔

ومن يشاقق الرسول من	اور جو شخص رسول سے مخالفت کرے گا اس کے
بعد ما تبين له الهدى	بعد کہ اس پر ہدایت واضح ہوچکی اور مسلمانوں
ويتبع غير سبيل المؤمنين	کے راستہ کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرے
نوله ما تولى ونصله	گا ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے
جهنم وساءت مصيرا	گا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور جہنم
	بہت برا ٹھکانا ہے۔

علاوہ ازیں امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں بکر بن عبداللہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ (خالی اوقات میں)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج۸ ص ۱۱۔

تربوز (فٹ بول کی طرح) ایک دوسرے کی طرف پھینکا کرتے (اور کھیلا کرتے) تھے (۱)
لیکن جب کام کا وقت ہوتا تو وہی اول درجہ کے (سنجیدہ) مرد ہوتے تھے۔

بجاں من احضرت ابوہریرۃ کا بھی یہی مقام تھا اگر کہیں ابوریہ کسی روایت میں یہ دیکھ
پاتے کہ ابوہریرہ بعض لوگوں اور نوجوانوں کے ساتھ تربوز پھینک پھینک کر کھیلا
کرتے تھے تب تو "پیکر حلم ووقار" استاذ ابوریہ اس ظریف الطبع اور خوش مزاج ابوہریرہؓ
(اور ابوریہ کے الفاظ میں) "پرلے درجہ کے بیہودہ گو" ابوھریرہ کے بارے میں کیا
کچھ فرماتے۔

امام بخاریؒ نے اپنی اسی کتاب الادب المفرد میں عبدالرحمن کی روایت سے
نقل کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مردہ دل لوگ نہ تھے وہ اپنی
مجلسوں میں اشعار سنتے سناتے، دور جاہلیت کے واقعات اور قصے بیان کیا کرتے،
لیکن جہاں اُن میں سے کسی کے سامنے اللہ کے کسی حکم کا معاملہ آتا (اور اس کی توہین ہوتی)
تو (شدت غیظ وغضب سے) اس کی آنکھوں کی پتلیاں اس طرح گھومنے (اور گھیرنے) لگتیں
جیسے وہ پاگل ہو گیا (۲)

امام بخاریؒ نے ہی الادب المفرد میں عبدالرحمن بن زیاد بن انعم الافریقی سے روایت
کیا ہے کہ میرے والد نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم (ایک مرتبہ) حضرت معاویہؓ کے عہد
خلافت میں جہاد کے لئے بحری سفر کر رہے تھے تو ہمارا جہاز حضرت ابوایوب انصاریؓ کے
جہاز کے ساتھ جا ملا جب ہمارا دن کا کھانا آیا تو ہم نے ابوایوب کو بلوایا وہ ہمارے
پاس آئے اور فرمایا: تم نے تو مجھے (کھانے پر) بلایا ہے اور میں روزے سے
ہوں لیکن تمہاری دعوت کو قبول کرنا میرے لئے ناگزیر تھا اس لئے کہ میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک مسلمان کے دوسرے
مسلمان بھائی پر چھ حق واجب ہیں اگر ان میں سے ایک کو بھی چھوڑا تو حقیقت میں اس

---

(۱) البدایہ ص ۷۷ (۲) ایضاً ص ۱۴۶

نے اپنے بھائی کے ایک واجب حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کی (۱) جب اس سے ملے تو سلام کرے (۲) جب وہ اس کی دعوت کرے تو اس کو قبول کرے (۳) جب اسے چھینک آئے تو یرحمك الله کہے (۴) جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے (۵) جب اس کا انتقال ہو تو اس کے جنازے میں شرکت کرے (۶) اور جب اس سے نصیحت کرنے کی درخواست کرے تو اس کو (حسب حال) نصیحت کرے۔

راوی کہتے ہیں: ہمارے ساتھ ایک بڑا ہی ظریف شخص بھی تھا جو ایک ایسے آدمی سے جو ہمارے کھانے میں شریک ہوا کرتا تو کہا کرتا: جزاك الله خيرا وبرا (خدا تجھے جزائے خیر اور اچھے کام کرنے — کھلانے — کی توفیق دے) جب اس ظریف شخص نے بار بار یہ جملہ کہا تو وہ بڑا ناراض ہوا (اور اس کو برا بھلا کہا) تو اس ظریف شخص نے حضرت ابوایوب انصاری سے دریافت کیا، آپ کی کیا رائے ہے ایک ایسے شخص کے بارے میں کہ جب میں اس کو جزاك الله خيرا وبرا کہتا ہوں تو وہ ناراض ہوتا ہے اور مجھے برا بھلا کہتا ہے" حضرت ابوایوب نے فرمایا: ہم تو یہ کہا کرتے تھے کہ خیر سے جس شخص کی اصلاح نہ ہو، شر اس کو ٹھیک کر دیتا ہے۔ اس لئے تم اس جملہ کو بدل دیا کرو اور اس کا الٹا کہا کرو، چنانچہ جب وہ شخص (کھانے پر) اس ظریف کے سامنے آیا تو اس نے کہا: جزاك الله شرا وعرا (خدا تجھے بدی اور برائی کی توفیق دے) تو وہ شخص بے ساختہ ہنس پڑا اور خوش ہو گیا اور کہا: تم دل لگی اور مذاق سے باز نہیں آؤ گے؟ اس نے جواب دیا: خدا ابوایوب کو جزائے خیر دے (انھوں نے بڑا اچھا علاج تبلایا)

یہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے شگفتہ اخلاق تو اب جو شخص ابوہریرہ کی ظرافت، خوش طبعی پر اعتراض کرتا ہے وہ درحقیقت دین کے ایک مباح امر (شگفتہ مزاجی) پر نکتہ چینی کرتا ہے اور شرفا کی نظروں میں پسندیدہ خصلت پر اعتراض کرتا ہے۔

ہشتم: لوگوں کا ابوہریرہ کا مذاق اڑانا:

استاذ ابوریہ ص ۱۶۱ پر لکھتے ہیں:

لوگ ابوہریرہ کی روایتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ ان روایتوں

میں طرح طرح کی انوکھی باتیں مذکور ہوتی ہیں اور ابوہریرہ کثرت سے ایسی ہی حدیثیں روایت کرتے ہیں چنانچہ ابورافع سے روایت ہے کہ قبیلۂ قریش کا ایک آدمی ابوہریرہ کے پاس نہایت قیمتی جوڑا (لباس) پہنے اتراتا ہوا آیا اور کہا : اے ابوہریرۃ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بہت بیان کیا کرتے ہو کیا تم نے میرے اس جوڑے (لباس) کے بارے میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سُنی ہے ؟ حضرت ابوہریرہ نے جواب دیا : ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنا ہے کہ تم سے پہلی اُمتوں میں کا ایک شخص گراں بہا جوڑا (لباس) پہن کر اتراتا ہوا چل رہا تھا کہ اچانک خدا نے اس کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک اسی طرح زمین میں دھنستا رہے گا۔ اب بخدا مجھے نہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری ہی قوم (قریش) یا تمہارے ہی کنبہ کا کوئی فرد ہو ؟

استاذ ابوریہ نے اس روایت کو ابن کثیر کی طرف منسوب کیا ہے اس کے بعد لکھتے ہیں

اس شخص کے سوال سے مترشح ہوتا ہے کہ اس شخص کا مقصد ابوہریرہ سے کچھ دریافت کرنا نہ تھا بلکہ ان کا مذاق اُڑانا مقصود تھا۔ اس لئے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ " تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یاد ہیں بلکہ اس نے یہ کہا کہ " تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بہت کثرت سے بیان کیا کرتے ہو" اس کا انداز بیان یہی بتاتا ہے کہ اس کا مقصد ابوہریرۃ کا مذاق اُڑانا اور ان کی تضحیک و توہین کرنا تھا۔

یہ ابوریہ کا بیان ہے اس میں چند امور قابل غور ہیں۔

اول : سائل صحابہ میں سے یقیناً نہ تھا اور نہ ان تابعین میں سے تھا جنہوں نے شریعت اور اس کے آداب صحابہ سے سیکھے ہیں بلکہ وہ یقیناً قریش کا کوئی آوارہ مزاج بھکڑ باز نوجوان تھا اس قسم کے نوجوان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ابوہریرہ کی قدر و منزلت کو جانتا ہو یا

ابوہریرہ کے علم وفضل کا صحیح اندازہ اس کی سوقیانہ باتوں سے لگایا جائے۔

دوم: وہ ایک آوارہ مزاج، عیش پسند اور مغرور ومتکبر نوجوان تھا بیش بہا لباس پہن کر اترا رہا تھا اس کی اس عیش پسندی اور خوشحالی و دولت مندی کا ہی یہ تقاضا تھا کہ اُس نے ابوہریرہ سے یہ سوال کیا کہ: میرے اس شاندار لباس کے متعلق بھی آپ کو کوئی حدیث یاد ہے؟ چنانچہ اس کے جواب میں حضرت ابوہریرہ نے (اس کے حسب حال) یہ حدیث سُنادی کہ: ایک (مغرور ومتکبر) شخص بیش قیمت لباس پہن کر (اپنے اوپر) اتراتا ہوا چل رہا تھا کہ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین و دھنسا دیا الخ اور ایک روایت⁽¹⁾ میں تو یہ بھی آیا ہے کہ اس اوباش ومتکبر نوجوان نے (اس پر) ابوہریرۃ سے کہا کہ: کیا وہ نوجوان اس طرح چل رہا تھا اور اس کے بعد اتنے زور سے اپنے ہاتوں کو جھٹکا دیا کہ ٹھوکر کھا کر اتنے زور سے زمین پر گرا کہ قریب تھا کہ ہاتھ پاؤں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں تو اس پر حضرت ابوہریرۃ نے کہا: ناک اور مُنہ کے بل گر (اور یہ آیت پڑھی) انا کفیناك المستهزئین (ہم آپ کا مذاق اُڑاتے والوں (کو سزا دینے) کے لئے کافی ہیں)

لہذا یہ تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ابوہریرہ کی عزت افزائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ کے ہاتھ اس آوارہ مزاج، مغرور، متکبر اور گستاخ نوجوان سے ابوہریرہ کی توہین وتضحیک کا بدلہ لے لیا۔

سوم: کسی گستاخ اور آوارہ مزاج بدکردار نوجوان کا حاملین حدیث میں سے کسی بزرگ کا مذاق اُڑانا یہ تو ایک ایسا واقعہ ہے جو ہر زمانہ میں پیش آیا ہے اور آتا رہے گا، انبیاء کرام، مصلحین اُمت اور علماء دین کے ساتھ تو ہمیشہ ایسا ہوا ہے جیسا کہ قرآن مجید نے ایسے متعدد واقعات کا ذکر کیا ہے تو کیا ان جیسے کمینوں احمقوں اور گستاخوں کا انبیاء کرام کا مذاق اُڑانا ان کی ذلت وحقارت کی دلیل بن سکتا ہے؟ یہ حضرات تو اس سے بہت پاک وصاف ہیں

---

(۱) یہ روایت دارمی نے اپنی سنن میں نقل کی ہے ج ۱ ص ۱۱۶ مطبوعہ دمشق

چہارم: یہ واقعہ ایک شخصی اور اپنی قسم کا تنہا واقعہ ہے جس کی کوئی نظیر ابوریہ کو نہیں مل سکی اگر ان کو کوئی اور ایسی نظیر مل جاتی تو اس کے ثابت کرنے میں وہ کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے لہٰذا مدعیٔ تحقیق ابوریہ کے لئے یہ کہاں سے جائز ہو گیا کہ وہ اس اکیلے واقعہ کو عمومی رنگ دے کر اس طرح بیان کریں کہ: اور بے شک لوگ ابوہریرہؓ کا مذاق اُڑایا کرتے تھے الخ۔ کانوا (کرتے تھے) کا لفظ تو ایک ایسے فعل کو ظاہر کرتا ہے جو کسی جماعت میں عام ہو اور بار بار کیا جاتا ہو اس لفظ کا استعمال تو ایسے کام کے سوا ہوتا ہی نہیں، تو کیا یہ واقعہ جو ایک بدکردار و بد اطوار آوارہ مزاج نوجوان سے رونما ہوا یہ بتلاتا ہے کہ صحابہ اور تابعین جو ابوہریرہ کے عہد میں دین اور حدیث کے حاملین تھے وہ سب ابوہریرہ اور ان کی روایات کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

اس موقعہ پر ابوریہ کو پھر ایک مرتبہ ایک ایسے نفس پرست شخص کی حیثیت سے رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا جو اپنی خواہش نفس کے پیچھے لگا ہوا اور اس جستجو میں ہو کہ اسے ذرا سی بھی کوئی انگلی رکھنے کی جگہ مل جائے تو وہ اس کو مدار بنا کر اپنے باطل خیال کی تائید میں پیش کر سکے۔ نہ کہ ایک ایسے محقق عالم کی حیثیت سے جو پوری غیر جانبداری اور اخلاص کے ساتھ حقیقت معلوم کرنے کی جستجو اور حق کی تلاش میں ہو

بیشک انسان کو اختیار ہے، وہ اپنے آپ کو جس مقام پر چاہے رکھ سکتا ہے چنانچہ استاذ ابوریہ نے ـــ اپنی اس "علمی تحقیق" کے ذریعہ جس کی نظیر اس سے پہلے کسی محقق کے ہاں نہیں ملتی ـــ اپنے لئے یہ پسند کیا ہے کہ وہ جھوٹوں افترا پردازوں اور شکوک وشبہات کے سہارے اپنی کمینی اغراض کو پورا کرنے والوں کے زمرہ میں اپنے آپ کو شامل کریں۔ خدا کرے وہ اپنی مراد کو پہونچیں، رہے حضرت ابوہریرہ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بزعم خود غلط محقق عالم (ابوریہ) کے اتہامات والزامات سے پاک وصاف اور بری کر دیا جس کا دعویٰ ہے کہ اس جیسی "علمی تحقیق" اس سے پہلے کسی محقق کو نصیب نہیں ہوئی۔ سچ ہے بالکل سچ واقعی ایسی "علمی تحقیق" نہ آج تک ہوئی نہ آئندہ ہوگا

نہم! ابوہریرہ کی حدیثوں کی کثرت

پروفیسر ابوریہ نے حضرت ابوھریرۃ کی کثرت احادیث پر بھی نکتہ چینی کی ہے جن کی تعداد مسند بقی ابن مخلد میں ۵۳۷۴ بتلائی ہے حالانکہ ان تمام احادیث کی اسناد حضرت ابوہریرۃ تک، محدثین کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے۔ حضرت ابوھریرۃ کی اس کثرت احادیث پر ابوریہ کو اس لئے بھی حیرت واستعجاب ہے کہ ابوہریرہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صرف تین سال رہے ہیں۔

ہم اس سے پیشتر اس کثرتِ روایت احادیث کا سبب پوری تفصیل سے بیان کر چکے ہیں یہاں ہم ابن کثیر کے بیان کا مزید اضافہ کرتے ہیں۔ ابن کثیر نے روایت کیا ہے کہ:۔

> جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دفن کرنے کے بارے میں مروان بن الحکم کا حضرت ابوہریرہ سے جھگڑا ہوا تو اس نے مشتعل ہو کر غصہ میں ابوہریرہ سے کہا: "لوگ کہتے ہیں کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی کثرت سے حدیثیں روایت کرتے ہو حالانکہ تم تو سنہ ۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ ہی پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے ہو"۔ تو ابوھریرۃ نے جواب دیا: ہاں میں اس وقت آیا ہوں جب سنہ ۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں تشریف فرما تھے اور میری عمر اس وقت کچھ اوپر تیس سال تھی مگر اس وقت سے لے کر حضور کے وصال تک میں برابر آپ کے ساتھ رہا ہوں میں آپ کے ساتھ ساتھ آپ کی ازواج مطہرات کے گھروں میں بھی جاتا اور آپ کی خدمت کرتا اور خدا کی قسم ان دنوں میں بالکل خالی ہاتھ اور مفلس وقلاش تھا، آپ کے ہی پیچھے میں نمازیں پڑھتا، آپ کے ساتھ ہی میں نے حج کیا اور ہر غزوہ میں آپ کے ساتھ رہا، اس ہر وقتی رفاقت کی وجہ سے ہی خدا کی قسم مجھے آپ کی حدیثوں کا سب سے زیادہ علم ہے، بخدا قریش اور انصار کے بہت

سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت میں اور آپکے پاس
ہجرت کر کے آنے میں مجھ سے بہت آگے تھے مگر وہ یہ بھی جانتے اور
مانتے تھے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر وقت رہتا ہوں
اس لئے وہ خود مجھ سے آپ کی حدیثیں دریافت کیا کرتے تھے ان حضرات
میں حضرت عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم تک شامل ہیں۔ خدا
کی قسم، نہ مدینہ کی کوئی حدیث مجھ پر مخفی رہی ہے اور نہ کوئی ایسا شخص جو
اللہ اور اس کے رسول کو محبوب رکھتا ہو، مجھ پر مخفی رہا ہے اور نہ کوئی
ایسا شخص جس کا اللہ اور اس کے رسول کی نظروں میں کوئی مرتبہ و مقام
ہو اور نہ کوئی ایسا شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیق رہا ہو۔
یہ حضرت ابو بکر صدیق کی طرف اشارہ ہے جو غار ثور میں آپ کے
رفیق تھے ۔ اور تمہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے
نکال دیا تھا اور مدینہ میں رہنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ یہ مروان کے باپ
حکم بن العاص پر تعریض ہے۔ اسکے بعد ابوہریرہ نے کہا: عبدالملک کا باپ
(یعنی مروان) اس (واقعہ) کے اور اس جیسے اور واقعات کے متعلق جو چاہے
مجھ سے دریافت کرلے۔ وہ بلاشبہ میرے پاس وافر علم بے شمار معلومات کا ذخیرہ
موجود پائے گا۔ راوی کہتا ہے خدا کی قسم اس واقعہ کے بعد مروان ابوہریرۃ
سے کترانے لگا تھا اور ابوہریرۃ سے اور ان کے جواب سے ہمیشہ ڈرا کرتا تھا
ابن کثیر ہی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ :۔

ابوھریرۃ نے مروان سے کہا: میں تو اپنی رضا و رغبت اور خوشی سے
اسلام لایا ہوں اور ہجرت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ
محبت کا فخر بھی مجھے حاصل ہے اور تم جو گھر والے (مکہ کے رہنے والے) ہو
اور دعوت اسلام کے سب سے پہلے مخاطب ہو تم نے تو داعی اسلام (رسول
علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی سرزمین (مکہ) سے نکال باہر کیا ہے اور ان

کو اور ان کے ساتھیوں کو بے پناہ اذیتیں پہونچائی ہیں تم تو میرے
بھی بعد اسلام لائے ہو اور با دل ناخواستہ بدرجہ مجبوری اسلام لائے
ہو (تم میرے سامنے کیا منہ لیکر بولتے ہو) تو مروان ابو ہریرۃ سے
گفتگو کرتے (اور طعن وتشنیع) پر بہت شرمندہ ہوا اور ان سے کترانے لگا(۱)

اور اس میں تو کسی شک وشبہ گنجائش ہی نہیں کہ جس شخص نے اپنی زندگی کسی چیز (مثلاً جمع حدیث) کے لئے وقف کر دی ہو، ہر وقت اسی کی فکر میں لگا رہتا ہوا ور اسی کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہو، اس شخص کے پاس اس چیز......(احادیث) سے متعلق معلومات اور اس کا تفصیلی علم تھوڑی سی مدت میں بھی اتنا جمع ہو جائے گا جو اس شخص کے پاس نہیں ہو سکتا جو اس طرح اس چیز کے لئے فارغ نہ ہو (اور اس کے لئے اپنی زندگی وقف نہ کی ہو)۔

ہم (اپنے زمانہ میں) بعض ایسے شاگردوں کا حال اچھی طرح جانتے ہیں جو اپنے اساتذہ کے ساتھ ہمہ وقت رہتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ ان اساتذہ سے تلمذ اور رفاقت کے اعتبار سے بہت پیچھے (یعنے نو وارد) ہوتے ہیں لیکن وہ (اس ہمہ وقتی رفاقت اور شغف کی وجہ سے) اپنے اساتذہ کے حالات و واقعات سے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات کے علم کا ثقہ ماخذ و مرجع ثابت ہوتے ہیں کہ اتنی تفصیلی معلومات انہی اساتذہ کے بہت سے قدیم شاگردوں کے پاس نہیں ہوتیں، لیکن ان قدیم طلبہ کو اپنے ان بعد میں آنے والے ساتھیوں کی یاد کردہ باتوں کی صداقت میں کبھی کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا باوجود اس کے کہ یہ جدید طلبہ ان اساتذہ کی شاگردی اور رفاقت میں اُن سے بہت پیچھے ہوتے ہیں (گویا وہ اس طرح ان کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہیں) تو پھر زیر بحث موضوع (یعنے زمانہ صحبت کے کم ہونے کے باوجود احادیث کی کثرت کے بارے) میں کونسی حیرانی اور تعجب کی بات ہے؟ ہمارے نزدیک تو سب سے اہم (راوی کی) صداقت

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۰۸

ہے اور ابوہریرہ کی سچائی کے متعلق نہ صحابہ کرام کو کبھی شک ہوا اور نہ ان کے معاصرین کو اور تابعین میں سے ان کے شاگردوں کو کبھی ادنیٰ شک و شبہ ہوا۔ صحیح اور معتبر تاریخ کا فیصلہ تو یہی ہے باقی ابوریہ جو بیان کرتے ہیں کہ بعض صحابہ نے ابوہریرہ کو جھوٹا کہا ہے یا ان کو ابوہریرہ کی صداقت میں شبہ تھا" تو یہ تو ایسا رسوا کن اور سفید جھوٹ ہے جس کا ماخذ وہ کتابیں ہیں جن کو ایک طالب علم، علم و تحقیق کا علمی ماخذ" کہتے ہوئے بھی شرماتا ہے تو پھر اس شخص (ابوریہ) کو تو کیا کہا جائے جو یہ دعویٰ کرے کہ ان کتابوں میں تو شک و شبہ کی رسائی تک نہیں ہے نہ ہی ان میں کسی ضعف کی گنجائش ہے۔

لیجئے ہم ابوریہ کے باطل مزعومات کی حقیقت بے نقاب کر کے ان کا پردہ چاک کرتے ہیں (۱)

(۱) ابوریہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہ کے دُرّے مارے تھے اور فرمایا تھا کہ اے ابوہریرۃ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ حدیثیں روایت کرتے ہو کیوں نہ کہا جائے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولتے ہو"

ہم ابوریہ کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اس روایت کو کسی معتبر اور قابل احترام علمی کتاب سے ثابت کر کے دکھائیں ان افسانوی اور ادبی کتابوں کو چھوڑ کر جو صرف گرمی محفل اور تفریح طبع کی غرض سے سُنی سُنائی اور گری پڑی روایتوں سے بھری ہوتی ہیں نیز شیعہ مکتب فکر کی ان کتابوں کے بھی علاوہ ہو جو محض ابوہریرہ کے ساتھ بغض و عناد کی بنا پر بہتان باندھنے میں مشہور و معروف ہیں اس لئے کہ ان کتابوں کی ہر اس شخص کے نزدیک جس کو ذرا سا بھی علم و تحقیق سے مَس ہو قطعاً کوئی علمی قیمت نہیں۔ اگرچہ (اس کے باوجود) ڈاکٹر ابوریہ اُن کتابوں کے اکثر و بیشتر حوالے دیا کرتے ہیں (اور نام و صفحہ تک لکھا کرتے ہیں) جن سے وہ اس قسم کی روایات نقل کرتے ہیں — اگرچہ

---

(۱) اس بحث کے لکھنے کے دوران ایک طرف تو بیماری نے شدت پکڑ لی دوسری طرف ناشر کا اصرار اس بحث کو جلد از جلد پریس بھیجنے پر شدت اختیار کر رہا تھا تاکہ کتاب کی طباعت جلد مکمل ہو (باقی صفحہ ۱۰۶ پر)

ان میں بھی وہ ہمیشہ تحریف اور قطع وبرید سے کام لیتے ہیں ۔ ان کی کتاب کا ہر پڑھنے والا قطعی طور پر اس کا مشاہدہ کرسکتا ہے ۔ اس کے باوجود ابوریہ نے اس واقعہ کے متعلق کسی بھی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ (۱)

(۴) ابوریہ کا دعویٰ ہے کہ :-

> حضرت عمرؓ نے ابوہریرہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کرتے رہیں گے (اور باز نہ آئیں گے) تو وہ ان کو اپنے وطن (یمن) میں یا قردہ (مدینہ کے قریب ایک بستی) میں نظر بند کردیں گے۔ اور دعویٰ کیا ہے کہ یہ روایت ابن عساکر اور ابن کثیر نے نقل کی ہے۔

حضرت عمرؓ کا حدیثیں بیان کرنے سے منع کرنا کچھ ابوہریرہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے (وہ تو عام طور پر صحابہ کو حدیثیں بیان کرنے سے منع کیا کرتے تھے جس کی مصلحت کا بیان گذشتہ فصلوں میں آچکا ہے) لیکن ابوہریرہ کو ان کے وطن بھیجدینے کی دھمکی دینا قطعاً ثابت نہیں اس لئے کہ اس زمانہ میں تو یہ جائز ہی نہ تھا باقی حدیثیں لکھنے اور روایت کرنے کے بارے میں حضرت عمرؓ کا طریق کار اور ان کی رائے ہم اس کتاب کے شروع میں بیان کرچکے ہیں

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۰۵) اس لئے ہمیں اس بحث کو مختصر اور سرسری طور پر لکھ کر بھیجدینے کے سوا چارہ نہ تھا علاوہ ازیں ہمارا ارادہ ہے کہ ہم حضرت ابوہریرۃ کی براءۃ اور صفائی پر ایک مستقل کتاب لکھیں اور اس میں ان بہتانوں کا تارو پود بکھیریں اور ان معترضین کے اقوال نقل کرکے بتلائیں کہ وہ کس قدر لچر اور بے بنیاد ہیں اور کس قدر علمی قدروقیمت کے معیار سے گرے ہوئے ہیں انشاءاللہ

(۱) ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ اسکافی سے نقل کیا گیا ہے جیسا کہ ابن ابی الحدید نے اپنی شرح نہج البلاغہ ج ا ص ۳۶۰ میں نقل کیا ہے، نام نہاد محقق ڈاکٹر ابوریہ کے نزدیک استدلال کے لئے یہ بہت کافی ہیں ۔ محشی ۱۲

لیکن ابو ریہ کا حضرت عمر کی طرف یہ قول منسوب کرنا: میں تم کو قردہ میں نظر بند کردوں گا، یہ تو ابو ریہ کی صریح تحریف اور دسیسہ کاری ہے اس لئے کہ حافظ ابن کثیر کی اصل عبارت یہ ہے:

> حضرت عمر نے کعب احبار سے کہا: یا تو تم پہلی اُمتوں کی باتیں (اسرائیلی روایات) بیان کرنا چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں قردہ کے علاقہ میں بھیجدوں گا(۱)

لہٰذا یہ دھمکی تو حضرت عمرؓ نے کعب احبار کو دی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کے واقعات اور ان کے قصے بیان کرنا چھوڑ دیں نہ کہ ابو ہریرہ کو کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنا چھوڑ دیں۔

علاوہ ازیں حافظ ابن کثیر ابو ہریرہ کو روایت احادیث سے متعلق حضرت عمرؓ کی ممانعت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

> یہ ممانعت اس پر محمول ہے کہ حضرت عمرؓ کو کچھ روایات کے متعلق اندیشہ تھا کہ ان کو لوگ بے محل نہ استعمال کر بیٹھیں نیز یہ کہ لوگ جن حدیثوں میں رخصتیں (اور سہولتیں) بیان کی گئی ہیں انھیں پر تکیہ نہ کر بیٹھیں (اور فضائل اعمال و رفع درجات سے محروم ہو جائیں) نیز یہ کہ انسان جب کثرت سے حدیثیں بیان کرنے لگتا ہے تو بعض اوقات نا دانستہ طور پر روایت حدیث میں غلطی یا خطا کر بیٹھتا ہے اور لوگ اس راوی کی وہی غلط روایت یاد کر لیتے ہیں یا اور اسی قسم کے امکانات۔

اس کے بعد ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

> اور بعض روایات سے تو ثابت ہے کہ حضرت عمر نے ابو ہریرہ کو اس کے بعد حدیثیں روایت کرنے کی اجازت دیدی تھی" اور اس کے بعد ابن کثیر نے اس اجازت کی تائید میں کچھ اور چیزیں نقل بھی کی ہیں (۲)۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۰۸ (۲) ایضاً

یہ ہے روایت حدیث کے متعلق حضرت عمر کے موقف کی حقیقت نہ کہ وہ جو بر خود غلط محقق عالم ابوریہ نے مسخ کر کے پیش کیا ہے۔

(۳) ابوریہ کا دعویٰ ہے کہ :۔

صحابہ کرام ابوہریرہ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگاتے تھے اور ان کی تردید کیا کرتے تھے چنانچہ ان کی تردید کرنے والوں میں سر فہرست حضرت عائشہؓ کا نام ہے اور ان کی تکذیب کرنے والوں میں حضرت ابوبکر، عمر عثمان اور علی (جیسے کبار صحابہ) شامل ہیں۔

اس کے بعد ابوریہ نے دعویٰ کیا ہے کہ : اس قول کے قائل ابن قتیبہ ہیں دیکھئے تاویل مختلف الحدیث ص ۴۸۔

اس رسوا کن اور مکروہ قول کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کرنے میں بھی ابوریہ نے حسب عادت صریح جھوٹ بولا ہے۔ ابن قتیبہ تو معروف معتزلی نظام اور اس جیسے معتزلیوں کے اقوال تردید کرنے کی غرض سے نقل کرتے ہیں اور پھر شدت کے ساتھ ان کی تردید کرتے ہیں اور ان اقوال کو باطل ثابت کر کے نہایت عمدہ طریقہ پر حضرت ابوھریرہ کی طرف سے نہایت قوی دفاع کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ابوریہ ہی اکیلے ایسے شخص نہیں ہیں جن کے پاس "تاویل مختلف الحدیث" کا نسخہ ہو کہ وہ جس طرح چاہیں ابن قتیبہ پر جھوٹ بول سکیں اور جس قول کو ابن قتیبہ نے نظام سے منسوب کیا ہے اس کو خود ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر کے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھوک سکیں بلکہ کتاب چھپی ہوئی علماء کے ہاتوں میں موجود ہے۔ کیا کسی بھی ایسے شخص کو جسے ذراسی بھی علم سے نسبت ہے یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ ایسا رسوا کن جھوٹ بولے اس پر طرّہ یہ کہ اس کے باوجود دعویٰ کرے کہ "میں نے ایسا تحقیقی اور علمی کارنامہ انجام دیا ہے کہ اس سے پہلے کسی بھی شخص نے انجام نہیں دیا" حق یہ ہے کہ جھوٹ بولنے میں اور صریح عبارتوں میں مسخ وتحریف کرنے میں ابوریہ سے کوئی شخص بھی حتیٰ کہ مستشرقین بھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

ہم ابوریہ کو اور ہر اس شخص کو چیلنج کرتے ہیں جو ابوہریرہ پر الزامات لگانے کی جرأت کرتا ہے کہ وہ ہمیں کوئی بھی ایسی تاریخی تصریح دکھلائے کہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم اجمعین اور عائشہ رضی اللہ عنہا میں سے کسی نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں جھوٹ بولنے کی نسبت ابوہریرہ کی طرف کی ہو ہمیں یقین ہے کہ ان کینہ پرور کمینے حاسدوں کی گردنیں (ڈھونڈتے ڈھونڈتے) ٹوٹ جائیں گی پھر بھی انھیں اس قسم کی کوئی تصریح ہرگز نہیں مل سکے گی اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ یہ تاریخی تصریحات عیون الاخبار اور بدائع الزھور جیسی کتابوں میں ہوں اور ابن الحدید اور اسکافی جیسے راویوں یا نظام جیسے معترضین سے مروی ہوں لیکن یہ کتابیں یہ راوی اور یہ معترضین محال ہے کہ علم و تحقیق کا معیار بن سکیں۔

حضرت عائشہؓ کو ابوہریرہ کی بعض حدیثوں پر تعجب بیشک ہوا کرتا تھا کیونکہ ان کے علم میں وہ حدیثیں نہیں ہوتی تھیں اسی لئے ابوہریرہ بھی بعض اوقات حضرت عائشہؓ کو یہ جواب دے کر مطمئن کردیا کرتے تھے کہ: آپ تو گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی تھیں یا آرائش و زیبائش میں لگی رہتی تھیں اس کے برعکس میں سایہ کی طرح ہمہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا جہاں آپ جاتے میں آپ کے ساتھ جاتا اور آپ کی حدیثیں سنتا اور یاد کیا کرتا تھا (اس کے سوا میرا اور کوئی مشغلہ ہی نہ تھا) حضرت عائشہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہ ہوتا تھا کہ وہ اس کا اعتراف کریں اور فرمائیں "ایسا ہی ہوگا" یہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے (ایک جلیل القدر صحابی کا) پاس ادب تھا اور صاحب حق کے حق کا اعتراف تھا اور یہ ایک ایسی عظمت و فضیلت تھی جس سے ابوریہ اور اس کے ہم قطار لوگ قطعاً محروم رہتے ہیں۔

مگر اس (پتھر کی تراشی ہوئی ٹب) کے قضیہ میں ابوہریرۃ پر حضرت عائشہ کی نکتہ چینی کی حقیقت ہم گزشتہ صفحات میں واضح کرکے ثابت کرچکے ہیں کہ ابوہریرہ پر جس نے اعتراض کیا تھا وہ حضرت عائشہ نہ تھیں بلکہ عبداللہ بن مسعود کا ایک شاگرد تھا جس کا نام قین اشجعی ہے۔

باقی حضرت عائشہؓ نے "جو جنبی کے روزہ والی حدیث" سے متعلق ابوہریرہ کی حدیث پر اعتراض کیا تھا اور ابوہریرہؓ نے بلاتردد اعتراف کیا تھا کہ حضرت عائشہؓ کو ان مسائل کا سب سے زیادہ علم ہے جو اس وقت پیش آتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ گھر میں تشریف فرما ہوا کرتے تھے (اس لئے حضرت عائشہؓ صحیح فرماتی ہیں) تو یہ بھی حضرت ابوہریرہ کی ایک گونہ فضیلت کی دلیل ہے کہ انھوں نے برملا حق کا اعتراف کر لیا تھا۔ لیکن ابوریہ اس فضیلت (اعتراف حق) سے یکسر محروم ہیں علاوہ ازیں بعض اوقات ابوہریرہ کوئی حدیث بیان کرتے اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیتے کہ یہ حدیث میں نے ایک اور صحابی سے سُنی ہے (یہ بجائے خود ابوہریرہ کے انتہائی تثبّت اور صداقت کی دلیل ہے) اس سلسلہ میں ہم گذشتہ اوراق میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔

اور یہ کہ اس مسئلہ میں متعدد فقہاء، تابعین اور ائمہ مجتہدین حضرت عائشہ کی مخالفت اور تردید کے باوجود ابوہریرہ کی رائے سے متفق ہیں۔

(۴) استاذ ابوریہ نے حافظ ابن کثیر سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ :۔

حضرت زبیرؓ نے ابوہریرہ کی حدیثیں سُنیں تو فرمایا: "سچ بھی اور جھوٹ بھی۔

ابوریہ نے اس واقعہ کے نقل کرنے میں بھی وہی کچھ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ :۔ "اہل کتاب آسمانی کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہیں۔"

حافظ ابن کثیر نے حضرت زبیرؓ کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد یہ بھی نقل کیا ہے :۔

عروۃ نے اپنے والد زبیر سے پوچھا: ابا جان! "سچ بھی کہا اور جھوٹ بھی" اس کا کیا مطلب ہے؟ تو حضرت زبیرؓ نے فرمایا: میرے بیٹے! اس کا مطلب یہ ہے کہ ابوہریرہ نے ان احادیث کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے سُنا ہے ان میں تو مطلق شک نہیں (یہ مطلب ہے صدق کا)
لیکن ان میں سے بعض احادیث کو وہ برمحل استعمال کرتے ہیں اور بعض
کو بے محل (یہ مطلب ہے کذب کا) (۱)

یہ ہے ابن کثیر کی پوری عبارت، اب آپ ہی تبلائیے کہ کیا آپ اس عبارت کا مطلب یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت زبیرؓ ابوہریرہ کو جھوٹا کہہ رہے ہیں؟ جیسا کہ ابوریہ دعویٰ کرتے ہیں، یا وہ ابوہریرۃ کے روایت احادیث میں سچا ہونے کا اقرار کر رہے ہیں؟

رہا حضرت زبیر کا یہ فرمانا کہ وہ بعض احادیث کو بے محل استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ابوہریرۃ بعض احادیث کا مفہوم وجوب اباحت اور استحباب وغیرہ (کیفیات احکام) کے اعتبار سے جو . . . . سمجھنا چاہیئے وہ نہیں سمجھتے تھے اس سے ابوہریرۃ کی روایت حدیث کی صحت وصداقت پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا (خاص کر جب کہ وہ پہلے فقرہ میں اس کی تصریح کر چکے ہیں) جو شخص عربی کلام سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس عبارت کا ابوہریرہ کی صداقت و دیانت پر طعن سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

(۵) ابوریہ نے نقل کیا ہے کہ:۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ابوہریرۃ کے اس قول
کی تردید کی ہے کہ: جو شخص کسی میت کو غسل دے (وہ غسل کرے)
اور جو جنازہ اُٹھائے اس کو وضو کرنا چاہیئے اور اس کے بارے میں نہایت
سخت الفاظ استعمال کیئے اور پھر کہا: اے لوگو! تم یہ نہ سمجھو کہ تم اپنے
مُردوں (کو غسل دینے یا جنازہ اٹھانے) کی وجہ سے نجس ہو جاؤ گے۔

ابوریہ نے یہ روایت حافظ ابن عبدالبر کی کتاب جامع بیان العلم سے نقل کی ہے۔ اس روایت کو بھی اس طرح نقل کرنا اس شخص (ابوریہ) کی علمی بددیانتی کی پڑھنے والوں کو گمراہ کرنے اور دھوکہ دینے کی حرص کی اور حقائق کو توڑ مروڑ کر کے بیان کرنے

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۰۹

کے ناپاک جذبہ کا بیّن ثبوت اور روشن مثال ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حافظ ابن عبد البر نے اپنی مذکورہ کتاب جامع بیان العلم میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے جس کے تحت ایسے اقوال اور فتوے ذکر کئے ہیں جن میں علما نے ایک دوسرے کے اقوال اور فتووں کو غلط بتلایا ہے چنانچہ اسی فصل کے تحت ابن عبد البر نے حضرت ابوبکر صدیق کا مرتدین سے جنگ کے معاملہ میں صحابہ کی مخالفت کی تردید کرنے کا ذکر کیا ہے اسی طرح حضرت عائشہ رض کا ابن عمر کے اس قول کی تردید کا ذکر کیا ہے کہ: "گھر والوں کے رونے پیٹنے سے مردہ کو عذاب ہوتا ہے" اور اس پر حضرت عائشہ رض نے فرمایا کہ:۔ "ابو عبد الرحمٰن (ابن عمر) کو یا وہم ہو گیا ہے یا ان سے غلطی ہوئی یا وہ بھول گئے ہیں" اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عُمروں کی جو تعداد بتلائی ہے اس کی بھی حضرت عائشہ رض نے تردید کی ہے، اسی طرح عبد اللہ بن مسعود نے میراث کے ایک مسئلہ میں ابو موسیٰ ا: رسلمان بن ربیعہ کے قول (فتوے) کی تردید کی ہے اسی سلسلہ میں ابن عبد البر نے اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ ابن مسعود نے ابوہریرہ کے اس قول (فتوے) کی بھی تردید کی ہے کہ "جو شخص مردہ کو غسل دے اسے خود غسل کرنا چاہیے اور جو جنازہ اٹھائے اس کو وضو کرنا چاہیئے"

آپ دیکھتے ہیں یہاں حضرت ابوہریرہ ایک مسئلہ میں فتویٰ دے رہے ہیں اور ابن مسعود ان کے اس فتوے کی — نہ کہ ان کی کسی حدیث کی — تردید کر رہے ہیں اب آپ ہی بتلائیں کہ کسی حدیث سے متعلق ابن مسعود نے ابوہریرہ کی کہاں تکذیب کی ؟

باوجودیکہ فقہا کی ایک بڑی جماعت نے ابوہریرہ کے قول کے مطابق فتویٰ دیا ہے بعض فقہا نے واجب کہا ہے اور بعض نے مستحب [1]

---

[1] بالفاظ دیگر ابن مسعود از روئے اجتہاد ایک فقہی مسئلہ میں ابوہریرہ سے اختلاف کرتے ہیں جیسا کہ عام طور پر فقہا ایک دوسرے سے اختلاف کیا کرتے ہیں ابن عبد البر کی پیش کردہ نظائر سے بھی یہی واضح ہے اس اختلاف کا حدیث کی روایت میں تصدیق و تکذیب سے کوئی تعلق نہیں - ۱۲ - محشی

(۶) ابوریہ نے اپنی انوکھی علمی تحقیق کو یہ کہہ کر ختم کیا ہے کہ :۔

صحابہ نے ابوہریرہ پر جو تنقیدیں کی ہیں اور ان کی روایات میں جو شکوک و شبہات ظاہر کئے ہم ان سب کو یہاں بالاستیعاب بیان کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ ہماری کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔

یہ بھی کھلا ہوا جھوٹ اور صریح بہتان ہے حقیقت میں ابوہریرہ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا تھا ابوریہ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس سب کو جمع کیا اور بالاستیعاب بیان کیا ہے یہاں تک کہ ایسی کتابوں سے بھی ابوہریرۃ پر اعتراضات والزامات نقل کر ڈالے ہیں جن کی علمی قدر وقیمت بھی کچھ نہیں ہے تو وہ کونسی کسر ہے جو مؤلف نے ابوہریرہ پر طعن وتشنیع اور توہین وتنقیص میں چھوڑی ہے جس کا وہ مظاہرہ کر رہے ہے (درحقیقت یہ بھی ایک دھوکہ اور فریب ہے جو وہ قارئین کو دینا چاہتے ہیں)

تاہم اختصار کے ساتھ ہم یہاں بعض صحابہ کی اس تنقید و تردید کی وضاحت (اور اس کا سبب بیان) کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو انھوں نے ابوہریرہ پر کی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ابوہریرۃ (صرف راوی حدیث ہی نہ تھے بلکہ مفتی بھی تھے اور وہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے ظاہر الفاظ سے جو مفہوم سمجھتے تھے اسی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے، اس میں کسی قسم کی تاویل نہیں کرتے تھے، بعض صحابہ اس میں ابوہریرۃ سے اختلاف کرتے اور اسی حدیث کا مفہوم اس کے خلاف لیتے تھے جو ابوہریرۃ نے لیا ہوتا اس لئے وہ ابوہریرہ (کی رائے اور فتوے) کی تردید کرتے تھے (نہ کہ ان کی حدیث کی) صحابہ کا یہ رویہ ابوہریرہ کے ساتھ ہی خاص نہ تھا ایسے (اختلاف رائے کے) واقعات صحابہ کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف بکثرت پیش آئے ہیں، حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابوموسیٰ، عائشہ وغیرہم (رضی اللہ عنہم) کی مثالیں بکثرت موجود ہیں ان حضرات کے حالات کے مطالعہ اور تلاش وجستجو سے ایسے واقعات باسانی مل سکتے ہیں۔ اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا حافظ ابن عبدالبر نے تو اپنی کتاب جامع بیان العلم میں اس موضوع پر ایک مستقل فصل قائم کی ہے۔ اہل علم (فقہا اور ائمہ مجتہدین) آئے دن ایک دوسرے پر اس

طرح کی تنقیدیں اور اعتراضات کرتے رہے ہیں لیکن ان کی یہ تنقید ایک دوسرے کی صداقت و عدالت اور دیانت و امانت پر طعن و تشنیع اور جرح کا موجب کبھی نہیں ہوئی حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین وغیرہ میں بیان کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کا شمار ان کبار صحابہ میں تھا جو فتویٰ دیا کرتے تھے۔ بعض مصنفین نے تو ابوہریرہ کے فتووں کا ایک ضخیم مجموعہ بھی مرتب کیا ہے۔

(۷) ڈاکٹر ابوریہ نے حضرت ابوہریرہ پر بہتان تراشی و افترا پردازی کے بعد اور ابوہریرہ کی تکذیب کے بارے میں صحابہ کرام سے جھوٹی روایتیں نقل کرنے کا فرض انجام دینے کے بعد امام ابوحنیفہ رضی کی طرف توجہ فرمائی ہے اور ایک غلط روایت ان کی طرف منسوب کی ہے کہ :۔

"امام ابوحنیفہ ابوہریرۃ کی حدیثیں قبول نہیں کرتے تھے۔"

ہم پختہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی طرف اس روایت کی نسبت قطعاً صحیح نہیں ہے اس لئے کہ فقہ حنفی ــ جو امام ابوحنیفہ سے منقول ہے ــ ایسے احکام سے بھرا پڑا ہے جن کی سند (اور دلیل) صرف ابوہریرۃ کی حدیثیں ہیں۔

رہا فقہاء حنفیہ کے متعلق یہ نقل کرنا کہ "وہ ابوہریرہ کو فقیہ نہیں سمجھتے تھے" سو یہ بات ایک ایسے شخص سے منقول ہے جو حدیث اور فقہ دونوں میں ناپختہ اور خام ہے، استاذ احمد امین مرحوم کی تردید کے ذیل میں ہم یہ ثابت کرچکے ہیں کہ تمام فقہاء حنفیہ بجز عیسیٰ بن ابان اور ان کے موافقین کے سب کے سب ابوہریرۃ کے فقیہ ہونے پر متفق ہیں (۱)

(۸) ابوریہ کا ابوہریرۃ پر ایک اور حملہ فرماتے ہیں :

---

(۱) شمس الائمہ سرخسی کے یہاں اس موضوع پر مکمل و مفصل بحث موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہاء حنفیہ کی نظر میں ابوہریرہ کی بڑی عظمت و احترام ہے اور وہ سب کے سب ابوہریرہ کی عدالت و صداقت، حفظ و ضبط کا اعتراف کرتے ہیں۔ ۱۲۔

ابوہریرۃ کا۔ اسی طرح دوسرے صحابہ مثلاً حضرت انس، معاذ اور
عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا۔ جو یہ طریقہ تھا کہ وہ اصل روایت اکابر
صحابہ سے لیتے پھر اس روایت کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
کر دیتے تھے (اور واسطہ کا ذکر نہ کرتے) یہ "تدلیس" ہے۔ اور اس
کے بعد تدلیس اور مدلسین (کی مذمت) کے بارے میں علماء اصول حدیث
کے بہت سے اقوال نقل کر دیئے ہیں (گویا ابوہریرۃ اس کا مصداق ہیں)

بجان من! ابوریہ کی یہ تدلیس (دھوکہ دہی)۔ بمعنی لغوی۔ بدترین قسم کی تدلیس (دھوکہ دہی) ہے۔

(علم مصطلح حدیث کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ) ایک صحابی کا دوسرے صحابی سے روایت لینا (یعنے سننا) اور پھر اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دینا ہرگز تدلیس نہیں ہے اس کا نام تو ارسال ہے اور علماء اصول حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ مرسل صحابی قطعاً مقبول ہے کیونکہ ایک صحابی دوسرے صحابی سے ہی حدیث روایت کرتا ہے اور صحابہ سب کے سب مسلم طور پر ثقہ اور عادل ہیں باقی یہاں یہ احتمال پیدا ہی نہیں ہوتا اور نہ عقلاً معقول ہے کہ صحابی تابعی سے حدیث روایت کرے (اور اس کو واسطہ ذکر کئے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دے) اسی وجہ سے صحابی جو بھی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتا ہے اس کو محدثین نے "متصل" تسلیم کیا ہے اگرچہ وہ دوسرے صحابی سے اخذ کر کے روایت کرے۔

ایسی صورت میں ابوریہ کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ تدلیس ہے اور تدلیس (کی شناعت) اور مدلسین (کی مذمت) سے متعلق علماء حدیث کے اقوال نقل کرنا صحیح معنی میں تدلیس یعنے دھوکہ اور فریب ہے۔

---

[۱] اس لئے نہ اول تو ایسا ہوتا ہی نہیں اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو صحابی کی صداقت وعدالت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ اس تابعی کا نام ظاہر کر دے اس کی تفصیلی بحث انواع حدیث کے ذیل میں گذر چکی۔ ۱۲۔ محشی

باوجود اس کے علم اصول حدیث میں مسلم ہے کہ محض تدلیس کے ارتکاب سے راوی، عدالت اور ثقاہت کے مرتبہ سے نہیں گرتا بڑے بڑے ائمہ حدیث کا شمار "مدلسین" میں ہوا ہے تو اس لحاظ سے خود ابوریہ اپنی اس تدلیس (دھوکہ دہی سے) "علماء محققین" کے مرتبہ سے گر جاتے ہیں۔ امانت ودیانت کے لحاظ سے تو اعتماد کے مرتبہ سے گرے ہی تھے اب فہم و فراست کے اعتبار سے بھی اعتماد کے درجہ سے گر جاتے ہیں، باطل کے پجاری اسی طرح گرا کرتے ہیں اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھایا کرتے ہیں۔

اور شعبہ سے جو ابوریہ نے نقل کیا ہے وہ یقیناً طباعت میں مسخ شدہ عبارت ہے ناممکن ہے کہ وہ اصل میں صحیح ہو کسی بھی امام حدیث سے ایسا قول منقول نہیں شعبہ جیسے امام حدیث تو درکنار ایک مبتدی طالب علم بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔

(۹) ابوریہ کا دعویٰ ہے کہ:۔

ابوہریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (العیاذ باللہ) جھوٹ بولنے کی گنجائش یہ نکالی تھی کہ جب (حدیث میں جھوٹ) کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہ کرتا ہو تو ایسے جھوٹ بولنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

اور اپنے اس زعم باطل کی تائید میں ابوریہ نے ابوہریرۃ سے مروی چند مرفوع حدیثیں نقل کی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتی ہیں:

مثلاً (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی حرام کو حلال نہ کرو اور حلال کو حرام نہ کرو اور معنی صحیح ہوں تو (ایسی جھوٹی حدیث روایت کرنے میں) کوئی حرج نہیں اور مثلاً (۲) جس شخص نے کوئی ایسی حدیث بیان کی جو اللہ عز وجل کی رضا کے مطابق ہو تو (یوں سمجھو کہ) میں نے ہی اس کو کہا ہے اگرچہ (حقیقت میں) میں نے اس کو نہ کہا ہو۔

اس قسم کی بے بنیاد اور گھڑی ہوئی روایات کو ائمہ حدیث نے الگ چھانٹ دیا ہے اور اُن کے گھڑنے والوں کی یا ضعیف راویوں کی بھی نشان دہی کر دی ہے جنہوں نے ان بے اصل روایتوں کو ابوہریرہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ درحقیقت ان میں سے ایک روایت کی نسبت

بھی ابوہریرہ کی طرف صحیح نہیں، تو ابوہریرہ کا اس میں کیا قصور ہے (کہ ان کی وفات کے بعد کوئی ان کی طرف جھوٹی روایات منسوب کردے) کیا یہ بھی علمی تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) ہے کہ جب بھی کسی شخص پر کوئی جھوٹ بولا جائے تو اس جھوٹی بات کو اس شخص کی طرف منسوب کردیا جائے۔[۵]

اور تعجب کی بات تو یہ (بہتان) ہے کہ محقق ابوریہ نے اس قسم کی ایک حدیث کی نسبت ابن حزم کی طرف کی ہے کہ: ابن حزم نے اس حدیث کو بیان کیا ہے، حالانکہ ابن حزم نے تو خود کہا ہے کہ یہ حدیث گھڑی ہوئی ہے اور اس کے گھڑنے والے کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ (ہمارا سائنٹفک محقق ابن حزم پر بہتان باندھنے میں اس سے بھی نہیں ڈرتا کہ اگر کسی نے کتاب الاحکام دیکھ لی تو کیا کہے گا) ہم گزشتہ فصلوں میں اس سلسلہ میں مفصل بحث کرچکے ہیں تو اب ہم ابوریہ کی اس حرکت کو اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے حدیث سے ناواقف پڑھنے والوں کو۔ اگرچہ وہ کتنے ہی بڑے تعلیمیافتہ اور ادیب کیوں نہ ہوں۔ دھوکہ دینا اور گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۱۰) ڈاکٹر ابوریہ کا دعویٰ ہے کہ:-

> ابوہریرہ کعب احبار سے۔ جو تابعی ہیں حدیثیں سنا کرتے اور ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کردیا کرتے تھے۔

یہ ایک ایسا مجرمانہ جھوٹا دعویٰ ہے جس کی ابوریہ اپنی قیاس آرائی اور اپنی عادت اور طریق کار کے مطابق علماء کی عبارتوں میں تحریف کرنے کے سوا اور کوئی دلیل نہیں پیش کرسکتے

حقیقت یہ ہے کہ علوم حدیث کی کتابوں میں راویان حدیث کے ایک طبقہ کا ذکر آیا ہے جس کا عنوان ہے روایۃ الاکابر عن الاصاغر (بڑی عمر والوں کا کم عمر والے لوگوں سے روایت کرنا) جس کے ذیل میں بطور مثال حضرت ابوہریرہ، عبادلہ اربعہ (عبداللہ بن مسعود،

---

[۵] ورنہ حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہے: جو شخص جان بوجھ کر کوئی جھوٹی بات بیان کرتا ہے وہ بھی جھوٹ بولنے والوں میں شامل یعنی جھوٹا ہے ۱۲۔ محشی

عبداللہ بن عمر عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص) معاویہ اور انس وغیرہ رضی اللہ عنہم کے کعب احبار سے روایت کرنے کا ذکر کیا گیا ہے (کہ کعب احبار تابعی ہیں مگر یہ صحابہ ان سے روایت کرتے ہیں)

ابوریہ اس عبارت سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے کعب احبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کی ہیں حالانکہ یہ صریح جھوٹ اور انتہائی مضحکہ خیز فریب ہے کیونکہ کعب (تو تابعی ہیں انھوں) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہی نہیں تو بھلا کس کی عقل میں یہ بات آسکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی آپ کی حدیثیں ایسے شخص سے روایت کریں جس نے نہ آپ کا زمانہ پایا ہو نہ آپ کو دیکھا ہو۔ اس کا ذکر تو درحقیقت گذشتہ قوموں کے حالات و واقعات اور ان کی تاریخ (یعنی اسرائیلی روایات) کے کعب احبار اور ان جیسے دوسرے علماء اہل کتاب سے جو مسلمان ہو گئے تھے اخذ کرنے اور روایت کرنے کے سلسلہ میں آتا ہے (نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ان علماء اہل کتاب سے اخذ کرنے کے بارے میں) اور اس سلسلہ میں (یعنی اسرائیلیات کے بارے میں) بھی یہ صحیح حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "نہ اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب" لہٰذا ان اہل کتاب کی روایات — جن کو اسرائیلیات کہا جاتا ہے — محض نصیحت اور عبرت کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں نہ کہ اس طرح کہ یہ (اسرائیلی) روایات قرآن عظیم کے (اقوام ماضیہ کے) بیان کردہ حالات پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہیں ۔ یا اُن کی محافظ ہیں بلکہ قرآن مجید کے بیان کردہ حالات و واقعات ہی اصل ہیں اور یقینی طور پر فیصلہ کن اور محافظ ہیں [۱]

[۱] یعنے اقوام ماضیہ کے متعلق قرآن حکیم کے بیان کردہ واقعات وحالات ہی قطعی اور یقینی ہیں علماء اہل کتاب کی بیان کردہ اسرائیلی روایات اگر قرآن کے بیان کے مطابق ہوتی ہیں تو بطور تائید ان کو قبول کیا جاتا ہے اور اگر قرآن حکیم کے بیان کے یا دین کے بنیادی اصول کے خلاف ہوتی ہیں تو ان کی تکذیب وتردید کی جاتی ہے باقی جو اسرائیلی روایات قرآن وحدیث میں مذکور تو نہ ہوں مگر اصولِ دین کے خلاف اور منافی بھی نہ ہوں تو ان کے متعلق سکوت کیا جاتا ہے نہ تصدیق کی جاتی ہے نہ تکذیب مذکورہ حدیث اسی تیسری قسم سے متعلق ہے ۱۲. مترجم۔

ابو ریہ (اپنے افترا کی تائید میں) ابوہریرہ کے بارے میں کعب احبار کی تعریف و توصیف کا ذکر کرتے ہیں کہ :۔

> ابوہریرہ نے باوجودیکہ تورات پڑھی نہیں تورات کے اچھے عالم ہیں (ابو ریہ اس روایت سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ استاد اپنے شاگرد کی تصدیق و تائید کر رہے ہیں)

اگر ابو ریہ کی بیان کردہ یہ روایت صحیح بھی ہو تب بھی اس کا کوئی وزن نہیں کیونکہ بہت سے لوگ کتابیں پڑھے بغیر وعظ وغیرہ کی مجلسوں اور محفلوں میں واقعات سن سن کر یاد کر لیا کرتے ہیں (ایسے ہی ابوہریرۃ نے بھی علماء اہل کتاب سے سُنکر تورات کے واقعات یاد کر لئے ہوں گے)

اسی طرح ابو ریہ دور تک (اپنے افترا کی تائید میں) اپنے "علمی اور تحقیقی" دلائل پیش کرتے چلے گئے ہیں جس سے انکا مقصد یہ ہے کہ قاری کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیں کہ حضرت ابوھریرۃ کعب احبار سے روایات سُنتے تھے اور جو کچھ سُنتے تھے اس کو ـــ العیاذ باللہ ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔

اس بے بنیاد موضوع پر ابو ریہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لچر اور ہیچ در پوچ ہونے کو ایک ادنیٰ طالب علم بھی محسوس کر سکتا ہے۔

ابو ریہ کے سب سے زیادہ طُرفہ تماشا دلائل میں سے ایک دلیل یہ روایت ہے جس کو امام مسلم نے بشیر بن سعد سے نقل کیا ہے۔ بشیر کہتے ہیں :۔

> اللہ سے ڈرو اور حدیث (اخذ کرنے اور روایت کرنے) میں انتہائی احتیاط برتو اس لئے کہ بخدا ہم نے دیکھا ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ابوہریرہ کی مجلس درس میں بیٹھتے ہیں تو ابوہریرۃ رسول اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بھی بیان کرتے ہیں اور کعب احبار سے سُنے ہوئے واقعات بھی بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد درس ختم کر کے اُٹھ جاتے ہیں تو میں

حاضرین مجلس میں سے بعض لوگوں سے سُنتا ہوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کعب احبار کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور کعب احبار کی روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں (اور اس طرح اپنے شیخ ابوہریرۃ کی روایتوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں) اس لئے تم اللہ سے ڈرو اور حدیث یاد کرنے اور روایت کرنے میں انتہائی (حاضر دماغی اور) احتیاط سے کام لیا کرو۔

وہ کونسا پڑھا لکھا آدمی ہے جو عربی جانتا ہوا اور بسر کی اس مذکورہ بالا صریح عبارت کو ابوہریرہ پر موجب طعن و تشنیع قرار دے اُن پر یہ تہمت لگائے کہ خود ابوہریرۃ کعب احبار سے جو روایات سُنتے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے والے بُسر بن سعید تو دراصل حضرت ابوہریرہ کی مجلس درس کے ان شرکاء کی نااہلیت بیان کر رہے ہیں جو حضرت ابوھریرہ کی زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بھی سُنتے اور کعب احبار کی اسرائیلی روایات بھی، اور دونوں کو آپس میں خلط ملط کر دیتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کعب کی روایتوں کو منسوب کر دینے والے وہ بعض (نالائق) شاگرد ہوئے جو ابوہریرہ سے حدیثیں اور روایتیں سُنا کرتے (اور ایک کو دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کر دیا کرتے تھے) نہ کہ خود ابوہریرۃ ایسا کرتے تھے لیکن علمی تحقیق (اور سائنٹیفک ریسرچ) کے نام نہاد محقق جن کی علمی تحقیق کی نظیر بھی ان سے پہلے کہیں نہیں ملتی اس واقعہ کو اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ خود ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کرنے میں جھوٹ بولا کرتے تھے اور یہ کہ وہ کعب سے روایتیں سُنتے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

اب آپ ہی بتلائیں کہ یہ ان کی کم فہمی کا نتیجہ ہے یا بے دینی کا؟ اور خدا کے، تاریخ کے اور ہوش مند قارئین کے سامنے ڈھٹائی اور بے شرمی کا نتیجہ ہے؟ اس موضوع پر دیکھئے ابوہریرہ پر جھوٹی حدیثیں گھڑنے کے الزام سے متعلق) ابو ریہ کے مغالطوں

میں سے ایک مغالطہ وہ روایت ہے جس کو ابوریہ نے صحیح مسلم سے نقل کیا ہے کہ:۔
ابوہریرہ نے زمین وآسمان کی پیدائش کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مرفوع حدیث روایت کی ہے جس کے شروع میں ابوہریرہ کہتے ہیں:۔

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا۔

اس کے بعد ابوریہ بخاری اور ابن کثیر سے نقل کرتے ہیں کہ:۔

ابوہریرۃ نے یہ حدیث کعب احبار سے لی ہے"

یہ دلیل نقل کرنے کے بعد ابوریہ محسوس کرتے ہیں کہ گویا ان کے ہاتھ کوئی بہت بڑی چیز لگ گئی اور اُنھوں نے ان تمام مسلمانوں کو جو ابوہریرہ پر اعتماد کرتے ہیں ایک بھنور کے بعد دوسرے بھنور میں ڈال دیا (یعنے ابوہریرہ نے صرف کعب کی روایت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ منسوب کردینے کی جرأت ہی نہیں کی بلکہ اخذ بیدی کہہ کر صریح بہتان بھی باندھا)

لیکن اگر ابوریہ میں ان صریح عبارتوں کے سمجھنے کی ذراسی بھی اہلیت ہوتی اور ذرا سا بھی علم وفہم ہوتا تو وہ یقیناً جان سکتے کہ بخاری اور ابن کثیر ابوہریرہ پر جھوٹ بولنے کا حکم نہیں لگا رہے ہے اور نہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ابوہریرہ کعب کی روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردیتے ہیں ــــ بھلا ان دونوں حضرات کو اللہ تعالیٰ پر ایسی بات کہنے کی جرأت کہاں ہوسکتی ہے؟ اور خدا نہ کرے کہ وہ بے دینی کے گڑھے میں اس حد تک جاگریں جس حد تک ابوریہ پہونچے ہوئے ہیں اور ہم گزشتہ اوراق میں یہ تو بیان کر ہی چکے ہیں کہ ان دونوں مصنفین نے ابوہریرہ کی کس قدر تعریف وتوصیف کی ہے اور علم (حدیث) اور دین میں ابوہریرہ کی صداقت وعدالت، ورع وتقوٰی اور امانت ودیانت کا واضح اعتراف کیا ہے ــــ بلکہ یہاں تو یہ دونوں حضرات اُس روایت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط منسوب کرنے کا حکم لگا رہے ہیں جس کو مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے (اور اخذ بیدی کے الفاظ اس کے غلط ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہے ہیں) اور ظاہر ہے کہ یہ غلطی درحقیقت تحتانی راویوں کی ہے

ابوہریرۃ کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ بخاری کی عبارت ان کی تاریخ میں اور ابن کثیر کے الفاظ ان کی تفسیر میں اس کا بین ثبوت ہیں (جس کا جی چاہے دیکھ لے) علامہ یمانی نے اپنی کتاب الانوار الکاشفہ[1] میں تفصیل سے اس پر بحث کی ہے جس سے محققین کے سینے تو کھل جائیں گے (اور دل مطمئن ہو جائیں گے)۔ لیکن ابوریہ جیسے کینہ پرور حاسدوں کا حسد اور اندھا پن یقیناً اور بڑھ جائے گا۔

(۱۰) ابوہریرہ اور بنوامیہ کی طرفداری

اس عنوان کے تحت استاذ ابوریہ نے وہ تمام مغلظ گالیاں جمع کر ڈالی ہیں جو شیعوں نے ابوہریرہ کے بارے میں اپنی کتابوں میں لکھی ہیں اس پر طرہ یہ دعویٰ ہے کہ میں نے بڑا شاندار کارنامہ انجام دیا اور یہ کہ میں نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو اس سے پہلے کوئی نہیں انجام دے سکا اور اس طرز پر علمی تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) آج تک کسی نے نہیں کی۔

اسی لئے ابوریہ نے اپنی اس خواہش نفس (یعنے بغض ابوہریرہ) کو پورا کرنے کی غرض سے جو ان کے دل و دماغ پر مسلط ہے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ وہ ان شیعوں کی وہ تمام سب وشتم نقل کر رہے ہیں جس کا نشانہ انھوں نے بڑے بڑے صحابہ کو بنایا ہے اور ان میں سے اکثر پر تہمت لگائی ہے کہ وہ حضرت معاویہ کو خوش کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولا کرتے تھے اور اس کے علاوہ بہت سی اسی قسم کی جھوٹی تہمتیں اور مغلظ گالیاں، جن سے ایک صحیح الحس انسان شدید قسم کا تعفن محسوس کرتا ہے نقل کر ڈالی ہیں۔

ہم ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں ہم اس گندگی کو اچھالنا اور گڑے مردے اکھاڑنا گوارا نہیں کر سکتے اور جو شخص بھی اس گند کو اچھالے ہم اس کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں تخریب کار اور مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنیوالا دشمن سمجھتے ہیں ایسا شخص درحقیقت مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے اور ایسے زمانہ میں جب کہ

---

(۱) ص ۱۸۸ — ۱۹۲

اس افتراق، اختلاف اور نزاع کا موجب یعنی خلافت اور اسلامی حکومت ہی باقی نہیں رہا۔

لیکن استاذ ابوریہ اپنی کتاب کو شیعہ مکتب فکر کے حلقوں میں رواج دینے اور مقبول بنانے کی غرض سے اپنی شیعیت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں چنانچہ صحابہ و تابعین میں سے جن حضرات پر شیعہ تہمتیں لگاتے ہیں ان پر ابوریہ بھی تہمت لگاتے ہیں اور جن سے شیعہ حضرات کو بغض و عداوت ہے ان سے ابوریہ بھی بغض و عداوت کا اظہار کرتے ہیں۔

ابوریہ اپنی کتاب کو مقبول بنانے کی غرض سے جو چاہیں راستہ اختیار کریں انھیں آزادی ہے۔ مگر انھیں اپنے ذہن سے یہ خیال یقیناً نکال دینا چاہیے کہ انھوں نے کوئی ایسا انوکھا جامع مقالہ لکھا ہے جو علمی تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) کے قواعد و ضوابط پر مبنی ہے جسے ہم اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ سمجھیں کہ اس سے پہلے کسی نے اس طرز پر ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا۔

بخدا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر لگائے گئے بہتانوں اور جھوٹے الزامات کو جو تاریخ کے گورستانوں میں دفن ہو چکے ہیں از سر نو ان کو اچھالنا اور گڑے مردے اکھاڑنا اور ایسی کتابوں پر اعتماد کرنا اور مدار تحقیق بنانا جن کے مؤلف صداقت و دیانت اور صحیح روایتوں کی تلاش و جستجو کے لئے معروف نہیں ہیں یا جن کے مصنفین ابوہریرہ سے مہلک بغض و عداوت رکھنے میں شہرۂ آفاق ہیں اگر یہی ہے وہ علمی تحقیق اور یہی ہے وہ طرز تحقیق جس تک کسی بھی مصنف کو رسائی نصیب نہیں ہو سکی تو جناب ابوریہ کو ان کا یہ علم و تحقیق مبارک ہو اور ہم تو نہیں سمجھتے کہ ہمارے شریف اور دانشمند شیعہ بھائی بھی دو فریقوں میں متنازع فیہ حق کو ثابت کرنے کے لئے یا اپنے اہل سنت بھائیوں کے خلاف اپنی تائید حاصل کرنے کے لئے اس جیسے شخص کو قابل اعتماد سمجھتے ہوں گے۔ یقیناً ایک جاہل، احمق اور فریب خوردہ طرفدار اپنے کو بھی اور اپنے دوستوں کو بھی ایسی مصیبتوں اور بلاؤں میں گرفتار کر دیتا ہے جن سے خدا اپنی پناہ میں ہی رکھے اور ایسا شخص ایسا شہرا اپنے سر مول لیتا ہے کہ اچھے لوگ اس سے دور رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔

قدیم زمانہ سے روایتوں میں مشہور چلا آتا ہے : "دو رُخے منافق آدمی کی اللہ کے یہاں کوئی قدر نہیں" اور نہ ہی خردمندوں کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ اور وہ عقیدہ جس کی بنیاد پر ہم اللہ کے دین پر چل رہے ہیں وہ تو یہ ہے کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت کرتے تھے حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے فضائل میں ابوہریرہ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، مدینہ میں حضرت ابوہریرہ کا، حاکم مدینہ، مروان بن الحکم کے ساتھ اہل بیت کی حمایت میں بڑا سخت جھگڑا ہوا جب کہ مسلمان حضرت حسن کو ان کے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دفن کرنا چاہتے تھے (اور مروان آڑے آرہا تھا) اور ابوہریرۃ بھی حضرت علی اور ان کے دونوں صاحبزادوں حسن وحسین کی طرح ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے حضرت عثمان کی حمایت اور مدد کی تھی جبکہ باغیوں نے ان کے مکان کا محاصرہ کیا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ابوہریرہ حدیث کی اشاعت اور علم حدیث کی خدمت میں مصروف رہنا پسند کرتے تھے۔ حضرت علی اور معاویہ کے درمیان جو جھگڑا تھا متعدد کبار صحابہ کی طرح ابوہریرہ نے بھی اس فتنہ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان حضرات کا یہ گریز صرف اس لئے تھا کہ وہ (غیر جانبدار رہ کر) مسلمانوں کی خانہ جنگی اور خونریزی سے خود کو محفوظ رکھ سکیں اور اس اجتہاد پر مبنی تھا کہ ان کے خیال میں متحارب فریقین کے معاملہ میں غیر جانبدار رہنا خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور (اسلام کی بنا پر عائد شدہ) ذمہ داری کو پورا کرنے کے زیادہ قریب ہے (اس لئے کسی بھی فریق کا ساتھ نہ رہنا چاہیئے) یہی موقف ابوہریرہ کا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب الزامات ہیں جو ابوہریرہ پر لگائے گئے ہیں۔ دسیسہ کاری ہے افتراء پردازی ہے اور اس عصبیت کی کارفرمائی ہے جس کا محرک گذشتہ زمانہ میں تو وہ نسل پرستی (یعنے عرب دشمنی) اور غرض پرستی ہوئی تھی جس کا ذکر ہم اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں اور اس زمانہ میں اس مردہ کو زندہ کرنے کا محرک نفاق ہے، جہالت ہے اور عقیدہ کا فساد ہے۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق مختصر نوٹ

اس فصل میں حضرت ابوہریرہ کے متعلق ائمہ حدیث اور ثقہ مورخین کی صریح عبارتیں جو ہم نے

بیان کی ہیں ان سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں ۔

اول! ابوہریرہ تمام صحابہ میں سب سے زیادہ حدیثوں کے روایت کرنے والے ہوئے ہیں اور یہ کہ جب سے ابوہریرہ اسلام لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی اُسی وقت سے انھوں نے حدیثیں یاد کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے اور اُن واقعات کا علم حاصل کرنے کی جستجو میں بھی لگے رہے ہیں جو ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے پیش آچکے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے رفقاءِ صحابہ سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں معلوم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے یہاں تک کہ ابوہریرہ نے اپنے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کرلیا جو کسی اور صحابی کے پاس نہ تھا۔

اور باوجود اس کے کہ ابوہریرۃ کی بعض احادیث نے اول اول بعض ایسے صحابہ کو جو ان حدیثوں سے واقف نہ تھے ان احادیث کے بارے میں حیرت آمیز تعجب میں ڈال دیا ہے نیز ابتداء میں ابوہریرہ کے اتنی کثرت سے حدیثیں روایت کرنا بھی بعض صحابہ کی حیرت و تعجب کا سبب بنا ہے۔ لیکن بالآخر اُن سب کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ ابوہریرہ حدیث کے سب سے بڑے حافظ اور سب سے زیادہ روایت کرنے والے راوی ہیں ۔۔۔ رہی باقی خود ابوہریرۃ کی اور اُن کی احادیث کی صداقت کے بارے میں تو اُنھوں نے کبھی شک کیا ہی نہیں ۔

ہم یہاں مثال کے طور پر ایسے دو واقعے نقل کرتے ہیں جو ابوہریرہ کی بعض احادیث پر صحابہ کے حیرت اور تعجب کا اظہار کرنے کی بنا پر پیش آئے ہیں۔ اور اس سے پہلے ہم وہ جواب تو نقل کرہی چکے ہیں جو ابوہریرہ نے حضرت عائشہؓ کو دیا تھا جس سے وہ مطمئن اور راضی ہوگئی تھیں۔

(۱) ابن سعد نے طبقات (۱) میں ولید بن عبدالرحمٰن سے نقل کیا ہے کہ ؛ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی کہ ؛ جو شخص جنازہ میں شریک ہوگا اس کو ایک "قراط" ثواب ملے گا ؛ یہ سنکر حضرت ابن عمر نے کہا ؛ اے ابوہریرہ! ذرا غور کرلو، تم کیا حدیث بیان کررہے ہو، اور پھر تم تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ہی زیادہ حدیثیں روایت کرتے ہو" تو ابوہریرہ نے ابن عمر کا ہاتھ پکڑا اور اُنھیں حضرت عائشہؓ کے پاس لے گئے اور ان سے کہا : آپ ذرا ان کو بتلا دیجئے کہ اس حدیث کو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسے سُنا ہے"۔ تو حضرت عائشہؓ

(۱) ج ۷ ص ۳۶۳ مطبوعہ بیروت۔

نے ابوہریرہ کی تصدیق کی۔ اس پر ابوہریرہؓ نے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن! خدا کی قسم مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنے سے نہ تو (انصار کی طرح نخلستانوں میں) کھجور کے پودے لگانے کا مشغلہ مانع تھا اور نہ ہی (مہاجرین کی طرح) بازار میں خرید و فروخت (اور تجارت) کا مشغلہ مانع تھا (میرا تو ہمہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنے اور حدیثیں یاد کرنے کے سوا اور کوئی مشغلہ ہی نہ تھا) تو ابن عمرؓ نے اعتراف کیا اور فرمایا: اے ابوہریرۃ واقعی تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ہم میں سب سے زیادہ جانتے ہو اور تمہیں ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یاد ہیں۔

(۲) ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں (۲) ابو الیسر بن ابی عامر سے روایت کیا ہے کہ میں طلحۃ بن عبید اللہ کے پاس بیٹھا تھا کہ اچانک ایک شخص آیا اور اس نے کہا: اے ابو محمد! بخدا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا یہ یمانی (ابوہریرۃ) فی الواقع تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں جانتا ہے یا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایسی باتیں بیان کرتا ہے جو اس نے نہیں سنیں یا آپ نے نہیں فرمائیں؟ اس پر طلحہ نے جواب دیا: بخدا ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ابوہریرۃ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ باتیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں، اور اُسے بہت سی ایسی باتوں کا علم ہے جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم مالدار لوگ تھے، ہمارے اہل و عیال بھی تھے اور کنبے قبیلے بھی، ہم تو صرف صبح، شام دو وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چلے جاتے تھے۔ لیکن ابوہریرۃ ایک مسکین آدمی تھے نہ ان کے پاس مال و زر تھا نہ اہل و عیال، ان کی بسر اوقات کا مدار تو صرف اس پر تھا کہ ان کا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کے ساتھ رہتا (جہاں آپ کھانا کھاتے وہ بھی کھاتے) اور جہاں آپ جاتے وہ بھی ساتھ جاتے (اور ہمہ وقت آپ کی خدمت میں رہتے)

اس لئے ہمیں اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ ابوہریرہ کو (بہت سی) ایسی باتوں کا علم ہے جن کا ہمیں علم نہ ہو سکا اور اُنھوں نے آپ سے (بہت سی) ایسی باتیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں"

---

(۱) ج ۸ ص ۱۰۹، ۱۲

ابن کثیر کہتے ہیں: ترمذی نے بھی ایک ایسی ہی روایت نقل کی ہے۔ تو یہ دونوں واقعے جو اہل علم (محدثین) کے نزدیک قابل اعتماد اور معتبر سندوں سے منقول ہیں ان لوگوں کی زبانیں بند کر دینے کے لئے بہت کافی ہیں جو نظام کے زمانہ سے لے کر ابو ریہ کے دور تک حضرت ابو ہریرۃ پر جھوٹ بولنے کی تہمت لگاتے چلے آئے ہیں۔

دوم! حضرت ابو ہریرۃ مرتے دم تک ۔۔۔ یعنی اختلاف روایات کے مطابق ۵۸ھ یا ۵۹ھ یا ۵۷ھ تک ۔۔۔ برابر حدیثیں روایت کرتے رہے ہیں۔ اور اس وقت تک صحابہ کرام کی بڑی بھاری تعداد موجود اور بقید حیات تھی اور مسلمان (دین کے بارے میں) انتہائی بیدار تھے اور اسلامی سلطنت اپنی طاقت و عظمت میں انتہائی عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور مسلمان علماء دین اس جلیل القدر صحابی کے گرد (حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاصل کرنے کے لئے) جمع رہتے تھے اور ان میں سے ہر شخص اپنے لئے یہ باعث عزت و شرف سمجھتا تھا کہ حضرت ابو ہریرۃ سے ملاقات کرے اور ان سے علم (احادیث) حاصل کرے یہاں تک کہ اسی شرف کو حاصل کرنے کی غرض سے تابعین کے سرخیل اور تابعین کے طبقہ میں بلا اختلاف سب سے بڑے امام سعید بن المسیب نے حضرت ابو ہریرۃ کی صاحبزادی سے شادی کی اور اس رشتہ سے ابو ہریرہ کی وفات تک ان کی خدمت میں حاضر اور ہمہ وقت موجود رہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے عہد میں ہی حضرت ابو ہریرۃ سے حدیثیں اخذ کرنے والے علماء کی تعداد آٹھ سو تک پہونچ گئی ہے جیسا کہ اس سے پہلے ہم امام بخاری کی روایت سے نقل کر چکے ہیں۔ یہ ایک ایسی تعداد ہے کہ اس کے مقابلہ میں کسی بھی دوسرے صحابی سے حدیثیں اخذ کرنے والوں کی تعداد اس کے دسویں حصہ تک بھی نہیں پہونچی۔ لہٰذا یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے یقیناً بہت کافی ہے جو حق کی تلاش میں ہوں اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوں کہ حضرت ابو ہریرۃ نے جس ماحول میں زندگی بسر کی ہے اس میں ۔۔۔ ان صحابہ و تابعین کے درمیان جو انہیں جانتے اور پہچانتے تھے ۔۔۔ وہ صداقت و دیانت کے اس بلند مقام پر فائز تھے جو ہر طرح کے شک و شبہ سے بہت بالاتر اور افواہیں اڑانے والوں کے اوہام و وساوس سے وراء الوراء ہے جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور تابعین کی ممتاز جماعت کی اس شان سے

واقف ہو، کہ وہ کس قدر سچ بولنے والی، حق کی حمایت کرنے والی، باطل کو ٹھکرا دینے والی، گناہ کے کاموں پر نکیر کرنے والی، ہوا پرستوں کے اور دین میں تحریف کی کوشش کرنے والوں کے، مقابلہ پر ڈٹ جانے والی، اور قول یا فعل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے جو بھی انحراف کرے اُس پر سختی سے گرفت کرنے والی تھی، وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ابوہریرہ کی صداقت میں انھیں اگر ذرا بھی شک ہوتا تو وہ خاموش رہنے والے نہ تھے (ابوہریرۃ کا یقیناً گریبان پکڑ لیتے اور حدیثیں نہ روایت کرنے دیتے) وہ بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے جبکہ ابوہریرہ کے پاس نہ کوئی حکومت وسلطنت کی طاقت تھی نہ ہی وہ عزت وجاہ اور اثر ورسوخ کے مالک انسان تھے تو اگر انھیں ابوہریرہ کی صداقت میں ذرا سا بھی شک ہوتا تو کونسی چیز ان کو ابوہریرہ پر گرفت کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے سے ممانعت کر دینے سے مانع ہو سکتی تھی۔ یہ حضرات تو خلفا اور امراء سلطنت کے منہ پر بے دھڑک حق بات کہہ دینے کے عادی تھے۔

سوم! آپ پڑھ چکے ہیں کہ ابوہریرۃؓ نے حضرت حسنؓ کو ان کے نانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دفن کرنے کے معاملہ میں مروان بن الحکم کو کیسا دنداں شکن جواب دیا تھا حالانکہ مروان اس وقت مدینہ کا گورنر تھا اور حکومت اس زمانہ میں اُمویوں کی تھی اس کے باوجود ابوہریرہ، مروان کے حضرت حسن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن کرنے سے روکنے پر اور اس معاملہ میں دخل اندازی کرنے پر کس قدر سخت برہم ہوئے تھے اور صاف کہہ دیا تھا: "تم اُس چیز میں دخل دے رہے ہو جس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں"۔ اور جب مروان نے چاہا کہ ابوہریرہؓ کو کثرت سے حدیثیں روایت کرنے کے عنوان سے خاموش کرے تو ابوہریرہ نے اس کا بھی نہایت درشت اور تیز و تند جواب دیا، تو کیا آپ کے خیال میں ایسے جواب وہ شخص دے سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولتا ہو، دین واسلام کے بارے میں متہم ہو؟ بنو امیہ کا حامی اور طرفدار ہو؟ جیسا کہ ڈاکٹر ابوریہ، ابوہریرہ کی تصویر پیش کرنے کے درپے ہیں۔ یا یہ جواب وہ شخص دے سکتا ہے جس کو اپنے دین واسلام پر، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کر کے آنے پر اور رسول اللہ کی حدیثیں بیان کرنے پر پختہ یقین اور کامل اعتماد ہو؟ حتیٰ کہ مروان کو بھی یہ آرزو کرنی پڑی کہ "میں ابوہریرہؓ کو غصہ نہ دلاتا تو اچھا ہوتا"۔

چہارم ! حضرت ابوہریرہؓ اپنے اس علم وفضل اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشر واشاعت میں مصروف اور منہمک رہنے کے ساتھ ہی اعلیٰ درجہ کے عابد وزاہد بھی تھے، ذکر اللہ، نماز اور توبہ واستغفار میں بھی کثرت سے مشغول رہا کرتے تھے چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ (۱) میں ابوعثمان نہدی سے روایت کیا ہے کہ: "ابوہریرہ ایک تہائی رات خود نماز میں کھڑے رہتے اور ایک تہائی رات ان کی بیوی اور ایک تہائی رات ان کا لڑکا (نوبت بنوبت نماز پڑھتے رہتے) ایک نماز میں کھڑا ہوتا پھر وہ (فارغ ہوکر) دوسرے کو جگا دیتا پھر دوسرا (فارغ ہوکر) تیسرے کو جگا دیتا۔"

نیز ابن کثیر ہی نے ابوہریرہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ: "میں رات کے تین حصے کرتا ہوں ایک حصہ (نماز میں) قرآن پڑھنے کے لئے دوسرے حصہ میں سوتا ہوں اور تیسرے حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یاد کرتا ہوں۔" ابن کثیر ہی نے ابوایوب انصاری سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ابوایوب انصاری کہتے ہیں کہ: ایک نماز پڑھنے کی جگہ ابوہریرہ کے اندر کے کمرہ میں بنی ہوئی تھی ایک ان کے (باہر کے) کمرے میں اور ایک گھر کے صحن میں اور اسی طرح ایک گھر کے دروازہ پر (ڈیوڑھی میں) نماز کی جگہ بنی ہوئی تھی جب ابوہریرہ (گھر سے) نکلتے تو ان سب جگہوں میں (ترتیب وار) نماز پڑھتے اور جب (گھر میں) داخل ہوتے تب بھی ان سب جگہوں پر نماز پڑھتے۔"

عکرمہ سے مروی ہے کہ: "ابوہریرہ ہر رات بارہ ہزار تسبیح پڑھا کرتے اور فرمایا کرتے: میں اپنے گناہوں کے بقدر تسبیح پڑھتا ہوں۔"

بجانِ من! یہ تو عبادت گذاری اور خوف وخشیت خداوندی کی انتہا ہے۔

میمون بن میسرہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ: "ابوہریرہ ہر روز دو بار بڑے زور سے نعرہ لگایا کرتے تھے ایک دن کے شروع میں اور کہا کرتے: رات گئی اور دن آپہونچا اور فرعون اور اس کی قوم کو (جہنم کی) آگ کے سامنے لایا گیا" اور جب شام ہوتی تو کہتے: "دن چلا گیا اور رات آپہونچی اور فرعون اور اس کی قوم کو (جہنم کی) آگ پر پیش کیا گیا" تو جو بھی ان کے اس نعرہ کو سنتا ضرور جہنم کی آگ سے خدا کی پناہ مانگتا۔

حضرت ابوہریرہ کہا کرتے تھے: "کسی بدکار کو نعمت ملنے پر ہرگز رشک مت کیا کرو کیونکہ اس کے تعاقب میں ایک نہایت تیز رفتار پکڑنے والا لگا ہوا ہے یعنی جہنم جس کے بارے میں ارشاد ہے:

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۱۰ تا ۱۱۴

جب بھی اس کی آگ دھیمی پڑنے لگتی ہے ہم اس کو اور بھی زیادہ بھڑکا دیتے ہیں۔

متعدد لوگوں نے حضرت ابوہریرہ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ ابوہریرۃ اپنے سجدوں میں اس سے (اللہ کی) پناہ مانگا کرتے تھے کہ میں زنا کروں، چوری کروں یا کفر اختیار کر دوں یا کوئی بھی کبیرہ گناہ کروں۔" تو ان سے پوچھا گیا کہ "کیا آپ کو (اپنے متعلق) اس کا اندیشہ بھی ہے؟" تو جواب دیا: "میں کیسے بے خوف ہو سکتا ہوں دراں حالیکہ شیطان (گمراہ کرنے کے لئے) زندہ ہے اور دلوں کو پھیر دینے والا خدا (بھی موجود ہے وہ) جس طرح چاہتا ہے دلوں کو پھیر دیتا ہے"۔

ابوعثمان نہدی سے مروی ہے کہ: میں نے ابوہریرہ سے پوچھا: آپ روزے کس طرح رکھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: میں تو ہر مہینہ کے شروع میں تین روزے رکھ لیا کرتا ہوں تاکہ اگر مجھے کوئی حادثہ (یعنی موت) پیش بھی آجائے تو مجھے پورے مہینے کے روزوں کا ثواب مل جائے (اور میں دنیا سے صائم الدہر جاؤں)

حضرت ابوہریرہؓ کے پاس ایک حبشی لونڈی تھی اس کی حرکتوں سے وہ بڑے تنگ اور پریشان رہا کرتے تھے ایک دن (اس کو پیٹنے کے لئے) کوڑا اٹھایا مگر کہا: اگر قیامت کے دن قصاص (بدلے) کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں تجھے اس کوڑے سے خوب پیٹتا، لیکن میں (روز روز کا یہ قصہ ختم کرنے کے لئے) تجھے اس ہستی کے ہاتھ فروخت کئے دیتا ہوں جو مجھے تیری پوری پوری قیمت اس وقت دے گا جبکہ میں اس کا سب سے زیادہ محتاج ہوں گا لہذا جا، تو اللہ کے لئے آزاد ہے

قوم (صحابہ) کی نگاہ ہوں میں ابوہریرہ کی نیکوکاری اور پرہیزگاری کی — جس میں انھوں نے زندگی بسر کی — یہ دلیل بہت کافی ووافی ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ (اکابر صحابہ کی موجودگی میں) ابوہریرہ نے ہی پڑھائی تھی اور ایک روایت کے مطابق ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ بھی ابوہریرہ نے ہی پڑھائی تھی۔

جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو رونے لگے، لوگوں نے پوچھا: آپ روتے کیوں ہیں؟ جواب دیا: میں تمہاری اس دنیا (کی جدائی) پر نہیں روتا، میں تو اپنے سفر کی درازی اور زاد راہ کی کمی پر رو رہا ہوں (کہ میں نے سفر آخرت کے لئے زاد راہ کچھ بھی نہیں لیا) میں جنت کی بلندیوں اور جہنم کی پستیوں کی طرف جا رہا ہوں، معلوم نہیں مجھے کہاں لے جایا جائے گا

(اور کہاں رکھا جائے گا)۔

کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ عبادت، نماز روزہ، تسبیح و استغفار، وعظ و نصیحت، خوف و خشیہ گریہ وزاری، غلاموں کو اللہ کے لئے آزاد کرنا ہمہ وقت خدا کا خوف اور شدت کے ساتھ اس کی یاد ثبت دغیرہ ملکوتی صفات ایک ایسے شخص میں پائی جا سکتی ہیں جو اسلام میں سب سے بڑے گناہ یعنے حدیث میں جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتا ہو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر (بے محابا شب و روز) جھوٹ بولتا ہو؟

اے اللہ پاک ہے تیری ذات، یہ تو بہت ہی بڑی تہمت ہے

پنجم! ان سب باتوں پر مستزاد یہ ہے کہ ابوہریرہ کو دنیا کے مال و دولت کا حصہ بہت ہی کم ملا تھا اس (تہید ستی) کے باوجود جو مال بھی ان کے پاس آتا اسے ہاتھ کے ہاتھ صدقہ کر دیا کرتے تھے

مروان کے کاتب (میر منشی) ابوزعزعہ کا بیان ہے کہ (ایک مرتبہ) مروان نے ابوہریرہ کے پاس سو دینار بھیجے جب صبح ہوئی تو ابوہریرہ سے کہلا بھیجا کہ: مجھ سے غلطی ہوئی میں نے آپ کو نہیں کسی اور کو یہ رقم بھیجی تھی۔" ابوہریرہ نے جواب دیا: اب تو میں نے یہ رقم خرچ کر دی باقی جب آپ (بیت المال سے) میرا وظیفہ (مشاہرہ) بھیجیں تو اس میں سے یہ رقم وضع کر لیں۔ ابوہریرہ نے یہ رقم (اسی وقت) صدقہ کر دی تھی۔ مروان کا مقصد بھی اس سے ابوہریرہ (کے زہد) کا امتحان لینا تھا (۱)

ششم! صحابہ اور کبار تابعین کا زمانہ ابھی گذرنے بھی نہ پایا تھا کہ ابوہریرہ سے مروی حدیثیں ائمہ حدیث کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں محدثین ان کو پرکھتے تھے، جو حدیثیں صحیح ثابت ہوتیں ان کو (اپنے شاگردوں کے سامنے) بیان کرتے اور جو صحیح ثابت نہ ہوتیں ان کو الگ کر دیتے اور ان میں جو ضعف یا خامی ہوتی اس کو بیان کر دیتے تھے (تاکہ آنے والے علماء حدیث اس کی چھان بین کریں) چنانچہ ابوہریرہ کی صحیح احادیث نے حدیث کے مدون مجموعوں (کتابوں) اور مسانید کے سینوں میں اپنا بلند مقام حاصل کر لیا تھا کوئی حدیث کی کتاب ان سے خالی نہ رہی تھی نہ کوئی مسند بھی تھی اس سے پہلے کہ نظام معتزلی اور اس کے مشائخ ائمہ اعتزال اور شیعہ اسکافی اور اس کے مشائخ شیعہ امام عالم ہستی میں قدم رکھیں (دنیا میں پیدا ہوں)

ہفتم! حضرت ابوہریرہؓ کی صحیح حدیثیں مختلف اسلامی ممالک میں فقہاء اور ائمہ مجتہدین

کا بھی مرکز توجہ واہتمام بن چکی تھیں۔ جب ابوہریرہ کی کوئی حدیث صحیح ثابت ہوجاتی تو اس کے مقابلہ میں کسی کو بھی کلام کرنے کی مجال نہ ہوتی بجز اس مسلک کے جو ابراہیم نخعی کے اور فقہا کوفہ میں سے اہل الرائی کے بعض مشائخ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اخبار آحاد کو قبول کرنے کے لئے انھوں نے کچھ شرطیں لگا رکھی تھیں جو مشہور ومعروف ہیں سب جانتے ہیں، لیکن عام ممالک اسلامیہ کے جمہور فقہا اور مجتہدین ان کے مسلک سے متفق نہ تھے حتیٰ کہ خود امام ابوحنیفہ جو "عراقی مکتب فکر" کے تاجدار ہیں اُن کے بارے میں بھی کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں کہ اُنھوں نے ابوہریرہ کی احادیث سے متعلق ابراہیم نخعی اور ان کے ہم خیال فقہا کا موقف اختیار کیا تھا بلکہ اگر ابوہریرہ کی صحیح حدیثیں جو امام ابوحنیفہ کے مقرر کردہ شرائط پر پوری اُترتیں تو وہ ان پر بے چوں وچرا عمل کیا کرتے تھے امام ابوحنیفہ کی ان شرائط صحت کا باعث اور داعی بھی اجتہاد واستنباط احکام کا تقاضہ اور صحابی کے علاوہ تحتانی راویوں کے بارے میں ــ نہ کہ کسی بھی صحابی کے بارے میں ــ انتہائی احتیاط برتی تھی۔ جو شخص بھی (امام ابوحنیفہ کے متعلق) اس کے خلاف دعویٰ کرے وہ جھوٹا اور افترا پرداز ہے جس کی خود ابوحنیفہ کا مسلک ــ جو مشہور ومعروف اور کتابوں میں مدون ہے ــ تکذیب وتردید کرتا ہے۔

ہشتم ۔ حضرت ابوہریرہ کو جن لوگوں نے سب سے پہلے طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا وہ نظّام جیسے معتزلہ کے بعض مشائخ تھے لیکن تنہا ابوہریرہ کے متعلق ہی نہیں بلکہ اکثر وبیشتر رسول اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں ان ائمہ معتزلہ کا ایک خاص موقف تھا (کہ وہ جھوٹی حدیثیں بیان کردیا کرتے ہیں) اسی طرح سنت اور حدیث کے بارے میں بھی ان کا ایک مخصوص موقف تھا کہ جو حدیث بھی عقل کے خلاف ہو وہ جھوٹی ہے، جس کی بنیاد پر اُنھوں نے بہت سی صحیح اور جمہور کے نزدیک ثابت شدہ احادیث کی تکذیب کو بھی جائز اور مباح قرار دے رکھا تھا۔ یہ موقف اُنھوں نے صرف یونانی فلسفہ کے تسلط کی بنا پر اختیار کر رکھا تھا جو ان کی عقلوں پر چھایا ہوا تھا چنانچہ وہ دین اور دین کی ہر چیز کو عقل کے پیمانوں سے ہی ناپتے تھے اور اگر اُنھیں جمہور مسلمین کا ڈر نہ ہوتا تو وہ خود قرآن کو بھی عقلی اعتراضات کا نشانہ ضرور بناتے اس لئے کہ حدیث کی طرح قرآن میں بھی ایسی بہت سی چیزیں موجود ہیں جن کو ان کی یونانی عقلیں گوارا نہیں کرتیں۔ اس ڈر اور خوف کے

باوجود بھی اُنھوں نے قرآن کی آیات کی ایسی تاویلیں کرنے میں دریغ نہیں کیا جن سے قرآن کی آیات اُن کی عقلیت کے ساتھ متفق ہوسکیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یونانی فلسفہ ہی وہ حق ہے جس میں باطل کا شائبہ تک نہیں ہے، حالانکہ آج ثانوی مدرسہ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یونانی فلسفہ کی ان مضحکہ خیز تصنیفات وتالیفات کی دھجیاں بکھیر سکتا ہے اگرچہ ابوریہ کا عقیدہ تو یہی ہے کہ یہ عقلیت پرست معتزلہ ہی وہ لوگ ہیں جو راجح اور برتر عقل کے مالک ہوئے ہیں۔ یعنے ہو بہو ابوریہ جیسی عقل کے ۔ (بہرحال نظام اور معتزلہ کے سب وشتم کا نشانہ صرف ابوہریرہ ہی نہیں ہیں بلکہ اکثر وبیشتر صحابہ بھی ابوہریرہ کے ساتھ شریک ہیں ایسی صورت میں معتزلہ کے اعتراضات کو صرف ابوہریرہ کے حق میں بطور دلیل پیش کرنا بددیانتی ہے)

باقی رہے شیعہ حضرات تو اُنھوں نے بھی تنہا ابوہریرہ کے بارے میں ہی یہ موقف اختیار نہیں کیا بلکہ چند صحابہ کو چھوڑ کر۔ جنھیں انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے ۔ باقی تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں کھلی ہوئی دشمنی، عداوت اور بغض وکینہ کا موقف اختیار کیا ہوا تھا (ابوہریرہ کی کچھ خصوصیت نہیں) ان میں کے بعض فرقے تو جمہور صحابہ کی تکفیر تک پہونچ گئے تھے جن میں ابوبکر، عمر، سعد اور خالد جیسی جلیل القدر ہستیاں بھی شامل تھیں جن کے ہاتھوں اللہ جل مجدہٗ نے انسانیت کو اسلام کی ہدایت پہونچانے کی سعادت بخشی ہے۔

شیعہ حضرات اپنے اس موقف میں ان اصولوں پر پوری طرح کاربند ہیں جن کا اُنھوں نے اپنے کو پابند بنایا ہوا ہے کہ ہر اس شخص سے بغض وکینہ رکھا جائے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کی امارت حضرت علیؓ کے سپرد نہیں کی اسی لئے چونکہ تمام صحابہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر متفق ہو گئے تھے لہذا شیعہ مکتب فکر کے پیروؤں نے تمام ہی صحابہ کو غیظ وغضب کا نشانہ بنایا اور ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس "وصیت" کے خلاف سازش کرنے والا قرار دیا جو ۔ ان کے زعم کے مطابق ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے حق میں فرمائی تھی۔

ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے نہ ہی یہ ہمارا موضوع بحث ہے لیکن ہم استاذ ابوریہ سے یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ابوہریرہ سے متعلق ان کی اغراض وخواہشات شیعوں کی خواہشات و

اغراض سے متفق ہیں (جس کی بنا پر وہ شیعہ فکر کی کتابوں سے ابوہریرۃ کے خلاف لکھ رہے ہیں) تو شیعہ مکتب فکر کے پیروؤں کا یہ غصہ اور غیظ و غضب تنہا ابوہریرہ ہی پر نہیں ہے بلکہ انھوں نے ابوبکر و عمر کے بارے میں تو اس سے بہت بڑھ چڑھ کر غیظ و غضب اور بغض و کینہ کا اظہار کیا ہے اور خاص طور پر ان دونوں بزرگوں (ابوبکر و عمر) کے بارے میں تو ابوہریرۃ سے بدرجہا زیادہ مغلظات اور بے سروپا قصے اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں جن کو ابوریہ نے علمی طور پر ایسی مستند کتابیں قرار دیا ہے کہ جن پر بھروسہ کیا جاسکے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ مکتب فکر کی ان کتابوں میں صحابہ کرام کے حق میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے — جس کو سب ہی جانتے ہیں — استاذ ابوریہ اس تمام خرافات و مغلظات کو اپنائیں اور قبول کریں (یعنے شیعہ بن جائیں کیا وہ اس کے لئے تیار ہیں ؟)

موجودہ حالات میں اس بحث کو چھیڑنا اسلامی مصالح عامہ کے بالکل خلاف ہے اگر ابوریہ یہ موقف اختیار نہ کرتے تو ہم بھی یقیناً اس بحث میں نہ پڑتے جس پر ہم صرف اس لئے مجبور ہوئے کہ ابوریہ کے بہتانوں، تہمتوں اور گمراہ کن بیانات کی تردید کرسکیں جن کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ "یہ ایسی علمی تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) ہے کہ ان سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوئی"۔

حضرت ابوہریرہ کی سیرت سے متعلق یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے جس میں ابوہریرہ کی پاکیزہ زندگی سے ان کے معاصر صحابہ و تابعین اور جمہور محدثین و علماء السلام کے قلوب میں چودہ سو سال سے جو ان کا علمی مقام ہے اس سے متعلق ایسے حقائق آگئے ہیں جو قیامت تک نہ مٹ سکیں گے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ کی سیرت سے متعلق اس مختصر نوٹ کو علامہ شیخ احمد شاکر مرحوم کے بیان پر ختم کریں۔

مسند امام احمدؒ جو محقق موصوف کی تحقیق و تعلیقات کے ساتھ شائع ہو رہی ہے جس کی طباعت ابھی پایہ تکمیل کو بھی نہیں پہونچی ہے اس کے جزء ۱۲ ص ۸۴ پر مسند ابوہریرہ کی ابتداء میں محقق موصوف لکھتے ہیں :

> بلاشبہ ہمارے زمانہ میں سنت و حدیث کے دشمن اعداء اسلام نے
> جو ہرزہ سرائی کی ہے اور ابوہریرہ پر طعن و تشنیع سے دلچسپی اور شغف

کا جو مظاہرہ کیا ہے اور ان کی صداقت و دیانت اور روایت حدیث
کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں جو شکوک و شبہات پیدا کئے ہیں اور
اسی قسم کی جو اور کمینی حرکات کی ہیں، اس سے ان دشمنان اسلام کا واحد
مقصد یہ ہے کہ اپنے پیشوا اور پیش رو مسیحی مبلغین کے نقش قدم پر چل کر
خود مذہب اسلام کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا
کرنے میں بزعم خود کامیاب ہو سکیں اگرچہ ظاہر میں تو وہ دعویٰ کرتے
ہیں کہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ہم (مذہب کے معاملہ میں) صرف قرآن پر
یا ہماری رائے کے مطابق جو حدیثیں صحیح ہیں اُن پر اکتفا کریں اور ان
کی رائے میں صرف وہی حدیثیں صحیح ہوتی ہیں جو ان کی اغراض و خواہشات
کے مطابق اور اس مغربی تہذیب و ثقافت اور یورپین معاشرت سے
ہم آہنگ ہوں جس کی وہ پیروی کر رہے ہیں (نہ صرف یہ بلکہ) ان میں کا
کوئی فرد بھی خود قرآن عظیم کی آیات میں ایسی تاویلیں کرنے سے نہیں
چوکتا جن سے قرآن کے الفاظ کے معنی اور مفہوم اس زبان (عربی) کے
معنی اور مفہوم سے خارج ہو جاتے ہیں جس میں قرآن نازل ہوا ہے صرف اس لئے
کہ قرآن کو بھی اپنی خواہشات اور اُن اغراض و مقاصد کے مطابق بنا لیں
جن کے وہ درپے ہیں۔

اس معاملہ میں یہ گروہ اسلام کا پہلا دشمن گروہ ہی نہیں ہے جو اسلام
پر (طرح طرح سے) حملے کر رہا ہے بلکہ ان کے پیشوا اور پیش رو اغراض
پرست دشمنان اسلام تو قدیم زمانہ سے ہی اسلام پر ایسی کمینی یورشیں
کرتے چلے آئے ہیں، مگر اسلام ہمیشہ اپنی راہ پر گامزن رہا ہے یہ لوگ (اسلام
کے خلاف) چیختے چلاتے رہتے ہیں اسلام ان کی چیخ و پکار کو سنتا تک
نہیں بلکہ یا تو وہ ان کمینے دشمنوں کو (باوقار انداز میں) نظر انداز کرتا ہوا
ان سے گزر جاتا ہے اور یا ان کو شریر دشمن گردان کر ان کا سر کچل دیتا

بے ادبی) تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ آپ واضح طور پر محسوس کریں گے کہ یہ موجودہ زمانہ کے دشمن (اسلام کے خلاف) جو بکواس کرتے ہیں وہ قریب قریب اُسی کی صدائے بازگشت ہوتی ہے جو وہ پرانے دشمن (اسلام کے خلاف) ہرزہ سرائی کر چکے ہیں فرق صرف ایک ہے کہ وہ قدیم دشمن ــ خواہ گم کردہ راہ فرقے ہوں یا ملحد و بے دین ــ اہل علم اور حقائق سے باخبر لوگ تھے اُن میں سے بیشتر کو اللہ جل شانہٗ نے علم و معرفت کے ہوتے گمراہ اور راندۂ درگاہ بنا دیا تھا لیکن یہ ہمعصر دشمن ان کے پاس تو جہالت، گستاخی بے ادبی اور بے سمجھے بوجھے اُن کے الفاظ کو موڑنے توڑنے اور اُن کے اُگلے لقمے چبانے کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں یہ تو ان افکار و نظریات میں (بندر کی طرح) ان کی نقالی کرتے ہیں اور اس پر اتراتے بھی ہیں اور ہر اس شخص پر اپنی برتری جتلاتے ہیں جو ان کو صراط مستقیم پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ (کہ ہم محقق ہیں تم کیا جانو)

اس کے بعد شیخ احمد شاکر لکھتے ہیں :-

بخدا میں نے حاکم ابو عبداللہ ــ وفات ۴۰۵ھ ــ کی کتاب مستدرک میں اُن کے شیخ المشائخ امام الائمہ امام ابن خزیمہ ــ وفات ۳۱۱ھ ــ کا بیان اُن لوگوں کی تردید میں جنہوں نے ابوہریرہ کے خلاف اعتراضات کئے ہیں بہت اچھی طرح دیکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے ان ہمعصروں پر ہی تردید فرما رہے ہیں، فرماتے ہیں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ صرف ان کی حدیثوں کو رد کرنے کی غرض سے وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں کو اللہ جل شانہ نے (نور بصیرت سے محروم اور) اندھا بنا دیا ہے اس لئے وہ ان حدیثوں کے معانی سمجھنے سے قاصر ہیں یہ (دلوں کے اندھے) لوگ۔

یا تو فرقۂ معطلہ (خدا کو بے کار بنا دینے والے گروہ) جہمیہ سے تعلق رکھتے

ہیں، یہ لوگ اپنے عقیدہ کے خلاف ابوہریرہ کی حدیثیں سنتے ہی اپنے مذہب کی حمایت میں ـــ جو سراسر کفر ہے ـــ ان کو رد کردیتے ہیں اور ابوہریرہ کو (مغلظ) گالیاں دینا شروع کردیتے ہیں اور ایسے الزامات اُن پر لگاتے ہیں جن سے خود اللہ جل جلالہٗ نے ابوہریرہ کو بری کردیا ہے۔ صرف اپنے جیسے پست طبقہ کے بازاری عوام کو فریب دینے کے لئے کہتے ہیں کہ ابوہریرہ کی حدیثوں سے استدلال نہیں کیا جاسکتا (وہ تو جھوٹی حدیثیں روایت کرتے ہیں)

یا وہ خارجی فرقہ کے لوگ ہیں جو اُمت محمد صلی اللہ علیہ السلام کے اوپر تلوار چلانے (اور قتل کرنے) کو جائز (بلکہ فرض) سمجھتے ہیں (کہ یہ سب کافر ہیں ان کو اور کافروں سے پہلے قتل کردینا چاہیئے) یہ خارجی نہ کسی امام کی اطاعت کو مانتے ہیں نہ کسی خلیفہ کی (اسی لئے ان کا نام خارجی ہے) یہ لوگ بھی جب اپنے مذہب کے ـــ جو سراسر گمراہی ہے ـــ خلاف ابوہریرہ کی حدیثیں سنتے ہیں اور دلیل و برہان کے ذریعہ ان کا جواب دینے سے عاجز ہوتے ہیں تو اس کے سوا اور کوئی چھٹکارے کی راہ ان کو نظر نہیں آتی کہ ابوہریرہ پر حملے اور طعن و تشنیع شروع کردیتے ہیں۔

یا وہ قدریہ فرقہ کے لوگ ہیں جو اسلام اور مسلمانوں سے الگ ہوچکے اور کٹ چکے ہیں (اسی لئے ان کو معتزلی "الگ ہوجانے والے" کہتے ہیں) اور (اپنے سوا) تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے چکے ہیں، اور جو صرف اس ازلی تقدیر کو مانتے ہیں جو اللہ جل شانہٗ بندوں کو پیدا کرنے اور ان کے نیک و بد کام شروع کرنے سے پہلے تجویز کرچکے اور فیصلہ کرچکے ہیں (اب وہ کچھ نہیں کرسکتے بندے اب جو کچھ کرتے ہیں وہ خود اُس کے خالق ہیں) تو یہ معتزلی جب ابوہریرہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حدیثیں سنتے اور دیکھتے ہیں جن سے تقدیر کا ثبوت ہوتا ہے (کہ اللہ جل شانہٗ اپنی ازلی تقدیر و تجویز کے باوجود بندوں کے افعال و اعمال کے خالق بھی ہیں بندہ جو کچھ کرتا ہے اُس کی قدرت خدا ہی دیتا ہے وہ خدا کے قدرت دیئے بغیر اپنے ارادہ و اختیار سے کچھ نہیں کرسکتا) تو وہ اپنے مسلک اور عقیدہ کے (کہ بندہ اپنے افعال

کا خالق ہے، ثبوت کے لئے۔۔۔۔ جو سراسر کفر و شرک ہے ۔ اس کے سوا کوئی دلیل
نہیں پاتے کہ ابوہریرہ کی حدیثوں سے استدلال کرنا درست نہیں ہے (اس
لئے کہ وہ حدیثوں میں جھوٹ بولتے ہیں)
یا وہ جاہل لوگ ہیں جو فقیہ بننا چاہتے ہیں اور (جہالت کی وجہ سے) فقہی
مسائل کے استنباط کے لئے ایسے خود ساختہ ماخذ اختیار کرتے ہیں جو درحقیقت ماخذ نہیں بن سکتے۔
تو جب یہ نام نہاد فقیہ ابوہریرۃ کی ایسی حدیثیں سنتے ہیں۔ جو ان لوگوں کے مسلک کے
خلاف ہوتی ہیں جن کا مسلک ان جاہلوں نے اپنایا ہوتا ہے اور جن کی پیروی
(اندھی تقلید) وہ بغیر کسی دلیل و برہان کے کر رہے ہوتے ہیں تو یہ لوگ بھی
ابوہریرہ پر اعتراضات کرنے شروع کر دیتے ہیں اور اپنے مسلک کے خلاف
ابوہریرہ کی حدیثوں کو بے محابا رد کر دیتے ہیں لیکن جو ابوہریرہ کی حدیثیں ان کے
مسلک کے موافق اور مؤید ہوتی ہیں ان سے اپنے مخالفین کے مقابلہ پر استدلال
کرنے سے بھی نہیں چوکتے (گویا ایک ہی سانس میں ابوہریرہ کی حدیثوں کو رد بھی کرتے ہیں اور قبول
بھی) ان فرقوں میں سے بعض نے تو ابوہریرہ کی بعض حدیثوں کو صرف اور محض
اس لئے رد کر دیا ہے کہ وہ ان کے معنیٰ سمجھ نہ پائے۔ ہم انشاء اللہ ایسی چند حدیثوں
کو بیان کریں گے۔

اس کے بعد امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی بعض ایسی احادیث کا ذکر فرمایا ہے
جن پر اشکالات کیے گئے ہیں اور پھر ان کے شافی و وافی جوابات دیئے ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر نوٹ (اور اجمالی خاکہ) حضرت ابوہریرہ اور ان کی احادیث کے بارے میں یہی
کلمۂ حق اور سچی بات ہے اور یہی مسلک ہے اسلام کے ائمہ ہدیٰ کا، اعلام دین اور اسلامی شریعت
کے بڑے بڑے فقہاء و مجتہدین کا انہی حضرات کے ہاتھوں میں حجت و استدلال کی باگ ڈور ہے انہیں
کی زبانوں کا فیصلہ ناطق ہے، صحیح تاریخ ۔۔۔۔۔۔ ان کی آراء کی مؤید ہے اور محکم علمی تحقیق کا انہی پر
مدار ہے۔

کچھ ڈاکٹر ابوریہ اور اُن کی کتاب اضواء علی السنۃ النبویہ کے متعلق

میں نے جس وقت اس کتاب کا مقدمۂ طبع لکھا تھا اور اس کے ضمن میں ڈاکٹر ابوریہ کی کتاب کا بھی سرسری ذکر کیا تھا اُس وقت میں نے ان کی کتاب پر انتہائی عجلت میں طائرانہ نظر ڈالی تھی اور اس کے تاثرات سپردِ قلم کردیئے تھے اس کے بعد جب میں نے حضرت ابوہریرہ سے متعلق ان کی تحریر پر غور وخوض کیا اور جو صریح عبارتیں اور قصے کہانیاں اُنھوں نے سُنائی ہیں ان سے محققانہ بحث کی تو اب میں پورے شرح صدر کے ساتھ مذکورہ ذیل حقائق جزم ویقین کے ساتھ بیان کرسکتا ہوں :

اوّل ! یہ شخص دوسروں کی باتیں نقل کرنے کے بارے میں قطعاً قابل اعتماد نہیں ہے یہ بسااوقات جس کی صریح عبارت نقل کرتا ہے اس میں اپنی طرف سے ایسے الفاظ بڑھا دیتا ہے جن سے معنی خراب ہوجاتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ صریح عبارت مصنف کی مراد کے بجائے خود اُس کی خواہش کے مطابق ہوجائے اور اس کا مطلب وہ ہوجائے جو وہ چاہتا ہے اسی طرح بسا اوقات اپنا مطلب نکالنے کے لئے اصل عبارت میں سے کچھ الفاظ کم کردیتا ہے ۔ (یہ اضافہ یا قطع برید علمی خیانت ہے جس کے بعد مصنف قابل اعتماد نہیں رہتا)۔

اسی طرح بسااوقات قاری کو فریب دینے اور گمراہ کرنے کی غرض سے جس شخص کا قول ہوتا ہے اس کے بجائے کسی اور شخص کی طرف منسوب کردیتا ہے (یہ صریح بہتان اور افترا ہے) حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا اس پر تنقید کے دوران اس کی مثالیں بکثرت آچکی ہیں

یہاں ہم چند مثالیں قارئین کے سامنے اس کی علمی "امانت و دیانت" کا پردہ چاک کرنے اور اس کی علمی تحقیق (سائنٹیفک ریسرچ) کی پول کھولنے کی غرض سے پیش کرتے ہیں ۔

(ا) اپنی کتاب اضواء علی السنۃ صفحہ ۱۶۲ کے حاشیہ نمبر ۳ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھتا ہے :-

"وہ داونٹوں پر لادسنے کے بقدر اہل کتاب" کی کتابیں عبداللہ بن عمرو کے
ہاتھ آگئی تھیں اور یہ اُن کتابوں کی روایتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
طرف منسوب کر کے روایت کیا کرتے تھے"

اور اس قول کو حافظ ابن حجر عسقلانی کی طرف منسوب کیا ہے کہ ابن حجر نے شرح بخاری فتح الباری
ص ۱۶۶ ج ا پر یہ لکھا ہے۔

حالانکہ (جس کا جی چاہے فتح الباری اُٹھا کر دیکھ لے) فتح الباری میں "عن النبی" کا لفظ مطلق
نہیں ہے (صرف "یرویہا للناس" کا لفظ ہے) "عن النبی" یہ لفظ صرف ابوریہ نے بڑھایا ہے
(تاکہ ابوہریرۃ کی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں کو — جو ابوہریرۃ سے بھی زیادہ حدیثوں
کے راوی ہیں — جھوٹا ثابت کر سکے) اور اس لفظ کو حافظ ابن حجر کی طرف صرف اس غرض سے منسوب
کیا ہے کہ (حافظ ابن حجر کی شخصیت سے متاثر کر کے) قاری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر
صحابہ کی حدیثوں کے بارے میں شک وشبہ میں ڈال دے صرف اِس بنیاد پر کہ وہ مسلمان اہل کتاب
(کعب احبار وغیرہ) کی زبان سے ان واقعات کو بھی سُن لیا کرتے تھے جو وہ گزشتہ قوموں کے بارے
میں بیان کیا کرتے تھے پھر اُن میں سے بعض حضرات (جیسے ابوہریرہ، عبداللہ بن عمرو وغیرہ) گذشتہ
قوموں کے قصوں کے طور پر (بغرضِ عبرت) ان کو لوگوں کے سامنے بیان بھی کر دیا کرتے تھے لیکن
محقق (ابوریہ اُن پر (از خود) یہ تہمت باندھتے ہیں کہ" وہ ان روایتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے" (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے) اور اسی (ایک بہتان
تراشی پر بس نہیں کرتے بلکہ اس (بہتان) کو حافظ ابن حجر کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ابن حجر نے
یہ کہا ہے . . . . حالانکہ ابن حجر نے یہ ہرگز نہیں کہا (یہ بہتان پر بہتان ہے)
حافظ ابن حجر (جیسے جلیل القدر امام حدیث) تو کیا، کوئی مسلمان بھی — جو ان انسانیت کی تاریخ کے
نادر روزگار جلیل القدر ہستیوں (صحابہ) کی راست گوئی، دین میں پختگی اور اللہ کے اوامر و نواہی کی حدود
پر سختی سے قائم رہنے والی جماعت سے واقف ہو — اُن پر ایسی تہمت ہرگز نہیں لگا سکتا اس لئے
کہ یہ صحابہ خوب اچھی طرح جانتے اور یقین رکھتے تھے کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہے اور غضب بھی" اور
ظاہر ہے کہ اللہ کے دشمنوں (منکرین حدیث) کے دِلوں کی تسکین اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب

اس سے بڑھ کر اور کوئی بہتان نہیں ہوسکتا جو ابو ریہ نے لگایا ہے۔

(۲) ابو ریہ اپنی کتاب اضواء علی السنۃ النبویہ کے صفحہ ۱۵ پر البدایۃ والنہایہ ص ۲۰۶ ج ۸ کے حوالہ سے حافظ ابن کثیر کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ :۔

عمر (رضی اللہ عنہ) نے (اہل کتاب کے مشہور عالم) کعب احبار سے کہا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنا چھوڑ دو ورنہ میں تم کو سرزمین قردۃ میں نظر بند کر دوں گا۔

(یہ حافظ ابن کثیر پر بہتان ہے) حافظ ابن کثیر کی عبارت کے الفاظ یہ ہیں :۔

لتترکن الحدیث "عن الاول" تم اگلی قوموں کی باتیں بیان کرنا چھوڑ دو۔

عن رسول اللہ کا لفظ قطعاً نہیں ہے (جس کا جی چاہے البدایہ والنہایہ اٹھا کر دیکھ لے) یہ صرف محقق ابوریہ کی دیانت اور علمی امانت ہے جو انھیں ابن کثیر کی اس صریح عبارت میں تحریف کرنے کی اجازت دیتی ہے صرف اس (ناپاک مقصد) کو ثابت کرنے کے لئے کہ کعب احبار (اسرائیلی روایات کو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بیان کیا کرتے تھے اور صحابہ کرام ان سے (یہ احادیث لیا کرتے (اور روایت کیا کرتے) تھے

یہ وہ بہتان ہے جس کا جال گولڈ زیہر جیسے یہودی مستشرقین نے صرف اس غرض سے بچھایا ہے کہ وہ دین اسلام میں یہودیت کے نفوذ اور اثر کو ثابت کر سکیں (کہ اسلام کی تشکیل یہودی روایات کی رہین منت ہے) اور ان (دشمنان اسلام) یہودیوں کی زبان سے نکلی ہوئی بات کو (طوطے کی طرح) ہمارے اس "علمی محقق" ابوریہ نے دہرایا ہے اور ان یہودی مستشرقین کو خوش کرنے کی غرض سے ان پر مزید احسان یہ کیا ہے کہ (ابن حجر اور ابن کثیر جیسے) ائمہ حدیث پر بہتان تراشی کرکے ان کے دعوے کے لئے ثبوت بہم پہونچا دیا۔ سچ کہا ہے کسی نے جھوٹوں کے گواہ گرہ کٹ جیسے روح دیسے فرشتے)

(۳) ابو ریہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۶۳ پر ابن کثیر کی کتاب البدایہ والنہایہ ص ۱۰۶ ج ۸ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ :۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوہریرہ کو دھمکی دی تھی کہ تم حدیثیں بیان کرنا چھوڑ دو ورنہ میں تم کو (تمہارے وطن) سرزمین دوس یا قردۃ میں نظر بند کر دوں گا۔

یہ ارض دوس اور ابوہریرۃ کی زیادتی بھی ابوریہ کی حضرت عمر اور ابن کثیر دونوں پر بہتان تراشی کا شاہکار ہے، حضرت عمر نے (ابوہریرہ کو نہیں بلکہ) کعب احبار کو دھمکی دی ہے۔ جیسا کہ ابن کثیر کی صریح عبارت ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ: حضرت عمر نے کعب احبار کو کہا ہے کہ تم اگلی قوموں یعنی امتوں کی روایات بیان کرنی چھوڑ دو۔ (اس عبارت میں نہ ابوہریرہ کا ذکر ہے نہ سرزمین دوس کا)

(۴) استاذ ابوریہ نے اپنی کتاب میں حضرت ابوہریرہ پر بحث کے دوران متعدد مقامات پر ایسی صریح عبارتیں نقل کی ہیں جن میں حضرت عمر، حضرت عائشہ، حضرت عثمان، حضرت علی وغیرہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا ابوہریرہ کو جھوٹا کہنے اور سمجھنے کی تصریح ہے اور پھر ان تمام روایتوں کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر دیا ہے کہ ابن قتیبہ نے یہ تمام روایتیں اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث میں نقل کی ہیں۔ (اور اپنے اس حوالہ کی اہمیت جتانے کی غرض سے) اپنی کتاب اضواء علی السنۃ کے حاشیہ میں ابن قتیبہ کے حالات لکھے ہیں اور بتلایا ہے کہ: اہل سنت کے ہاں (اُن کی حمایت میں) زورِ بیان اور قوت استدلال کے لحاظ سے ابن قتیبہ کا وہی مرتبہ و مقام ہے جو معتزلہ کے ہاں (ان کی حمایت میں) جاحظ کا ہے۔ اس (ابن قتیبہ کی شخصیت کو جتانے) کا مقصد صرف پڑھنے والے کو یہ تاثر دے کر دھوکا دینا اور گمراہ کرنا ہے کہ ابن قتیبہ جیسا شخص جس کا مرتبہ اور مقام اہل سنت والجماعت کے ہاں اتنا بلند ہے اُس کا ابوہریرہ پر یہ تنقید کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ابوریہ نے جو موقف ابوہریرہ کے بارے میں اختیار کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، بالکل صحیح ہے۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے (جس کا ہم اس سے پہلے بھی اظہار کر چکے ہیں) کہ ابن قتیبہ نے تو اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث تصنیف ہی اس غرض سے کی ہے کہ صحابہ کرام کے عہد سے لے کر ان کے زمانہ تک، ائمہ حدیث پر جن لوگوں نے طعن و تشنیع کی ہے ان کی تردید کریں اور ان کے مسکت جوابات دیئے ہیں اور بتلایا ہے کہ یہ ائمہ حدیث پر طعن و تشنیع کرنے والے (دشمنان اسلام) نظّام اور اُسی

جیسے مکتب اعتزال (عقلیت پرستی) کے دوسرے سربراہ ہوئے ہیں اس کے بعد ابن قتیبہ نے ان (الزامات اور) گالیوں کی فہرست پیش کی ہے جو نظام نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوہریرہ وغیرہ کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم کو دی ہیں اس کے بعد ان میں سے ایک ایک الزام کے نہایت ٹھوس جوابات دیئے ہیں اور ان صحابہ میں سے ہر ایک کے متعلق جو بہتان نظام نے باندھا ہے اس کا پردہ چاک کر کے نظام کی خوب تجہیل و تحمیق کی ہے۔

تو ہمارے اس علمی محقق (ابوریہ) نے ابن قتیبہ کی کتاب سے نظام کے عائد کردہ تمام اعتراضات والزامات تو لے لئے اور ان کے جوابات سے آنکھیں میچ لیں اور نظام کے ان تمام اعتراضات والزامات کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کر دیا (کہ ان صحابہ کے متعلق ابن قتیبہ نے یہ کہا ہے) یہ ہے ہمارے اس عہد حاضر کے "علمی محقق" کی علمی امانت و دیانت۔ (چور کہیں کے)

(۵) ابوریہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۹۵ پر مرحوم سید رشید رضا کا ایک بیان کعب احبار اور وہب بن منبہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ: سید رشید رضا نے کہا کہ:-

وما یدرینا ان کل الروایات	ہمیں کیا معلوم کہ تمام روایتوں کے۔ یا ان میں سے موقوف
اوالموقوفة منها۔ ترجع الیهما۔	روایتوں۔ کے مرجع یہی دو شخص نہیں ہیں (اور انہی کی ساختہ پرداختہ نہیں ہیں)

حالانکہ سید رشید رضا کی عبارت یہ ہے:-

وما یدرینا ان کل "تلک" الروایات الخ اس عبارت میں سے ابوریہ نے "تلک" کا لفظ کھا گئے جس سے سید رشید نے صرف ان روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو کعب اور وہب اہل کتاب سے نقل کرتے ہیں .... (اور ان کا منشا یہ ہے کہ کعب اور وہب جو "اسرائیلی روایات" اہل کتاب کی طرف منسوب کر کے بیان کرتے ہیں یا بغیر ان کی طرف منسوب کئے بیان کرتے ہیں اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ واقعی علماء اہل کتاب سے نقل کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ تمام اسرائیلی روایات انہی کی ساختہ پرداختہ ہوں اور محض رعب جمانے کے لئے علماء اہل کتاب کی طرف منسوب کر دیتے ہوں بالفاظ دیگر سید رشید رضا ان دونوں شخصوں کے متعلق شک و شبہ کا اظہار صرف اسرائیلی روایات کے متعلق کر رہے ہیں نہ کہ تمام روایات

اور احادیث کے متعلق لیکن لفظ تلک نکال دینے سے عبارت کا مطلب یہ ہو گیا کہ نہ صرف اسرائیلی بلکہ تمام صحابہ کی کل کی کل روایات کا مرجع بھی وہ شخص ہیں اور سب کی سب روایتیں مشکوک و مشتبہ ہیں یہی ابوریہ کا وہ ناپاک مقصد ہے جس کے ثابت کرنے کے وہ درپے ہیں۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ کسی بڑے عالم کی صاف و صریح عبارت میں اپنی من مانی بات کو ثابت کرنے کے لئے قطع برید کر کے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنا کتنی زبردست دلیری، دھوکہ دہی اور کتنی بڑی مجرمانہ جعل سازی ہے۔

مجرمانہ علمی خیانت کی یہ چند ایسی واضح مثالیں ہیں جن میں ذرہ برابر بھی حجت کی گنجائش نہیں یہ قطعی طور پر اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ابوریہ اپنی کتاب میں جو صاف و صریح عبارتیں اپنے دعووں کے ثبوت میں نقل کرتے ہیں ان میں کس طرح مجرمانہ قطع برید کرتے ہیں اور کس طرح بے باکی کے ساتھ ایک شخص کی بات کو دوسرے شخص کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

(میں نے تمام مستشرقین کی کتابوں کو پڑھا ہے) میں علیٰ شاہد ہوں کہ کٹر سے کٹر متعصب اور جعل ساز مستشرق بھی اتنی بیباکی اور دیدہ دلیری سے صاف اور صریح عبارتوں میں قطع برید کرنے کی جرأت نہیں کر سکا جتنی دلیری سے ابوریہ نے "یہ کارنامہ" انجام دیا ہے۔

اب آپ ہی بتلائیے! اس "علمی اور تحقیقی" کام کرنے والے مصنف کی علمی امانت و دیانت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے (یہ "محقق" ہے یا "رہزن")

دوم: ابوریہ اپنے اُس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے جو وہ جمہور علماء اُمت کے خلاف قائم کرتا ہے۔ علماء متقدمین کی ایسی صاف اور صریح عبارتیں نقل کرتا ہے جو ان سے کسی اور موضوع بحث کے ذیل میں منقول ہیں نہ کہ اس موضوع بحث کے سلسلہ میں جس سے ابوریہ خود بحث کرتا ہے (بالفاظ دیگر بے محل عبارتیں نقل کر کے اپنا الو سیدھا کرتا ہے) مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس کی کتاب کو پڑھنے والا یہ سمجھے کہ وہ بڑے بڑے علماء بھی اس مصنف کی تائید کر رہے ہیں۔

اس (فریب کاری اور دھوکا بازی) کی مثالیں ہم ابوہریرہ کے متعلق ابوریہ کا یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ "ابوہریرۃ تدلیس کیا کرتے تھے" (دھوکہ دیا کرتے تھے)۔

پہلی مثال! تمام علماء حدیث اس پر متفق ہیں کہ ابوہریرۃ جو ایسی حدیثوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بیان کیا کرتے تھے جو انھوں نے آپ کی زبان مبارک سے نہیں بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سُنی ہوتی تھیں اس کا نام (علم اصول حدیث کی اصطلاح میں) ارسال ہے اور تمام علماء اس فعل کے جائز صحیح اور صحابہ سے ثابت ہونے پر متفق ہیں (جیسا کہ مرسلِ صحابی کی بحث میں آپ پڑھ چکے ہیں) اور صرف ابوہریرۃ ہی ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ بلکہ کبار صحابہ تک ایسا کیا کرتے تھے (اور ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا اس لئے کہ ہر صحابی ہر وقت تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر نہیں رہ سکتا تھا لامحالہ ہر صحابی اپنی عدم موجودگی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات اور اعمال وافعال کو حاضرین سے معلوم کیا کرتا تھا اور صحابہ چونکہ سب کے سب عادل اور ثقہ ہیں اس اعتماد کی بنا پر وہ بلا تکلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے اس قول یا فعل کو روایت کرتا تھا اور بالکل صحیح ہوتا تھا)

لیکن استاذ ابوریہ اس ارسال (ترک واسطۂ صحابی) کو تدلیس (دھوکہ دہی) کے نام سے تعبیر کر کے علماء اصول حدیث کے وہ تمام اقوال نقل کر دیتے ہیں جو انھوں نے مُدلِّس راوی (دھوکہ دینے والے راوی) کی جرح و تنقید اور اس کے ناقابل اعتماد ہونے کے بارے میں اصول حدیث کی کتابوں میں نقل کئے ہیں تاکہ وہ اس (جعل سازی) سے یہ ثابت کر سکیں کہ علماء اصول حدیث کے اصول وضوابط کے مطابق ابوہریرۃ کی حدیثیں (بے اصل اور) ناقابل اعتبار اور ناقابل استدلال ہیں۔

دوسری مثال! ابوریہ ابوہریرۃ پر جھوٹ بولنے کی (بے بنیاد) تہمت لگاتے ہیں اور اس کے بعد علماء اصول حدیث کی تصریحات نقل کرتے ہیں کہ:- جو راوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولتا ہے اس کی اگلی پچھلی تمام حدیثوں پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے اور وہ استدلال کے قابل نہیں رہتیں اور بعض علماء تو اس کو کافر تک کہتے ہیں"۔ اور علماء اصول حدیث کے اس ضابطہ کو ابوہریرہ پر چسپاں کر دیتے ہیں بالفاظ دیگر وہ دلیل کا ایک جزو (صغریٰ) کے طور پر ایک خود ساختہ اور بے بنیاد مقدمہ بناتے ہیں اور پھر دوسرا جزو کبریٰ

کے طور پر ایک مسلم ضابطہ اس کے ساتھ لگا دیتے ہیں اور پھر ان دونوں جزوؤں سے اپنی منشا کے مطابق نتیجہ نکالتے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ میں نے اپنے مخالفین کا منہ اس طرح بند کر دیا کہ اب دم بھی نہیں مار سکتے۔ (اس طریق کار کے مطابق ابوہریرہ کے متعلق ابوریہ کی دلیل اور اس کے دونوں مقدموں کی صورت یہ ہوگی: صغریٰ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں جھوٹ بولتے ہیں کبریٰ اور جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولے اس کی تمام اگلی پچھلی حدیثوں قابل اعتبار لائق استدلال نہیں رہتیں۔ نتیجہ۔ لہٰذا ابوہریرۃ کی حدیثیں قابل اعتماد اور لائق استدلال نہیں ہیں حالانکہ اس دلیل کا پہلا مقدمہ صغریٰ قطعاً غلط اور ابوہریرہ پر کھلا ہوا بہتان ہے لہٰذا جو نتیجہ اس سے نکالا ہے وہ بھی قطعاً غلط ہے)

تیسری مثال: اسی طریق پر ابوریہ نے آغاز بحث میں (حدیثوں کے ناقابل اعتماد ہونے پر) یہ دلیل پیش کی ہے: صغریٰ۔ احادیث آحاد ظن (گمان) کے لئے مفید ہوتی ہیں کبریٰ اور گمان حق کے لئے قطعاً مفید نہیں ہوتا نتیجہ لہٰذا احادیث آحاد (حق کے لئے قطعاً مفید نہیں اور وہ) ہم پر کچھ بھی لازم نہیں کرتیں (بالکل بیکار ہیں)

اس دلیل کے پہلے جزو صغریٰ کے ثبوت کی دلیل کے طور پر جو علماء کے صریح اقوال پیش کئے ہیں وہ بیشک صحیح اور درست ہیں لیکن دوسرا جزو کبریٰ ناقابل تسلیم ہے (جیسا کہ ہم خبر واحد کے حجت ہونے کی بحث میں بیان کر چکے ہیں) لہٰذا یہ نتیجہ بھی قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ دنیا جانتی ہے کہ کوئی بھی قیاس (استدلال) اس وقت تک صحیح اور کسی دعوے کو ثابت کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے دونوں جزو (مقدمے صغریٰ وکبریٰ) صحیح اور مسلم نہ ہوں۔ مگر ابوریہ اپنی تمام تحقیقی مباحث میں محض اپنی سینہ زوری سے اس (غلط اور ناقابل تسلیم) طریق پر دلائل پیش کرتے ہیں اور پروا نہیں کرتے اور اپنے اسی عیارانہ طرز کی بدولت وہ کثرت سے ایسے علمی ماخذوں اور حوالوں کو یعنی محققین کی صریح عبارتوں کو (اپنے نظریات کی تائید میں) پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو اگرچہ علمی اور تحقیقی حلقوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں لیکن وہ علمی حلقے (محققین) ابوریہ کے افکار ونظریات اور نقطہ نظر سے قطعاً متفق نہیں بلکہ ان کے افکار ونظریات کلی طور پر ابوریہ کے برعکس اور ان کا نقطۂ نظر ابوریہ سے بالکل مختلف اور

متضاد ہے (اس لحاظ سے ابوریہ اپنے دعوؤں کی تائید میں ان کی عبارتوں کا حوالہ ہرگز نہیں دے سکتے) اس کے باوجود ابوریہ نے محض اپنی کتاب کے ان سادہ لوح پڑھنے والوں کو گمراہ کرنے اور رعب جمانے کی غرض سے جو نہیں جانتے کہ علمی تحقیقات کیسی ہوا کرتی ہیں اس عیارانہ طریق پر) ان محققین کی عبارتوں کی بھرمار کی ہے (تاکہ وہ یہ محسوس کریں کہ اُفوہ کس قدر تحقیقی کتاب اور کیسا محقق مصنف ہے کہ اپنے دعوؤں کے ثبوت اور نظریات کی تائید میں اتنی کثرت سے علماء کی عبارتوں پر عبارتیں نقل کرتا چلا جارہا ہے)

سوم! ابوریہ محض اپنی کمینی خواہشات کی بنا پر صاف اور صریح عبارتوں کے سمجھنے میں عمداً اور جان بوجھ کر غلطی کرتے ہیں اور بڑی سینہ زوری سے اس پر اصرار کرتے ہیں

مثال (۱) جیسا کہ (آپ ابوہریرہ کی تہدستی کے بیان میں پڑھ چکے ہیں کہ) ابوریہ نے ابوہریرہ کے قول علی مل‌ءِ بطنی کے معنی سمجھنے اور بیان کرنے میں جان بوجھ کر ٹھوکر کھائی ہے

مثال (۲) یا جیسا کہ (ابوہریرۃ کے کعب سے حدیثیں روایت کرنے کی بحث میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ) ابوریہ نے ابوہریرۃ کی مجلس درس میں حاضر ہونے والے بشیر بن سعد نامی ایک شخص کے اس قول کے معنی ـــ کہ وہ بشیر (اپنی حماقت سے) حضرت ابوہریرہ کی ان روایتوں کو جو وہ کعب احبار سے روایت کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردیتا اور جو روائتیں ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کرتے ان کو کعب احبار کی طرف منسوب کردیا کرتا تھا ـــ جان بوجھ کر غلط سمجھے اور بیان کئے ہیں (کہ خود ابوہریرہ ایسا کیا کرتے تھے حالانکہ یہ بشیر بن سعد کی حرکت تھی جیسا کہ اس کے بیان سے صاف ظاہر ہے) ہم اس سے پہلے قارئین کو (ابوریہ کی اس عیاری پر متنبہ بھی کرچکے ہیں۔

یہ عیارانہ انداز تحقیق درحقیقت کٹر متعصب مستشرقین کا ہے اسی انداز تحقیق نے ان مستشرقین کو ان کے بعد آنے والے انصاف پسند یورپین محققین کی نظروں سے ہی گرادیا ہے اور ان کی تحقیقات کی وقعت ختم کردی ہے (مگر ہمارے کاسہ لیس محقق ابوریہ اسی لکیر کو پیٹے جارہے ہیں)

چہارم! ابوریہ کے دل و دماغ پر جو شیطانی منصوبے اور افکار و نظریات مسلط ہیں وہ ان کو اس پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی بحث کے دوران ان صریح نصوص کو یکسر نظر انداز کردیں جن کی

صحت پر علماء اُمت متفق ہیں اور ان جھوٹی روایات پر اعتماد کریں جن کے باطل ہونے کی محققین نے تصریح کی ہے اور ان قصوں کہانیوں پر اعتماد کریں جو (گرمئ محفل کے لئے) ادبی مجلسوں میں بیان کی جاتی ہیں اور ایسے حوالوں سے نقل کی جاتی ہیں جن کی محققین کی نظر میں کوئی وقعت نہیں نہ ان کی کوئی سند ہوتی ہے نہ ان کے کہنے والوں کا کچھ اتہ پتہ ہوتا ہے۔

مثال! یہی وجہ ہے کہ ابوریہ نے حدیث کی تمام صحیح کتابوں (صحاح ستہ) صحیح بخاری صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد، سنن لنسائی، سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ میں موجود ابوہریرۃ کی بَسط رداء (چادر پھیلانے) والی حدیث کو بغیر کسی روک ٹوک کے اور بغیر کسی جھجک کے رد کردیا اور اس حدیث کی تکذیب میں مذاق اڑانے اور پھبتیاں کسنے کی حد تک پہونچ گئے دراں حالیکہ اپنا مطلب نکالنے کے وقت وہ دمیری کی کتاب الحیوان، شرح ابن الحدید، عیون الاخبار اور مقامات بدیع الزماں ہمدانی (جیسی لچر) کتابوں کی روایات پر بھی اعتماد کرلیتے ہیں (مطلب جو نکالنا ٹھیرا)

یہ ہو بہو وہی کرم متعصب مستشرقین کا انداز بحث وتحقیق ہے جس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کرچکے ہیں ابوریہ نے قدم بقدم انہی کی پیروی کی ہے (مبارک ہو)

پنجم! پروفیسر ابوریہ نے ابوہریرہ پر گالیوں کی بوچھار کرنے انہیں جھوٹا ثابت کرنے اور عامِ سنت وحدیث اور اس کے راویوں کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے میں کلی طور پر مشہور مستشرق گولڈزیہر، اسپرینگر، وان کریمر جیسے یہودیوں اور مسیموں کی اور دائرۃ المعارف برطانیہ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) کی تحریروں پر اعتماد کیا ہے اور (نہ صرف یہ بلکہ) وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ وہ ان (یہودی ومسیحی دشمنان اسلام کی تحقیقات) سے اپنی بحث وتحقیق میں استفادہ کرتے ہیں حالانکہ وہ ان دشمنوں سے بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابیوں پر گالی گلوج کی بوچھار کرنے کے اور کسی چیز کا استفادہ نہیں کرتے (ان کے پاس اس کے سوا اور ہے بھی کیا) بلکہ بدزبانی، فحش کلامی میں وہ ان مستشرقین سے بہت آگے ہیں اور ان سے بڑھ کر زبان دراز اور مُنہ پھٹ ہیں۔

مثال (۱) ملاحظہ فرمائیے شپرنجر (جرمنی ڈاکٹر اسپرنگر) ابوہریرۃ کے متعلق کہتا ہے:۔

ابوہریرۃ پرہیزگاری کی وجہ سے حدیثیں گھڑنے میں بہت محتاط تھے۔

اس فقرہ میں اگرچہ ابوہریرہ کی طرف جھوٹ کی نسبت کی گئی ہے لیکن یہ فقرہ شائستگی کے لحاظ سے (ابوریہ نے جو ابوہریرۃ کو مغلظ گالیاں دی ہیں اور تذلیل وتحقیر کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے مقابلہ میں تعریف وتوصیف کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔

مثال (۲) علاوہ ازیں اسپرنگر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ: اکثر (بیشتر) جھوٹی روایتیں جو راویوں نے ابوہریرۃ کی طرف منسوب کی ہیں (وہ دراصل ابوہریرۃ کی روایتیں ہی نہیں بلکہ) وہ بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں ابوہریرہ کے سر ڈالدی گئی ہیں" تو دیکھئے اسپرنگر ان (جھوٹی) روایتوں (کے گھڑنے) کا ذمہ دار ابوہریرہ کو نہیں ٹھہراتا لیکن محقق ابوریہ ان تمام روایتوں (کے گھڑنے) کا ذمہ دار — جو ابوہریرۃ کی طرف جھوٹ منسوب کی گئی ہیں — ابوہریرہ کو ٹھیراتے ہیں اور انہی روایتوں کی بنیاد پر وہ حق اور انصاف سے بعید نتیجے نکالتے ہیں (کہ ابوہریرۃ جو حدیثیں گھڑا کرتے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردیا کرتے تھے) چنانچہ ابوریہ دعویٰ کرتے ہیں کہ: ابوہریرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے کو حلال اور جائز سمجھتے تھے بشرطیکہ اس جھوٹ سے کوئی حرام چیز حلال نہ ہوتی ہو اور کوئی حلال چیز حرام نہ ہوتی ہو" اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ ابوہریرہ کی طرف منسوب چند حدیثیں پیش کرتے ہیں جو سب کی سب گھڑی ہوئی ہیں اور ابوہریرہ کی طرف جھوٹ منسوب کردی گئی ہیں جیسا کہ ائمہ حدیث ان حدیثوں کی پول کھول چکے ہیں اس لحاظ سے شاگرد (ابوریہ) اپنے استاد (اسپرنگر) سے بڑھ گیا مگر نہ عقل وخرد، فہم وفراست اور بحث وتحقیق کی گہرائیوں میں اور ادب وتمیز میں بلکہ اس کے علاوہ کسی اور ہی چیز میں (یعنے بیہودگی، بدتمیزی اور جھگڑا بازی میں)

ششم! ابوریہ نے اپنی کتاب میں بحث وتحقیق کے دوران شرافت وتہذیب اور ادب واحترام کا پیرایہ مطلق نہیں اختیار کیا ان کے قلم سے بسا اوقات ایسے کانوں کو ناگوار محسوس ہونے والے کریہہ الفاظ وکلمات نکل جاتے ہیں جو عامی اور بازاری لوگوں کی مجلسوں میں تو سنے جا سکتے ہیں لیکن تصنیف وتالیف کی دنیا اور کتابوں میں کہیں ان کا نام ونشان نہیں مل سکتا۔

مثال (۱) ابوریہ آغاز بحث میں ہی (محض رعب جمانے کے لئے) اپنا نظریہ بیان کرتے ہیں کہ: جھوٹ کے معنی ہیں کسی خبر کا واقعہ کے مطابق نہ ہونا خواہ عمداً ہو خواہ خطا کے طور پر یعنے واقعہ

کے خلاف بات بیان کرنا جھوٹ ہے خواہ بیان کرنے والے نے جان بوجھ کر واقعہ کے خلاف بیان کیا ہو خواہ بلاقصد وارادہ) اس کے بعد کہتے ہیں: "پس اللہ کی لعنت ہو جھوٹ بولنے والوں پر خواہ قصداً جھوٹ بولیں خواہ بلاقصد وارادہ۔"

ابوریہ (جھوٹ کے متعلق اپنا یہ نظریہ بیان کرتے ہیں اور پھر ایسے شخص پر وہ اللہ کی لعنت بھیجتے ہیں حالانکہ وہ) جانتے ہیں کہ بڑے بڑے صحابہ، محدثین، فقہا اور بڑے بڑے علما سے بھی خطا ہو جاتی ہے (اور لاعلمی میں خلاف واقعہ بات زبان وقلم سے نکل جاتی ہے) کبھی وہم ہو جاتا ہے روایتوں میں بھی، فتووں میں بھی تاریخی واقعات میں بھی (اسی لئے مشہور مقولہ ہے الانسان مرکب من الخطاء والنسیان انسان بھول چوک کا پتلا ہے) لہٰذا استاذ ابوریہ کے "ادب وتہذیب" کے اعتبار سے یہ تمام حضرات خدا کی لعنت میں گرفتار رہیں (اس لئے کہ ایسا کون انسان ہے جس سے کبھی غلطی اور بھول چوک نہ ہوئی ہو) درحقیقت ابوریہ اس پیرایہ میں پوری اُمت پر لعنت بھیجنا چاہتے ہیں) یہ ہے ابوریہ کا ادب واحترام)

خدا کا عدل وانصاف دیکھئے کہ اللہ جل شانہٗ نے ہمیں خود ابوریہ کو جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کا مجرم (اور ملعون) ثابت کرنے کی توفیق عطا فرما دی جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔

مثال (۲) پھر ذرا ان فحش گالیوں اور گستاخانہ کلمات والفاظ کو بھی پیش نظر رکھئے جو ابوریہ نے حضرت ابوہریرہ کے پھر حضرت معاویہ کے متعلق اور پھر ان ارباب تحقیق کے متعلق استعمال کئے جن کو وہ جانتے ہیں کہ وہ میری اس انوکھی "علمی بحث وتحقیق" کی ضرور مخالفت کریں گے جس کی اس سے پہلے کہیں مثال نہیں ملتی، ذرا دیکھئے، کیسی نپی تلی مغلظ گالیاں دی ہیں اور کس قدر ذلیل ترین اوصاف کے ساتھ ان کا تعارف کرایا ہے۔

بخدا میں اس کتاب کو پڑھا کرتا اور تعجب کیا کرتا تھا کہ یہ کریہہ کلمات ایک عزت نفس کا احترام کرنے والے پڑھے لکھے شخص کے قلم سے نکل کس طرح رہے ہیں؟ کہ اسی اثنا میں مجھ سے ایک ایسے شخص نے جسے میں ذاتی طور پر جانتا پہچانتا ہوں ایک ایسی بات کہی جس سے میرا سارا تعجب اور حیرانی ختم ہو گئی کہ: وکل اناء بالذی فیہ ینضح — برتن میں جو ہوتا ہے وہی چھلکتا ہے۔ (یعنی ذات کا کمینہ ہے اپنا کمینہ پن دکھا رہا ہے تعجب کی اس میں کیا بات ہے)

ہفتم: ابوریہ اپنی بحث وتحقیق کے دوران اپنی انفرادیت اور اپنے "انوکھے پن" کو ثابت کرنے کی

ذھن میں ـــ اور یہ کہ وہ ایسی اچھوتی تحقیقات پیش کر رہے ہیں جس کی متقدمین تک کو ہوا نہیں لگی اور یہ کہ اُنھوں نے ابوہریرہ کی وہ حقیقت بے نقاب کی ہے جس سے ابوہریرہ سے حدیث حاصل کرنے والے آٹھ سو حاملین حدیث صحابہ وتابعین بھی نا آشنا رہے ہیں ـــ اس کی بھی پروا نہیں کرتے کہ وہ عمر فاروق جیسے سخت گیر صحابہ کرام پر بھی "سیدھے پن" اور "بے خبری" کا الزام لگا رہے ہے کہ اُنھوں نے اسلام میں داخل ہونے والے اہل کتاب کو ـــ جو (اُن کے بقول) مسلمان ہی اس لئے ہوئے

- -

تھے کہ اسلام میں خفیہ طور پر رخنہ اندازی کریں ـــ اس بات کا موقعہ دیا کہ وہ رسول اللہ علیہ الصلوۃ والسلام پر جھوٹ بولیں (اور گھڑی ہوئی اسرائیلی روایات آپ کی طرف منسوب کریں) اور پھر یہ صحابہ کرام (اپنی ناسمجھی اور بیوقوفی سے) اُن سے اُن جھوٹی حدیثوں کو روایت کریں اور (اس جعلسازی کو سمجھنے کے لئے ان میں اتنی بھی سمجھ بوجھ نہ ہو جتنی (ابوریہ کو میسر ہے کہ) وہ احساس کر سکیں کہ یہ لوگ تو اسلام میں رخنے ڈالنے والے جعلساز ہیں بلکہ ان کے فریب میں آجائیں اور ان سے (وہ جعلی) حدیثیں نقل کرتے رہیں اور اُن کو دین میں خفیہ رخنہ اندازی اور عقائد کو خراب کرنے کے لئے آزاد اور بے لگام چھوڑ دیں کہ وہ مزے کرتے پھریں بلکہ ان کی تعظیم وتکریم بھی کیجائے۔

پھر ان (آٹھ سو صحابہ وتابعین پر ہی نہیں بلکہ ان) کے بعد آنے والی نسلوں پر بھی بے خبری کا الزام لگاتے ہیں جن میں ہزاروں لاکھوں سرکردہ علماء، فقہاء، مجتہدین، محدثین شامل ہیں کہ وہ بھی اس حقیقت کو نہ پا سکے جس کو (بارہ صدی بعد) ہمارے "انوکھے محقق" (ابوریہ) نے پایا ہے اور اُنھوں نے اپنی کتاب میں اِن حقائق کو درج کیا ہے جنکی اُمت کے اِن لاکھوں علماء کو .... ہوا تک ابھی نہیں لگی وہ تو اب سے ایک ہزار سال پہلے کتابوں میں درج ہو جانی چاہئیں تھیں مگر اُنھوں نے (اپنی ناسمجھی کی وجہ سے) ایسا نہیں کیا یہاں تک کہ یہ دُنیا کے انوکھے محقق (ابوریہ) اُٹھے اور اُنھوں نے اس مہم کو سر کیا اور یہ کہ وہ اچھوتی تحقیقات ہیں جو اس کے بعد علمی تحقیقات کا رخ بالکل بدل دیں گی۔

یہ ڈینگیں ہمارے اُس انوکھے محقق نے خود اپنی زبان سے ماری ہیں اور قلم سے ہانکی ہیں، ان کی کتاب کے قریب قریب ہر صفحے پر آپ کو ان ڈینگوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ (اوٹ پٹانگ) دعوے یہ غرور ونخوت اور یہ تعلیاں صرف ایک ہی چیز کی خبر دیتی ہیں اور وہ ہے اس شخص کی عقل (کی

جاہل بے وقوف انسان ہے)

دراصل پاک و بے نیاز ہے وہ ذات جس نے عقل کے حصّے بھی اپنی مخلوق کو اسی طرح تقسیم کئے ہیں جیسے رزق کے حصّے (کہ کسی کو نانِ شبینہ بھی میسر نہیں اور کوئی رزق سے مالا مال ہے اسی طرح کوئی عقل و خرد سے بالکل ہی کورا ہے اور کوئی عقل و دانش کی دولت سے مالا مال ہے)

ہشتم! استاذ ابوریہ کا دعویٰ ہے کہ: "اُنھوں نے اپنی کتاب میں بڑی کثرت سے ایسے قطعی اور یقینی دلائل پیش کئے کہ شک و شبہ ان کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا اور اُن پر مزید ایسی تائیدات پیش کی ہیں جن میں ذرہ برابر لچک نہیں ہے۔"

اس دعوے کی صداقت کا پتہ چلانے کے لئے ہمارے لئے یہ بہت کافی ہے کہ ہم ان ماخذ (کتابوں) پر ایک سرسری نظر ڈال لیں جن کی رو سے اُنھوں نے اُن مسلمہ امور کی مخالفت اور تردید کی ہے جن کو اُمت نسلاً بعد نسل مانتی چلی آئی ہے ان میں سے چند کتابوں اور اُن کے مصنفین کے نام درج ہیں

(۱) دمیری کی کتاب حیاۃ الحیوان (۲) ابن رشیق کی العمدۃ (۳) ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغۃ (۴) ابن قتیبہ کی المعارف (۵) نویری کی نہایۃ الارب (۶) جاحظ کی البیان والتبیین اور (۷) الحیوان (۸) ابن قتیبہ کی عیون الاخبار (۹) ابن جبیر کی رحلۃ (۱۰) مقریزی کی الخطط (۱۱) ابن طبا طبا کی الفخری (۱۲) یاقوت کی معجم الادبا (۱۳) خطیب کی تاریخ بغداد (۱۴) ابن عساکر کی تاریخ (۱۵) ابوالفدا کی تاریخ النجوم الزاھرۃ (۱۶) معلوف باشا کی معجم الحیوان (۱۷) عبد الحسین شرف الدین کی ابوھریرۃ (۱۸) بغدادی کی خزانۃ الادب (۱۹) ثعالبی کی خاص الخاص (۲۰) ثعالبی کی ثمار القلوب (۲۱) توحیدی کی الصداقۃ والصدیق (۲۲) صفدی کی نکت الھمیان فی نکت العمیان (۲۳) علوانی کی شرح لامیۃ العجم (۲۴) جرجی زیدان (عیسائی) کی العرب قبل الاسلام اور (۲۵) تاریخ التمدن الاسلامی (۲۶) برطانیہ کی دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۲۷) فان کریمر کی الحضارۃ الاسلامیۃ (۲۸) فولٹن کی السیادۃ العربیہ (۲۹) ابراھیم یازجی کی حضارۃ الاسلام (۳۰) فلپ ھٹی اور ایڈورڈ جرجس اور جبرائیل جبور کی تاریخ العرب المطول (۳۱) بروکلمن کی

تاریخ الشعوب الاسلامیہ (۳۲) قس (پادری) ابراہیم لوقا کی المسیحیة فی الاسلام

(۳۳) گولڈزیہر کی کتاب العقیدة والشریعة فی الاسلام

یہ ایک نمونہ ہے ان ماخذوں (کتابوں) کا جن کی فہرست مصنف نے کتاب کے آخر میں بڑے فخر کے ساتھ پیش کی ہے، اور دعویٰ کیا ہے کہ یہ وہ ماخذ ہیں جن میں — ان کے زعم کے مطابق — شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں اور انہی کتابوں سے میں نے ایسے دلائل وشواہد پیش کئے ہیں جن کے پاس بھی شک نہیں پھٹکتا اور ان میں ذرہ برابر کمزوری نہیں پائی جاتی۔

رہیں وہ صاف اور صریح عبارتیں جو بخاری، مسلم، مسند احمد، موطا مالک، نسائی، ترمذی اور حدیث کی مشہور ومعروف اور معتبر کتابوں میں موجود ہیں تو ان میں سے جس کو چاہا یہ کہہ کر جھوٹا قرار دیدیا کہ ان میں شک وشبہ کی گنجائش ہے یا ان میں ضعف پایا جاتا ہے۔

بخاری کی صریح عبارتوں میں تو شک ہے لیکن اسکافی کی کہانیاں قابل اعتماد ہیں،

مسلم کی روایتوں میں تو ضعف ہے لیکن ثعالبی کے سچا ہونے میں مطلق شبہ نہیں

احمد تو جھوٹی حدیثیں روایت کرتے ہیں لیکن ابن ابی الحدید سچی روایتیں ہی نقل کرتے ہیں

مجھے اس سے تو کچھ کہنا نہیں جس نے یہ ہرزہ سرائی کی ہے۔ مگر میں ان بزرگ کا گریباں ضرور پکڑنا چاہتا ہوں — جو خود عہد حاضر کے سرفہرست ادیبوں میں سے ہیں اور انھوں نے ابوریہ کی کتاب پر نہایت زوردار تقریظ لکھی ہے اور ماخذوں (کتب حوالہ) کی فراوانی اور بہتانات پر اپنی انتہائی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے — اور پوچھنا چاہتا ہوں — اس لئے کہ وہی اس ملک مصر میں جدید طرز تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) کے علمبردار ہیں — کہ کیا اس ہرزہ سرائی کرنے والے شخص کو "محققین" میں یا "تحقیقی کام" کرنے والے طالب علموں میں یا ان لوگوں میں ہی شمار کیا جاسکتا ہے جو "علم اور تحقیق" کے معنی سمجھتے ہیں؟

نہم! ابوریہ کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے "علمی تحقیق" کے طرز پر کتاب لکھی ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ علمی طرز کیا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب میں اختیار کیا ہے؟ حدیثوں کو جانچنے پرکھنے اور صحیح قرار دینے کے وہ ایک یا چند ضابطے کیا ہیں جو انھوں نے تجویز کئے ہیں؟ حدیث کی موجودہ اور متداول کتابوں میں جو عظیم الشان ذخیرہ حدیثوں کا موجود ہے اس کا کیا کریں؟ کیا ان سب کو دریابرد کردیں؟ یا ان سب کو قبول کرلیں؟ یا کچھ کو قبول کریں اور کچھ کو چھوڑدیں؟ اور کس قاعدہ اور ضابطہ کے تحت

ایسا کریں (یعنے جو حدیثیں قبول کی جائیں وہ کس قاعدہ کے تحت اور جو رد کی جائیں وہ کس ضابطہ کے تحت) کیا خالص عقل کے تحت؟ تو وہ کس کی عقل ہو؟ کیا ابوریہ کی جیسی عقل جس نے سچی اور کھری حدیثوں کو جھوٹا اور جھوٹی کہانیوں کو سچا کہا ہے اور صحیح بخاری کی حدیثوں کو رد کیا ہے اور اسکافی کے قصّے کہانیوں کو قبول کیا ہے؟ پھر ابوھریرۃ کی حدیثوں کا ہم کیا بنائیں؟ کیا وہ سب کی سب جھوٹی ہیں؟ یا کچھ جھوٹی ہیں اور کچھ سچی؟ تو ان جھوٹی اور سچی حدیثوں میں امتیاز کیسے کیا جائے؟

ابوریہ نے اپنی اس تصنیف میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ صرف قارئین پر انفرادیت اور انوکھے پن کا سکہ جمانا ہے کہ تمام قدما، محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل حدیثوں کے جانچنے پرکھنے کے صحیح تحقیقی قواعد وضوابط اختیار کرنے سے بالکل بے خبر رہے ہیں ان کی اس غفلت اور بے خبری کو طشت ازبام کرنے والے وہ پہلے اور منفرد محقق ہیں (آج تک کسی بھی محقق کو اس کا احساس تک نہ ہوا) اور اس حربہ کے ذریعہ حدیث اور اس کے راویوں کے بارے میں ــ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے تمام راویان حدیث کے بارے میں ــ شکوک وشبہات پیدا کرنے کا کوئی بھی طریقہ ایسا نہیں جو انھوں نے اختیار نہ کیا ہو (اور کوئی کسر ایسی نہیں جو انھوں نے باقی رہنے دی ہو) اس کے باوجود ان کا دعویٰ یہ ہے کہ میں نے حدیث کی وہ خدمت کی ہے جو اب تک کسی نے نہیں کی (یعنے حدیثوں کا قصہ ہی ختم کردیا اور راویان حدیث کا جنازہ ہی نکال دیا)

تو کیا یہی ہے علمی طرز تحقیق؟ کیا یہی ہے وہ تحقیقی مطالعہ جو خالص علمی بنیادوں پر کیا گیا ہے؟ کیا یہی ہے وہ سب سے پہلی تحقیقی تصنیف جس کی نظیر آج تک کوئی مصنف پیش نہیں کرسکا؟

میں تو شہادت دینے کے لئے تیار ہوں کہ جو خرد مند مصنفین اپنی عزت نفس کا اور اپنے اور اپنے قارئین کی عقل وخرد کا احترام کرنے والے ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی اس سے قبل اس قسم کی کتاب نہیں لکھی ابوریہ کے لئے ہی یہ شرف مبارک ہو (نہ صرف یہ، بلکہ عمر عزیز کے تیئس سال کی محنت اس کارنامہ پر صرف کرنا بھی مبارک ہو۔ سچ فرمایا ہے اللہ جل شانہ نے ارشاد ہے:۔

قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً؟ الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم

(اے نبی) کہدو: کیا میں اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ٹوٹے میں رہنے والوں کا حال نہ بتلاؤں؟ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں برباد ہوئیں اور وہ

یحسنون صنعا ۔ یہی سمجھتے رہے کہ ہم اچھے کام کررہے ہیں ۔

آخر میں ہم اپنا فیصلہ آپ کو سنائے دیتے ہیں :۔ سابقہ بیانات سے یہ بالکل واضح ہو چکا کہ ابوریہ کی کتاب اضواء علی السنۃ النبویہ کی ذرہ برابر علمی اور تحقیقی قدر وقیمت اور وقعت نہیں ہو سکتی اس کے دو سبب ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ کتاب علمی اور تحقیقی طرز واسلوب سے بالکل محروم ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس کا مصنف علمی امانت و دیانت سے بالکل عاری ہے

یہ خدائی فیصلہ ہے۔ سنئے ارشاد ہے :۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ۔ اور اللہ ہی حق بات کہتا ہے اور وہی راہ حق کی رہنمائی کرتا ہے ۔

فصل ہفتم

مستشرقین کا تصورِ سنّت

تمہید، صلیبی جنگوں کے عوامل ومحرکات تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی ملکوں پر مسیحی اقوام اور صلیبی عساکر کے مجنونانہ حملوں کے محرکات وعوامل صرف دو تھے۔

(۱) پہلا عامل دینی بغض وعناد اور کورانہ مذہبی تعصب تھا جس نے اہل کلیسا کو اس پر برانگیختہ کیا تھا کہ وہ یورپ کے عوام میں مسلمانوں کے خلاف بدترین نفرت و بیزاری کے جذبات بھڑکائیں۔ گھناؤنے قسم کے بے سروپا الزامات و اتہامات ان کے خلاف تراشیں اور مسیحی اقوام کو شدت کے ساتھ اس پر اُکسائیں کہ ان کافروں (یعنی مسلمانوں) کے قبضہ سے وطنِ مسیح یعنی فلسطین و بیت المقدس کو آزاد کرانا ان کا اولین فریضہ ہے۔ چنانچہ ان صلیبی لشکروں میں اکثر و بیشتر لڑنے والے وہ مذہبی دیوانے ہوتے تھے جن کو محض دینی تعصب ــــ انتہائی نیک نیتی اور عقیدت مندی کے تحت ــــ گھربار اور وطن کو خیرباد کہہ کر میدان جنگ میں کودنے پر مجبور کرتا تھا جہاں ان کو موت وہلاکت، قتل و خون ریزی، تباہی و بربادی، پے در پے حملوں کا سامنا اور یکے بعد دیگرے آنے والی تازہ دم فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

(۲) دوسرا عامل سیاسی واستعماری (ہوس ملک گیری) تھا۔ یورپ کے بادشاہوں اور فرمانرواؤں نے بلادِ اسلامیہ اور خاص کر شام اور اُس کے گرد ونواح کے ملکوں کے بارے میں جس طرح وہاں کی دولت وثروت، کارخانوں اور تجارت گاہوں اور سرسبز وشاداب زرخیز زمینوں کی بے مثل پیداوار کا حال سُن رکھا تھا،

جس سے وہ (یورپین ممالک) قطعاً محروم تھے۔ اسی طرح وہاں کے امن و امان راحت و اطمینان، اور شاندار تہذیب و تمدن کی ایسی داستانیں بھی سُنی ہوئی تھیں جو اُنہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ چنانچہ ان حکمرانوں نے دیوانہ وار "عیسیٰ مسیح" کے مقدس نام پر اپنی فوجوں کی کمان کرتے ہوئے اسلامی ممالک پر چڑھائی کر دی۔ حالانکہ ان کے دلوں میں استعماری اغراض، ہوس ملک گیری اور مسلمانوں کی دولت و ثروت کی حرص و طمع کے علاوہ "حمایت حق" کا نام و نشان تک نہ تھا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ مسلسل دو صدی تک خون ریز جنگ کے بعد بھی یہ مال و زر کے دیوانے مسیحی حملہ آور خائب و خاسر اور ہزیمت خوردہ خالی ہاتھ اپنے گھروں کو واپس جائیں اور جن ریاستوں اور علاقوں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا وہ بھی ان کے قبضہ سے نکل جائیں اور یہ حریص و لالچی حملہ آور دلوں میں حسرت و یاس اور پیشانیوں پر ہزیمت و نامرادی کا داغ لئے ہوئے اپنے وطن کو واپس لوٹیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اتنا ضرور ہوا کہ یہ لوگ اپنے دماغوں میں تعلیمات اسلام کی روشنی، اور اپنے ہاتھوں میں ایسی تہذیب و تمدن کے ثمرات، لئے ہوئے لوٹے جس سے خود ان کا ملک محروم تھا (بالفاظ دیگر دو صدی تک اسلامی ممالک کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے وہ اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے آشنا ضرور ہو گئے)

اگرچہ یورپ کے عوام نے تو اپنی اس بیک بینی و دو گوش واپسی کو ہی بہت غنیمت سمجھا تھا، مگر ان کے حکمراں اور فرماں روا اس مصمم عزم کے ساتھ واپس ہوئے کہ خواہ کتنا ہی زمانہ لگے اور کتنے ہی مصارف و مالی خسارے اُٹھانے پڑیں وہ ان اسلامی ملکوں پر ایک نہ ایک دن غلبہ حاصل کر کے چھوڑیں گے

سرد جنگ کا آغاز اور تحریک استشراق

نیز ان ممالک اسلامیہ پر فوجی طاقت اور عسکری قوت سے غلبہ پانے میں ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد قطعی طور پر اُنھوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نبرد آزمائی کے بجائے ان کے عقائد و تعلیمات اور تاریخ و تمدن کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ان پر علمی اور تمدنی حملے زیادہ تر موثر اور کارگر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ ممالک اسلامیہ پر یورپین اقوام کی ثقافتی اور ذہنی یورش اور سرد جنگ شروع کرنے کی تمہید تھی اور یہیں سے مستشرقین (اسلامی اور مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن پر ریسرچ کرنے والے انگریزوں) کی مختلف جماعتوں کی داغ بیل پڑتی ہے۔ جو آج تک برابر معروف کار ہیں۔ اور جن کی

تشکیل ابھی قریبی زمانہ تک مسیحی پادریوں اور یہودی عالموں سے ہوتی رہی ہے (یعنی عیسائی اور یہودی مذہبی علماء مختلف انجمنیں اور ادارے بناکر اسلامی اور مشرقی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن پر ریسرچ کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تھے) ان علماء یہود ونصاریٰ کے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت وعداوت اور ان کے عناد وتعصب کے بارے میں تو کسی کو شک وشبہ ہو ہی کیا سکتا ہے۔ اگرچہ ان علماء یہود ونصاریٰ میں بھی ایک ایسا انصاف پسند طبقہ موجود ہے جس نے خود اس حلقۂ متعصب مسیحی مبلغین کی جماعت پر ۔۔ اسلام کی حمایت میں ۔۔ حملے کئے ہیں اور انھوں نے اسلامی وعربی علوم وفنون کے دیانتدارانہ مطالعہ اور تحقیق کا پوری طرح اہتمام کیا ہے جو بیشتر حق وانصاف پر مبنی ہے۔ لیکن مستشرقین کی غالب اکثریت ۔۔ جو آج تک بھی اسلامی اور عربی علوم وفنون کے مطالعہ اور علمی تحقیق میں مصروف ہے۔ یا تو وہ متعصب یہودی عالم اور عیسائی پادری ہیں جن کا واحد مقصد ہی تعلیمات اسلامیہ میں تحریف وقطع برید اور اسلام کی حسین وجمیل صورت کو مسخ کرنا اور بگاڑنا ہے۔ یا وہ استعماری ایجنٹ ہیں جن کا واحد مقصد اسلامی ملکوں کی تہذیب وتمدن اور قومی وملی روایات کی جانب سے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات اور اضطراب وہیجان پیدا کرنا اور اسلامی تہذیب وتمدن کو خود مسلمانوں کے ذہنوں میں انتہائی مسخ شدہ ومکروہ شکل میں اُتارنا ہے (تاکہ وہ بآسانی یورپین تہذیب وتمدن کو اختیار کرکے پوری فکری وذہنی غلامی میں گرفتار ہو جائیں)۔

یورپین مصنفین ومستشرقین کا طریق کار ان لوگوں کی تحقیقات میں مندرجہ ذیل خصائص نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

(۱) ہر اس چیز سے بدگمانی اور غلط فہمی پیدا کرنا جس کا تعلق اسلام کے اساسی مقاصد اور جوہری اغراض وغایات سے ہو۔

(۲) مسلمانوں کے عظماء رجال، علماء دین اور اکابر ملت کے بارے میں بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا کرنا۔

(۳) مختلف ادوار میں اور بالخصوص دور اول میں اسلامی معاشرہ کی ایسی تصویر پیش کرنا جس میں انتشار ہی انتشار نظر آتا ہو اور "انانیت" اس دور کی عظیم شخصیتوں اور رجال کار کا گلا گھونٹتی دکھائی دیتی ہو۔

(۴) اسلامی تہذیب کی حقیقت سے بہت دور اور واقعہ سے بعید بعید "تصویر کشی" جس میں اس کی شان وشوکت کو حقیر وخوار اور اس کے آثار باقیہ اور کارہائے نمایاں کی توہین کی گئی ہو۔

(۵) اسلامی معاشرہ کے حقیقی مزاج اور اس کی فطرت سے جاہل وناآشنا ہونے کی وجہ سے اس کے بارے میں اپنے ملک وملت کے اخلاق وعادات کو سامنے رکھ کر فیصلہ صادر کرنا (بالفاظ دیگر اسلامی معاشرہ کو یورپین معاشرہ پر قیاس کرکے ان کے اخلاق وعادات پر حکم لگانا)

(۶) نصوص (صریح اور واضح عبارتوں) کو اپنی مزعومہ رائے اور مفروضہ قیاسات کے تابع بنانا (بالفاظ دیگر نصوص کی من مانی مرادیں گھڑنا اور اپنی اغراض وخواہشات کے مطابق ان میں تاویلیں کرنا)۔ جن نصوص کو یہ رد کرتے ہیں یا قبول کرتے ہیں اس میں ہٹ دھرمی اور سینہ زوری سے کام لینا (یعنی نصوص کے رد وقبول میں ہٹ دھرمی سے کام لینا جس کو چاہا رد کردیا۔ جس کو چاہا قبول کرلیا)

(۷) اکثر وبیشتر بالقصد والارادہ نصوص میں تحریف کرنا اور جہاں تحریف کی گنجائش نہ ہو وہاں عبارتوں کے معانی بیان کرنے میں کج فہمی بلکہ غلط فہمی سے کام لینا۔

(۸) جن ماخذوں سے حوالے نقل کرتے ہیں ان کے انتخاب میں ہٹ دھرمی اور سینہ زوری مثلاً ادب کی کتابوں کے حوالوں سے تاریخ حدیث میں فیصلے کرنا اسی طرح تاریخ کی کتابوں کے اقتباسات سے تاریخ فقہ میں حکم لگانا۔ دمیری کی کتاب الحیوان سے جو کچھ نقل کرتے ہیں اس کو تو یہ لوگ صحیح بتلاتے ہیں لیکن امام مالک جو کچھ موطا میں روایت کرتے ہیں اس کی یہ تکذیب کرتے ہیں اور یہ سب کچھ صرف خواہش نفس کے اتباع اور حق سے انحراف کی خاطر کیا جاتا ہے۔ یہ ہے روح استشراق ......

جس کی نمایاں خصوصیات ہم نے اوپر ذکر کیں ان مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہر علم وفن تاریخ، فقہ، تفسیر حدیث، ادب اور تہذیب وتمدن کو اپنی ریسرچ (عمل جراحی) کا تختۂ مشق بنایا ہوا ہے۔

مستشرقین کی کامیابی کے وسائل

ان کی حکومتوں کی بے پناہ حوصلہ افزائیاں۔ ان کے پاس ماخذوں کی کثرت وفراوانی، مطالعہ وتحقیق کے لئے ان کی فارغ البالی، ان میں سے ہر ایک کا کسی ایک فن یا اس فن کے کسی خاص شعبہ میں پوری مہارت اور

خصوصیت حاصل کرنا یہ وہ اسباب ہیں جنہوں نے ان کو اس کا موقعہ فراہم کیا کہ اپنی زندگیاں اس کام میں صرف کر دیں اور انہی وسائل نے اپنی تحقیقات کو علمی رنگ میں پیش کرنے میں ان کی مساعدت کی۔ انہیں اسباب و وسائل کی آسانیوں کی بنا پر انھوں نے اسلامی موضوعات سے متعلق اتنی کتابوں اور تحقیقات کا سرمایہ جمع کر لیا جو آج تک خود ہمارے علماء بھی جمع نہ کر سکے۔

ہمارے علماء کی ان وسائل سے محرومی

ہمارے علماء دورِ حاضر میں ایک ایسے معاشرہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو اپنی سیاست، دولت و ثروت اور ملی و ملکی موقف (پوزیشن) میں تشتت و انتشار کا شکار ہے۔ لہٰذا جس کام کے لئے یہ مستشرقین اپنی عمریں فارغ کر لیتے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے علماء کے لئے اس کا موقعہ کہاں میسر آ سکتا ہے؟

تحریکِ استشراق کی کامیابی کے تباہ کن اثرات

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہمارے جدید تعلیمیافتہ گروہ کے لئے ان مستشرقین کی کتابیں اور تحقیقات ہی مرجع بنی ہوئی ہیں۔ یہ جدید تعلیم و تربیت یافتہ گروہ سرتاپا مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، مختلف غیر عربی انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی وغیرہ زبانوں سے ان کو کچھ تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے (اسی کے نتیجہ میں وہ ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں)۔

جدید تعلیمیافتہ طبقہ کی فریب خوردگی اور گمراہی

ان جدید تہذیب یافتہ لوگوں میں سے بیشتر مسلمان محققین ان مستشرقین کی تحقیقات کے دامِ فریب میں پھنس چکے ہیں، اور ان کی علمی مقدرت و فوقیت اور دیانت و اخلاص کے معتقد ہیں۔ اپنی تصنیفات و تالیفات میں انھیں کے نقشِ قدم پر انہی کے افکار و نظریات کی رہنمائی میں چلتے ہیں بلکہ بعض نے تو ان کے افکار و آراء کو بعینہٖ اور بجنسہٖ نقل کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے حضرات بھی ہیں جو ان سے اخذ و استفادہ پر فخر بھی کرتے ہیں اور بعض ایسے زیرک ہیں کہ انھوں[۱] نے ان کے افکار و خیالات کو نیا اسلامی لباس پہنانا شروع کر دیا ہے۔ میں اس وقت آپ کے سامنے ان کے نمونے پیش کرنا نہیں چاہتا، آپ استاذ احمد امین کا اندازِ تحقیق ان کی تصنیف فجر الاسلام میں دیکھ ہی چکے ہوں گے جو استشراقی مکتبِ فکر کے مسلمان تلامذہ کے، اندازِ تحقیقِ علمی کی ایک روشن مثال ہے

[۱] ہمارے ملک میں ایسے زیرک و طرار لوگوں میں سرِ فہرست ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ڈائرکٹر مرکزی ادارۂ تحقیقات

(باقی صفحہ ۱۶۱)

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم مستشرقین کا سنت کے بارے میں موقف بیان کرتے ہیں۔ اور سنت سے متعلق مستشرقین کے ان شبہات کا ذکر کرتے ہیں جن کی انھوں نے دھوم مچا رکھی ہے۔ اور جن سے بہت سے مسلمان اہل قلم بھی مرعوب و متاثر ہو چکے ہیں، جیسا کہ آپ مشاہدہ کر چکے ہیں۔

گولڈ تسیہر اور نظریہ سنت

مستشرقین میں شاید سب سے زیادہ خطرناک، سب سے زیادہ جلد باز اور اس میدان میں خباثت اور فساد پھیلانے کے اندر سب سے زیادہ پیش پیش ہنگری کا یہودی مستشرق گولڈ تسیہر (زیہر) ہے اس کو عربی ماخذوں (قدما مصنفین کی کتابوں) سے خوب واقفیت حاصل تھی، جیسا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے تخریبی کارناموں (تصانیف) سے ظاہر ہے، یہاں تک کہ گذشتہ صدی اور خود ہمارے دور میں بھی اس کی تصانیف اور اس کی علمی تحقیقات مستشرقین کا اختصاصی اور اہم ماخذ و مرجع بنی ہوئی ہیں۔ استاذ احمد امین مصریؒ نے اپنی کتاب فجر الاسلام اور ضحی الاسلام کے اندر تاریخ حدیث کے ذیل میں اس گولڈ کی بہت سی آراء و نظریات کو غیر رسمی شکل میں (بغیر نام لئے) اور بعض خیالات کو واضح رسمی صورت میں (نام لے کر) نقل کیا ہے اور تصریح کی ہے کہ یہ گولڈ تسیہر کی آراء و تحقیقات ہیں، اسی طرح ڈاکٹر علی حسن عبد القادر نے اپنی تصنیف نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی کے اندر تاریخ حدیث کے سلسلہ میں اس مستشرق کے شبہات کا خلاصہ نقل کیا ہے جیسا کہ ہم خود بھی اس موضوع پر اس کی تحقیق اور رائے کا صاف اور واضح تذکرہ اس کی کتاب "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام" میں موجود پاتے ہیں۔ اس کتاب (العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام) کا عربی میں ترجمہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، استاذ عبد العزیز عبد الحق اور ڈاکٹر علی حسن عبد القادر نے کیا ہے۔

ہم بھی اس مقام پر گولڈ کی اس موضوع "تاریخ حدیث" سے متعلق آراء و نظریات پر تنقید و تبصرہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس موقع پر اس کے ہر پیراگراف کا تتبع اور ہر فقرہ کے جواب کا استقصاء تو نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کے لئے تو ایک مستقل اور علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس مختصر سے

(بقیہ صفحہ ۱۶۰) اصلاحی کا نام نامی و اسم گرامی ہے ملاحظہ فرمائیے ان کے مقالہ "تصور سنت و تحریک حدیث" ماہنامہ فکر و نظر کراچی اگرچہ موصوف تو اب ادارۂ تحقیقات اسلامی سے واپس میکگل چلے گئے ہیں مگر استشراقی ذہن و فکر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اپنے بہت سے شاگرد یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں، اسی طرح ڈاکٹر ابو ریہ کی کتاب اضواء علی السنۃ المحمدیہ کا اسلوب تحقیق بھی ایسا ہی ہے۔ ۱۲ محشی

رسالہ میں تاریخ حدیث سے متعلق اس کے تمام تر شکوک شبہات اور جملہ تحقیقات و تحریفات کی ایک ایک کرکے تردید کرنا ممکن نہیں۔ اس مقام پر تو میں اس کی تحقیقات کا عام نقطۂ نظر اور اس کی ریسرچ کے خاص خاص "خطوط" کی نشاندہی کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں باقی تفصیلی تردید اور ایک ایک شبہ کا جواب آئندہ کسی موقع کے لیے چھوڑتا ہوں۔ اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس فرض کی ادائیگی کی خاطر وہ میری عمر مقدر اور زندگی میں توسیع فرمادیں۔

ڈاکٹر علی حسن عبد القادر "نظرۃ عامۃ فی الفقہ" صفحہ ۱۲۶ پر لکھتے ہیں :-

"یہاں ایک بڑا ہی اہم مسئلہ درپیش ہے۔ ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ اس کی کچھ تفصیل ناظرین کے سامنے پیش کریں دور حاضر کا یہ اہم مسئلہ "وضع حدیث" ہے۔ ابھی قریبی زمانہ تک مستشرقین کے حلقوں میں اس نظریہ اور خیال کا بڑا غلغلہ رہا ہے کہ حدیث کا اکثر حصہ ایسا صحیح نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ اسلام کے دور اول یعنے اسلام کے عہد طفلی کا یہ قابل اعتماد اور ضبط تحریر میں آیا ہوا وثیقہ ہے۔ بلکہ یہ ذخیرۂ احادیث تو دراصل اسلام کے تشکیلی دور اور عہد استحکام، میں خود مسلمانوں کی تشریعی مساعی کے کارناموں میں سے ایک شاندار کارنامہ ہے۔"

ڈاکٹر حسن علی عبد القادر نے اشارۃً یہ بھی کہہ دیا ہے کہ "یہ ہی گولڈ تسہیر کی رائے اور تحقیق ہے جس کا اظہار اس نے اپنی کتاب "دراسات اسلامیہ" میں کیا ہے۔

مستشرقین کے شکوک و شبہات

ان مصنفین نے اس نظریہ کی تشریح اس طرح کی ہے :-

(۱) اسلام کے اس دور اول میں حکمران خاندان بنو امیہ اور اہل علم و اہل تقویٰ کے درمیان شدید نزاع اور کش مکش قائم تھی۔ اسی لئے یہ اہل علم و ارباب تقویٰ حدیث و سنت کو، ان کے دست برد سے بچانے کی غرض سے جمع اور محفوظ کرنے میں مشغول ہوگئے اور چونکہ جو ذخیرۂ احادیث ان کے ہاتھ آیا وہ (اموی حکومت کے خلاف) ان کی مطلب برآری کے لئے معین و کارآمد نہ ہوسکا۔ . . . .

. . . . . اس لئے انہوں نے اپنی طرف سے ایسی احادیث گھڑنی شروع کیں

جن (کے مضامین) سے ان کو دلچسپی تھی۔ اور جو (اُن کے خیال میں) اسلامی رُوح کے منافی نہ تھیں۔ اور (اس وضع حدیث پر اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کیا اور اپنے اس فعل شنیع کے جواز میں یہ دلیل پیش کی کہ ہم یہ سب کچھ دین سے بغاوت و سرکشی الحاد و بے دینی اور اسلامی تعلیمات سے بُعد وانحراف کا مقابلہ کرنے اور دین کی حمایت و صیانت کے لئے کر رہے ہیں (لہٰذا اس میں کوئی گناہ نہیں) اور چونکہ خاندان بنو اُمیہ کے دشمن علویین (اور خاندان نبوت) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے ان علماء و اتقیاء کی تمام تر اُمیدیں وابستہ تھیں، اس لئے سب سے پہلے انہوں نے اہل بیت کی مدح و ثنا میں حدیثیں گھڑنا شروع کیں۔ جس کے نتیجہ میں بنو اُمیہ کی عیب چینی و حرف گیری اور ان پر حملے کرنے کے لئے بالواسطہ راہ ہموار ہو گئی۔

اور اسی طرح پہلی صدی ہجری میں ان فقہی اور قانونی احکام کے مخالفین کے مقابلہ میں حدیث نے ایک خاموش معارضہ (پروپیگنڈہ) کی حیثیت سے انتہائی تکلیف دہ شکل اختیار کر لی۔

(۲) معاملہ انہیں مخالفین تک محدود نہ رہا، بلکہ حکومت خود بھی ان (محدثین) کے مقابلہ میں خاموش نہ رہ سکی۔ چنانچہ جب حکومت کسی "رائے" کو عام کرنا یا ان اتقیاء کو خاموش کرنا چاہتی تو وہ بھی اپنے نظریات کے موافق حدیثوں کو اس کا ذریعہ بناتی اور (وضع حدیث کے) وہی ہتھکنڈے اختیار کرتی جو اس کے مخالفین کرتے تھے۔ حدیثیں وضع کی جاتیں یا وضع حدیث کی دعوت دی جاتی تھی۔ ہمارے اس دعوے کا ثبوت اس امر سے بآسانی مل سکتا ہے کہ ہم کوئی بھی سیاسی یا اعتقادی اختلافی مسئلہ ایسا نہیں پاتے جس کی بنیاد قوی سند والی احادیث پر نہ ہو۔ لہٰذا یہ احادیث کو وضع کرنے اور انکو پھیلانے یا بعض کو دبانے اور ان کو موضوع کہہ کر رَد کرنے کا آغاز بہت ابتدائی دور میں ہو چکا تھا۔ چنانچہ بنو اُمیہ کا طریق کار یہ تھا" جیسا کہ حضرت معاویہ نے مغیرہ بن شعبہ سے کہا تھا کہ تم علی کو بُرا بھلا کہنے اور عثمان کے حق میں دُعائے رحمت کرنے میں مطلق سستی سے کام نہ لو۔ اور تم علی کے ساتھیوں کو گالیاں دو،

اور ان کی حدیثوں کو دباؤ، اور ان کے مقابلہ پر عثمانؓ اور ان کے حامیوں کی تعریف کرو، ان کو اپنے سے قریب کرو اور ان کی بات سنو۔"

اس طریق پر علیؓ کے خلاف امویوں کی (تفضیلت کی) حدیثوں کی بنیاد پڑی۔ اور بنو امیہ اور ان کے متبعین کو اپنے نظریات کے موافق حدیثوں میں دروغ گوئی سے کام لینے کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ البتہ اہم مسئلہ تو ان لوگوں کے مہیا کرنے کا تھا جن کی طرف ان احادیث کی نسبت کی جاتی تھی۔ اور ان امویوں نے تو امام زہری جیسے امام حدیث کو بھی اپنے مکر و فریب سے احادیث وضع کرنے کے لیے آلہ کار بنا لیا تھا۔

ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر موصوف نے اس مقام پر مستشرق گولڈ تسیہر کے امام زہری پر الزامات کو انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں گولڈ کے اس بیان کو پورا کا پورا نقل کر دوں جس کی کاپی میں نے کلیۃ الشرع کے درس کے دوران ڈاکٹر صاحب موصوف سے لی تھی۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ میرے پاس ہنوز موجود ہے جس میں مستشرق مذکور کہتا ہے:-

عبدالملک بن مروان نے ابن زبیر کی بغاوت کے زمانے میں لوگوں کو حج کرنے سے روک دیا تھا، اور مسجد اقصیٰ میں (کعبہ کے مقابلہ پر) قبۃ الصخرۃ بنایا تھا تاکہ لوگ حج کے لئے یہاں آئیں اور کعبہ کی بجائے اس کے گرد طواف کریں اس کے بعد عبدالملک نے چاہا کہ کسی تدبیر سے عوام الناس کو دینی عقیدت کے تحت اس قبۃ الصخرہ کا حج کرنے پر آمادہ کرے۔ چنانچہ اس نے زہری کو جو امتِ اسلامیہ میں شہرہ آفاق شخصیت کے مالک تھے۔ اس مقصد کے لئے حدیثیں وضع کرنے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے بہت سی حدیثیں (اس مقصد کے لئے) وضع کیں۔ ان میں سے ایک حدیث یہ ہے:

لاتشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد مسجدی ھذا والمسجد الحرام والمسجد الاقصی	سوائے تین مسجدوں کے کسی اور مسجد کی طرف سفر نہ کیا جائے۔ میری یہ مسجد (نبوی)، مسجد حرام، اور مسجد اقصیٰ۔

انہیں احادیث میں سے ایک حدیث یہ ہے:-

الصلوٰۃ فی المسجد الاقصی	مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنا دوسری مساجد

تعدل الف صلوٰۃ فیما سواہ — میں نماز پڑھنے سے ثواب میں ہزار گنا زیادہ ہر

اسی طرح کی اور بھی حدیثیں ہیں۔

اس امر کی دلیل کہ زہری ہی ان احادیث کے وضع کرنے والے ہیں یہ کہ۔

(۱) زہری عبدالملک کے دوست تھے اور ان کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔

(۲) دوسرے یہ کہ جو احادیث بیت المقدس کے فضائل سے متعلق وارد ہوئی ہیں وہ سارمی کی ساری صرف زہری کی سند سے مروی ہیں۔

رہا یہ کہ بنو امیہ کو ان احادیث کی نشر و اشاعت کی جو ان کے مطلب برآری کے لئے مفید تھیں جرأت و ہمت کیوں اور کیسے ہوئی؟ اور انھوں نے زہری جیسے مرد صالح کو وضع حدیث کے لئے کیسے استعمال کر لیا، اور استعمال بھی ایسا جو مادی قسم کا (یعنی مال و زر کی طمع) نہ تھا بلکہ محض دھوکہ دہی اور فریب خوردگی کی نوع کا تھا۔ ان سوالات کا جواب ہم ان بعض روایات سے واضح طور پر ملتا ہے جو آج تک خطیب بغدادی کے یہاں محفوظ چلی آتی ہیں۔ ہم یہاں ان سے کام لے سکتے ہیں۔ (۱) عبدالرزاق بن ہمام (۲۱۱ھ) عن معمر بن راشد (۱۵۳) کی سند سے ہمیں ایک روایت ملتی ہے جو مختلف طریقوں سے مروی ہے۔ اس سند میں معمر بن راشد ان لوگوں میں سے ہیں جن کا زہری سے سماع ثابت ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ولید بن ابراہیم اُموی زہری کے پاس ایک صحیفہ لئے ہوئے آیا اور اس کو ان کے سامنے رکھ کر اس میں لکھی ہوئی احادیث کی بطور سماع ان سے روایت کرنے کی اجازت مانگی (یعنے اس طرح کہ گویا وہ احادیث ولید نے زہری سے سُنی ہیں)۔ اس پر زُہری نے ولید کو بلا تامل تردد اجازت دیدی اور کہا، میرے سوا ان احادیث کو تمہیں اور کون تبلا سکتا ہے؟ اس طرح اس اموی کے لئے جو کچھ اس صحیفہ میں لکھا تھا زہری کی مرویات کی حیثیت سے روایت کرنا ممکن ہوگیا۔ اس واقعہ کی ان بہت سی مثالوں سے تائید ہوتی ہے جن کا سابق میں ذکر آچکا ہے کہ زُہری شاہی خاندان کی خواہشات کو دینی وسائل کے ذریعہ پورا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اگرچہ اپنے تقویٰ کی بنا پر کبھی کبھی ان کو اس میں تامل و تردد بھی ہوتا

تھا لیکن وہ ہمیشہ اس حالت پر قائم نہیں رہ سکتے تھے اور مستقل طور پر حکومت کے
محکموں کا اثر قبول کرنے سے بچ نہیں سکتے تھے چنانچہ اسی مستشرق نے بروایت زہری
ہم سے ایک نہایت اہم بات روایت کی ہے۔ اور وہ خود زہری کا ایک قول ہے کہ:
ان اُمرا نے ہمیں حدیثیں لکھنے (وضع کرنے) پر مجبور کر دیا ہے" یہ روایت بتلاتی ہے
کہ زہری اُمت اسلامیہ میں اپنی شہرت و قبول عام سے فائدہ اٹھا کر حکومت
کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اور یہ کہ زہری ان لوگوں میں
سے نہ تھے جن کو بنو اُمیہ کا ہمنوا نہ بنایا جاسکے۔ بلکہ وہ اس گروہ میں سے تھے جو حکومت
کے ساتھ عملی تعاون کے قائل تھے۔ اسی وجہ سے وہ قصر شاہی میں جانے آنے
سے اجتناب بھی نہ کرتے تھے۔ بلکہ اکثر وہ سلطان کی حاشیہ برداری میں چلتے پھرتے
نظر آتے تھے۔ بلکہ ہم تو ان کو حج کے سفر میں حجاج کے خدام میں بھی موجود پاتے ہیں
(یہ حجاج وہی موذی اور مبغوض شخص ہے جس سے ہر مسلمان کو سخت عداوت و نفرت
تھی) خلیفہ ہشام نے زہری کو اپنے ولی عہد کا اتالیق و مربی بھی مقرر کیا تھا۔ اور یزید
ثانی کے عہد حکومت میں زہری نے قاضی کا عہدہ بھی قبول کر لیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات
جن کے زیر اثر وہ ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیتے تھے اور وہ ان لوگوں میں سے نہ
تھے جو اس ظالم و جابر خاندان خلفاء بنو امیہ ـــــ ارباب تقویٰ اس اموی خاندان
کو ان ہی الفاظ سے یاد کرتے تھے ـــــ کے مقابلہ میں صف آرا تھے۔

اس کے بعد مستشرق مذکور ظالم حکمرانوں کے پاس آنے جانے اور سلاطین کے پاس اٹھنے بیٹھنے
سے جو فتنے پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر ذرا تفصیل سے کرتا ہے۔ نیز یہ کہ جو لوگ منصب قضا کو قبول کر لیتے
تھے ان کو اہل تقویٰ غیر ثقہ لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ اور کہتا ہے کہ:

دیکھو شعبی رنگین کپڑے پہنتے تھے اور نوعمروں کے ساتھ کھیلتے تھے صرف اس
لئے کہ ان کو منصب قضا کا اہل نہ سمجھا جائے۔ نیز یہ کہ شعبی نے ابن الاشعث کے
ساتھ مل کر حجاج کے مقابلہ میں جنگ کی تھی۔ اور یہ کہ علماء کے نزدیک یہ بات
مسلّم تھی کہ جس نے قضا کی ذمہ داری سنبھالی گویا وہ بے چھری کے ذبح کر دیا
گیا۔

شرعی احکام سے متعلق حدیثیں بھی گھڑی جاتی تھیں

زہری پر الزامات کی فہرست گنانے (اور چارج شیٹ لگانے) کے بعد مستشرق مذکور (گولڈ تسیہر) کہتا ہے :-

"وضع حدیث کے باب میں صرف سیاسی حدیثوں یا اموی خاندان کی مصالح سے متعلق حدیثوں تک ہی معاملہ محدود نہ تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر خالص دینی امور حتٰی کہ وہ عبادات بھی اس وضع حدیث سے نہ بچی تھیں جن میں اہل مدینہ کا تعامل ان بنو امیہ کے عمل سے مختلف ہوتا تھا جیسا کہ معروف ہے کہ (۱) جمعہ کے دو خطبے ہوتے تھے (۲) اور خلفاء راشدین کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے (۳) اور عید کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا۔ لیکن بنو امیہ نے اس پورے طرز عمل کو بدل دیا تھا ۔۔۔ اموی خلیفہ جمعہ کی نماز کا خطبہ بیٹھ کر دیتے اور رجاء بن حیوۃ کی روایت سے اس پر استدلال کرتے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے"۔ اسی پر جابر بن سمرۃ نے یہ کہہ کر سختی سے ٹوکا تھا کہ "جو یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے وہ جھوٹ بولتا ہے"۔ اسی طرح حضرت معاویہ نے منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ نیز انھوں نے مقصورۃ کی بنا ڈالی جس کو بعد میں عباسیوں نے ختم کیا"۔

گولڈ زیہر کہتا ہے :-

"ان بنو امیہ نے اپنے مطلب کے موافق حدیثوں کی اشاعت ہی پر بس نہیں کی بلکہ جو حدیثیں ان کے نظریات و مصالح کی ترجمانی نہ کرتیں ان کو دبانے حتٰی کہ ان کو چھپانے اور ان کی تضعیف کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ اسی لئے بلا شبہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو احادیث بنو امیہ کے مصالح کے موافق تھیں وہ بنو عباس کے برسر اقتدار آنے کے بعد گوشۂ خفا میں جا پڑیں (اور بنو عباس نے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو بنو امیہ نے اپنے مخالف حدیثوں کے ساتھ کیا تھا)

اس کے بعد مستشرق مذکور اپنے اس قول کی تائید میں (کہ بنو امیہ نے مخالف حدیثوں کو گرانے اور ساقط

کرنے کی کوششیں کیں) بعض علماء جرح و تعدیل کے وہ اقوال پیش کرتا ہے جو رواۃ حدیث کی جرح و تعدیل کے سلسلہ میں عام طور پر ائمہ جرح و تعدیل پیش کیا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے اقوال بکثرت ائمہ جرح و تعدیل سے منقول ہیں (گویا یہ سب بنوامیہ کی کارگذاری ہے) مثلاً

(۱) محدث عاصم بن نبیل — یہ حافظ حدیث ہیں اور ثقہ ہیں ان کا پورا نام ضحاک بن مخلد ابو عاصم النبیل ہے یہ امام زفر کے اصحاب (تلامذہ) میں سے ہیں (یاد رہے) یہ عاصم بن النبیل نہیں ہیں (وہ اور ہیں) ۲۱۲ھ میں ان کی وفات ہوئی اور نوے[1] سال عمر پائی ہے — کہتے ہیں کہ: "میں نے نیک لوگوں کو حدیث سے زیادہ کسی چیز میں جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔" (۲) اسی طرح کا ایک قول یحییٰ بن سعید القطان متوفی ۱۹۲ھ سے بھی منقول ہے (۳) وکیع، زیاد بن عبداللہ کے متعلق کہتے ہیں کہ: "حدیث میں بلند مقام کا مالک ہونے کے باوجود وہ بہت جھوٹ بولا کرتے تھے۔" (۴) یزید بن ہارون کا قول ہے کہ ان کے زمانہ میں اہل کوفہ بجز ایک کے سب مدلس" (دھوکہ باز) تھے یہاں تک کہ دونوں سفیانوں کا ذکر بھی مدلسین کی فہرست میں کیا گیا ہے" نیز کہتا ہے، دوسری صدی میں مسلمانوں نے سمجھ رکھا تھا کہ صحت حدیث کے اعتراف کے لئے ضروری ہے کہ صرف اس کی ظاہری شکل (روایت) کی طرف رجوع کیا جائے اور نیز یہ کہ جید اسناد والی احادیث میں بھی بہت سی موضوع حدیثیں موجود ہیں"

ان مستشرقین کو اپنے اس نظریہ (تحریک وضع حدیث) کی تائید میں ایک حدیث سے اور بھی مدد ملی اور وہ حدیث یہ ہے :-

سیکثر الحدیث عنی فمن حدثکم بحدیث فطبقوہ علی کتاب اللہ فما وافقہ فھو منی، قلتہ اولم اقلہ ۔	عنقریب میرے نام سے بکثرت حدیثیں روایت کیجائیں گی سو جو تم سے کوئی حدیث بیان کرے اس کو کتاب اللہ سے ملا کر دیکھو، جو اس کے موافق ہو وہ میری جانب سے ہے خواہ میں نے اس کو کہا ہو یا نہ کہا ہو۔

---

(۱) ملاحظہ فرمایئے تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۲۳

(وضع حدیث کا) یہ وہ اساسی اصول ہے جو وضع حدیث کا سلسلہ عام ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد وجود میں آ گیا تھا۔ اس کا کچھ پتہ ہم کو ان احادیث سے بھی چلتا ہے جن کو قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے ان میں سے ایک روایت وہ ہے جس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیدیا تھا۔ سوائے اس کتے کے جو شکار کے لئے ہو، یا مویشیوں کی حفاظت کے لئے" تو اس پر کسی نے ابن عمر کو بتلایا کہ "ابوہریرہ اس حدیث میں او کلب زرع (یا وہ کتا جو کھیت کی حفاظت کے لئے ہو) کے الفاظ بھی بڑھاتے تھے" تو اس پر ابن عمر نے کہا: "ابوہریرہ کے پاس زمین تھی جس میں وہ کاشت کیا کرتے تھے" ابن عمر کا یہ قول ایک محدث کی ان حرکات کی غمازی کرتا ہے جو وہ اپنی شخصی اغراض کے لئے روا رکھتا ہے۔

حدیث کے صحیفوں کا رواج

بعض فقہی احکام و اصول کو ثابت کرنے کے لئے محدثین نے زبانی روایات کے علاوہ ایک اور دروازہ بھی کھٹکھٹایا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے بعض ایسے لکھے ہوئے صحیفے (نوشتے) ظاہر کرنے شروع کئے جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارادوں کو وضاحت کے ساتھ بتلاتے ہیں ـــ تصدیق کے لئے حدیث کی یہ نوع ہمارے دور میں بھی موجود ہے ـــ اور جہاں کسی صحیفہ کے اصل نسخہ کے متعلق بحث آتی ہے تو یہ حضرات نہ اصل نسخہ کے بارے میں جس سے اس کو نقل کیا گیا ہے کچھ پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ اور نہ اس کی صحت کی چھان بین کرتے ہیں۔ ہم ان وضاعین حدیث کی اس جرأت و جسارت کی تحقیق اس واقعہ سے بھی کر سکتے ہیں کہ بنو امیہ کے عہد میں بعض لوگوں نے شمالی و جنوبی عرب قبائل کے درمیان اتفاق و اتحاد کی ایک تحریک چلائی اور انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک تحریری معاہدہ پیش کیا جو تبع بن معدیکرب کے زمانہ میں یمنی اور ربیعہ قبائل کے درمیان کبھی ہوا تھا، (اور دعویٰ کیا کہ) یہ معاہدہ ان کو اس حمیری سردار (تبع) کے کسی پوتے پر پوتے کے پاس محفوظ شکل میں ملا ہے" تو جو لوگ ایسی بے بنیاد باتوں کو بھی قبول کر سکتے ہیں، ان کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ ان جیسے صحیفوں کو جن کا زمانہ نسبتاً

قریب جس سے (یعنی عہد نبی علیہ السلام) بہ صحیح تسلیم کرلیں۔ ہماری مراد اس سے وہ
صحیفہ ہے جس میں چھوٹی بڑی گائے بیل کے نصابِ زکوٰۃ کی تفصیلات درج ہیں
اس لئے کہ اس مسئلہ نصاب زکوٰۃ مواشی میں مختلف احادیث وارد ہوئی ہیں لیکن
ان میں کوئی حدیث بھی برصحیح نہیں ہے جس سے جامعین حدیث زکوٰۃ کی ادائیگی کے
لئے کوئی واضح اور قطعی نظام اخذ کرسکتے لہذا ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی ان نوشتہ ہدایات کی طرف رجوع کیا جو آپ نے عرب کے مختلف علاقوں
میں اپنے عاملوں (زکوٰۃ وصول کرنے والے کارندوں) کے نام لکھ کر بھیجی تھیں مثلاً
آپ نے (یمن کے عامل) معاذ بن جبل کو وصیت لکھ کر دی تھی یا اور عمرو بن حزم وغیرہ
محصلین کے پاس کچھ نوشتہ ہدایات بھیجی تھیں جن میں درج شدہ تفصیلات حدیث
کے راوی ہم سے بیان کرتے ہیں۔ ان نسخوں پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا جن کو اصل نوشتوں
سے نقل کیا گیا تھا۔ بلکہ بعض قدیم اصل نوشتوں کو بھی پیش کیا مثلاً ابن عمر کے
پاس ایک نوشتہ تھا جس سے عمر بن عبدالعزیز نے ایک نسخہ نقل کرنے کا حکم دیا تھا اور
ابوداؤد نے زہری سے ابن عمر کے اس صحیفہ (نسخہ) کی تصحیح بھی نقل کی ہے ایک اور
صحیفہ (نوشتہ) بھی بتلایا جاتا ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر بھی ثبت
تھی اس کا بھی ابوداؤد نے ذکر کیا ہے۔ حماد بن اسامہ نے بروایت ثمامہ بن انس
اس نوشتہ (صحیفہ) کو ظاہر کیا ہے حضرت ابوبکر صدیق نے اس صحیفہ (نوشتہ) کو انس بن
مالک کے پاس بھیجا تھا جب وہ (انس) زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے

گولڈ تسیہر کے اس طویل اقتباس کو نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر حسن علی عبدالقادر موصوف کہتے ہیں کہ:۔
(حدیث کے متعلق) یہ نظریہ اور تصور ہے جو گذشتہ صدی میں مستشرقین کے حلقوں میں مقبول اور کارفرما تھا
اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: "دورِ حاضر میں ان مستشرقین کے حلقوں میں اس نظریہ کے برعکس ایک
اور نظریہ عام اور مقبول ہوگیا ہے جو اس قدیم نظریہ کے خلاف اور اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اسلامی نقطہ ہائے
نظر کے موافق ومطابق ہے"

مؤلف موصوف نے اس نئے اور بہتر نقطہ نظر کے محض تذکرہ پر اکتفا کیا ہے اور ان دونوں میں سے

کسی پر بھی — نہ اُس پر نہ اس پر — بحث و تنقید نہیں کی گویا:۔

وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ — اللہ نے مومنوں کو قتال سے بچا دیا۔

پر عمل کیا ہے (یعنے مستشرقین نے ہی مستشرقین کی تردید کر دی اور ہمیں تردید کی زحمت سے بچا دیا۔)

مستشرقین کے نظریات و اوہام کے جوابات[1]

تمہید اس کتاب (السنت ومکانتها فی التشریع الاسلامی) کے گذشتہ صفحات میں ہم صحابہ کرام کے حفظ حدیث اور روایت حدیث کے بارے میں غیر معقول اہتمام اور غایت شغف کا تفصیلی جائزہ لے چکے ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام کے بعد تابعین اور اتباع تابعین کی جمع حدیث اور روایت حدیث کی شدت حرص اور احادیث کے ذخیرہ کو ہر طرح کی ملاوٹ اور تحریف کی آمیزشوں سے پاک و صاف کرنے کے بارے میں ان کی انتہائی پیمان بین، حیرت انگیز اور زبردست کوشش و کاوش پر بھی کما حقہٗ روشنی ڈال چکے ہیں اسی طرح ہم یہ بھی دکھلا چکے ہیں کہ علماء سنت (محدثین) نے کتنا بین۔ و شناسائین حدیث کی پورش و جستجو میں کیسی کیسی جانفشانیاں اُٹھائی ہیں اور ان کی بدنیتوں اور خبیث افرادں کو کس خوبی سے بے نقاب کیا ہے اور ذخیرۂ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو جھوٹی احادیث کے اضافے (ان بدباطن لوگوں نے) کر دیئے تھے ان کی کس تحقیق و تنقیح کے ساتھ نشاندہی کی ہے یہاں تک کہ (ان محدثین اور علماء رجال کی ناقابل تردید کوششوں اور کاوشوں سے) سنت کے صحیح مجموعے "کتب صحاح" کی شکل میں وجود میں آ گئے پھر (اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ) تا قدین فن (علماء اصول حدیث اور ائمہ جرح و تعدیل) نے ان کتب

---

[1] ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی رحمۃ اللہ نے اس مقام پر گولڈ زیہر اور اس کے پیرو مستشرقین کے ان نظریات کے اصولی طور پر نہایت محکم اور ایسے ٹھوس جوابات دیئے ہیں جن کے ان تمام مفروضہ قیاسات اور اوہام و شکوک کی وہ عمارت زمین بوس (منہدم) ہو جاتی ہے جو ان اصول پر قائم ہے اور ان تمام جزئیات و نظائر کا بالاستیعاب جواب دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی ہے جو ان مفروضہ اصول پر مبنی ہیں ہم آخر میں انشاء اللہ ان تمام جزئیات و نظائر کے بھی جوابات دینگے جن سے ان مستشرقین کے طرز استدلال کی حقیقت بھی بے نقاب ہو جائے ۱۲ محشی

حدیث کی ایک ایک حدیث پر روایت و درایت دونوں کے اعتبار سے سیر حاصل بحث و تنقید کی ہے۔ تب جا کر انھوں نے احادیث صحیحہ کی صحت کا اعتراف اور (ان کی حجیت کو) تسلیم کیا ہے۔

اگر محدثین اور علمار رجال کی ان تمام بے نظیر اور بے مثال تحقیقی اور تنقیدی مساعی کو آپ ان مستشرقین کے مفروضہ قیاسات اور اوہام وشکوک سے الگ ہو کر بنظر غائر منصفانہ نقطۂ نظر سے دیکھیں تو آپ کو کلی طور پر یقین ہو جائے گا کہ مستشرقین محض اوہام اور بے بنیاد شکوک وشبہات کی تاریک وادیوں میں بھٹکتے اور ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں (نہ صرف یہ بلکہ) یہ لوگ حقائق و واقعات کے بارے میں فیصلے کرنے کے اندر اپنی اغراض وخواہشات اور تعصب وعناد سے بھی متاثر ہیں اور حقائق کے ساتھ ایک ایسا کھیل کھیل رہے ہیں جو ایک انصاف پسند محقق کی نظروں میں علم وفن کی تحقیر و تذلیل اور اس کو بازیچۂ اطفال بنا دینے کے مترادف ہے اور یہ تاریخی حقائق کو ایسے ذلیل نظریات وخواہشات کے سامنے سرنگوں کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں جو محض ہوائے نفس اور تعصب وعناد پر مبنی ہیں۔

یہ ایک مختصر سی تمہید ہے جس سے ہمارا مقصد مکمل ومفصل جواب دینا نہیں ہے بلکہ ہم ایک منصف قاری کی توجہ ان حقائق کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں جو اس کے سامنے عیاں ہیں تاکہ یہ حقائق اس کی نظر سے اس وقت اوجھل نہ ہو جائیں جب ہم ان تعصب پرستوں کے ان دعووں پر پوری بحث اور تنقید کریں۔

سطور ذیل میں ہم (مستشرقین کے) اس دعوے کے ان بعض اجزا کا مختصر سا تنقیدی جائزہ لینا چاہتے ہیں جن کی تفصیل سابق میں گذر چکی ہے اور ان بعض اجزا پر تفصیلی بحث کرنا چاہتے جن سے اب تک ہم نے (اس کتاب میں) تعرض نہیں کیا ہے۔

کیا حدیث مسلمانوں کے فکری ارتقار کا نتیجہ ہے

یہودی مستشرق گولڈ تسیہر کا دعویٰ ہے کہ:

"حدیث کا اکثر وبیشتر حصہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اسلام کے دینی، سیاسی، اور اجتماعی ارتقار کا نتیجہ ہے۔"

معلوم نہیں اس متعصب یہودی کو اس قسم کا (بے اصل اور بے بنیاد) دعویٰ کرنے کی جرأت کس طرح ہوئی حالانکہ ثابت شدہ تاریخی حقائق و دلائل اس کی تکذیب و تردید کر رہے ہیں۔

(۱) اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دار فانی سے رفیق اعلیٰ اور عالم ملکوت کی جانب

اس وقت منتقل ہوئے ہیں جب کہ آپ نے اسلام کی اعلیٰ وارفع اور محکم و مستحکم عمارت کی بنیادیں ان کامل واکمل اساسی اصول پر استوار کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن) میں نازل فرمائے اور ان سنتوں، شرعی احکام اور (انسانی زندگی پر) محیط اور کافی (دوامی قوانین پر جو شارع دین الٰہی ہونے کی حیثیت سے خود آپ نے نافذ فرمائے۔ چنانچہ خاتم انبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے دستر ہزار یا بقول بعض ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمانوں کے مجمع میں) یہ اعلان فرما دیا تھا۔

ترکت فیکم امرین، لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنتی

میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت

اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی اعلان فرمایا:۔

لقد ترکتکم علی الحنیفیۃ السمحۃ لیلھا کنھارھا۔

بخدا میں نے تم کو ایسی سیدھی، سادی اور آسان شریعت پر چھوڑا ہے جس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔

(۲) اور یہ تو سب ہی جانتے اور مانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن عظیم کی سب سے آخری آیت یہ نازل ہوئی ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

آج (جمعہ ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو) میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیدیا۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس آیت کریمہ سے اسلام کے (ہر پہلو سے) کامل و مکمل اور (انسانی زندگی کے لئے) کافی اور تام ہونے کا اعلان فرمانا ہے۔ اس لئے (ہم قطعی اور یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات اس وقت ہوئی ہے جب اسلام مکمل طور پر پختہ و مستحکم ہو چکا تھا۔ کم سن اور نوخیز بچہ نہ تھا جیسا کہ اس یہودی مستشرق کا دعویٰ ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ عالمگیر فتوحات اسلامی کے نتیجہ میں مسلمان ماہرین قانون اسلامی کو تنوع احوال وظروف کے تحت ایسے جزئیات و حوادث کا سامنا کرنا پڑا جو قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ مذکور نہ تھے لہٰذا ان (غیر منصوص) مسائل میں انھوں نے (شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم کے مطابق) قیاس و استنباط کی غرض سے اپنی آراء سے

غیر منصوص مسائل کو منصوص مسائل پر قیاس کیا ہے اور ان کے احکام کتاب و سنت سے اخذ کر کے تجویز کئے ہیں اور اس (اجتہاد و قیاس) میں اُنھوں نے اسلام کے دائرہ سے باہر قدم مطلق نہیں رکھا اور اسلامی تعلیمات سے سر موانحراف نہیں کیا۔

(۳) عصر اول میں اسلام کی غایت درجہ پختگی اور استحکام کی قوت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ناقابل تردید تاریخی حقیقت بہت کافی ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق قیصر و کسریٰ جیسے شہنشاہوں اور ان کی سلطنتوں پر ــــ جو تہذیب و تمدن اور استحکام و استقلال میں اپنی مثال آپ تھیں ــــ حیرت انگیز طریق پر غلبہ اور تسلط و اقتدار حاصل کرنے میں! اور پھر ان دونوں عظیم تر ملکوں اور قوموں کا سیاسی، معاشی اور اقتصادی انتظام کرنے میں! اور ملکوں میں آباد قوموں پر قیصر و کسریٰ سے بہتر اور کامل تر نظام مملکت و حکمرانی اور ان سے زیادہ عدل و انصاف مبنی پائیدار حکومت قائم کرنے میں نہ صرف یہ کہ کامیاب ہو گئے بلکہ قیصر و کسریٰ سے بہت بڑھ گئے۔ ذرا سوچئے اگر اسلام فی الحقیقت کم سن" (ناپختہ و ناتمام) ہوتا تو فاروق اعظم اس عظیم تر ذمہ داری اور بارگراں کو کس طرح اُٹھا سکتے تھے (یعنی ایک خام اور غیر ترقی یافتہ دین و آئین کے ساتھ؛ دنیا کی ان قدیم و مستحکم سلطنتوں اور تہذیبوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر غائت درجہ پائیدار اسلامی سلطنت اور اسلامی تہذیب و تمدن کو قائم کرنے میں کیونکر کامیاب ہو سکتے تھے) اور پھر اس طویل و عریض اور وسیع سلطنت کو کیسے چلا سکتے تھے اور کس طرح ایک ایسا خارق العادۃ اور عدل و انصاف پر مبنی نظام سلطنت قائم کر سکتے تھے جس سے ان ملکوں میں آباد قوموں کو وہ امن و سعادت کی نعمت میسر آئی جو ان کو اپنے سابق بادشاہوں اور حکمرانوں کے عہد سلطنت میں کبھی میسر نہ آئی تھی۔

(۴) علاوہ ازیں ایک انصاف پسند محقق واضح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ روز اول سے مسلمان روئے زمین کے جن خطوں اور ملکوں میں بھی پہونچے وہ ہر جگہ ایک ہی جیسی عبادت ادا کرتے تھے، باہمی معاملات میں ایک ہی طرح کے احکام پر عمل پیرا تھے، اپنے گھرانوں اور خاندانوں کی عائلی زندگی کی بنیادیں ایک ہی اساس پر قائم کرتے تھے، اور اس طرح مسلمان دنیا بھر میں عقائد، عبادات، معاملات اور عادات و اخلاق میں اکثر و بیشتر متفق و متحد تھے یہ عالمگیر اتحاد و اتفاق اور یکسانیت ہرگز میسر بلکہ ممکن نہ ہوتی اگر جزیرۃ العرب سے نکلنے سے پہلے ان کے پاس ایک ایسا پختہ و مکمل اور انسانی زندگی پر محیط و مستحکم نظام اور دین و آئین موجود نہ ہوتا جس میں ان کی زندگی کے تمام شعبوں اور مرحلوں کے لئے واضح احکام و قوانین وضع کر دیئے

گئے ہوں۔ اگر مجموعۂ احادیث یا اس کا اکثر و بیشتر حصہ پہلی دو صدیوں میں مسلمانوں کے فکری ارتقاء کا نتیجہ ہوتا تو یقینی اور لازمی طور پر شمالی افریقہ میں رہنے والے مسلمانوں کی عبادات جنوبی چین میں بسنے والے مسلمانوں کی عبادات سے مختلف ہوتیں اس لئے کہ ان دو دراز ملکوں کی معیشت و ماحول اور فکری و سماجی زندگی میں مکمل طور پر اختلاف پایا جاتا ہے پھر یہ دونوں خطے باوجود انتہائی بعد مسافت کے اسلامی معیشت و معاشرت اور دین و آئین میں اس قدر متحد اور یکساں کس طرح ہو گئے؟

ایک شبہ کا ازالہ

جہاں تک پہلی صدی ہجری کے بعد متعدد فقہی مذاہب کی تشکیل اور تعدد کا تعلق ہے سو یہ بلاشبہ کتاب و سنت کی ہمہ گیری اور وسعت و جامعیت کا لازمی[1] نتیجہ ہے اور کتاب و سنت کے سمجھنے میں صحابہ کرام کے مختلف مدارج فہم و ادراک اور مختلف نقطہ ہائے نظر کا ناگزیر[2] اثر ہے۔ کتاب اللہ تو مسلمانوں کے درمیان محفوظ و متواتر چلی ہی آتی تھی، رہی سنت تو آپ کو دوسری و تیسری صدی کے مجتہدین اور ائمہ مذاہب میں ایسا کوئی قول اور مذہب نہ ملے گا جس کا قائل کوئی صحابی یا تابعی نہ رہا ہو اور یہ (صحابہ و تابعین کے اقوال و مذاہب کا اختلاف) یقیناً اس مستشرق کے زعم کے مطابق دین کے مکمل ارتقاء اور کمال بلوغ سے پہلے رونما ہو چکا[3] ہے ـــ اس تحقیق کے بعد سارے اوہام و شکوک کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں۔

باقی اس مستشرق مذکور نے اپنے نقطۂ نظر کے ثبوت میں جو دلائل پیش کئے ہیں عنقریب آپ دیکھیں گے کہ ان سب کی حیثیت بھی ایک ایسی عمارت کی سی ہے جو کسی ایسے کمزور کنارے پر کھڑی ہو جو گرا چاہتا ہے اور اللہ کے فضل سے ابھی آپ کے سامنے ایک ایک کر کے یہ تمام دلائل اعداداً ساقط ہو جائیں گے۔

---

[1] یعنی کتاب و سنت کے وضع کردہ احکام و قوانین چونکہ اصولی طور پر انسانی زندگی کے تمام تر اطوار اور مختلف زمانوں اور ملکوں میں متنوع احوال و ظروف پر حاوی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مختلف قوموں، ملکوں اور زمانوں میں احوال اور واقعات جزئیہ مختلف اور نو بنو ہوتے رہتے ہیں اس لئے ہر خطہ اور ملک کے علماء و فقہاء نے جب اپنے اپنے ملک اور زمانہ میں کتاب و سنت سے احکام اخذ و استنباط کئے تو لازمی طور پر احکام جزئیہ فقہیہ میں اختلاف و تنوع اور تعدد رونما ہوا اور ایسا ہونا ناگزیر تھا

[2] یعنی صحابہ کرام نے اپنی اپنی فہم و ادراک کے مطابق نصوص کتاب و سنت سے احکام استنباط کئے اور غیر منصوص مسائل کو منصوص پر قیاس کرنے کی غرض سے اپنی اپنی فہم و بصیرت کے مطابق تنقیحات قائم کیں۔ اس لئے صحابہ کرام کے اجتہادی مسائل میں اختلاف رونما ہوا نیز اس کے نتیجہ میں تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نقطہ ہائے نظر اور مسلکوں میں اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر تھا حتی

[3] اس لئے کہ یہ مستشرق دوسری اور تیسری صدی کو ارتقاء دین اور بلوغ اسلام کا زمانہ قرار دیتا ہے اور صحابہ و تابعین کا عہد

۱۔ دین میں بنو اُمیہ کا موقف

یہودی مستشرق گولڈ تسہیر اپنے نظریہ (تحریک وضع حدیث) کی بنیاد اُس نزاع واختلاف پر رکھتا ہے جس کو وہ اپنے زعم میں "بنو اُمیہ" اور متقی علماء کے درمیان مسلسل کارفرما قرار دیتا ہے اور وہ اس بات پر بہت حریص اور مصر نظر آتا ہے کہ ہمارے سامنے بنو اُمیہ کی تصویر ایسی کھینچے کہ گویا وہ محض ایک اقتدار پرست خالص دنیوی گروہ تھا جس کو سوائے فتوحات اور جہانگیری کے اور کوئی فکر نہ تھی۔ نیز یہ کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی اسلامی تعلیمات اور اس کے آداب سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔

اس مستشرق کا یہ "مفروضہ" واقعات اور تاریخ پر صریح ظلم اور بہتان ہے اس لئے کہ :۔

(۱) اوّل تو ہمارے سامنے اس وقت "اُموی دور" کی تاریخ سے متعلق جو کتابیں موجود ہیں ان کے بارے میں یہ مسلّم ہے کہ وہ عباسی دور میں لکھی گئی تھیں اور یہ دور بنو اُمیہ کی عداوت و دشمنی سے معمور ہے (بالفاظ دیگر بنو اُمیہ کی موجودہ تاریخ ان کے دشمنوں نے لکھی ہے) ان راویوں اور تاریخ نگاروں نے جس طرح چاہا ہے روایات اور تاریخی واقعات میں اضافے اور تصرفات کئے ہیں اور عباسی پروپیگنڈے نے بنو امیہ اور ان کے خلفاء کے بارے میں بے بنیاد افواہیں پھیلانے کے سلسلہ میں تاریخ کے اندر ایک اہم اور خطرناک کردار ادا کیا ہے اس لئے کہ مرور ایام کے بعد ان افواہوں نے اور بازاری روایتوں نے تاریخ کی کتابوں میں مستقل طور پر جگہ پالی اور اکثر لوگوں کی نظر میں وہ حقائق بن گئیں حالانکہ ان کی حقیقت اُن سنی سنائی بازاری گپوں سے زیادہ نہیں جو بلا تحقیق ایک دوسرے سے نقل ہوتی چلی آتی ہیں۔ درحقیقت یہ سارا کھیل (بنو امیہ کے جانی دشمن) عباسیوں، غالی شیعوں اور رافضیوں کا کھیلا ہوا تھا اس لئے بنو امیہ سے متعلق روایات اور تاریخ کی کتابوں کے بیانات پر بلا تحقیق و تنقید اعتماد کر لینا از روئے تحقیق و انصاف ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔

۲۔ یہ تو ایک بات ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ اس کے باوجود بھی ہمیں کثرت سے ایسی تاریخی تصریحات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۵) یقیناً اس سے قبل ہے حاصل یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین کے اقوال و مذاہب کا اختلاف و تعدد صحابہ و تابعین کے اختلاف پر مبنی ہے جو ایک طرف کتاب و سنت کی جامعیت اور وسعت و ہمہ گیری کا اور دوسری طرف صحابہ کے مراتب فہم و ادراک کے اختلاف و تفاوت کا اگزیر نتیجہ ہے احادیث کے ذخیرہ یا اکثر و بیشتر حصہ کو اس کا نتیجہ اور اسلام کے ارتقائی دور کی پیداوار کہنا صحابہ تابعین کے ساتھ بدگمانی اور افتراپردازی کی واضح دلیل ہے اور یہی اس باطن مستشرق کا مقصد ہے ۱۲ ف

ملتی ہیں جو اس یہودی مستشرق کے بنو امیہ کے اسلام سے انحراف اور احکام اسلام پر دست درازی کے الزام واتہام کی تکذیب وتردید کرتی ہیں چنانچہ

ابن سعد نے طبقات میں خلیفہ بننے سے پہلے عبدالملک کے زہد وتقویٰ اور عبادت گذاری کے بارے میں ایسی متعدد روایات نقل کی ہیں جن کی بنا پر لوگوں میں عبدالملک کا لقب "حمامۃ المسجد" (مسجد کا کبوتر) پڑ گیا تھا یہاں تک کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ: "صحابہ کرام کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد کس کی طرف رجوع کیا جائے"؟ تو انھوں نے عبدالملک کی طرف اشارہ کرکے جواب دیا: "اس نوجوان کی طرف"۔ امام زہری پر بحث کے ذیل میں آپ پڑھیں گے کہ عبدالملک علما وطلبہ کو حدیث وآثار کی تلاش وجستجو میں رہنمائی کرنے کے حریص تھے (اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عبدالملک خود احادیث وآثار کے کس قدر حامل وعالم ہوں گے) انھوں نے ایک مرتبہ زہری سے کہا تھا جب کہ زہری بالکل نوعمر طالب علم تھے کہ "تم انصار کے پاس جایا کرو وہاں تم بہت زیادہ علم (رسول اللہ کی حدیثیں) پاؤ گے"۔ جب لوگ عبدالملک کے پاس خلافت کے لئے بیعت کرنے آئے ہیں تو وہ ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی دھیمی سی روشنی میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ عبدالملک کے بیٹے ولید کا بھی دینداری کے لحاظ سے یہی حال تھا۔ جو مساجد آج تک معروف ومشہور چلی آتی ہیں وہ ولید کے عہد خلافت میں ہی تعمیر ہوئی ہیں۔ اسی لئے مورخین کے حلقہ میں ولید کا عہدِ خلافت "اسلام کا عمرانی دور" کہلاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بجز یزید بن معاویہ کے باقی تمام خلفاء بنو امیہ (کی دینداری اور دین کی محبت وانسیت) کا بھی یہی حال تھا۔ یزید بن معاویہ بیشک اپنے شخصی کردار اور چال چلن میں یقیناً طور پر شرعی اخلاق وآداب کی حدود سے ہٹا ہوا تھا۔

الغرض عباسی کارندوں (پروپیگنڈا کرنے والے ایجنٹوں) اور شیعہ راویوں نے بکثرت ایسے واقعات کی ان خلفاء بنو امیہ کی طرف نسبت کی ہے جو تحقیق وتنقید کی رو سے ہرگز صحیح ثابت نہیں ہوتے چنانچہ ولید بن عبدالملک کے متعلق یہ بہتان تراشا ہے کہ: اس نے کلام اللہ کو پھینک دیا تھا اور پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے (حالانکہ یہ الزام بالکل بے اصل ہے) جو شخص بھی ان واقعات کو حق وانصاف کی روح (اور جذبہ) کے ساتھ پڑھے گا اس پر عیاں ہو جائے گا کہ یہ سب سیاسی دسیسہ کاری اور جھوٹ ہے

(۳) تاریخ بنو امیہ کی اسلامی فتوحات کا بہت شاندار طریق پر ذکر کرتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اسلام

کا رقبہ پورے عباسی دور میں اس سے آگے نہیں بڑھا جتنا اموی عہد سلطنت میں پہونچ گیا تھا (اسی لئے یہ مسلم ہے کہ اسلامی فتوحات کا "زریں دور" بنو امیہ کا عہد سلطنت ہے) ان تمام زریں فتوحات کا سہرا یقیناً بنو امیہ کے سر ہے جن کے خلفاء کی اولادیں میدانِ جہاد میں آن ظفر مندعسا کر کی کمان کرتی تھیں جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کو دنیا میں پھیلانے کے لئے جہاد کر رہے تھے پھر علما کو ان سے دشمنی اور عداوت کیوں ہوتی؟ اور ان پر یہ بہتان کیسے باندھا جا سکتا ہے کہ "وہ تو اسلام کو سمجھتے بھی نہ تھے"، "ان کو اسلام سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا" اور نہ وہ اسلام کی خاطر جان دینے کے لئے قطعاً تیار تھے؟

لہٰذا اس یہودی مستشرق نے جو نظریہ وضع حدیث کی بنیاد بنو امیہ اور علماء اتقیا کے درمیان شدید عداوت پر رکھی ہے یہ کسی طرح بھی صحت پر مبنی نہیں ہو سکتا ہاں بنو امیہ کے اور خارجی وعلوی (شیعہ وخوارج) کے درمیان نہایت شدید اور مستحکم عداوت اور دشمنی ضرور تھی لیکن یہ لوگ (خارجی اور علوی) ان علماء حدیث کے گروہ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے جو جمع حدیث، روایت حدیث اور تدوین وتنقیح حدیث کے لئے اٹھے تھے مثلاً سعید بن المسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ، سالم مولی عبداللہ بن عمر، نافع مولی عبداللہ بن عمر، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد بن ابی بکر، ابن شہاب زہری، عطاء، شعبی، علقمہ، حسن بصری اور اسی قسم کے دیگر ائمہ حدیث۔

ان حضرات کا بنو امیہ کے ساتھ جنگ کے میدانوں میں کبھی کوئی تصادم ہوا (یعنی کسی بھی ملکی اور سیاسی معاملہ میں کوئی نزاع اور مقابلہ نہیں ہوا) اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی صحیح اور معتبر روایت ہے کہ یہ محدثین بنو امیہ کی مخالفت کے درپے تھے۔ زیادہ سے زیادہ سعید بن المسیب پر عبدالملک کے ظلم و زیادتی کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے سو اس کا سبب بھی سب جانتے ہیں کہ یہ تھا کہ عبدالملک اپنے بیٹے ولید کے لئے اور اس کے بعد سلیمان کے لئے بیک وقت بیعت لینا چاہتے تھے (یعنی یکے بعد دیگرے دونوں بیٹوں کے لئے بیک وقت بیعت لینا چاہتے تھے) تو اس سے امام مدینہ سعید بن المسیب نے صاف انکار کر دیا۔ (اور سختی کے ساتھ منع کیا اور کہا) کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی وقت میں دو بیعتوں سے منع فرمایا ہے"! یہ ہے اس جور وجفا اور مخالفت کی حقیقت (ظاہر ہے کہ یہ ایک خالص شرعی مسئلہ ہے اس میں سعید بن المسیب کا خلیفہ سے مزاحمت کرنا ان کا دینی فرض تھا) اس واقعہ سے پہلے ہم کو سعید بن المسیب اور خلفاء بنو امیہ کے درمیان کوئی جھگڑا اور نزاع نظر نہیں آتا (جس کو بنو امیہ اور

ارباب علم و تقویٰ کی مخالفت و خصومت کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے) ہاں حجاج اور اس کے زمانے کے بعض علما کے درمیان ضرور کچھ مخالفت و عداوت تھی مگر اس کا سبب محض حجاج کا وہ بے تحاشی ظلم اور بے پناہ تشدد تھا جو وہ اموی خلافت کے تمام مخالفین پر بلا استثناء کیا کرتا تھا نہ یہ کہ وہ فسق و فجور اور گمراہی و بدکاری میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ جس کی وجہ سے علما و صلحا اور ارباب تقویٰ اس پر پل پڑے ہوں۔ ذرا سوچئے، یہ کیسے ممکن ہے دراں حالیکہ حجاج ہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے قرآن کریم کے حروف پر نقطے اور الفاظ پر حرکات لگوائیں یہ تو اس کے کتاب اللہ کے ساتھ غایت شغف و اعتنا کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ یہ اہتمام وہی شخص کر سکتا ہے جس کے قلب کی گہرائیوں میں دینداری اُتری ہوئی ہو۔

مختصر یہ ہے کہ اگر اس مستشرق کی مراد اُن "علما" سے جن کو بنو امیہ سے خصومت و عداوت تھی خارجی اور علوی زعما ہیں تو بسر و چشم، لیکن ان کا کوئی تعلق ان "علماء حدیث" سے ہرگز نہیں ہے جنہوں نے حدیث کی اشاعت اس کے حفظ و روایت اور وضاعین کی آمیزشوں سے حدیث کو پاک و صاف کرنے میں اپنی عمریں صرف کی ہیں اور اگر ان علماء سے اس کی مراد عطاء، نافع، سعید، حسن، زہری، مکحول، اور قتادہ جیسے محدثین کرام ہیں تو یہ سراسر کذب و افتراء ہے جس کی تاریخ شدت سے تردید و تکذیب کرتی ہے۔[1]

---

[1] از روئے عقل بھی علماء و صلحاء اور حاملین حدیث کے اور بنو امیہ کے درمیان ایسی خصومت و منازعت جس کے تحت ایک دوسرے کی مخالفت میں حدیثیں گھڑنے کی نوبت آجائے اسی وقت ممکن ہو سکتی تھی جبکہ یہ علماء و اتقیاء کا گروہ بنو امیہ کے مقابلہ پر خود اپنی یا کسی اور فرد یا گروہ کی حکومت و اقتدار کے حامی ہوتے اور بنو امیہ کو حکومت و اقتدار سے محروم کرنے کے لئے ایسی ذلیل سازش کرتے، تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ اموی عہد خلافت میں "صلحا و اتقیاء امت" نے خلفاء بنو امیہ کے مقابلہ پر کسی بھی فرد یا جماعت کی یا خود اپنی حکومت کی خواہش نہیں کی خارجی اور علوی فرقے بیشک بنو امیہ کو حکومت و اقتدار اعلیٰ سے محروم کر کے اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بنو امیہ کے خلاف سازشیں بھی کیں اور میدان جنگ میں لڑائیاں بھی لڑیں۔ لیکن ان لوگوں کا محدثین و ائمہ حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ ۱۲ محشی

۲- کیا مدینہ کے علماء حدیثیں وضع کیا کرتے تھے

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز (بلکہ مضحکہ خیز) بات یہ ہے کہ اس یہودی مستشرق نے اپنی دونوں کتابوں دراسات اسلامیہ اور العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ خصومت و عداوت (جو تحریک وضع حدیث کے وجود میں آنے کا سبب بنی) بنو امیہ اور "علماء مدینہ" کے درمیان تھی نیز یہ کہ مدینہ کے علماء ہی نے بنو امیہ سے مقابلہ کرنے کی غرض سے وضع حدیث کی تحریک کی ابتدا کی تھی"۔

(۱) لیکن مثل مشہور ہے "جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے" ہم پوچھتے ہیں کہ اگر بالفرض اس مستشرق کے زعم کے مطابق علماء مدینہ نے ایسا کیا بھی تھا تو کیا اس زمانے میں کل علماء اسلام مدینہ میں ہی تھے کیا مکہ، کوفہ، بصرہ، دمشق، مصر، اور دیگر اسلامی شہروں میں صحابہ اور دوسرے علماء نہ تھے۔ اس زمانے میں مکہ کے اندر علاوہ متاخرین صحابہ کے عطاء، طاؤس، مجاہد، عمرو بن دینار، ابن جریج ابن عیینہ جیسے محدثین و علماء موجود تھے اور بصرہ میں حسن، ابن سیرین، مسلم بن یسار، ابو الشعثاء ایوب سختیانی مطرف بن عبداللہ الشخیر جیسے محدثین و فقہاء موجود تھے کوفہ میں علقمہ، اسود، عمرو بن شرحبیل مسروق ابن الاجدع، عبیدۃ سلمانی، سوید بن غفلہ، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، عمرو بن میمون، ابراہیم نخعی عامر شعبی، سعید بن جبیر، قاسم بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود جیسے حفاظ و ائمہ حدیث موجود تھے اور شام میں ابو ادریس خولانی، قبیصۃ بن ذویب، سلیمان بن حبیب، خالد بن معدان، عبدالرحمٰن بن غنم الاشعری، عبدالرحمٰن بن جبیر اور مکحول موجود تھے اور مصر میں یزید بن ابی حبیب، بکر بن عبداللہ الاشج، عمرو بن الحارث، لیث بن سعد اور عبداللہ بن ابی جعفر موجود تھے اسی طرح یمن میں مطرف وغیرہ محدثین عظام موجود تھے۔[1]

یہ ہیں اموی دور کے چوٹی کے علماء، کیا یہ سب علماء مدینہ کے ساتھ وضع حدیث کی تحریک میں شریک تھے؟ اور یہ اتحاد و اتفاق رائے ہوا کیوں کر؟ یہ کانفرنس کہاں منعقد ہوئی تھی جس میں یہ سب شریک ہوئے اور وضع حدیث کی تحریک چلانے کی قرارداد باتفاق رائے پاس ہوئی؟ اور اگر یہ

---

(۱) ملاحظہ کیجئے اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷، اور اس کے بعد

تمام محدثین عظام علماء مدینہ کے ساتھ وضع حدیث کی تحریک میں شریک نہ تھے تو یہ اہل مدینہ کے اس فعل شنیع پر خاموش کس طرح رہے؟ اور (یہ جاننے کے باوجود) انھوں نے علماء مدینہ کی حدیثیں کیسے روایت کیں؟ ان علماء مدینہ پر عالم اسلام کے .. علماء کبار کی جانب سے تاریخ میں کہیں کوئی انکار اور تردید مذکور ہے؟ بلکہ ہمیں تو معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے کہ ان تمام بلاد و امصار کے علماء اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ "حجاز (مکہ مدینہ) کی حدیثیں تمام احادیث کے ذخیرہ میں صحیح تر اور قوی تر ہیں"۔ بلکہ خود اموی خلیفہ عبدالملک علماء مدینہ کی احادیث کی صحت کا اعتراف کرتا ہے جب کہ وہ زہری کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ تم انصار مدینہ کے مکانوں پر جاؤ اور ان سے رسول اللہ کی حدیثوں کا علم حاصل کرو۔" اس کی مزید تفصیل زہری کے بیان میں آئے گی۔ اگر مدینہ میں حدیثیں گھڑنے کی ٹکسال تھی اور نو بنو حدیثیں وہاں وضع ہوا کرتی تھیں تو یہ اعتراف کیسا؟ اور زہری کو رہنمائی کیوں ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ یہ ایسا لچر اور بے بنیاد دعویٰ ہے جو تاریخی تنقید کے سامنے ذرا دیر نہیں ٹھیر سکتا لیکن کیا کیجئے تعصب اور ہوائے نفس انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔

(۲) اس مستشرق کی ستم ظریفی بلکہ بد دیانتی ملاحظہ فرمائیے ـــــ اور یہی اس دعوے کے لچر اور بے بنیاد ہونے کا بین ثبوت ہے ـــــ کہ سعید بن المسیب اور خلیفہ عبدالملک کے مذکورۂ بالا نزاع کو وہ تمام علماء مدینہ اور بنو امیہ کے درمیان نزاع و خصومت کا اور اس کے نتیجہ میں علماء مدینہ پر کذب فی الحدیث، وضع حدیث کی تحریک چلانے کا بہتان لگانے کا ذریعہ تو بناتا ہے لیکن اس تحریک میں سعید کے کردار کا کہیں ذکر تک نہیں کرتا (یعنے کسی ایک بھی ایسی حدیث کی نشاندہی نہیں کرتا جو سعید نے وضع کی ہو) حالانکہ (اس مفروضہ کے پیش نظر) سعید کو تو اس تحریک کا سب سے زیادہ سرگرم سربراہ ہونا چاہئے تھا، مستشرق مذکور اس تحریک میں سعید کی کارکردگی بالکل نہیں دکھلاتا آخر کیوں؟ کیا وہ زہری کی طرح سعید پر بھی فی الحقیقت وضع حدیث کا الزام لگانا چاہتا ہے؟ مگر اس کو صراحتاً اس اتہام لگانے کی جرأت نہیں ہوتی، صرف اس لئے کہ اس الزام کی تائید میں ایک بھی بناوٹی حدیث اس کو نہیں ملتی جیسا کہ اس نے زہری کے بارے میں کیا ہے (کہ ایک روایت میں تحریف کرکے زہری کے وضع حدیث کے ثبوت میں پیش کر دیا) یا وہ سعید کو اس اتہام سے بری سمجھتا ہے؟ اور سعید کے علاوہ اور تمام علماء مدینہ کو مورد الزام قرار دیتا ہے) حالانکہ یہ قطعاً ناممکن ہے اس لئے کہ سعید بن المسیب

تو مدینہ کے ان متقی علماء میں سرِفہرست (بلکہ امام اہل مدینہ) تھے جو اس مستشرق کے مفروضہ کے مطابق بنو امیہ سے منحرف اور اس تحریک وضع حدیث چلانے پر مجبور ہو لئے تھے۔ "دروغ گو" اسی طرح منہ کی کھایا کرتے ہیں اور اپنے جھوٹ کو سچ بنانے میں اسی طرح ہاتھ پاؤں مارا کرتے ہیں۔ بخدا! ہمارے علماء حدیث نے تو وضاعین حدیث (حدیثیں گھڑنے والوں) کا زبردست تعاقب کیا ہے اور ان کو زندیق و بدکار قرار دیا ہے۔ دراصل یہی بات اس مستشرق کو اچھی نہیں لگی اور اسی لئے اس نے وضاعین حدیث کی سرپرستی کی ہے اور اسی غرض سے ہمارے علماء حدیث کے لئے "علماء اتقیا" کا لقب اختراع کر کے (از راہ تلبیس) اس پر اضافہ یہ کیا کہ ان کا مسکن مدینہ بتلایا ــ اور یہ حقیقت ہے کہ مدینہ "علماء اور اتقیاء امت" کا مسکن تھا مگر امت مسلمہ اس "عالم و متقی" کا وہ مفہوم مراد لیتی اور سمجھتی ہے (جو نصوص قرآن و حدیث میں معتبر ہے) یعنے وہ صلحاء اُمت جو صفات علم و تقوی سے موصوف ہوں اور اس "تقوی" کے لوازمات میں سے ہے اللہ کے دین کے لئے جدوجہد کرنا امور دینیہ خصوصاً روایت حدیث میں راستبازی اور دیانتداری اختیار کرنا اور (سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و حمایت میں) کذابین و وضاعین حدیث سے ڈٹ کر مقابلہ اور جنگ کرنا۔ نہ کہ وہ معنی جن کے تحت یہ مستشرق ان وضاعین حدیث کو "علماء اتقیا"[1] کہتا ہے یعنے اپنے "عقائد" کے دفاع کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں دسیسہ کاری و مسخ و تحریف کرنا (خود ساختہ حدیثوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے) آپ پر بہتان باندھنا۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مستشرق نے یہ "اتقیاء" کا لفظ شیعوں کے لفظ "تقیہ" سے لے کر ان وضاعین حدیث کے لئے استعمال کیا ہے اور از راہ تلبیس ان کو "علماء اتقیا" کے لقب سے نوازا ہے اور مدینہ ان کا مسکن قرار دیا ہے تاکہ ان کے ثقہ ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے[2]۔

---

[1] اس مستشرق گولڈ تسیہر کی یہ تلبیس بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہمارے زمانے کے ایک محقق اپنے مقالہ "تحریک حدیث" میں مشہور گمراہ فرقہ کرامیہ کو "قدماء محدثین" کے لقب سے نواز کر "قدماء محدثین" پر وضع حدیث کا دروازہ کھولنے کا الزام لگاتے ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ بینات بابت ماہ اگست، ستمبر، اکتوبر مقالہ "قدماء محدثین پر وضع حدیث کا بے جا الزام"۔ (محشی)

[2] غرض اس یہودی مستشرق کی یہ انتہائی خطرناک تلبیس اور دسیسہ کاری ہے کہ علماء اتقیا کا لفظ اس خود ساختہ مفہوم کے تحت اُن زنادقہ و ملحدین کے لئے استعمال کرتا ہے جو اپنے باطل عقائد و نظریات کو ثابت کرنے کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔

(باقی صفحہ ۱۸۳! پر)

۴۔ کیا ہمارے علماء نے دین کے دفاع کی خاطر جھوٹ بولنے کو روا رکھا ہے

اس (دسیسہ کاری) کے بعد یہ یہودی مستشرق کہتا ہے:-

"اس امر کے پیش نظر کہ جو حدیثیں ان علماء (مدینہ) کے ہاتھ آئیں وہ ان کی اغراض (بنو امیہ کی مخالفت) کو پورا کرنے کے لئے کافی نہ تھیں انھوں نے اپنی طرف سے بے دھڑک ایسی حدیثیں گھڑنی شروع کیں جو ان کی غرض (بنو امیہ کی رسوائی) کو پورا کرتی تھیں اور اسلامی روح کے منافی نہ تھیں۔ اور (اس افترا پردازی کے جواز کے بارے میں) اپنے ضمیر کو یہ کہکر مطمئن کیا کہ ہم یہ کام (وضع حدیث) ظلم و جور، الحاد و بیدینی اور دین کے صحیح راستوں سے انحراف کا مقابلہ کرنے کے لئے کر رہے ہیں (یعنی ہم دین کی حمایت میں رسول اللہ پر یہ جھوٹ بول رہے اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں)

گویا یہ مستشرق گولڈتسیہر اپنے اس بیان سے ہمارے علماء کی جرأت (پوزیشن صاف) کرنا اور حدیثیں وضع کرنے کی وجہ جواز پیدا کرنا چاہتا ہے۔

درحقیقت یہ ایک ایسے جاہل شخص کا نقطۂ نظر ہے جس کی فہم علماء اسلام کی اس ثقاہت و دیانت اور علو مرتبت کی بلندیوں تک — جس سے ہمارے ثقہ اور متدین علماء حدیث موصوف ہوئے ہیں — نہ پہونچی ہے اور نہ پہونچ سکتی ہے۔ اور نہ اس کی فہم کی رسائی اس حد تک ہوسکتی ہے جتنا یہ ہمارے راست باز علماء اپنی روزمرہ کی زندگی تک میں جھوٹ بولنے کو عار، مومن کی شان سے بعید سمجھتے اور اس سے اجتناب کرتے تھے (یہ کیا جانے ایمان اور مومن کی شان) اور نہ اس خوف وخشیت کے منتہا تک اس کی عقل وفہم کی رسائی ہوسکتی ہے جو بیان سے باہر خوف اور ڈر اللہ جل جلالہ کے معاملہ میں ہمارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۲ کا) اور پھر ان کا مسکن مدینہ قرار دے کر "علماء مدینہ" پر وضع حدیث کی تحریک چلانے کا بہتان باندھا ہے اور مسلمانوں کو ان سے بدظن کرنا چاہتا ہے اور "راسخ علماء اتقیا" کے پرفریب لفظ سے وہ عداوت وخصومت جو بنو امیہ اور غالی شیعوں اور رافضیوں کے درمیان تھی اس کو بھی "علماء مدینہ" کے سر منڈھتا ہے اور اس کذب وافترا اور فریب وتلبیس پر اپنے "مفروضہ قیاسات" یعنے "تحریک وضع حدیث" کی بنیاد رکھتا ہے نعوذ باللہ من الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس۔ محشی

علما کے دلوں میں جاگزیں اور رگ و ریشہ میں پیوست تھا اور نہ اس انتہائی نفرت کی حدوں تک اس جاہل کا تصور پہونچ سکتا ہے جو ہمارے پاکباز علما حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے سے تھی یہاں تک کہ بعض علما نے تو ایسے جھوٹ بولنے والے کو کافر، مرتد اور واجب القتل قرار دیا ہے اور اس کی توبہ کے قبول ہونے سے بھی انکار کیا ہے (اس مغضوب یہودی نے ہمارے علماء حدیث کو بھی اپنے علمار یہود کی طرح شب و روز خدا اور رسول پر جھوٹ باندھنے اور بہتان لگانے والا سمجھا ہے)

یہ کور باطن مستشرق ہمارے علمار حدیث کے ان (فوق العادہ) خصائص اور ان کے نظریات و عقائد کو نہ سمجھ سکنے میں قطعاً معذور ہے اس لئے کہ ان (ملکوتی) صفات کا تو اس پر اور اس کے لادینی ماحول پر سایہ تک بھی نہیں پڑا (وہ جیسا خود ہے اور جیسا اپنے ماحول کو دیکھتا ہے ویسا ہی دوسروں کو سمجھتا اور قیاس کرتا ہے) جو آدمی خود جھوٹ بولنے کا عادی ہوتا ہے وہ اوروں کو اپنے سے زیادہ جھوٹا سمجھتا ہے چور اپنی طرح سب کو چور سمجھا کرتا ہے (المرؤ یقیس علی نفسہ مشہور مقولہ ہے) ورنہ تو کون کہہ سکتا ہے کہ سعید بن المسیب جیسے شخص نے جنہوں نے مار کھانا، ذلت اٹھانا اور ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنا گوارا کیا لیکن ایک وقت میں دو بیعتیں کرنا برداشت نہ کیا صرف اس لئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف تھا — اپنے لئے یہ جائز سمجھیں گے کہ رسول اللہ کی سنت کی حمایت میں رسول اللہ پر جھوٹ بولیں؟ اور کون اس بات کی جرأت کر سکتا ہے۔ کہ ایسے لوگوں[۱] پر — جنہوں نے سنت رسول کی خلاف ورزی پر اپنے بعض حکمرانوں کی علانیہ مخالفت کی ہو — یہ الزام لگائے کہ انہوں نے اس کے بعد خود رسول اللہ کی سنت (حدیث) میں ایسے احکام کا اضافہ کرنا اپنے لئے جائز قرار دے لیا تھا، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صادر نہیں فرمایا؟

---

[۱] ان لوگوں" سے مراد علماء مدینہ ہیں جنہوں نے عبد الملک کے مذکورہ بالا خلاف سنت حکم پر علانیہ مخالفت کی اور سختیاں جھیلیں مگر یہ یہودی انہی کو کذب علی الرسول کا مرتکب اور وضع حدیث کی تحریک چلانے والا قرار دیتا ہے اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ ان کی عقلیں بالکل ہی ماری گئی تھیں کہ حدیث کا خلاف کرنے پر حکمرانوں سے تو لڑتے ہیں اور خود حدیثیں گھڑتے ہیں، ایسا عقل کا مارا انسان بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ العیاذ باللہ ۱۲ محشی

قارئین کرام! کیا تمہارے پاس عقلیں نہیں ہیں جن سے تم فیصلہ کرسکو (کہ یہ ممکن ہے یا نہیں؟) یا تم ایسے لوگوں کے متعلق بحث کررہے ہو جن کی عقلیں ماری گئی تھیں؟

۴۔ حدیث میں جھوٹ کی ابتدا کس طرح ہوئی؟

اس (ملمع کاری) کے بعد یہ یہودی مستشرق کہتا ہے کہ: اور اس امر کے پیش نظر کہ ان متقی علماء کی اُمیدیں خاندان بنو اُمیہ کے دشمنوں یعنے "علویوں" سے وابستہ تھیں، اس لئے ابتداء میں تو ان کے وضع حدیث کا دائرہ اہل بیت کی مدح تک محدود رہا پھر اسی کے نتیجہ میں بالواسطہ بنوامیہ کی عیب چینی اور ان پر حملوں کی راہ ہموار ہوگئی[۵۱] اور اسی طرح یہ تحریک وضع حدیث پہلی صدی ہجری میں فقہی اور قانونی احکام کے مخالفین (بنو اُمیہ) کے مقابلہ میں ایک خاموش معارضہ (بزدلانہ مقابلہ) کی حیثیت سے انتہائی دلآزار اور ایذا رساں شکل میں چلتی رہی۔[۵۲]

دیکھئے کس صفائی سے یہ یہودی مستشرق یہاں سے قلابازی کھاتا ہے۔ پہلے کہا تھا "احادیث وضع کرنے کا جذبہ دین کی دفاع کی خاطر رونما ہوا تھا" اور اب کہتا ہے "بنوامیہ پر خاموش حملے کرنے کی غرض سے حدیثیں گھڑنی شروع ہوئیں" بات کہاں سے کہاں پہونچادی، اور اس چالاکی سے یہ مستشرق ... دعویٰ کرتا ہے کہ اہل بیت کی مدح میں حدیثیں ہمارے ان متقی علماء مدینہ نے ہی گھڑنی شروع کی ہیں۔

رہی اہل بیت کی مدح، سو قرآن و حدیث سے اشتغال رکھنے والے خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ خود اللہ جل شانہٗ نے قرآن کریم میں بعض صحابہ کی تعریف فرمائی ہے اور یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کی اسی طرح تعریف فرمائی ہے جس طرح حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان،

---

۵۱ یعنے بنو اُمیہ کے خلاف حدیثیں بھی گھڑی جانے لگیں۔ محشی

۵۲ اس قلابازی سے اس مستشرق کے فریب کا پردہ چاک ہوگیا اور اس نے خود اقرار کرلیا کہ "علماء و اتقیاء" سے اُس کی مراد "علویین" ہیں اس لئے کہ تاریخ بھی شاہد ہے اور قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ اہل بیت کی مدح میں اور بنوامیہ کی مذمت میں حدیثیں گھڑنے والے علویوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوا اس یہودی نے صرف علماء مدینہ کو بدنام کرنے کے لئے اُن کا مسکن مدینہ بتلایا تھا سچ ہے "جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے" یہ تو اردو کی مثل ہے عربی میں ایسے موقعہ پر کہتے ہیں "کاد المریب یقول خذونی" مجرم خود کہہ بیٹھتا ہے میں مجرم ہوں مجھے پکڑ لو) ۱۲ محشی

حضرت طلحہ، حضرت عائشہ، حضرت زبیر، اوران جیسے کبار صحابہ کی تعریف فرمائی ہے اس لئے کبار صحابہ کی مدح میں بلا شبہ صحیح احادیث کا کچھ حصہ ذخیرۂ احادیث رسول اللہ میں ضرور موجود ہے اور انہی میں سے اہل بیت بھی ہیں (لہذا اہل بیت کی مدح میں یقیناً کچھ صحیح حدیثیں ضرور موجود ہیں اور حاملین و محافظین حدیث نے ان کو اور تمام صحیح حدیثوں کی طرح ہمیشہ روایت کیا ہے اس لئے مدح اہل بیت کی ہر حدیث کو موضوع کہہ دینا کھلی ہوئی جہالت بلکہ عداوت ہے) لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ شیعوں نے ان میں خوب بڑھ چڑھ کر اضافے کئے ہیں اور اپنے حریف بنو امیہ اور ان کے متبعین کو جلانے اور ایذا پہونچانے کی غرض سے اہل بیت کے فضائل میں بے دھڑک حدیثیں گھڑی ہیں۔ لہذا علماء سنت (اس کذب علی الرسول کو کیسے برداشت کر سکتے تھے انھوں) نے ان شیعوں کا اس سلسلہ میں خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور جو جھوٹی حدیثیں شیعوں نے گھڑی ہیں ان میں سے ایک ایک کی نشاندہی کی ہے (کتب اسماء رجال اس کا زندہ ثبوت ہیں) اس صورت میں فضائل اہل بیت میں احادیث گھڑنے والے مدینہ کے علماء اتقیاء نہیں ہیں (بلکہ علوی شیعہ ہیں) ان حضرات نے تو ان شیعہ وضاعین حدیث کی پول کھولی ہے اور سب سے پہلے وضع حدیث کو روکنے کے لئے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا ہے یہاں تک کہ ابن سیرین نے تو یہ اعلان کر دیا ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

> اب سے پہلے حدیث کی اسناد کو کوئی نہیں پوچھا کرتا تھا لیکن جب یہ (وضع حدیث کا) فتنہ پھیل گیا تو اب محدثین یہ کہنے لگے ، پہلے اپنی حدیث کے راویوں کے نام بتاؤ (پھر حدیث سنیں گے) چنانچہ اگر دیکھتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی اہل سنت ہیں تو ان کی حدیث کو قبول کر لیتے ہیں اور اگر دیکھتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی اہل بدعت ہیں تو ان کی حدیث کو رد کر دیتے ہیں

گولڈ تسیہر اگر یہ جاننا چاہتا ہے کہ علماء حق اور اہل سنت کی نظر میں " اہل بدعت " کون لوگ ہیں تو اس سے کہدو کہ انہی عربی ماخذوں (کتب تاریخ و رجال حدیث) کی طرف رجوع کرے جن سے اس نے یہ وضع حدیث کا قصہ نقل کیا ہے اور (بددیانتی سے) اس میں تحریف کی ہے گولڈ تسیہر خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ تاریخ اسلام میں " اہل بدعت " شیعہ، خوارج، روافض، جیسے گمراہ فرقوں کا

کا نام ہے (اس نے جان بوجھ کر ازراہ تلبیس ان کو "اتقیا" کے پُرفریب لقب سے تعبیر کیا ہے) اور مدینہ ان کا مسکن قرار دیا ہے)

کون عقل کا دشمن یہ باور کر سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہمارے متقی اور پرہیزگار علماء مدینہ ان گمراہ فرقوں (شیعہ اور خوارج) کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کریں جنہوں نے اہل بیت کے فضائل میں نو بنو حدیثیں گھڑ گھڑ کر اضافہ کی ہیں اور دوسری طرف وہ خود وہی کام کرنے لگ جائیں جس کی مقاومت اور تردید کر رہے ہیں ۔ یعنے اُسی غرض (بنو امیہ کی مخالفت) کے لئے خود فضائل اہل بیت میں حدیثیں گھڑنے لگ جائیں (جس کے لئے شیعہ اور خوارج گھڑ رہے ہیں اتنا بیوقوف تو دنیا میں کوئی بھی نہ ہوگا)

اور اگر بالفرض یہ علماء مدینہ اسی مقصد (بنو امیہ کی مخالفت) کے لئے اسی قسم کی حدیثیں وضع کرنے کو روا بھی رکھتے ہوتے تو ان کے لئے دانائی کی بات یہ ہوتی کہ شیعہ تحریک (وضع حدیث) کی مخالفت اور مقاومت نہ کرتے بلکہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے (ہر عقلمند جب دیکھتا ہے کہ اس کا ایک دشمن دوسرے دشمن کی سرکوبی کر رہا ہے تو وہ خاموشی سے تماشا دیکھا کرتا ہے) لہذا ہم گولڈ تسیہر سے دریافت کرتے ہیں کہ (اگر واقعہ یہی تھا جو وہ دعویٰ کرتا ہے تو) ان علماء مدینہ نے ایسا کیوں نہیں کیا ؟ (یعنے جب کہ شیعہ اور خوارج ان کا مقصد ہی پورا کر رہے تھے تو انھوں نے سکوت کیوں نہیں اختیار کیا اور ان کی مقاومت کیوں کی ؟)

مزے کی بات یہ ہے کہ ابن ابی الحدید جیسا شیعہ عالم تو یہ اعتراف کرتا ہے کہ :-

"شیعوں نے سب سے پہلے حدیث میں جھوٹ بولا ہے اور اہل بیت کے مناقب میں موضوع حدیثوں کے اضافے کئے ہیں"

لیکن گولڈ تسیہر صاحب فرماتے ہیں نہیں سب سے پہلے یہ "خدمت" اہل سنت یا بقول گولڈ "مدینہ کے اہل تقویٰ" نے انجام دی ہے (واہ کیا بات کہی ہے بقول کسی کے :-

"من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید" میں کیا راگ الاپ رہا ہوں اور میرا طنبورہ کیا راگ الاپ رہا ہے

شیعہ عالم کہتا ہے شیعہ ہیں سب سے پہلے حدیثیں گھڑنے والے ۔ یہ یہودی کہتا ہے نہیں تم

نہیں علماء مدینہ میں سب سے پہلے حدیثیں گھڑنے والے آخر "یہودی" ہے نا)

قارئین خود فیصلہ کریں کیا یہ تاریخی حقائق وواقعات میں بدترین قسم کی تحریف نہیں ہے جس کا ارتکاب بجز ایک عادی مجرم کے اور کوئی نہیں کرسکتا (چوری اور سینہ زوری اسی کو کہتے ہیں)

۵۔ کیا وضع حدیث میں اموی حکومت کا ہاتھ تھا؟

پھر مستشرق مذکور کہتا ہے کہ:-

معاملہ انہیں تک محدود نہ رہا بلکہ حکومت خود بھی ان کے مقابلہ میں خاموش نہ رہی۔ چنانچہ جب وہ کسی رائے کو عام کرنا یا ان اتقیاء کو خاموش کرنا چاہتی تو وہ بھی اپنے نظریات کے موافق حدیثوں کو اس کا ذریعہ بناتی، اور وہ بھی وہی ہتھکنڈے استعمال کرتی جو اس کے مخالفین کرتے تھے۔ حدیثیں وضع کی جاتیں یا وضع حدیث کی دعوت دی جاتی:

یہ ایک نیا دعویٰ ہے جس کا وجود سوائے مصنف کے دماغ کے اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ سے ہمیں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جو یہ بتلاتی ہو کہ بنوامیہ کی حکومت نے اپنی کسی رائے کو عام کرنے کے لئے احادیث وضع کی تھیں، ہم اس مستشرق سے پوچھتے ہیں کہ "وہ احادیث" کہاں ہیں جو اس حکومت نے بنائی تھیں ؟ ہمارے علماء کی عادت تھی کہ وہ ہر حدیث کو سند کے ساتھ نقل کیا کرتے تھے، اور آج بھی ان صحیح احادیث کی اسانید کتب سنت میں موجود ہیں، لیکن ان ہزاروں حدیثوں میں ہمیں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملتی جو عبدالملک، یزید، ولید یا کسی گورنر جیسے حجاج، خالد بن عبداللہ القسری یا انہیں جیسے لوگوں کی سند سے روایت کی گئی ہو۔ اگر ایسی حدیثوں کا وجود تھا تو تاریخ کے گوشوں میں کہیں نہ کہیں تو ہوتیں آخر وہ کہاں گئیں کہ ان کا نام ونشان تک نہ رہا ؟ اگر اموی حکومت نے احادیث خود وضع نہیں کی تھیں، بلکہ وضع کی دعوت دی تھی، تو اس کا کیا ثبوت ہے ؟

۶۔ حدیث میں اختلاف کے اسباب

گولڈ تسیہر کہتا ہے کہ:-

کوئی سیاسی یا اعتقادی اختلافی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد
کسی نہ کسی قوی سند والی حدیث پر نہ ہو"

کیا یہی اس دعوے کا ثبوت ہے کہ اموی حکومت نے ہی وضع حدیث کی دعوت دی تھی؟ (اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو یہاں اختلافی مسائل میں وضع احادیث کا یہ جرم خود مختلف مذاہب والوں نے ہی کیوں نہ کیا ہو؟ اور پھر صرف "وضع" ہی ان احادیث مختلفہ میں اختلاف کا سبب کیوں ہو؟

علماء نے حدیث میں اختلاف کے بہت سے اسباب ذکر کئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:-

(۱) کہ ایک فعل شرعی کی مختلف مواقع اور مختلف اوقات میں متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں ایک صحابی نے ایک موقعہ پر ایک صورت دیکھی اس کو نقل کر دیا دوسرے صحابی نے . . . دوسرے وقت دوسری صورت مشاہدہ کی اسکی روایت کر دیا۔ جیسے یہ دو حدیثیں:-

(۱) الوضوء من مس الذکر — شرمگاہ کو چھونے سے وضو لازم آتا ہے

(۲) ھل ھوالابضعۃ منک — یہ تو تمہارے جسم کا ہی ایک ٹکڑا ہے

یقیناً دو وقتوں میں اور دو موقعوں پر یہ دونوں حکم دیئے گئے ہیں اور دونوں صحیح ہیں پہلا حکم استحباب پر مبنی ہے اور دوسرا بیان جواز پر یعنے وضو ٹوٹے گا تو نہیں مگر مستحب ہے کہ وضو کر لیا جائے۔

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی فعل کو بیان جواز کے لئے دو طرح کیا ہو (کہ ایسا بھی جائز ہے اور ایسا بھی جائز ہے) ایک صحابی نے اس فعل کو ایک وقت میں ایک طرح دیکھا ویسے ہی بیان کر دیا، دوسرے نے دوسری حالت میں دوسری طرح دیکھا اس کے موافق بیان کر دیا اس کی مثال صلوٰۃ الوتر ہے جس میں سات رکعتیں بھی ہیں، نو بھی، گیارہ بھی اور یہ سب جائز ہیں۔

(۳) تیسرا سبب یہ ہے کہ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہی حالت میں اور ایک ہی موقعہ پر دیکھا ہو اور اس کے باوجود روایت میں اختلاف ہو۔ جیسے آپ کے حج کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آپ نے "قران" کا احرام باندھا تھا یا "افراد" کا یا "تمتع" کا۔ یہ اختلاف صحابہ کی فہم پر مبنی ہے جس نے

جو سمجھا روایت کر دیا۔ کیونکہ صحابہ کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے، ان میں ہر بات سمجھنے کی گنجائش تھی۔ اس لئے کہ قِران، تمتع یا افراد کا مدار نیت پر ہے اور نیت پر لوگ مطلع نہیں ہو سکتے تھے۔

(۴) اختلاف کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ صحابہ کی رائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مفہوم و مراد اور اس کے حکم شرعی کے سمجھنے میں مختلف ہو جاتی تھی۔ بعض صحابہؓ اس حکم سے وجوب مراد لیتے اور بعض استحباب۔

(۵) ایک سبب یہ بھی تھا کہ کسی صحابی نے کوئی ایسا نیا حکم سُنا جو پہلے حکم کو منسوخ کرتا ہے لیکن دوسرے صحابی نے اس منسوخ کرنے والے حکم کو نہیں سُنا تھا، لہٰذا وہ اپنے سماع کے مطابق پہلے حکم کی ہی روایت کرتے رہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے علماء نے حدیث میں اختلاف کے بہت سے اسباب بیان کئے ہیں، جس اختلاف کا مرجع وضع حدیث تھا اس کو بھی بیان کر دیا۔ اور جس اختلاف کا مرجع اور سبب وضع کے علاوہ کچھ اور تھا اس کو بھی بیان کر دیا۔ اس موضوع (اختلاف حدیث) پر ہمارے محدثینؒ نے بہت قیمتی قیمتی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان میں زیادہ مشہور امام شافعی، ابن قتیبہ اور طحاوی وغیرہ ائمہ رحمہم اللہ کی تصانیف ہیں۔ لہٰذا یہ مفروضہ کہ حدیث میں اختلاف ان کے موضوع ہونے کی دلیل ہے محض ایک خیال ہے (جو علوم شرعیہ سے جہالت پر مبنی ہے) اور اس سے زیادہ لچر اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اس اختلاف کو "بنو امیہ کا وضع حدیث میں ہاتھ ہونے پر اور اس کی دعوت دینے" پر دلیل بنایا جائے۔

۷۔ کیا حضرت معاویہ کا بھی وضع حدیث میں ہاتھ تھا؟

گولڈ تسیہر ہمارے سامنے ایک اور دلیل پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ چنانچہ وہ حضرت معاویہ کے متعلق یہ روایت بیان کرتا ہے کہ:-

انھوں نے مغیرہ بن شعبہ سے کہا تھا کہ "تم علی کو بُرا بھلا کہنے اور عثمان کے حق میں دعا رحمت کرنے میں کوتاہی نہ کرو اور تم علی کے ساتھیوں کو خوب گالیاں دیا کرو، ان کی احادیث کو دباؤ، اور ان کے مقابلہ میں عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں کی خوب تعریفیں کیا کرو، ان کو اپنے قریب بلاؤ اور ان کی بات سنو"۔

اس کے بعد گولڈ تسیہر کہتا ہے کہ:-

"اس طرح علی کے خلاف اموی حکومت کی حدیثوں کی بنیاد پڑی"۔

اس دلیل پر ذرا نظر ڈالئے۔ حضرت معاویہ اپنے ایک ماتحت افسر یا امیر سے کہتے ہیں کہ: تم علی کے ساتھیوں پر ظلم و زیادتی کیا کرو، اور عثمان کے ساتھیوں کو اپنے قریب کرو۔ بھلا اس کو وضع حدیث سے کیا تعلق؟ کیا ہر حکومت اپنی جماعت (پارٹی) اور مخالفین کی جماعت (پارٹی) کے درمیان یہ فرق و امتیاز اور یہی رویہ اختیار نہیں کرتی؟ اس کا وضع حدیث سے کیا واسطہ؟

حضرت معاویہ مغیرہ سے یہ کب کہتے ہیں کہ: علی کے خلاف اور عثمان کے حق میں حدیثیں گھڑنے میں کوتاہی نہ کیا کرو۔ اگر معاویہ اس طور پر کہتے تو یہ اس مستشرق کے مزعومہ دعوے کی دلیل بن سکتا تھا لیکن انھوں نے یہ کہاں کہا ہے؟ اور معاویہ کے جو الفاظ اس نے نقل کئے ہیں ان سے ہم یہ کس طرح اور کیونکر سمجھیں؟

رہا گولڈ تسیہر کا معاویہ کے بیان میں یہ فقرہ کہ "اصحاب علی کو برا بھلا کہو اور ان کی احادیث کو دبا دو" اور اس سے مستشرق مذکور کا اس بات پر استدلال کرنا، کہ بعض حدیثیں دبائی گئی ہیں، تو یہ تو ہر اس شخص کے لئے عبرت کا مقام ہے جو اس مستشرق کے علم اور اس کی امانت و دیانت کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے۔ حضرت معاویہ کے اس قول کی اصل عبارت یہ ہے جس کو طبری نے (۶/ ۱۴۱) پر اس طرح روایت کیا ہے۔

لا تتحشم عن شتم علی و ذمہ والترحم علی عثمان والاستغفار لہ والعیب علی اصحاب علی والاقصاء لہم وترک الاستماع منہم واطراء شیعۃ عثمان والادناء لہم والاستماع منہم۔	تم علی اور ان کی اولاد کو سب و شتم کرنے میں اور عثمان کے لئے رحمت و مغفرت کی دعائیں کرنے میں اور علی کے ساتھیوں پر عیب گیری کرنے اور (اپنے سے) ان کو دور کرنے میں ان کی بات نہ سننے میں اور طرفداران عثمان کی خوب خوب تعریفیں کرنے میں ان کو (اپنے سے) قریب کرنے ان کی بات سننے میں مت جھجکا کرو۔

دیکھئے اس عبارت میں اس مستشرق نے کس دیدہ دلیری سے تحریف کی ہے۔ "والاقصاء لہم" کو "تضطہاد من احادیثہم" سے بدل دیا ہے لفظ "احادیثہم" کا پوری عبارت میں کہیں نام تک نہیں ہے۔ اب آپ نے دیکھا۔ ان "علماء محققین" اور "ادراکی مفکرین" کی دیانت و امانت کا کیا حال ہے؟ فرض کیجئے یہ لفظ احادیثہم یہاں ہوتا بھی، تب بھی اس کے معنی اس جگہ باہمی گفتگو اور مجلس

ہیں گفت وشنید کے ہوتے نہ کہ وہ اقوال (قولی احادیث) جنکی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاتی ہے۔

یہ ہیں اس یہودی مستشرق کے دلائل جن پر یہ ایک اہم فیصلہ کی بنیاد قطعی اور یقینی انداز میں رکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ :-

"اموی حکومت نے خود بھی احادیث وضع کیں اور دوسروں کو بھی احادیث کے وضع کرنے کی دعوت دی"

۸۔ کیا بنو امیہ نے زہری کو حدیث وضع کرنے کے لئے آلہ کار بنایا تھا

اس کے بعد کہتا ہے کہ :-

بنو امیہ اور ان کے اتباع کو اپنے نظریات کے موافق احادیث میں دروغ گوئی کی تو مطلق پرواہ نہ تھی۔ البتہ اہم مسئلہ ان لوگوں کو پیدا کرنے کا تھا جن کی طرف ان احادیث کی نسبت کی جائے چنانچہ ان امویوں نے امام زہری جیسے لوگوں کو اپنے مکروفریب سے حدیثیں وضع کرنے کے لئے آلہ کار بنا لیا تھا"

یہاں ہم اپنا ذمہ حق اور اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس یہودی مستشرق کی سازش وفریب کاری کا پردہ اچھی طرح چاک کر دیں جو اس نے اپنے زمانے کے سب سے بڑے امام سنت کے خلاف روا رکھی ہے، ...... بلکہ تابعین کے اس امام کے خلاف جس نے سب سے پہلے سنت کو مدون کیا تاکہ ہم اس یہودی کی خیانت، دنائت، مسخ وتحریف اور دسائس سے واقف ہو سکیں۔ اس یہودی مستشرق کی یہ ایک نہایت تباہ کن اور مستقل پالیسی تھی کہ سنت کے ارکان واکابر محدثین کو ایک ایک کرکے نشانہ بنائے اور ناواقف مسلمانوں کو اُن سے بدظن کرے چنانچہ اس نے اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والوں میں سب سے بڑے صحابی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر خوب خوب حملے کئے۔ آپ اسی کتاب میں استاذ احمد امین مصری کی کتاب ضحیٰ الاسلام پر تنقید کے ذیل میں ان تمام الزامات واتہامات کی مکمل تردید پڑھ چکے ہیں جنہوں نے اس معاملہ میں حق تعالٰی کے خوف کو پس پشت ڈال کر اس مستشرق کی پیروی کی ہے اور جب اپنے زعم میں ابوہریرہ کو ساقط اور ناقابل اعتبار گردان چکا تو تابعین کے دور کے رکن سنت امام زہری کو اسی طرح گرانا اور ناقابل اعتماد بنانا چاہا ہے۔ اور جب یہ بھی کر چکا یعنے سنت رسول اللہ کی دونوں پہلوؤں پہ کدال چلا کر فارغ ہو گیا تو اپنے زعم میں وہ سمجھ بیٹھا کہ حدیث وسنت

کی عمارت اب زمین پر آرہی اور کلی طور پر مسمار ہوگئی۔ یعنی اس نے ایک طرف سنت کے کثیر الروایت راویوں اور ائمہ حدیث پر حملے کئے اور اتہامات لگائے، دوسری طرف وضع حدیث کی تحریک (سازش) کا پروپیگنڈا کر کے مجموعی طور پر ذخیرۂ سنت میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے، جیسا کہ آپ ابھی اس کا طرزِ عمل دیکھ چکے ہیں؟

لیکن خدا کا فیصلہ سب پر غالب ہے حق کے سامنے باطل کو بہر حال شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے چاہے وہ کتنے ہی وسیع سایہ اور مضبوط سہارے کی پناہ لے۔

امام زہری اور تاریخ میں اُن کا مرتبہ و مقام

اس مستشرق گولڈ زیہر نے امام زہری پر جو تہمتیں تراشی اور الزامات لگائے ہیں ان کا دفاع کرنے اور جواب دینے سے پہلے ہم یہاں بھی وہی طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جو ہم نے حضرت ابوہریرۃ کے موقف کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا کہ ہم پہلے امام زہری کی اس "تصویر" کو پیش کرتے ہیں جس سے امام زہری ہماری تاریخ میں جانے پہچانے گئے ہیں نیز ان کے بارے میں علماء حدیث کی آراء اور محدثین کی تاریخ میں ان کا حقیقی مرتبہ و مقام واضح کرتے ہیں تاکہ اس یہودی مستشرق نے اُن پر جو تہمتیں جڑی ہیں اور جھوٹے الزامات لگائے ہیں (اور ان کی اس تصویر کو مسخ کیا ہے) ان سے مقابلہ کر کے قطعی اور دوٹوک فیصلہ کیا جا سکے (کہ ان تہمتوں اور بہتانوں کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں یہ صرف اور محض بہتان تراشی اور افترا پردازی ہے)

زہری کا پورا نام و نسب، تاریخ ولادت و وفات اور مختصر سوانح حیات

زہری کا نام محمد بن مسلم زہری ہے کنیت ابوبکر ہے سلسلۂ نسب: محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب بن عبد اللہ بن الحارث بن زہرۃ القرشی الزہری ہے۔

---

(۱) امام زہری کی یہ سوانح حیات ہم نے مختلف ماخذوں (کتابوں) سے مرتب کی ہے ان میں سے اکثر قلمی کتابیں ہیں جو عام کتب خانوں (لائبریریوں) میں نہیں ملتیں ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں تاریخ ابن عساکر، ابن ابی حاتم کی کتاب

(باقی صفحہ ۱۹۴ پر)

مورخین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زہری ۵۱ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد مسلم بن عبید اللہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ بنو امیہ کے خلاف لڑائیوں میں شریک ہوئے ہیں۔ جب زہری کے والد کی وفات ہوئی تو وہ نوعمر بچے تھے۔ ان کے والد نے اپنے پیچھے مال ومتاع کچھ نہیں چھوڑا تھا اس لئے انہوں نے یتیمی اور فقر و افلاس میں ہوش سنبھالا بجز ایک بڑے بھائی کے اور کوئی ان کی کفالت کرنے والا اور مربی نہ تھا۔ ان کے اس برادر بزرگ کے بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے کوئی قابل ذکر چیز نہیں بیان کرتی۔

تحصیل علم سب سے پہلے زہری نے قرآن کریم حفظ کرنے کی طرف توجہ کی ان کے چچا زاد بھائی کا بیان ہے کہ زہری نے صرف اسّی دن میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد (ماہر انساب) عبداللہ بن ثعلب کے ہاں آنے جانے لگے اور ان سے اپنی قوم کے نسب کا علم حاصل کیا۔ بعد ازاں زہری نے حرام وحلال کا یعنی فقہ کا علم حاصل کرنے کی طرف توجہ کی چنانچہ انھوں نے ان صحابہ کے پاس تحصیل علم فقہ کے لئے جانا شروع کیا جن سے ملاقات ممکن تھی (اور اس وقت تک بقید حیات تھے) ان صحابہ کی تعداد دس ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: حضرت انس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر، حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہم۔ ان میں سے بعض صحابہ کے بارے میں اختلاف بھی ہے کہ زہری ان سے ملے ہیں یا نہیں۔ یہ ابتدائی علوم حاصل کر لینے کے بعد کبار تابعین کے حلقہ ہائے درس میں بیٹھنا شروع کیا جیسے سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، عبید اللہ بن عبید اللہ بن عتبہ، ابوبکر بن عبد الرحمٰن۔ ان میں سے سب سے زیادہ جن بزرگ کی خدمت میں رہے وہ تابعین کے جلیل القدر امام سعید بن المسیب ہیں ان کے حلقۂ درس میں مسلسل آٹھ سال تک علم حاصل کرتے رہے۔

امام زہری (تحصیل علم کے لئے) بارہا (مدینہ سے) شام بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ پہلی مرتبہ وہ خلیفہ مروان کے عہد حکومت میں شام گئے ہیں اس وقت وہ بالغ ہو چکے تھے۔ پھر حضرت عبداللہ بن الزبیر کی شہادت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۳) الجرح والتعدیل، ذہبی کی تاریخ الاسلام، سیوطی کی طبقات المحدثین یہ کتابیں، ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، ابن حجر کی تہذیب اور نووی کی تہذیب الاسماء واللغات کے علاوہ ہیں۔

کے بعد عبدالملک (بن مروان) کے ساتھ زہری کا تعلق رہا اُس کے بعد آنے والے خلفاء بنو اُمیہ۔ ولید، سلیمان اور عمر بن عبدالعزیز، یزید ثانی، ہشام بن عبدالملک ــــ کے ساتھ بھی ان کا یہ میل جول باقی رہا ہے اسی طرح زہری مرتے دم تک (تحصیل حدیث کے لئے) عراق اور مصر کے سفر بھی کرتے رہے ہیں۔

امام زہری کی وفات ۱۲۴ھ میں ــــ یہی مورخین کے نزدیک راجح ہے ــــ ان کی اپنی جاگیر ادامی کے مقام پر ہوئی ہے۔ یہ مقام حدود حجاز کے آخر اور حدود فلسطین کے شروع میں واقع ہے۔ وفات کے وقت ان کی عمر بہتر برس کی تھی۔ زہری نے وصیت کی تھی کہ ان کو عام گذرگاہ چوراہے پر دفن کیا جائے تاکہ ہر گذرنے والا ان کے لئے دعاء رحمت ومغفرت کرے۔ اللہ تعالیٰ اُن پر رحمت فرمائیں اور اپنی رضا سے نوازیں۔

امام زہری کا حلیہ اور ان کے نمایاں وممتاز ترین اخلاق واوصاف

زہری کا قد چھوٹا تھا، داڑھی ہلکی تھی، رخسار ستواں تھے۔ سر اور داڑھی کے بالوں میں مہندی کا خضاب لگایا کرتے تھے، آنکھوں میں معمولی سی چوندھیاہٹ تھی۔ اعلیٰ درجہ کے خوش بیان اور فصیح اللسان تھے۔ ان کے زمانہ میں مشہور تھا کہ اپنے زمانہ میں تین شخص سب سے زیادہ فصیح البیان ہیں (۱) زہری (۲) عمر بن عبدالعزیز (۳) اور طلحہ بن عبید اللہ۔

زہری کے اخلاق وخصائل میں سب سے زیادہ مشہور اور لائق ذکر اخلاق جود وکرم اور سخاوت ہیں ان دونوں صفات میں تو وہ آیت من آیات اللہ اور قدرت کا ایک عجیب شاہکار تھے۔ (مصر کے امام) لیث بن سعد فرماتے ہیں: جتنے لوگوں کو میں نے دیکھا ہے ابن شہاب ان سب سے زیادہ سخی تھے؛ جو بھی سائل ان سے کچھ مانگنے آتا اس کو دیہی دیتے، جب اُن کے پاس کچھ نہ رہتا تو اپنے وابستگان اور رشتہ داروں سے قرض لیتے اور سائل کا سوال پورا کرتے حتیٰ کہ جب ان کے پاس بھی کچھ نہ رہتا تو اپنے غلاموں تک سے قرض لیتے اور سائل کو دیتے۔ بعض اوقات ان کے پاس کوئی سائل آتا اور ان کے پاس اس کو دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو ان کا چہرہ افسردہ ہو جاتا اور بطور معذرت اس سے کہتے: تم مطمئن رہو اللہ تعالیٰ ضرور کوئی بہتری کی صورت پیدا فرمائیں گے (یعنی خدا ضرور کہیں سے کچھ بھیجے گا اور تمہاری ضرورت پوری کی جائے گی) چنانچہ اللہ تعالیٰ بھی زہری کے اس صبر اور برداشت کی لاج رکھ لیتے اور ان کی خواہش کو پورا کر دیا کرتے یا تو (احباب میں)

کوئی شخص ان کو اتنا ہدیہ دیدیتا (جو ان کی داد ودہش کے لئے کافی ہو) اور یا کوئی شخص ان کے ہاتھ کوئی (بیش قیمت) چیز فروخت کردیتا اور اس کی قیمت ادا کرنے میں ان کو مہلت دیدیتا (کہ جب چاہو دیدینا)۔

زہری بسا اوقات عام گذرگاہ کے کنارے آنے جانے والوں کے لئے شہد اور ثرید کے دسترخوان بچھا دیا کرتے تھے (تاکہ سوال کی زحمت کے بغیر ہر بھوکا راہرو یا مسافر اپنا پیٹ بھر سکے)

ایک مرتبہ (سفر کے دوران) زہری کا گذر ایک چشمہ (یا آبادبستی) سے ہوا وہاں کے باشندوں نے زہری سے شکایت کی کہ ہمارے ہاں اٹھارہ[۱۸] بوڑھی (اور بے کس) عورتیں ایسی ہیں جن کے پاس کوئی خادم نہیں ہے (جو ان کی خدمت کرے) اتفاق سے زہری کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا (کہ ان کی مدد کریں) تو انھوں نے اٹھارہ ہزار درم اسی وقت قرض لئے اور ہر بڑھیا (کی خدمت کے لئے) ایک ایک کنیز خرید کردی۔

حدیث کے طلبہ (ان کے شاگردوں) میں سے اگر کوئی ان کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کردیتا تو قسم کھا لیتے کہ دس دن تک وہ حدیث بیان نہیں کریں گے (حدیث کا درس نہ دیں گے) صحرانشینوں (بدوی قبائل) کو علم دین سکھانے کے لئے وہ (بسا اوقات) سفر کیا کرتے تھے ان کو علم دین اور فقہ (احکام شرعیہ) کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جاڑے کے موسم میں شہد اور پنیر سے اور گرمی کے موسم میں شہد اور گھی سے ان کی تواضع بھی کرتے (ہر موسم کے مناسب ان کی دعوتیں بھی کرتے)

اسی انوکھی اور عجیب وغریب قسم کی سخاوت اور مہمان نوازی کی وجہ سے ان پر قرضے چڑھ جاتے جن کو کبھی خلفاء بنو امیہ ادا کرتے اور کبھی ان کے احباب ادا کرتے۔

امام زہری کی دو[۲] بے مثل نمایاں ترین صفات

امام زہری کی وہ نمایاں اور ممتاز ترین صفات جن کی وجہ سے ان کو علم اور حدیث میں یہ مقام حاصل ہوا اور آفاق عالم میں یہ بے مثل شہرت نصیب ہوئی اور اپنے ہمعصروں پر یہ عظیم فوقیت اور برتری حاصل ہوئی، دو[۲] ہیں:۔

اوّل! علم اور حدیث حاصل کرنے میں انتھک محنت ومشقت، علماء حدیث سے ملاقات کرتے اور ان سے جو حدیثیں سنتے ان کو مدون اور مرتب کرنے کے بحد حریص تھے۔ راتوں جاگتے

اور جو حدیثیں محدثین سے سنتے ان کو یاد کرتے اور (بار بار دُہرا کر) پختہ کرتے (اور پھر ان کو ترتیب وار لکھتے) طلب علم اور تحصیل حدیث کے سلسلہ میں ہم زہری کے چند ہم دَرسوں اور ساتھیوں کے بیانات نقل کرتے ہیں۔

ابوالزناد کہتے ہیں: ہم تو صرف حرام و حلال (فقہی احکام) سے متعلق حدیثیں لکھتے لیکن ابن شہاب جو حدیثیں بھی سنتے سب لکھ لیتے تھے، جب ہمیں اُن حدیثوں کی ضرورت پڑی تو پتہ چلا کہ زہری ہم میں سب سے زیادہ حدیثوں کے جاننے والے ہیں (ہر طرح کی حدیثیں ان کے پاس محفوظ ہیں)

ابراہیم بن سعد کہتے ہیں :- میں نے اپنے والد سے عرض کیا: ابن شہاب آپ سب سے کس طرح فوقیت لے گئے؟ فرمانے لگے: زہری ہمیشہ درس حدیث کی صدر مجلس میں ہوتے تھے اور مجلس درس میں جو بھی بوڑھا یا جوان ملتا اُس سے حدیثیں دریافت کر لیا کرتے تھے پھر (مجلس درس ختم ہو جانے کے بعد) انصار کے محلوں میں سے کسی بھی محلے میں جاتے وہاں اُنھیں جو بھی بوڑھا یا جوان ملتا اس سے حدیثیں دریافت کرتے یہاں تک کہ عروسی کی مسہریوں میں بیٹھنے والی دلہنوں سے بھی علمی بحثیں کرتے (اس لئے ان کے پاس حدیثوں کا اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ ہم میں سے کسی کے پاس نہیں ہے)

اساتذہ کی بے مثل خدمت گذاری

زہری کی حدیثیں حاصل کرنے کی حرص اس حد تک پہونچی ہوئی تھی کہ (اپنے شیخ) عبیداللہ عتبہ بن مسعود کی خدمت اور گھریلو کام کاج بھی کیا کرتے تھے۔ صرف اس لئے کہ انہیں حدیثیں حاصل کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہاتھ آجائیں گھر کے لئے پینے کا پانی تک بھر کر لاتے پھر (جب کوئی کام نہ ہوتا تو دربان کی طرح) دروازے پر کھڑے ہو جاتے عبیداللہ اپنی لونڈی سے پوچھتے: دروازہ پر کون ہے؟ تو وہ جواب میں کہتی: وہ آپ کا چندھا غلام (لڑکا) ہے" اس سے اس کی مراد زہری ہوتے تھے — جن کی آنکھ میں معمولی سی چوندھیاہٹ تھی — یہ لونڈی (ہمہ وقت ہر طرح کی گھریلو خدمت کرنے اور نوکروں کی طرح کام کاج کرنے اور نوکروں کی طرح دروازہ پر موجود رہنے کی وجہ سے) زہری کو غلام (نوکر) سمجھتی تھی۔

زہری کے متعلق لوگوں کا بیان ہے کہ جب وہ گھر میں اکیلے ہوتے تو حدیث کی کتابیں (نوشتے) اپنے چاروں طرف رکھ لیتے اور دنیا کی ہر چیز سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر ان میں منہمک ہو جاتے یہاں تک کہ (ان کے اس راتوں کے انہماک کی وجہ سے) ان کی بیوی بھی تنگ آگئیں اور ایک دن رات کو ان سے کہا: خدا کی

قسم یہ کتابیں تو میرے اوپر تین سوکنوں سے بھی زیادہ بھاری ہیں" (یعنی اگر تم تین شادیاں اور بھی کرلو تب بھی مجھے اتنی کوفت نہ ہوگی، چوتھی رات تو یکسوئی کی ملجائے گی اور اب تو ایک رات بھی نصیب نہیں ہوتی)

امام زہری کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب وہ کسی شیخ سے کوئی حدیث سنتے اور گھر لوٹتے تو آتے ہی اپنی لونڈی کو جگاتے اور اس سے کہتے :۔۔۔فلاں محدث نے آج مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے اور فلاں محدث نے یہ حدیث بیان کی ہے وہ کہتی : تم نے یہ حدیثیں سنی ہیں تو مجھے کیا؟ وہ فرماتے : میں جانتا ہوں کہ تجھے ان سے کچھ فائدہ نہیں لیکن میں یہ حدیثیں ابھی ابھی سن کر آیا ہوں اس لئے میں ان کو دہرانا چاہتا ہوں (تاکہ اچھی طرح یاد ہوجائیں گویا آج کل کی اصطلاح کے مطابق درس کے فوراً بعد "تکرار" کرتے تھے اور لونڈی کو بڑا خفش بناتے تھے)

دوم! دوسری صفت زہری کا زبردست حافظہ اور یادداشت کی قوت ہے اس صفت میں بھی زہری قدرت کی ایک حیرت انگیز نشانی اور تعجب خیز کرشمہ تھے۔ ان کے چچازاد بھائی کی زبانی یہ تو آپ سن ہی چکے ہیں کہ زہری نے اسّی دن میں قرآن حفظ کرلیا تھا (مصر کے) امام لیث بن سعد خود زہری کا قول نقل کرتے ہیں کہ :۔ زہری نے کہا : میں نے حدیثوں کی امانت اپنے دل میں رکھی ہے (نوشتوں میں نہیں) کہ کہیں بھول نہ جاؤں"۔ عبد الرحمٰن بن اسحٰق بھی زہری کا قول نقل کرتے ہیں کہ : زہری نے کہا : نہ میں نے کبھی کسی حدیث کو (اپنے شیخ سے) دہروایا (استاذ کی زبان سے ایک مرتبہ سنکر ہی ہر حدیث یاد ہوگئی ہے) اور نہ مجھے کبھی کسی سنی ہوئی حدیث میں شک ہوا سوائے ایک حدیث کے وہ بھی جب میں نے اپنے رفیق دوست سے پوچھا تو ویسی ہی نکلی جیسے مجھے یاد تھی"۔

امام زہری کے حافظہ کے حیران کن واقعات

امام زہری کے بے مثل حافظہ کی قوت کے (خارق العادۃ اور محیر العقول) واقعات تو بہت ہیں ہم یہاں ان میں سے صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس کو شام کے مورخ ابن عساکر نے تاریخ ابن العساکر میں اپنی سند سے جو عبد العزیز بن عمران تک پہونچتی ہے بیان کیا ہے کہ :۔

ایک مرتبہ خلیفہ عبد الملک نے اہل مدینہ کو ناراضگی اور عتاب سے بھرا ہوا ایک لمبا چوڑا خط لکھا۔ یہ خط دو بڑے بڑے صفحوں پر لکھا ہوا تھا۔ وہ خط (مسجد نبوی) کے منبر پر مجمع عام میں پڑھ کر سنایا گیا۔ جب لوگ خط سن چکے اور منتشر ہوگئے تو امام

سعید بن المسیب کے تلامذہ ان کے پاس جمع ہوئے تو سعید نے ان سے دریافت کیا کہ خط میں کیا لکھا تھا ؟ (کسی کو یاد ہے ؟ یہ سُنکر یہ سب خاموش ہو گئے) تو سعید نے ان سے فرمایا : کاش ہمیں کوئی ایسا شخص ملجاتا جو ہمیں اس خط کے مضمون سے آگاہ کرتا" یہ سُنکر اس مجلس میں سے کوئی کہنے لگا یہ لکھا تھا، کوئی کہنے لگا یہ لکھا تھا لیکن سعید کو ان کے مختلف بیانات سے تشفی نہیں ہوئی ۔ زہری سمجھ گئے تو انھوں نے عرض کیا : اے ابو محمد ! آپ پورا کا پورا خط (ہو بہو) سننا چاہتے ہیں ؟ انھوں نے کہا : جی ہاں" تو زہری نے ان کے سامنے وہ پورا خط اس طرح بلفظہ سنا دیا جیسے ان کے ہاتھ میں وہ خط ہے (اور اسے دیکھ کر سنا رہے ہیں) ۔

زہری کے غیر معمولی حافظہ کی شہرت اس قدر ہوئی کہ خود خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے آزمانے کا قصد کیا تو اس نے زہری سے درخواست کی کہ : میرے لڑکے کو کچھ حدیثیں لکھا دیجئے ۔ زہری نے کاتب کو بلا کر چار سو حدیثیں املا کرا دیں ۔ ہشام نے مہینہ بھر یا کچھ کم و بیش مدت کے بعد زہری سے کہا : اے ابوبکر وہ نوشتہ تو ضائع ہو گیا" تو زہری نے پھر کاتب کو بلا کر وہی حدیثیں لکھا دیں ۔ ہشام نے جب اس نوشتہ کو پہلے نوشتہ سے ملا کر دیکھا تو ایک حرف بھی نہیں چھوٹا تھا ۔

امام زہری کے بارے میں ایک اور روایت کا ذکر کرنا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا وہ یہ ہے کہ زہری شہد بہت پیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ شہد حافظہ کو قوی کرتا ہے کھٹے سیب اور سرکہ کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے ." یہ دونوں چیزیں نسیان پیدا کرتی ہیں" اسی سلسلہ میں زہری کا یہ قول بھی قابل ذکر ہے کہ : جسے حدیثیں یاد کرنی ہوں اسے کشمش خوب کھانی چاہیئے ۔

علم حدیث میں امام زہری کی شہرت ومقبولیت اور لوگوں کا انکی طرف رجوع

امام زہری نے بچپن میں جو علم حاصل کرنے کے لئے راتوں کی نیند اپنے اوپر حرام کی تھی دور دراز سفروں کی صعوبتیں جھیلی تھیں اور اپنے اساتذہ ومشائخ کی خدمتیں کی تھیں اور اس کے نتیجہ میں حافظہ کی قوت، یادداشت کی پختگی اور روایت حدیث میں صداقت ودیانت کی جو شہرت عام حاصل کر لی تھی اس کے پیش نظر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں رہتی کہ زہری کی شہرت اطراف عالم میں پھیل گئی اور لوگ دور دور سے علم حدیث حاصل کرنے اور حدیثیں لکھنے کے لئے ان کے پاس آنے لگے ۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

زہری جب مدینہ آتے تھے تو ان کے دوران قیام محدثین مدینہ میں سے کوئی بھی محدث حدیثیں بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتا جب تک وہ چلے نہ جاتے۔ میں نے بچشم خود ستر اور اسی برس کے بوڑھے محدثین کو بھی دیکھا کہ ان کے پاس کوئی بھی حدیث کا طالب حدیثیں سننے اور لکھنے کے لیے نہ آتا اور زہری کے پاس طلبہ کی بھیڑ لگی رہتی تھی حالانکہ زہری عمر میں ان محدثین سے بہت چھوٹے تھے اور ابن شہاب ہی کو تمام محدثین مدینہ پر فوقیت دیتے تھے۔

امام زہری کی وسعت علم حدیث پر ان کے ہمعصر علماء حدیث کی تعریفیں

تذکرۃ الحفاظ میں حافظ ذہبی، اور حافظ ابن عساکر ... اپنی تاریخ میں (مصر کے امام) لیث بن سعد کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ :۔

میں نے زہری سے زیادہ جامع عالم حدیث کوئی نہیں دیکھا، زہری ترغیب و ترہیب کے موضوع کے تحت جب حدیثیں بیان کرتے ہیں تو آپ سن کر بیساختہ کہیں گے کہ زہری ترغیب و ترہیب ہی کی حدیثیں اچھی جانتے ہیں اور اگر قرآن و سنت سے متعلق حدیثیں بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس موضوع سے متعلق ہی ان کی حدیثیں زیادہ جامع اور حاوی ہیں۔

امام مالکؒ نے روایت کیا ہے کہ :۔

(ایک مرتبہ) ابن شہاب مدینہ آئے تو (فقیہ مدینہ) ربیعۃ (الرای) کا اُنھوں نے ہاتھ پکڑا اور دونوں دیوانخانہ میں داخل ہو گئے۔ جب عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تو ابن شہاب تو یہ کہتے ہوئے نکلے "میرا خیال ہے کہ مدینہ میں ربیعۃ کی طرح کا کوئی عالم نہیں ہے" اور ربیعۃ یہ کہتے نکلے "میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی عالم علم کے اس مقام پر پہونچ سکتا ہے جس پر زہری پہونچے ہوئے ہیں"۔

ایک مرتبہ عمرو بن دینار، امام زہری کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھے اور اس طویل صحبت کے بعد اُنھوں نے کہا : میں نے اس قریشی نوجوان جیسا انسان آج تک نہیں دیکھا۔

حدیث وسنت کے اندر زہری کا مرتبہ ومقام

ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل میں اور حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی ایک روایت نقل کی ہے کہ :-

عمر بن عبد العزیز نے ایک دن اپنے ہمنشینوں سے دریافت کیا، تم ابن شہاب کے پاس جایا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں ہم جایا کرتے ہیں" تو اس پر عمر بن عبد العزیز نے فرمایا، ہاں ان کے پاس ضرور جایا کرو کیونکہ اب قدیم سنت کا ان سے بڑھ کر جاننے والا کوئی نہیں رہا" اس پر معمر کہتے ہیں: حالانکہ حسن بصری اور ان کے ہم پلہ لوگ اس زمانہ میں زندہ تھے (اس کے باوجود عمر بن عبد العزیز نے زہری کو ہی یگانہ عالم سنت قرار دیا)

علی بن مدینی کا کہنا ہے کہ :-

ثقہ راویوں کی احادیث کا مدار حجاز میں زہری اور عمرو بن دینار پر ہے بصرہ میں قتادہ اور یحیی بن کثیر پر ہے اور کوفہ میں ابو اسحق اور اعمش پر ہے یعنی بیشتر صحیح حدیثیں ان چھ حفاظ حدیث سے باہر نہیں جاسکتیں۔

عمرو بن دینار کہتے ہیں :-

میں نے حدیث میں زہری سے بڑھ کر صریح حدیثیں بیان کرنے والا اور اُن سے زیادہ بصیرت رکھنے والا کوئی محدث نہیں دیکھا۔

ایوب سختیانی نے سفیان بن عیینہ سے کہا :-

زہری کے بعد اہل حجاز کی حدیثوں کا جاننے والا میرے علم میں یحیی بن کثیر سے بڑھ کر کوئی محدث نہیں ہے تو اس پر سفیان نے کہا : زہری سے بڑھ کر سنت وحدیث کا جاننے والا تو کوئی ہوا ہی نہیں (یحیی کو زہری سے کیا نسبت)

مکحول کا کہنا ہے :-

روئے زمین پر زہری سے بڑھ کر قدیم سنت وحدیث کا جاننے والا کوئی محدث نہیں ہوا۔

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں :۔

حدیث کا جو علم زہری کے پاس رہ گیا ہے وہ کسی بھی محدث کے پاس نہیں ہے

(یہ تو بطور مشتے از گلزارے چوٹی کے حفاظ حدیث کے اقوال ہم نے نقل کئے ہیں باقی) اسی طرح کی علماء حدیث کی تصریحات کثیر تعداد میں موجود ہیں اور ان سب اس پر متفق ہیں کہ امام زہری اپنے زمانہ میں حدیث و سنت کے سب سے بڑے عالم تھے اور غالباً یہ وہی بات ہے جو ابن عساکر کی روایت کے مطابق خود امام زہری سے منقول ہے فرماتے ہیں :۔

میں پینتیس یا چھتیس سال تک شام والوں کی حدیثیں علماء حجاز کے پاس اور حجاز والوں کی حدیثیں علماء شام کے پاس پہونچاتا (اور روایت کرتا) رہا ہوں۔ اس عرصہ میں مجھے (شام یا حجاز میں) کوئی ایسا محدث نہیں ملا جس نے مجھے کوئی ایسی نئی حدیث بتلائی ہو جو میں نے نہ سُنی ہو۔

علم سنت و حدیث میں امام زہری کے آثار خالدہ

امام زہری نے تاریخ سنت و حدیث میں جو زندۂ جاوید کارنامے اور آثار باقیہ چھوڑے ہیں ان میں تین کارنامے سب سے زیادہ اہم ہیں۔

اوّل : خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے حدیث و سنت کی تدوین کرنے میں اولیت کا فخر و امتیاز امام زہری کو حاصل ہے جبکہ خلیفۂ موصوف نے اپنے مدینہ کے گورنر ابوبکر بن حزم کے اور تمام بڑے بڑے شہروں کے گورنروں کے نام سرکاری حکم (سرکلر) بھیجا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں (حفاظ حدیث سے حاصل کر کے) یکجا جمع کریں۔ وضع حدیث کا مقابلہ کرنے کے لئے علماء حدیث کی کوششوں پر بحث کے دوران ہم یہ بتلا چکے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کے اس حکم کے بعد خود ابوبکر بن حزم نے تو تھوڑی سی ہی حدیثیں جمع کیں جس شخص نے پورے اہتمام اور جانفشانی و عرق ریزی کے ساتھ حدیثیں یکجا جمع کی ہیں اور جو سب سے پہلے حدیثیں جمع کرنے والے کے لقب سے اُمت میں مشہور و معروف ہیں وہ امام ابن شہاب زہری ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ :۔

جس شخص نے سب سے پہلے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے حدیثوں کو یکجا جمع کیا

وہ ابن شہاب زہری ہیں جیساکہ ابونعیم نے محمد بن الحسن عن مالک کی سند

سے روایت کیا ہے کہ سب[1] سے پہلے جس نے حدیثوں کو یکجا جمع کیا وہ زہری ہیں"

میں کہتا ہوں : ابن عساکر کی تاریخ میں بھی میں نے خود یہی پڑھا ہے کہ " سنت کی تدوین زہری کی طرف منسوب ہے "

حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں (ج ۱ ص ۷۳ پر) اپنی سند سے جو عبدالعزیز ابن محمد الدراوردی تک پہونچتی ہے ۔ روایت کیا ہے کہ :۔

جس نے سب سے پہلے حدیثوں کو یکجا جمع کیا اور لکھا وہ ابن شہاب زہری ہیں"

(جمع وتدوین حدیث کے سلسلہ میں مختلف) روایات میں تطبیق اسی طرح دی جاسکتی ہے کہ زہری کو تو جمع وتدوین سنت میں سبقت واولیت کا فخر حاصل ہے زہری کے بعد اور (شہروں کے) محدثین نے لگاتار حدیثیں جمع کرنی اور (عنوانات کے تحت یا صحابہ کی ترتیب سے) مرتب کرنی شروع کی ہیں

دوم : بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن کے یاد اور محفوظ رکھنے میں زہری منفرد اور یگانہ محدث ہیں ۔

ابن عساکر نے امام لیث بن سعد سے روایت کیا ہے کہ :۔

سعید بن عبدالرحمن بن حنبل نے ان سے کہا : اے ابوالحارث (لیث کی کنیت ہے)

اگر ابن شہاب نہ ہوتے تو بہت سی حدیثیں ضائع ہو جاتیں "

جمحی کہتے ہیں ۔ " اگر ابن شہاب نہ ہوتے تو بہت سی حدیثیں ضائع ہو جاتیں ۔

امام مسلم اپنی کتاب صحیح مسلم میں کتاب الایمان والنذور کے تحت بیان کرتے ہیں :۔

نوّے حدیثیں ایسی ہیں جن کو صرف زہری نے جید سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور کوئی بھی دوسرا محدث ان کے روایت کرنے میں زہری کے ساتھ شریک نہیں (یعنی صرف زہری ہی روایت کرتے ہیں اگر زہری نہ ہوتے تو وہ ضائع ہو جاتیں)

سوم ! زہری سب سے پہلے محدث ہیں جس نے علماء حدیث کو اسناد کی اہمیت کی طرف

---

[1] جلد اول میں جمع وتدوین حدیث کے باب میں جو حواشی سپرد قلم کئے گئے ہیں اس موقعہ پر وہ بھی دیکھ لئے جائیں محشی

توجہ دلائی اس سے پہلے محدثین سند بیان کرنے کا چنداں اہتمام نہیں کرتے تھے چنانچہ امام مالکؒ کہتے ہیں :۔

> سب سے پہلے جس نے اسناد کے ساتھ حدیثیں بیان کی ہیں وہ ابن شہاب زھری ہیں۔

غالباً امام مالک کا مقصد اس قول سے، زہری کے شام میں محدثین کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی جانب اشارہ کرنا ہے۔ کیونکہ ابن عساکر نے ولید بن مسلم سے امام زھری کا یہ قول نقل کیا ہے :۔

> اے اہل شام! یہ کیا بات ہے میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری حدیثوں کی نہ باگ ڈور ہے اور نہ لگام (یعنے: سند ہے نہ مدار اسناد) اسی دن سے ہمارے محدثین (شام کے محدثین) نے (زہری کے متنبہ کرنے پر) اسندوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا (کہ نہ بغیر سند کے کوئی حدیث بیان کرتے ہیں اور نہ بغیر سند کے کسی سے کوئی حدیث سنتے ہیں)

امام زہری کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کی رائیں

ابن سعد مصنف طبقات بن سعد لکھتے ہیں :۔

> زہری ثقہ راوی حدیث ہیں ان کے پاس علم حدیث و روایت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور اعلیٰ درجہ کے فقیہ بھی ہیں۔

امام نسائی کہتے ہیں :۔

> نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی احادیث کی جو سب سے اچھی اسنادیں ہیں وہ چار ہیں : (۱) ایک زھری عن علی بن الحسن عن ابیہ عن جدہ ۔ (۲) دوسرے زھری عن عُبید اللہ عن ابن عباس ان کے علاوہ دو اور سندیں بیان کی ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں:

> محدثین میں سب سے اچھی حدثیں اور سب سے کھری سندیں زھری کی ہوتی ہیں

ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ :۔

> ابوزرعہ سے دریافت کیا گیا کہ :۔ سب سے زیادہ صحیح اسناد کونسی ہے ؟ انھوں نے

فرمایا: چار اسنادیں ہیں جن میں سب سے پہلی زھری عن سالم عن ابیہ والی سند ہے۔

ابن حبان کتاب الثقات میں لکھتے ہیں:

محمد بن مسلم بن شہاب الزہری القرشی ــ جن کی کنیت ابوبکر ہے ــ سب سے زیادہ اچھے اور پختہ حافظہ کے مالک تھے، حدیثوں کے متن سب سے اچھے سیاق (انداز و الفاظ) میں بیان کیا کرتے تھے، بہت بڑے فقیہ اور فضل و کمال کے مالک محدث تھے۔

صالح بن احمد کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد (احمد) نے بیان کیا کہ:-

زھری مدنی ہیں، تابعی ہیں اور ثقہ راوی حدیث ہیں۔

امام مسلم صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام زھری کی عظمت و جلالت شان اور ان کے شاگردوں کی کثرت و عظمت کو ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

جن حدیث کے راویوں کو تم دیکھو کہ وہ امام زھری جیسے جلیل القدر چوٹی کے محدثین سے ــ جو اپنی عظمت شان میں اور پختہ یادداشت کے مالک حافظ حدیث شاگردوں کی کثرت میں ضرب المثل ہیں ــ ایسی غیر معروف حدیثیں روایت کریں جو اور کوئی زہری سے روایت نہیں کرتا تو سمجھ لو کہ یہ منکر حدیثوں کے راوی ہیں۔

حافظ ذہبی امام زہری کے متعلق لکھتے ہیں:-

زہری حفاظ حدیث کے گروہ میں سب سے بڑے امام، حافظ اور حجت (سند) تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں:-

زھری بہت بڑے فقیہ ہیں، ابوبکر کنیت ہے، مدنی حافظ حدیث ہیں، صف اول کے کبار ائمہ حدیث میں سے ایک ہیں حجاز اور شام دونوں ملکوں کے یکتا و یگانہ عالم ہیں۔

امام نووی تقریب میں لکھتے ہیں:-

زہری کی جلالت قدر، حافظہ کی پختگی اور (روایت حدیث میں) انتہائی احتیاط اور صحاح بین پر محدثین کا اتفاق ہے۔

الغرض امام زہری کے ثقہ ہونے کی تصدیق، امانت و دیانت، جلالت شان، محدثین کے حلقہ میں ان کی قدر و منزلت اور شرافت کے بارے میں ائمہ حدیث اور علماء جرح و تعدیل کی روایات و اعترافات بے شمار ہیں۔

ان ائمہ حدیث کے ناموں کی فہرست جنہوں نے امام زہری سے حدیثیں روایت کیں اور اپنی کتابوں میں درج کیں۔

امام زہری سے بیشمار مخلوق نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان میں سے مشہور محدثین کے نام یہ ہیں:

(۱) امام مالکؒ (۲) امام ابو حنیفہ (جیسا کہ جلال الدین سیوطی نے طبقات المحدثین میں بیان کیا ہے) (۳) عطاء بن ابی رباح (۴) عمر بن عبدالعزیز (۵) ابن عیینہ (۶) امام لیث بن سعد (۷) امام اوزاعی (۸) ابن جریج۔

مصنفین کتب حدیث میں سے امام بخاری نے صحیح بخاری میں امام مسلم نے صحیح مسلم میں اور سنن اربعہ (سنن نسائی، سنن ابو داؤد سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ) کے مصنفین نے اپنی اپنی سنن میں امام مالک نے موطا میں، امام شافعی اور امام احمد نے اپنی اپنی مسندوں میں امام زہری کی حدیثیں بکثرت درج کی ہیں۔ غرض کسی بھی محدث کی کتاب اور کسی بھی حافظ حدیث کی مسند زہری کی روایتوں سے خالی نہیں، بلکہ ابواب حدیث میں سے قریب قریب کوئی باب بھی ایسا نہیں ہے جس میں زہری کی کوئی نہ کوئی حدیث (مرفوع) یا اثر (حدیث موقوف) یا (اجتہادی) رائے موجود نہ ہو

امام زہری کے متعلق شبہات اور اُن کے جوابات

یہ ہے علم اور حدیث میں زہری کا مرتبہ اور مقام اور مسلمان علماء دین و ائمہ حدیث کی زہری کے متعلق رائیں ان میں سے کسی ایک نے بھی زہری پر کسی ایسی بات کا الزام نہیں لگایا جو ہرزد نہیں ہوئی اور نہ ان کی امانت، دیانت اور ثقاہت کے بارے میں کسی سے بھی کوئی شک و شبہ منقول ہے اس یہودی مستشرق گولڈ تسیہر سے پہلے ہمارے علم میں پوری دنیا میں کوئی ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہوا جس نے امام زہری کی امانت و دیانت اور ثقاہت پر کوئی تہمت لگائی ہو یا شک و شبہ کا اظہار کیا ہو۔

آپ اس سے پہلے یہ تو پڑھ ہی چکے ہیں کہ اس مستشرق نے امام زہری کے متعلق کیسے کیسے بے سروپا الزامات لگائے ہیں اور بے اصل شکوک وشبہات ظاہر کئے ہیں۔ اب ہم یہاں ان کا تفصیل سے ذکر کر کے ایک ایک کا جواب دیتے ہیں۔

امام زہری کی خلفاء بنوامیہ سے وابستگی

گولڈزیہر کا دعویٰ ہے کہ: امام زہری کا بنوامیہ سے یہ رابطہ اور تعلق ہی تھا جس کی بنا پر بنوامیہ نے اپنی خواہشات کے موافق احادیث وضع کرنے کے لئے ان کو آلۂ کار بنا لیا تھا"

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ زہری جیسے راست گو، پختہ کار اور حجت فی الحدیث امام کا بنوامیہ سے ربط وتعلق ان کے وضع حدیث کے لئے آلہ کار بننے کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟ قرون اولیٰ میں ہمیشہ سے اہل علم کا تعلق خلفاء وسلاطین سے رہا ہے، لیکن اس وابستگی سے اہل علم وتقویٰ کی دیانت وامانت پر کبھی کوئی زد نہیں پڑی۔ پھر زہری جیسے عالم کا تعلق ان خلفاء کے ساتھ رہا ہو یا ان خلفاء کا تعلق زہری جیسے امام کے ساتھ رہا ہو، بہرصورت یہ تعلق اس جلیل القدر امام کے دین کو، امانت کو اور تقویٰ وپرہیزگاری کو ہرگز مجروح نہیں کر سکتا۔ امام زہری سے استفادہ کرنے والے بہرحال مسلمان ہی تھے جن کا یہ شیخ "علم کے حلقوں سے نکل کر خلفاء کی مجلسوں میں صبح وشام جاتا آتا، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سناتا، یا کوئی دینی فکر وخیال ان کے سامنے پیش کرتا، یا کوئی شریعت کا حکم بیان کرتا، یا ان کی اولاد کو آدابِ مملکت سکھاتا، یا ان کو اُمت مسلمہ کے حقوق، اور خدا کی طرف سے جو اُن پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ یاد دلاتا اور اپنا مذہبی فرض منصبی انجام دیتا تھا۔ (اس لئے کہ اسلامی تعلیمات کے تحت اعظم الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر — ظالم حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنا سب سے بڑا جہاد ہے — علم کا سب سے کٹھن فریضہ ہے)

العقد الفرید[1] میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ امام زہری اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پاس گئے تو اس نے زہری سے پوچھا کہ وہ حدیث کیسی ہے جو اہل شام ہم سے بیان کرتے ہیں؟ زہری نے دریافت کیا: امیرالمومنین وہ کیا کہتے ہیں؟ خلیفہ نے کہا: وہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی

---

[1] جلد ا ص ۶۰ (طبع جدید)

بندہ کے سپرد اپنی رعایا کی نگرانی کرتے ہیں اور اس کو حکمران بنا دیتے ہیں تو اس کی نیکیاں ہی نیکیاں لکھی جاتی ہیں، بدیاں اور برائیاں نہیں لکھی جاتیں، یہ سُنکر زہری نے کہا: امیرالمومنین یہ تو قطعاً باطل ہے کیا وہ "نبی" جو خلیفہ بھی ہو اللہ کے نزدیک زیادہ لائق عزت و حرمت ہے یا وہ خلیفہ جو صرف خلیفہ ہو اور نبی نہ ہو؟ ولید نے جواب دیا: جو نبی بھی ہو اور خلیفہ بھی ہو۔ اس پر زہری نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی سیدنا داؤد علیہ السلام سے فرماتے ہیں:۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ، وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ، إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ [۵۱]	اے داؤد ہم نے تمہیں روئے زمین میں خلیفہ بنایا ہے اس لئے تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اور اپنی خواہش پر نہ چلو ورنہ تم اللہ کے راستے سے ہٹ جاؤ گے، بیشک جو لوگ اللہ کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔

"اے امیرالمومنین یہ اس شخص کے لئے وعید ہے جو نبی بھی تھے اور خلیفہ بھی، تو اُس شخص کے باب میں آپ کا کیا خیال ہے جو صرف خلیفہ ہو نبی نہ ہو؟ (کیا اس کے لئے یہ وعید نہ ہوگی؟) ولید نے کہا: بے شک یہ لوگ تو ہمیں اپنے دین سے گمراہ کرتے ہیں!"

ذرا غور کیجئے امام زہری جیسے انسان اور ولید جیسے خلیفہ کے درمیان ربط و تعلق اُمت کے لئے کتنے عظیم فائدہ پر منتج ہوا؟ پھر یہ امر بھی (اس مقام پر) قابل لحاظ ہے کہ کیا زہری کا موقف ایک ایسے عالم جیسا ہے جو دربار شاہی کے اثر سے مرعوب ہو گیا ہو، اور ان کی خواہشات کی گرفت سے آزاد نہ رہ سکا ہو، اور ان کی دلچسپیوں کو پورا کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں گھڑتا رہا ہو؟ یا ان کا مقام ایک ایسے پختہ کار عالم کا سا ہے جو خیر خواہ ہو، اللہ کے دین اور مسلمانوں کے لئے بھلائی چاہتا ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے وضاعین حدیث کی جھوٹی روایتوں کو رد کرتا ہو؟ اور مسلمانوں کے خلیفہ کو جھوٹے راویوں کے زیر اثر آنے اور ان اکاذیب میں گرفتار ہونے سے

---

[۵۱] سورہ ص آیت ۲۶

روکتا اور بچاتا ہو، تاکہ وہ ظلم وجور پر قائم نہ رہے، اور باطل میں حد سے بڑھتا نہ چلا جائے۔

اس کے بعد اس واقعہ پر بھی غور کیجئے جس کو ابن عساکر نے اپنی سند سے جو امام شافعی رحمۃ اللہ تک پہنچتی ہے، نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے سلیمان بن لیسار سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی۔

والذی تولی کبرہٗ منھم لہٗ عذاب عظیم ط — اس بہتان باندھنے میں جس نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کے لئے بہت بڑا عذاب ہے

ہشام نے پوچھا وہ کون تھا جس نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؟ سلیمان نے جواب دیا: وہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔" ہشام نے کہا کہ: تم جھوٹ بولتے ہو، اس سے مراد علی بن ابی طالب ہیں (مصنف فرماتے ہیں) معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہشام سچ مچ یہ بات نہیں کہہ رہا تھا بلکہ حق کے معاملہ میں اہل علم کی شدت اور پختگی کو آزمانا چاہتا تھا۔ سلیمان بن یسار نے کہا: امیرالمومنین جو فرماتے ہیں اُن کو ہی اُس کا علم ہوگا (یعنی امیرالمومنین اپنے قول کے ذمہ دار ہیں) پھر ابن شہاب زُہری پہنچے تو ان سے بھی ہشام نے یہی سوال کیا کہ بتلاؤ "الذی تولی کبرہٗ منھم سے کون مراد ہے؟ زُہری نے جواب دیا: عبداللہ بن اُبی بن سلول، اس پر خلیفہ ہشام نے کہا: تم نے جھوٹ کہا اس سے مراد تو علی بن ابی طالب ہیں۔ امام زُہری نے غصہ میں آگ بگولہ ہو کر کہا: میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ تیرا باپ مرے، خدا کی قسم اگر آسمان سے کوئی پکارنے والا یہ منادی (اعلان) بھی کر دیتا کہ خدا نے جھوٹ کو حلال کر دیا ہے، تب بھی میں جھوٹ نہ بولتا۔ مجھ سے فلاں و فلاں (شیوخ) نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عائشہ پر تہمت لگانے کے واقعہ میں سب سے بڑھ چڑھ کر جس نے حصہ لیا تھا وہ عبداللہ ابن ابی بن سلول تھا۔"

امام شافعی فرماتے ہیں کہ: لوگ (اس بیباکی اور حق گوئی پر) ہشام کو مسلسل زہری کے خلاف اُبھارتے اور بھڑکاتے رہے، یہاں تک کہ اس نے زہری سے کہا:-

تم (یہاں سے) چلے جاؤ، اس لئے کہ خدا کی قسم ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم، تم جیسے لوگوں کی ذمہ داری لیں، زہری نے پوچھا: یہ کیسے؟ کیا میں نے تم سے زبردستی اپنے ذمہ پر کچھ لیا ہے یا تم نے میرے ذمہ پر زبردستی مجھ سے کچھ لیا ہے؟ (میرا تمہارا لینا دینا کچھ نہیں پھر ذمہ داری کیسی)

لہذا تم ہی میرا پیچھا چھوڑ دو۔" ہشام نے کہا: نہیں، تم نے دو لاکھ (درہم) قرض لئے ہیں (پیچھا کیسے چھوڑیں)، زہری نے جواب دیا: تم کو اور تم سے پہلے تمہارے باپ کو یہ بات خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے یہ مال تمہارے باپ کی ذمہ داری پر قرض نہیں لیا ہے۔" اس کے بعد زہری غصہ میں بھرے ہوئے (وہاں سے) چلے گئے۔ تو اس پر ہشام نے کہا: ہم نے شیخ کو ناراض کر دیا" پھر ہشام نے ان کے قرض میں سے ایک لاکھ درہم ادا کرنے کا حکم دے دیا۔ زہری کو اس کی اطلاع ہوئی تو کہا، اس اللہ جل شانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر جس کی جانب سے یہ (کرم ہوا) ہے[1]

امام زہری پر جھوٹ بولنے کا الزام لگانے اور خلفاء کے ساتھ تعلق رکھنے کی بنیاد پر ان کی دیانت کو متہم اور مجروح قرار دینے والے اس یہودی (گولڈ زیہر) کے دنیا میں جنم لینے سے بہت پہلے ابن عساکر اپنی تاریخ میں آٹھ سو سال قبل اس واقعہ کو امام شافعی جیسے جلیل القدر امام سے نقل کر چکے ہیں جو حق و صداقت کے مالک ائمہ میں ممتاز امام ہیں۔ کیا آپ اس واقعہ پر غور نہیں کرتے؟ زہری کی دیانت و امانت کا مبلغ یہ واقعہ کس قدر واضح طور پر بتلا تا ہے۔ جن سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ زہری کے اور خلفاء کے درمیان ربط و تعلق زہری کے دین و امانت پر ذرہ برابر بھی اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ ایک ایسا شخص جو مسلمانوں کے خلیفہ کو یہ کہے: لا ابا لك (تیرا باپ مرے) حالانکہ یہ وہ کلمہ ہے جو ایک معمولی آدمی بھی دوسرے آدمی کو جس کا وہ ادب و احترام کرتا ہو ہرگز نہیں کہہ سکتا، یہ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ زہری کا خلیفہ سے تعلق ایک کمزور و کمتر شخص کا طاقتور و برتر شخص سے تعلق نہ تھا اور نہ ایک فریب خوردہ کا فریب دینے والے سے، بلکہ ایک ایسے شخص کا تعلق تھا جس کو اپنے دین پر کامل اعتماد تھا اور اپنے علم و فضل کے لحاظ سے برتر و قوی تر تھا، جھٹلائے جانے پر آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تاریخ کے حقائق میں سے کسی ایک حقیقت کی تحریف پر بھڑک اٹھتا

---

[1] اس عبارت کا جو ترجمہ بینات میں شائع ہوا ہے وہ غلط ہے جلدی میں اغتصاب کو اغتضاب پڑھ لیا گیا حالانکہ غضب کے مادہ سے اغتضاب (باب افتعال) آتا ہی نہیں ہاں غصب سے اغتصاب آتا ہے جس کے معنی ہیں کسی پر ظلم کرنا، زبردستی کرنا اس کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی کام لینا۔ یہی معنی یہاں مراد ہیں جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے۔ ۱۲ محشی

ہے ایک ایسا شخص جو خلیفہ کے سامنے شیروں کی طرح دھاڑتا ہے، صرف اس لئے کہ خلیفہ کتاب اللہ کی ایک آیت کی تفسیر میں اس کو جھٹلاتا ہے اور اُس کے خلاف تفسیر کرتا ہے، جو اس سے پہلے اہلِ علم کے نزدیک مسلم تھی۔ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ ایسا شخص خلیفہ کی خواہشات کی خاطر ذلت و رسوائی مول لے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی حدیثیں گھڑے جن کی کوئی اصل نہ ہو۔ زُہری کے اس قول پر آپ غور نہیں کرتے: "کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟ تیرا باپ مرے، خدا کی قسم اگر کوئی منادی مجھے آسمان سے بھی یہ آواز دے کہ زُہری خدا نے جھوٹ تیرے لئے حلال کر دیا ہے تب بھی میں جھوٹ نہ بولوں گا۔"

یقیناً امام زُہری تاریخ انسانیت میں اُن ممتاز طرز کے لوگوں (یعنی صحابہ کے نقشِ قدم پر چلنے والوں) میں سے تھے جن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت دے کر رہتی دنیا تک کے لئے حق گوئی، عزتِ نفس، اور جھوٹ سے اجتناب — خواہ وہ مباح ہی کیوں نہ ہو — کا ایک روشن مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا تھا۔

پھر سوال یہ ہے کہ آخر زُہری ان بنو امیہ کی خواہشات کا ساتھ دے کر ان سے کس چیز کے طلبگار تھے؟ کیا وہ مال کے طلب گار تھے؟ خود یہ مستشرق اس امر کا معترف ہے اور ہمارے ساتھ اس امر پر متفق ہے کہ زُہری اس طرز کے لوگوں میں سے نہ تھے جن کو مال کی طمع غلام بنا لیتی ہے۔ چنانچہ اس مستشرق نے زُہری کے بارے میں عمرو بن دینار کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"میں نے کسی شخص کی نظر میں دینار و درہم کو اتنا حقیر نہیں دیکھا جتنا زُہری کی نظر میں، دینار و درہم ان کے نزدیک گویا اونٹ کی مینگنیاں تھیں۔"

پھر کیا زُہری (خلفاء سے) عزت وجاہ کے طلب گار تھے؟ مستشرق مذکور اس امر کا بھی معترف ہے اور ہمارے ساتھ متفق ہے کہ: "زُہری امتِ مسلمہ میں عظیم تر شہرت اور مقبولیت کے مالک تھے"۔ اس سے بڑھ کر اور وہ کس جاہ و منزلت کے طلب گار ہو سکتے تھے؟ تو جب زُہری نہ عزت وجاہ کے طلبگار تھے نہ دولت و ثروت کے خواہاں اور ان کی امانت دیانت اور جرأت و بیباکی کا حال ابھی آپ سُن چکے ہیں تو آخر وہ کونسی حماقت و سفاہت ہو سکتی تھی جس کی بنا پر وہ بنو اُمیہ کے لئے اپنے دین و ایمان کو بیچتے اور مسلمانوں کے اندر اپنی شہرت کو بٹا لگاتے، جبکہ انھیں نہ مال وجاہ کی حرص و طمع تھی نہ کسی عہدہ اور منصب کی۔

پھر مستشرق مذکور بنو امیہ کے زمانہ کی تصویر اس طرح پیش کرتا ہے گویا وہ پورا زمانہ ظلم وجور کا زمانہ تھا۔ اور یہ دکھاتا ہے کہ" مدینہ کے متقی اور پرہیزگار علماء کی اُن سے مسلسل جنگ جاری تھی، اور وہ اُن سے کلی طور پر منحرف تھے" اور ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ زہری نے مدینہ میں ہی پرورش پائی اور مدینہ کے شیوخ سے ہی علم حاصل کیا۔ سعید بن المسیب کی وفات تک ہمیشہ ان کی صحبت میں بیٹھتے رہے، جب کبھی زُہری مدینہ آتے امام مالک ان سے اخذ و استفادہ کرتے، خود زہری کے قول کے مطابق وہ پینتیس[۳۵] سال تک شام اور مدینہ آتے جاتے رہے ہیں۔ پھر مدینہ کے علماء زہری سے (بنو امیہ سے ربط و تعلق کی بنا پر) کیوں ناراض اور برگشتہ نہیں ہوئے؟ اگر یہ بات صحیح تھی کہ زہری بنو امیہ کی خاطر جھوٹ بولا کرتے تھے تو مدینہ کے علماء نے ان کی تکذیب کیوں نہیں کی؟ ان کے استاد سعید بن المسیب نے ان سے بے تعلقی کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ یہ سعید وہی جری اور بے باک عالم ہیں جنہوں نے عبدالملک کی سطوت و دبدبہ کی پرواہ تک نہیں کی تھی؟ آخر ان علماء کو زہری کے بارے میں سکوت اختیار کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا؟ کیا اُنھیں زہری سے خوف تھا؟ ان کا حال تو یہ تھا کہ خلیفہ سے لے کر معاشرہ کے ادنیٰ درجہ کے آدمی تک، کسی شخص پر بھی تنقید کرنے سے وہ نہیں ڈرتے تھے۔ اچھا فرض کر لیجئے وہ زہری سے خائف ہی تھے تو ان علماء نے (بنو امیہ کا دور ختم ہو جانے کے بعد) بنو عباس کے عہد حکومت میں زہری پر جرح و تنقید کیوں نہیں کی؟ بنو عباس کے حامیوں نے جس طرح بنو امیہ کے خلفاء پر ان کے امراء اور اعوان و انصار پر حملے کئے، زہری پر اس طرح حملے کیوں نہیں کئے؟ احمد بن حنبل، یحیٰی بن معین بخاری، مسلم، ابن ابی حاتم اور انہی جیسے کبار علماء جرح و تعدیل نے زہری کے معاملہ میں سکوت کیوں اختیار کیا؟ جبکہ وہ خدا کے دین کے بارہ میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے تھے پھر آخر اُنھوں نے حکومت بنو اُمیہ کی حامی سب سے بڑی شخصیت (زہری) پر جو عظیم شہرت کی مالک بھی تھی جرح و تنقید کرنے سے سکوت کیوں اختیار کیا؟ جب یہ بات ہے کہ مدینہ کے علماء جن کے سرخیل خود زہری کے شیخ سعید بن المسیب ہیں، زہری کے معاملہ میں خاموش ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ خود علماء مدینہ اور دوسرے ممالک کے علماء زہری سے علم حدیث اخذ کرتے ہیں، اور علماء جرح و تعدیل عباسی دور میں بھی — زہری کے بنو امیہ سے ربط و تعلق کے باوجود — ان کی توثیق کرتے ہیں۔ یہ تمام حقائق اس امر کی بہت بڑی دلیل ہیں کہ زہری کی شخصیت شک و شبہ سے بالاتر ہے

ہدف طعن وتشنیع بنائے جانے سے کہیں ارفع واعلیٰ، کذب، وضع حدیث اور اہل ظلم و باطل سے ساز باز جیسی رکیک و ذلیل حرکتوں سے کہیں پاک و منزہ تھی۔

صخرہ کا واقعہ، اور حدیث لاتشد الرحال الخ

مستشرق مذکور کا دعویٰ ہے کہ:-

> عبدالملک نے قبۃ الصخرۃ اس لئے تعمیر کرایا تھا کہ وہ اہل شام و عراق اور حج بیت اللہ کے درمیان حائل و مانع ہو جائے (یعنی شام و عراق کے باشندے حج بیت اللہ کے بجائے صخرہ کی زیارت کے لئے آیا کریں اور اسی کا طواف کیا کریں) اور یہ کہ وہ اپنے اس عمل کو دینی لباس پہنانا چاہتا تھا۔ تو اس مقصد کے لئے ولید کے دوست زہری نے اس کی خاطر یہ حدیث گھڑ دی: لا تشد الرحال الخ۔

بخدائے لایزال! یہ تو افترا، تحریف اور تاریخی حقائق کے ساتھ دل لگی کے طرفہ عجائبات میں سے ایک اعجوبہ ہے بلکہ جھوٹ کا بے مثل شاہکار اور ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ثقہ مورخین کا اس میں مطلق اختلاف نہیں کہ قبۃ الصخرۃ جس نے تعمیر کرایا وہ ولید بن عبدالملک تھا نہ کہ عبدالملک۔ ابن عساکر، طبری، ابن الاثیر، ابن خلدون اور ابن کثیر وغیرہ مشاہیر مورخین نے اس کی تصریح کی ہے۔ ہمیں تو کسی ایک بھی مورخ کی کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی جس میں کسی نے قبۃ الصخرہ کی تعمیر کو عبدالملک کی جانب منسوب کیا ہو۔

اگر اس قبہ کی تعمیر — جیسا کہ یہ یہودی مستشرق گولڈتسیہر کہتا ہے۔ صرف اسی غرض سے تھی کہ یہ کعبہ کی جگہ لے لے۔ اور لوگ کعبہ کے بجائے اس کا حج کیا کریں، تو یہ تو بلا ریب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ اور زبردست حادثہ تھا۔ یہ بات ہرگز باور نہیں کی جا سکتی کہ یہ مورخین کبار اس پر ایسی کریمانہ خاموشی سے گزر جائیں اور اس کا نام تک نہ لیں، ان حضرات کی عادت تو یہ ہے کہ اس سے بھی کم اہمیت والا اور معمولی واقعہ بھی ہو تو اُسے بھی اپنی تاریخوں میں درج کر دیتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے (عبدالملک کے عہد میں) علما کی وفات، اور مختلف قاضیوں کی منصب قضا پر تقرری وغیرہ تک کا ذکر کیا ہے۔ اگر (فی الواقعہ) عبدالملک نے ہی اس قبہ کو بنایا ہوتا تو وہ ضرور عبدالملک

کے تذکرہ میں اس کا ذکر کرتے۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ولید بن عبد الملک کی تاریخ میں وہ اس قبہ کی تعمیر کا برابر تذکرہ کر رہے ہیں۔ اور یہ حضرات تو بڑے بلند پایہ ثقہ، مورخین ہیں تاریخ نگاری میں ان کا مقام نہایت پختہ اور مسلم ہے۔ ہاں دمیری کی کتاب الحیوان میں ابن خلکان کے حوالہ سے یہ ضرور لکھا ہے کہ عبد الملک نے ہی اس قبہ کو بنوایا تھا۔ مگر اس کی اصل عبارت اس طرح ہے۔

بناها عبد الملک وکان الناس یقفون عندها یوم عرفة۔ — عبد الملک نے اس قبہ کو تعمیر کرایا تھا اور لوگ عرفہ کے دن (نویں ذی الحجہ کو) اس کے پاس جمع ہوتے تھے۔

باوجودیکہ عبد الملک کی طرف اس تعمیر قبہ کی یہ نسبت نہایت ضعیف اور ناقابل اعتبار ہے، اور ائمہ تاریخ کی تصریحات بھی اس کے خلاف ہیں، تاہم اس عبارت میں عبد الملک کے خلاف کوئی قابل مواخذہ بات نہیں ہے نہ ہی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبد الملک نے اس مقصد کے لئے یہ قبہ بنایا تھا کہ لوگ اس کا حج کریں۔ بلکہ اس سے تو ظاہر یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس از خود اپنے طور پر وہاں جمع ہو جاتے تھے (عبد الملک کا ہاتھ اس میں مطلق نہ تھا) علاوہ ازیں اس عبارت میں کعبہ کے بجائے قبہ کا حج کرنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کا حاصل یہ ہے کہ لوگ عرفہ کے دن از خود وہاں آکر قیام کیا کرتے تھے۔ اور یہ رواج تو مسلمانوں کے بہت سے شہروں میں عام تھا کہ جاہل عوام کسی بھی متبرک مقام پر عرفہ کے دن جمع ہو جایا کرتے تھے، جس کی کراہت اور ناجائز ہونے کی فقہاء نے تصریحیں کی ہیں کعبہ کے بجائے قبہ کا حج کرنے میں، اور وہاں جا کر محض جمع ہو جاتے ہیں، تاکہ حج کے دن عرفات کے قیام سے مشابہت ہو جائے، زمین آسمان کا فرق ہے (مگر یہ جاہل یہودی اسے کیا جانے اور جانتا بھی ہو تو اسے تو زہری کو بدنام کرنے کے لئے سلسلۂ واقعات کی کڑیاں ملانی ہیں) عوام الناس اس لئے ایسا کیا کرتے تھے کہ جو لوگ حج کے لئے جانے کی طاقت نہیں رکھتے وہ (اپنے خیال میں یہاں جمع ہو کر) حاجیوں کے ساتھ کسی نہ کسی درجہ میں اجر و ثواب میں شریک ہو جائیں اور عوام کا یہ عمل کچھ قبۃ الصخرہ کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا بلکہ ہر اسلامی شہر کے عوام عرفہ کے دن شہر سے باہر نکل جایا کرتے اور وہاں اسی طرح قیام کرتے جیسے حجاج عرفات میں قیام کرتے ہیں

۲۔ دوسرے یہ کہ اس واقعہ کی جو صورت گولڈ تسیہر نے بیان کی ہے۔ صریحاً باطل ہے۔ کیونکہ کسی چیز کی تعمیر اس غرض کے لئے کی جائے کہ لوگ اس کا حج کریں کھلا ہوا کفر ہے۔ اس لئے عبد الملک

(جو بہرحال ایک مسلمان خلیفہ تھا) اس کھلے ہوئے کفر کا ارتکاب کیسے کرسکتا تھا؟ دراں حالیکہ (اس کی عبادت گزاری اور خدا پرستی کا تو یہ عالم ہے کہ) اس کو تو لوگ کثرت عبادت کی وجہ سے حمامۃ المسجد (مسجد کی کبوتری) کے لقب سے پکارتے تھے؟

علاوہ ازیں عبدالملک کے سخت سے سخت مخالفین نے بھی اس کی اور بہت سی چیزوں پر اس کو مطعون کیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کسی نے بھی اس پر کفر کا الزام نہیں لگایا۔ نہ ہی اس پر اس قبہ کی تعمیر کے سلسلہ میں کوئی عیب چینی یا اعتراض کیا گیا۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو وہ سب سے پہلے عبدالملک کے خلاف اس کی تشہیر کرتے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ امام زہری، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۵۱ھ یا ۵۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قتل ہوا ہے ۷۳ھ میں (اور خلفاء بنو امیہ کی اہل حجاز سے مخالفت اور دشمنی حتیٰ کہ قتل و قتال بھی اسی زمانے کے واقعات ہیں) تو (اس حساب سے) زہری کی عمر اس وقت پہلی روایت کے مطابق بائیس ۲۲ سال کی تھی اور دوسری کے مطابق پندرہ سال کی تو کیا یہ بات قرین قیاس اور عقل میں آنے والی ہے کہ زہری کی اس نوعمری میں علماء امت مسلمہ اور محدثین کے حلقہ میں اتنی شہرت و عظمت ... قائم ہو جائے کہ وہ علما و محدثین ... زہری کی ایک ایسی موضوع حدیث تک کو قبول کر لیں جس میں (خلفاء بنو امیہ کی حمایت میں) قبہ کا حج کرنے کی دعوت دی گئی ہو!

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ تاریخی نصوص اور تصریحات اس بارے میں قطعی اور یقینی موجود ہیں کہ ابن زبیر کے زمانہ میں زہری نہ عبدالملک کو جانتے تھے اور نہ اس وقت تک عبدالملک کو انھوں نے دیکھا تھا۔ چنانچہ ذہبی کا بیان ہے کہ زہری پہلی بار خلیفہ عبدالملک کے پاس ۸۰ھ کے اندر آئے ہیں اور ابن عساکر یہ ملاقات ۸۲ھ میں بتاتے ہیں لہٰذا زہری کی عبدالملک سے پہلی ملاقات یقیناً ابن زبیر کے قتل کے چند سال بعد ہوئی ہے اور اس وقت زہری اتنے نوعمر تھے کہ عبدالملک نے ان کا امتحان تک لیا ہے اور پھر زہری کو یہ نصیحت کی ہے کہ: انصار کے گھروں سے علم حاصل کرو۔ لہٰذا یہ "مفروضہ" کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ زہری نے اپنے دوست عبدالملک کی خواہش کو پورا کیا اور اس کے لئے بیت المقدس کے بارے میں حدیث (لا تشد الرحال الخ) وضع کی تاکہ لوگ ابن زبیر کے زمانہ میں خانہ کعبہ کے بجائے قبۃ الصخرہ کا حج کریں؟

۵۔ پانچویں یہ کہ حدیث لا تشد الرحال الخ حدیث کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ نیز یہ حدیث زہری کی سند کے علاوہ دوسری مختلف اسانید سے بھی مروی ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے اس کو ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے، جس کی سند زہری کی سند کے علاوہ ہے۔ امام مسلم نے اس کو تین مختلف سندوں سے روایت کیا ہے

(۱) پہلی زہری کے طریق سے۔

(۲) دوسری جریر عن ابن عمیر عن قزعۃ عن ابی سعید کے طریق سے۔

(۳) اور تیسری ابن وھب عن الحمید بن جعفر عن عمران بن ابی انس عن سلمان الاغر عن ابی ھریرۃ کی سند سے۔ لہٰذا زہری اس حدیث کے روایت کرنے میں متفرد (تنہا) نہیں ہیں۔ جیسا کہ گولڈ زیہر کا دعویٰ ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ دوسرے راوی بھی اپنے شیوخ سے اس حدیث کی روایت میں شریک ہیں، جیسا کہ آپ سن چکے ہیں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے بیت المقدس کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنے کا حکم دریافت کیا گیا (ابن تیمیہ ان لوگوں میں سے ہیں جو قبروں کی زیارت کے جواز کے منکر ہیں) انھوں نے جواب دیا کہ "صحیحین" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث موجود ہے کہ آپ نے فرمایا لا تشد الرحال .... الخ اور صحیحین میں یہ حدیث ابو سعید اور ابو ہریرہ کی سند سے مذکور ہے، اس کے علاوہ اور دوسرے طریق سے بھی مروی ہے غرض یہ مشہور و معروف حدیث ہے جس کو امت کا قبول عام حاصل ہے اہل علم کا اس حدیث کی صحت، مقبولیت اور تصدیق پر اجماع ہے۔ اور (اسی حدیث کی بنا پر) مسلمانوں میں سے تمام اہل علم کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ بیت المقدس کا سفر ایسی عبادت ادا کرنے کی غرض سے جس کی شریعت نے وہاں اجازت دی ہو، مستحب ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس جاتے اور وہاں نماز پڑھا کرتے تھے"

۶۔ چھٹے یہ کہ اس حدیث کو زہری نے اپنے شیخ سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ زہری نے اگر از خود اس حدیث کو بنو امیہ کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے سعید بن المسیب کے نام سے وضع کیا ہوتا تو سعید اس افترا پر ہرگز خاموش

رہنے والے نہ تھے (بلکہ فوراً تردید کرتے) سعید تو وہ شخص ہیں جن کو بنو امیہ کی جانب سے (مصالح حکومت کی خلاف ورزی پر) سخت اذیتیں پہونچائی گئی ہیں انھوں نے مار تک کھائی ہے (مگر خاموش نہ رہے، پھر زہری کے اس سفید جھوٹ پر وہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے) سعید بن المسیب کا انتقال ۹۳ھ میں ہوا ہے یعنی ابن زبیر کے قتل کے بیس سال بعد اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو خبر نہ ہوئی ہوگی) پھر سعید زہری کے اس جھوٹ پر کیسے اتنے زمانہ تک خاموش رہے؟ حالانکہ حق گوئی کی طاقت کے باب میں وہ قوت وعزیمت کے نہایت محکم اور بلند پہاڑ تھے، اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے؟

۷. ساتویں یہ کہ اگر بالفرض زہری نے عبد الملک کو خوش کرنے کے لئے اس حدیث کو وضع کیا بھی تھا، تو انھوں نے اس حدیث میں "قبۃ الصخرۃ" کی فضیلت کی کیوں تصریح نہیں کی جبکہ عبد الملک کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگ اس کا حج کریں؟ زیادہ سے زیادہ جو اس حدیث سے اور اسی قسم کی فضیلتِ بیت المقدس سے متعلق صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے وہ بیت المقدس میں نماز پڑھنے اور اس کی زیارت کرنے کی فضیلت ہے اور بس اور اس کے لئے بھی کسی معین وقت کی قید نہیں ہے۔ (اسے "قبۃ الصخرۃ" کے طواف اور حج سے کیا واسطہ) اور اتنی بات تو خود قرآن سے بھی فی الجملہ ثابت ہے۔ پھر اس حدیث کی بنا پر یہ افسانہ کہاں سے گھڑ لیا گیا کہ "عبد الملک کا ارادہ حج کے ایام میں کعبہ کے بجائے قبہ کا حج کرانے کا تھا"؟

۸. آٹھویں یہ کہ حدیث لا تشد الرحال جس کو علماء نے صحیح بتلایا ہے، اس کا تعلق ان جھوٹی احادیث سے مطلق نہیں ہے جو بیت المقدس اور صخرہ کے فضائل میں بیان کی جاتی ہیں، اور جن میں سے ایک بھی زہری سے مروی نہیں ہے۔ علماء حدیث نے ان سب احادیث پر جرح وتنقید کی ہے، بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ "صخرہ کے بارے میں جتنی احادیث ہیں وہ سب جھوٹی ہیں" اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ بیت المقدس کی فضیلت میں سوائے تین حدیثوں کے کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔

(۱) پہلی لا تشد الرحال

(۲) دوسری وہ حدیث جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا ہے کہ:-

روئے زمین پر سب سے پہلے کونسی مسجد تعمیر کی گئی ؟ تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ مسجد حرام، پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد کونسی ؟ آپ نے فرمایا : مسجد اقصیٰ ۔

(۳) تیسری حدیث وہ ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بیت المقدس کی ایک نماز (اجر و ثواب میں) دوسری جگہوں کی سات سو نمازوں کے برابر ہے ۔

ابراہیم بن ولید اموی کا واقعہ گولڈ زیہر کا دعویٰ ہے کہ :۔

> ابراہیم بن ولید اموی زہری کے پاس ایک صحیفہ لایا تھا اور اُن سے درخواست کی تھی کہ زہری اُس کو اس صحیفہ میں لکھی ہوئی احادیث کی اپنی طرف سے (اور اپنی سند) سے روایت کرنیکی اجازت دیدیں، اس طور پر کہ جیسے ابراہیم بن ولید نے یہ احادیث زہری سے سُنی ہیں تو زہری نے بلا تردد ابراہیم کو اجازت دیدی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ تمہیں ان احادیث کے روایت کرنے کی اجازت میرے سوا کون دے سکتا ہے؟ اور اس طرح (یعنی اس جعلسازی سے) یہ اموی (ابراہیم بن الولید) اس صحیفہ میں لکھی ہوئی تمام رواتیوں کو زہری کی مرویات کہکر روایت کرسکا

اس واقعہ کے بیان کرنے میں گولڈ زیہر نے کئی غلطیاں کی ہیں ؟ اور بہت سے مغالطے دیئے ہیں ۔

(۱) اول یہ کہ ابن عساکر نے تصریح کی ہے کہ ابراہیم کا زہری سے سماع ثابت ہے ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ابراہیم نے اپنے شیخ زہری کے سامنے وہی صحیفہ پیش کیا ہوگا جس میں لکھی ہوئی حدیثیں اس نے زہری سے سُنی ہوں گی ۔ اس کو محدثین کی اصطلاح میں عرض المناولہ (لکھی ہوئی احادیث پیش کرنا) کہتے ہیں ۔ ابن صلاح مقدمہ میں لکھتے ہیں :۔

القسم الرابع من انواع تحمل الحدیث "المناولة" فان كان معها اجازة مثل ان يناول الشيخ الطالب كتابا من سماعه ويقول : اروهذا عنى ، او يبا تيه الطالب بكتاب قد سمعه	کسی شیخ کی حدیثیں اُس سے حاصل کرنے کی اقسام میں چوتھی قسم مناولہ (لکھی ہوئی حدیثیں حاصل کرنا) ہے اگر اس کے ساتھ شیخ کی اجازت بھی ہو، مثلاً شاگرد کو وہ نوشتہ دے جس سے اس نے شیخ سے سماع کیا ہے اور یہ کہے کہ اس (نوشتہ کی احادیث) کو تم مجھ سے روایت کرو (میں اجازت دیتا ہوں) یا شاگرد خود وہ

من الشيخ فيتامله الشيخ، ثم يقول له: اروعني هذا ولسيمى هذا "عرض المناولة" وقد قال الحاكم: ان هذا سماع عند كثير من المتقدمين وحكوه عن مالك والزهري وربيعة ويحيىٰ بن سعيد ومجاهد وسفيان الخ (۱)

نوشتہ لائے جس کی احادیث کو اس نے شیخ سے سنا ہے، پھر شیخ اس کو غور سے پڑھ کر یہ کہے: تم اس نوشتہ کی احادیث کو مجھ سے روایت کرو (میں اجازت دیتا ہوں) اس کو "عرض المناولة" کہتے ہیں حاکم نے کہا ہے کہ بہت سے متقدمین کے نزدیک یہ سماع (کے حکم میں) ہے۔ یہ طریقِ اخذِ حدیث مالک، زہری ربیعۃ، یحییٰ بن سعید، مجاہد اور سفیان وغیرہ سے منقول ہے۔ الخ

ایوب سختیانی کہتے ہیں کہ:-

ہم زہری کے سامنے علم (احادیث) پیش کیا کرتے تھے"۔

عُبیداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں زہری کے پاس ایک نوشتہ لایا زہری نے اس نوشتہ کی احادیث کو غور سے پڑھا، پھر کہا کہ میں نے تم کو اس کی احادیث کے روایت کرنے کی اجازت دی"۔

ایسی مثالیں زہری کے بہت سے تلامذہ کی موجود ہیں، جو زہری کے سامنے وہ احادیث لکھی ہوئی پیش کرتے تھے جو انھوں نے زہری سے سُنی ہوتی تھیں، زہری ان سب کو غور سے دیکھتے پڑھتے اور پھر اس نوشتہ کی احادیث روایت کرنے کی ان کو اجازت دیدیا کرتے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو یقیناً ابراہیم بن ولید کا واقعہ بھی اسی قبیل سے ہے جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابن عساکر کی روایت میں لفظ عرض کی تصریح موجود ہے اور عرض کے معنیٰ ہی یہ ہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا، کہ شیخ کو طالب علم صحیفہ لا کر دے تاکہ وہ اس کو غور سے پڑھ کر اجازت دیدے لیکن یہ کہنا کہ ابراہیم نے از خود روایتیں جمع کی تھیں، پھر زہری سے ان کے بسند زہری روایت کرنے کی اجازت چاہی تھی، اور زہری نے اس ابراہیم کی بات مان لی، اور بے دیکھے بھالے اجازت دیدی" اس کا تو تصور بھی زہری جیسے عظیم انسان محدث سے محال ہے، جو اُمت اسلامیہ میں عظیم محدث ہونے کی حیثیت

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح ص ۹۰، واختصار علوم الحدیث ص ۱۴۱

سے کامل شہرت حاصل کر چکے تھے اور ظاہر ہے کہ زہری کی یہ شہرت اور قبول عام زہری کی امانت دیانت، صداقت اور کمال حفظ وضبط پر ہی مبنی تھا

۲- دوم یہ کہ زہری کا قول : من یستطیع ان یجیزک بہا، اصل میں یہ قول اس طرح تھا، (جیسا کہ ابن عساکر نے نقل کیا ہے) ومن یجیزک بہا غیری ؟ یعنی میرے سوا تم کو ان احادیث کی اجازت اور کون دے گا ؟ اس میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے اس لئے کہ زہری کے علاوہ زہری کے تلامذہ کو مثلاً اسی ابراہیم کو کوئی بھی دوسرا شخص اجازت نہیں دے سکتا، بالخصوص ایسی احادیث کی جو انھوں نے اپنے شیخ زہری سے ہی سُنی ہوں۔ علاوہ ازیں زہری اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ "حدیث وسنت" کے علم کے مالک تھے۔ نیز ہم اس سے پہلے بہت سے ائمہ حدیث کا یہ قول بھی نقل کر آئے ہیں کہ : " اگر زہری نہ ہوتے تو سنت کا بہت سا ذخیرہ ضائع ہو جاتا" امام مسلم نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ " زہری ایسی نوّے[۹۰] حدیثیں روایت کرتے ہیں جو ان کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا"۔ لہٰذا ابراہیم سے زہری کے اس کہنے کے معنی یہ ہیں کہ "میرے سوا ان احادیث کو جانتا کون ہے جو تمہیں ان کی اجازت دے گا"۔ نہ یہ کہ میرے سوا اور کون مسلمان تمہیں حدیثیں گھڑنے کی اجازت دے گا جیسا کہ اس یہودی مستشرق نے (اپنے خبث باطن کی بنا پر) سمجھا ہے

۳- سوم یہ کہ اس ابراہیم سے مروی کوئی ایک روایت بھی حدیث کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ نیز جرح وتعدیل کی کتابوں میں بھی اس ابراہیم کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، نہ ثقات میں، نہ ضعفا میں اور نہ ہی متروکین میں۔ پھر وہ احادیث کہاں ہیں جن کو ابراہیم نے زہری کی جانب منسوب کر کے ان کی اجازت سے لوگوں میں پھیلایا ہے ؟ حدیث کی کتابوں میں ان کی جگہ کہاں ہے ؟ اور کس نے ان کو ابراہیم سے روایت کیا ہے ؟ اور یہ صحیفہ کہاں اس طرح روپوش ہو گیا کہ اس کا تاریخ کی کتابوں میں بھی کہیں نام تک نہیں ملتا ؟

کیا یہ زہری نے یہ کہا ہے کہ " اِن لوگوں نے ہمیں حدیثیں، لکھنے پر مجبور کر دیا

پھر گولڈ تسہیر دعویٰ کرتا ہے کہ :- زہری اپنے اس قول میں جس کو معمر نے ان سے روایت کیا ہے، ایک "بہت ہی اہم اعتراف" کرتے ہیں وہ قول یہ ہے :-

ان ھٰؤلاء الامراء اکرھونا علی کتابۃ احادیث

ان حکام نے ہمیں حدیثیں لکھنے (وضع کرنے) پر مجبور کر دیا۔

بقول گولڈ تسیہر زہری کا یہ قول واضح طور پر بتلاتا ہے کہ زہری حکومت کی خواہشات کو اپنے نام سے۔ جو اُمت مُسلمہ میں شہرت اور قبول عام حاصل کر چکا تھا۔ پورا کرنے (یعنے اس کے حسب منشاء حدیثیں گھڑنے اور اپنے نام سے اُن کو پھیلانے) کے لئے تیار رہتے تھے۔

حدیث کے باب میں زہری کی راست گوئی اور جرأت و بیباکی کے بیان کے ذیل میں ہم بتلا چکے ہیں کہ حکّام کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہونا زہری سے کسقدر مستبعد اور ناقابل یقین امر ہے خلفاء بنو اُمیہ اور زہری کے مابین پیش آنے والے اُن تاریخی واقعات کا بھی ہم ذکر کر چکے ہیں جن کے پیش نظر تم یہ یقین کر سکتے ہو کہ زہری ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہو سکتے جو مسلمانوں میں اپنی مقبولیت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر حکومت کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے تیار رہتے ہوں۔

باقی گولڈ تسیہر نے جو یہ عبارت نقل کی ہے اس میں بڑی سادگی اور نہایت صفائی سے ایسی تحریف کی ہے کہ عبارت کا مفہوم اور مطلب کچھ سے کچھ ہو گیا بلکہ بالکل اُلٹ گیا۔ اصل واقعہ، جیسا کہ ابن عساکر اور ابن سعد نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ زہری کا طریقہ تھا کہ وہ لوگوں کو احادیث لکھاتے نہیں تھے۔ اور بتلاتے تھے کہ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے حافظہ پر اعتماد کریں تحریروں اور نوشتوں پر بھروسہ نہ کریں، جیسا کہ ہم پہلے بھی اس کا ذکر کر آئے ہیں۔ جب ہشام نے اُن سے حدیثیں لکھانے کی درخواست کی اور ان کے حافظہ کا امتحان لینے کی غرض سے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اپنے لڑکے کو احادیث املاء کرانے پر اصرار کیا تو زہری نے چار سَو حدیثیں لکھوائیں، اس کے بعد زہری ہشام کے دربار سے اُٹھ کر باہر آگئے اور بلند آواز سے کہا:

ایھا الناس انا کنا منعنا کم امراً قد بذلنا ہ الآن لھٰؤلاء، وان ھٰؤلاء الامراء کرھونا علی کتابۃ "الاحادیث" فتعالوا حتّی احدثکم بھا، فحدثھم بالاربعمائۃ الحدیث	اے لوگو! ہم تم کو جس چیز سے (حدیثیں لکھانے سے) انکار کیا کرتے تھے، اِن حکام کے لئے آج ہم نے اس (اصول) کو قربان کر دیا یعنی ان اُمراء نے ہمیں حدیثیں لکھانے پر مجبور کر دیا۔ پس تم بھی آؤ تاکہ میں وہ حدیثیں تم سے بھی بیان کر دوں (اور لکھا دوں) چنانچہ اُنھوں نے وہی چار سو حدیثیں بیان کر دیں (اور لکھا دیں)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

یہ ہے امام زہری کا قول اور اس کے بعینہ الفاظ جو تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، خطیب بغدادی نے اسی قول کو دوسرے لفظوں میں اس طرح روایت کیا ہے وہ الفاظ یہ ہیں:

کنا نکرہ کتاب العلم — ای کتابتہ حتی اکرھنا علیہ ھولاء الامراء، فرأینا أن لا نمنعہ احدا من المسلمین (۱)	ہم علم (احادیث) کا لکھنا لکھانا برا سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان امراء نے ہمیں اس پر مجبور کردیا۔ اس لئے اب ہم نے مناسب سمجھا کہ کسی بھی مسلمان کو اس سے نہ روکا جائے (اور جیسے ان امراء کی اولاد کو حدیثیں لکھائی ہیں تمام لوگوں کو بھی لکھادیں)

غور کیجئے کہ زہری کے اس قول میں جو گولڈتسیہر نے نقل کیا ہے یعنی اکرھونا علی کتابت احادیث (ہمیں انھوں نے حدیثیں لکھنے پر مجبور کردیا ہے) اور اس قول میں جو مورخین نے نقل کیا ہے یعنی اکرھونا علی کتابۃ الاحادیث (ہمیں انھوں نے احادیث لکھوانے پر مجبور کردیا) یا جیسا کہ خطیب نے نقل کیا ہے "علی کتاب العلم" ان دونوں کے درمیان کتنا بڑا فرق ہے؟ پھر ذرا اس مستشرق کی علمی امانت و دیانت بھی ملاحظہ فرمایئے۔ لفظ الاحادیث سے "آل" حذف کردیا جس سے خوبی عیب سے بدل گئی (اور امراء کے لئے حدیثیں لکھنے یعنی وضع کرنے کا اعتراف ثابت ہوگیا) اور ان حالیکہ زہری کی اصل عبارت ان کی غایت درجہ امانت و دیانت اور اشاعت حدیث میں ان کے انتہائی اخلاص کو ظاہر کرتی تھی۔ کہ انھوں نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ جس چیز سے (یعنے حدیثیں لکھانے سے) عام لوگوں کو منع کیا کرتے تھے اس کو صرف امراء کے لئے مباح کریں اور عوام کو اس سے محروم رکھیں بلکہ جب امراء کے لئے اس کو مباح کیا ہے۔ تو سب لوگوں کے لئے یہ فیض عام ہونا چاہیئے (اسی لئے دربار سے باہر آتے ہی مجمع عام میں اعلان کردیا اور وہی حدیثیں جو ان کو لکھائی تھیں سب کو لکھادیں) لیکن اس مستشرق کی یہ "امانت و دیانت" کا تقاضہ ہے کہ یہ .... صرف اس قول کی بنیاد پر زہری کی طرف یہ بات منسوب کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ زہری نے ان امراء کے لئے ایسی حدیثیں وضع کی ہیں جن پر انھیں ان امراء نے مجبور کیا ہے"۔ یہ بات کہاں اور وہ بات کہاں؟

---

(۱) تقیید العلم ص ۱۰۷

(کجا آسمان کجا ریسماں، ہندی کی مثل ہے ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ)

زہری کی قصر شاہی میں آمد و رفت، اور سلطان کے حاشیہ برداروں میں نقل و حرکت

پھر گولڈ تسیہر کہتا ہے کہ:-

زہری ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کی بنو امیہ کے ساتھ ساز باز نہ ہو سکتی ہو بلکہ وہ تو حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنے کو روا سمجھتے تھے اسی لئے وہ قصر شاہی میں آمد و رفت سے بھی پرہیز نہیں کرتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات سلطان کے جلو میں چلا کرتے تھے۔"

ہم اس سے پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ خلفاء اسلام کی مجلسوں میں محض جانے آنے سے نہ کبھی ان کی دیانت وامانت اور دین پر کوئی حرف آیا ہے اور نہ ہی وہ کبھی اس آمد و رفت سے خلفاء کی خواہشات سے مغلوب ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کے اثر و نفوذ کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں۔ زہری اور بنو امیہ کے درمیان جو اعلیٰ وارفع سطح کا رابطہ تھا اس پر بھی ہم دلائل پیش کر چکے ہیں یہ رابطہ ایک ایسے جلیل القدر عالم دین کا رابطہ تھا جس کو اپنے علم و دین اور وجاہت و وقار علمی کی وجہ سے عزت وعظمت کا اعلیٰ مقام حاصل تھا، ایسا عالم دین جس کو خلیفہ سے حق کی خاطر مقابلہ اور دو بدو کرنے میں کسی وقت بھی ذرہ برابر تامل نہ ہو، جب بھی وہ اس دینی موقف کو اختیار کرنا اپنا فرض سمجھے۔ زمانہ قدیم میں بھی صحابہ کرام حضرت معاویہ کے پاس جاتے آتے تھے، تابعین اموی خلفا کے درباروں میں آمد و رفت رکھتے تھے، امام ابو حنیفہ عباسی خلیفہ منصور کے دربار میں جاتے آتے تھے، اور امام ابو یوسف کا تو خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ بہت زیادہ قوی رابطہ تھا (اس لئے کہ قاضی القضاۃ — چیف جسٹس تھے) اس کے باوجود ان بزرگان دین پر کسی نے آج تک زبان طعن و تشنیع دراز نہیں کی۔ اور کسی نے ان کو اس بنیاد پر ثقاہت و عدالت کے مرتبہ سے گرا ہوا نہیں بتایا کہ یہ خلفاء کے ساتھ ربط و ضبط رکھتے تھے یا ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے (ہاں یہ یہودی مستشرق المرء یقیس علی نفسہ کے فطری اصول کے تحت یقیناً علماء اسلام کو بھی اپنے بے ضمیر اور دین فروش پادریوں اور علماء و رجال کلیسا پر قیاس کرنے اور درباری تعلق کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہے)

حجاج کے ساتھ زہری کا حج

یہ کہنا بھی کہ زہری نے حجاج جیسے سفاک ظالم کی رفاقت میں حج کیا تھا گولڈ تسیہر کا ایک پر فریب دعویٰ ہے اور صرف اس لئے کہ وہ قارئین کے دلوں میں زہری کے متعلق مزید نفرت و حقارت پیدا کر سکے اور ان کی دینی کوتاہی اور کمزوری پر اور زیادہ دلیلیں فراہم کر سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ زہری اس موقع پر حج کے وقت حجاج کے "ساتھ" اور اس کے حاشیہ برداروں میں نہ تھے، بلکہ وہ اُس وقت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی "معیت" میں تھے جب کہ عبداللہ بن عمر کی حجاج سے ملاقات ہوئی ہے لیجئے اس واقعہ سے متعلق اصل بیان پڑھئے جو اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے حافظ ابن حجر کی کتاب تہذیب میں اس طرح موجود ہے۔

عبدالرزاق نے اپنی کتاب مصنف میں زہری سے روایت نقل کی ہے کہ زہری نے بیان کیا کہ خلیفہ عبدالملک نے حجاج کو فرمان لکھا تھا کہ: حج کے "مناسک" (اعمال حج) میں تم ابن عمر کی پیروی کرنا" تو حجاج نے ابن عمر کے پاس پیغام بھیجا کہ: جب آپ کا ارادہ عرفات کو روانگی کا ہو تو ہم کو اطلاع کر دیجئے" چنانچہ ابن عمر اور ان کے مولیٰ سالم مقررہ وقت پر روانہ ہوئے اور میں بھی ان کے ساتھ تھا زہری کہتے ہیں کہ میں روزہ سے تھا اس لئے مجھے شدید گرمی سے بڑی سخت تکلیف ہوئی"

اس سے معلوم ہوا کہ زہری تو درحقیقت عبداللہ بن عمر کے ساتھ تھے جبکہ (خلیفہ کے حکم کے تحت) ابن عمر کی ملاقات حجاج کے ساتھ حج میں ہوئی ہے، نہ کہ حجاج کی معیت میں۔

ہشام کے بچوں کو زہری کا تربیت دینا

گولڈ زیہر کے زعم میں زہری کا یہ فعل بھی قابل اعتراض تھا کہ:۔

ہشام نے زہری کو اپنے "ولیعہد" کا مربی مقرر کیا تھا"

یہ اعتراض تو رہا ایک طرف، اس میں تو ایک بڑی تاریخی غلطی بھی موجود ہے اس لئے کہ ہشام

بن عبدالملک کا ولی عہد اُس کا بھتیجا ولید بن یزید تھا (نہ کہ اس کا بیٹا) ہشام نے اپنے بھائی یزید بن عبدالملک کی وصیت کی بنا پر اس کو ولی عہد بنایا تھا۔ یہ ولید بن یزید ایک آوارہ اور اوباش قسم کا آدمی تھا اور زہری اس کے درمیان تو ایسی ہی شدید عداوت اور کشیدگی کار فرما تھی جیسی نکوکار اور بدکردار لوگوں کے درمیان ہوا کرتی ہے (اس لئے زہری اور اُس ولیعہد کے مربی مقرر ہوں، اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا) اور زہری تو اُس زمانہ میں ہشام کے بچوں کے مربی اور اتالیق ...... تھے۔ جب اس نے ۱۰۶ھ میں حج کیا تھا۔ اس تاریخی غلطی کے علاوہ ہم نہیں سمجھتے کہ زہری اگر ہشام کے بچوں کی تربیت کرتے ہیں تو اس سے اُن پر کونسا الزام یا اتہام عائد ہوتا ہے؟ کیا یہ زہری کا خلیفۃ المسلمین کی اولاد کی تربیت کو اپنے ذمہ لے لینا اس سے بہتر نہیں تھا کہ اُن بچوں کی تربیت آوارہ، اوباش اور خدا و رسول کے دشمن قسم کے لوگ کرتے؟ (یہ صرف چشم بدبین کی کج بینی کا کرشمہ ہے کہ زہری کی نیکی اور خوبی بھی اُسے بدی اور بُرائی نظر آتی ہے) بہرحال تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہشام کے انہی زہری کے تربیت کردہ لڑکوں نے روم کی سرزمین میں کامیاب دینی لڑائیاں لڑی ہیں، اور بہت سے خطوں اور علاقوں میں اسلام کی اشاعت میں انھوں نے روشن کارنامے اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ کیا یہ انصاف نہیں ہے کہ ہم ان لڑکوں کے ان شاندار غزوات اور دینی خدمات کی نسبت اُن کے اُستاد و مربی امام زہری کی طرف کریں (اور اُن کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ قرار دیں) بالخصوص جبکہ مورخین بیان کرتے ہیں کہ زہری ایک عظیم الشان "سپاہی" بھی تھے اور یہ کہ ایک مرتبہ وہ شام میں جہاد کرنے کی نیت سے آئے بھی تھے نیز وہ اکثر فوجی وردی "بھی پہنا کرتے تھے۔

زہری کا "منصب قضا" پر تقرر

آخر میں گولڈتسیہر زہری پر یہ الزام لگاتا ہے کہ:-

> زہری نے یزید ثانی کی جانب سے قضاء کے عہدہ کو قبول کر لیا اگر وہ متقی ہوتے تو ان کا فرض تھا کہ وہ اس عہدے سے ایسے ہی بھاگتے جیسے شعبی اور دوسرے صلحاء اُمت ہمیشہ اس عہدہ سے بھاگتے رہے تھے۔

کیا یہ تنقید و تنقیص درست ہوسکتی ہے؟ جہاں تک منصب قضاء کا تعلق ہے ہمیں نہیں معلوم کہ کسی نے بھی اس عہدہ کے قبول کرنے کو عدالت و دیانت میں عیب چینی اور الزام و تہمت کا موجب قرار دیا ہو۔ دراں حالیکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب، معاذ بن جبل اور معقل بن یسار وغیرہ صحابہ کو اس عہدہ پر متقرر فرمایا ہے۔ بنو امیہ کے عہد میں بھی بہت سے تابعین اس عہدہ پر فائز رہے ہیں۔ چنانچہ شریح، ابو ادریس خولانی، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، قاسم بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ ابن مسعود وغیرہ بہت سے لوگوں نے بنو امیہ کے زمانہ میں ہی اس عہدہ کی ذمہ داری قبول کی ہے بلکہ ان میں سے بعض تو وہ بھی ہیں جو خود حجاج کے دور میں بھی قاضی رہے ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ کسی نے بھی ان حضرات پر محض قاضی بننے کی وجہ سے جرح یا عیب چینی کی ہو۔

رہی یہ بات کہ شعبی قضاء کے عہدہ سے بھاگتے تھے اور یہ کہ انھوں نے ابن الاشعث کے ساتھ مل کر حجاج سے جنگ کی تھی، تو یاد رہے کہ اس بیان میں بھی ایک عجیب و غریب مغالطہ ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ شعبی نے حجاج سے جنگ کرنے اور ابن اشعث کا فتنہ دب جانے کے بعد خود حجاج کے عہد میں ہی خلیفہ یزید بن عبدالملک کی طرف سے "قضاء" کے عہدہ کو قبول کیا ہے اور اس عہدہ پر فائز رہے ہیں تو یہ مستشرق اس سلسلہ میں شعبی کے آخری طرز عمل سے کیوں انجان بنتا ہے اور اس کا نام تک نہیں لیتا؟ حالانکہ اس مسئلہ میں اگر شعبی کا طرز عمل حجت اور دلیل استدلال ہے تو ان کے آخری عمل سے استدلال کرنا چاہیئے۔ (حقیقت یہ ہے کہ شعبی نے صرف سیاسی اختلافات کی بنا پر اس عہدہ کے قبول کرنے سے انکار بھی کیا تھا اور جنگ بھی، اور جب وہ اختلافات نہ رہے اور سیاسی حالات بدل گئے تو انھوں نے حجاج کی اس پیش کش (عہدہ) کو قبول کر لیا)

رہا اس مستشرق کا یہ دعویٰ کہ متقی اور پرہیزگار علماء منصب قضاء سے اجتناب کیا کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس عہدہ کو قبول کر لینا قاضی کے دینی اعتماد و علمی ثقاہت کو ضائع کر دیتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کرنا کہ:

من تولی القضاء فقد ذُبح بغیر سکین۔ — جس نے قضاء کے عہدہ کو قبول کر لیا۔ وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔

تو بیشک یہ اجتناب و احتراز ہمارے ائمہ سے منقول ضرور ہے، لیکن یہ واقعات کے بالکل

خلاف ہے۔ کیونکہ انہی ائمہ نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ اسلام کے احکام خمسہ قضا کے ذیل میں آتے ہیں (جن کو قائم کرنا ہر عالم دین کا فرض ہے) اور یہ کہ ظالم حکمرانوں کی طرف سے بھی قضاء کی ذمہ داری سنبھالنا بلاکسی اختلاف کے جائز ہے (جبکہ وہ حکمران اسلامی احکام کے نافذ کرنے میں مداخلت یا مزاحمت نہ کریں) حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا مقصد ہر قاضی کو اس پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ انتہائی احتیاط کے ساتھ فیصلے کرے اور عدل وانصاف کا دامن کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑے۔

مصنف ہدایہ شیخ الاسلام مرغینانی نے ہدایہ میں لکھا ہے کہ:-

"ظالم حکمراں کی جانب سے منصب قضاء کو قبول کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح عادل حکمراں کی جانب سے۔ اس لئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے عہدے قبول کئے ہیں، حالانکہ حضرت علی کی حیات میں حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب تھا۔ اسی طرح تابعین عظام نے حجاج کی طرف سے قضاء کی ذمہ داری قبول کی ہے حالانکہ وہ مسلمہ طور پر ظالم حکمراں تھا۔ اِلّا یہ کہ وہ ظالم حکمراں قاضی کو حق کے مطابق فیصلہ نہ کرنے دے اور قضا بالحق میں مداخلت ومزاحمت کرے (تو ایسی صورت میں قضا کی ذمہ داری بیشک نہ قبول کرنی چاہیے)"[1]

علماء مالکیہ میں سے ابن العربی رحمہ اللہ نے ترمذی کی کتاب القضاء کی شرح میں لکھا ہے کہ:-

حکمران کے ساتھ (امور سلطنت میں) موالات (اور معاونت) ہر شخص پر فرض عین نہیں ہے۔ بلکہ فرض کفایہ ہے۔ اگر امام تمام لوگوں کو اعانت کی دعوت دے اور کوئی بھی قبول نہ کرے تو بیشک سب گنہگار ہوں گے اور اگر کچھ لوگوں نے اس دعوت کو قبول کرلیا اور اس کی اعانت کردی تو سب کے ذمہ سے فرض ساقط ہوجائے گا۔"

ابن فرحون مالکی نے اپنی کتاب تبصرۃ الحکام میں لکھا ہے:-

(۱) فتح القدیر ج ۶ ص ۳۶۴- ۱۲

واضح رہے کہ جن احادیث میں منصب قضا کے قبول کرنے سے ڈرایا گیا
ہے اور اس پر وعید آئی ہے وہ حدیثیں صرف جان بوجھ کر ظلم و جور کرنیوالے
ذی علم قاضیوں کے حق میں وارد ہوئی ہیں یا ان نا اہل اور جاہل قاضیوں کے حق
میں ہیں جو اصول و احکام قضا سے ناواقف ہونے کے باوجود اس قضا اور فصل
خصومات (مقدمات طے کرنے) کے کام میں گھستے پھرتے ہیں۔ لہٰذا یہ مذکورہ
بالا وعید بھی انہی دونوں قسم کے قاضیوں کے حق میں وارد ہوئی ہے (۱)

اس بیان سے بخوبی واضح ہو گیا کہ منصب قضا کو قبول کرنا ــــ جیسا کہ گولڈ تسیہر اس کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے ــــ ہرگز قاضی کی ثقاہت و عدالت کو ساقط کرنے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ عہدہ تو بڑی عظمت و شرافت کا موجب ہے اگر اللہ کے بندوں کے معاملات اللہ کے حکم کے موافق طے کرنے اور حق کے مطابق فیصلہ کرنے میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کی سعادت کا شرف ہی ہوتا تب بھی یہ منصب قاضی کے شرف و فضیلت کے لئے بہت کافی ہے (چہ جائیکہ یہ بجائے خود خلافت الٰہیہ کا ایک پرتو ہے) ہاں اس میں شک نہیں کہ بہت سے علماء نے اس عہدۂ قضاء سے فرار و اجتناب کیا ہے اور بعض بزرگوں نے تو اس سلسلہ میں بڑی بڑی تکلیفیں بھی جھیلی ہیں لیکن ان کا یہ گریز اور اجتناب اس لئے نہیں تھا کہ اس عہدہ کو قبول کرنا قاضی کی عدالت و ثقاہت کو ساقط کر دیتا ہے اور جرح کا موجب ہے۔ بلکہ انھوں نے محض غایت زہد و تقویٰ اور انتہائی احتیاط کے تحت اور اس مسئولیت سے بچنے کی غرض سے اجتناب کیا ہے کہ وہ خدا سے اس حال میں ملنا اور بارگاہ الٰہی میں اس حیثیت سے پیش ہونا نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کے حقوق و معاملات کا بار ان کی گردن پر ہو اور وہ ان کے جوابدہ ہوں۔ چنانچہ ابن العربی نے بعض صحابہ کرام کے منصب قضاء قبول کرنے سے گریز کی وجہ بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

انسان جو بھی اعمال صالحہ کرتا ہے ان کے بارے میں اُسے اس سے ڈرتے
رہنا چاہیئے کہ ان اعمال صالحہ کی شرائط میں اُس سے کوتاہی نہ ہو گئی ہو، نیز ان

---

(۱) جلد اول ص ۱۰۰۹ فتح العلی کے حاشیہ پر۔ ۱۲

اعمال میں بیشمار غیر محسوس خرابیاں پیدا ہو جانے کے احتمال کی بنا پر عنداللہ اُن کے
قبول نہ ہونے کا اندیشہ بھی لگا رہنا چاہیئے اور یہ تو ان اعمال صالحہ (حقوق اللہ) کا
حال ہے جن میں اطاعت و فرمانبرداری کا اثر اس شخص کی ذات تک محدود رہتا ہے
اس سے آگے تجاوز نہیں کرتا چہ جائیکہ وہ اعمال جن کا تعلق بندوں کے
اُن حقوق سے ہے جن کے ادا کرنے کا اُن کو ذمہ دار بنایا گیا ہے اور ان
کی ذمہ داری کا طوق اس کی گردن میں پڑا ہوا ہے ان اعمال (حقوق العباد) کے
بارے میں تو یہ خوف اور اندیشہ بہت زیادہ ہونا چاہیئے اور اُن میں بہت بڑی
احتیاط اور بہت زیادہ اجتناب کی ضرورت ہے۔

یہاں تک ہماری اس مبسوط و مفصل بحث کا تعلق صرف امام زہری رحمہ اللہ کی ذات سے رہا ہے اور اس یہودی مستشرق گولڈ تسیہر کے زہری پر لگائے ہوئے اُن بے جا الزامات اور بے حقیقت تہمتوں کی جو ابدہی سے رہا ہے جو اگر صحیح تسلیم کر لئے جائیں تو حدیث و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں امام زہری کا اعتماد یکسر ختم ہو جاتا ہے اور ان کی روایت کردہ احادیث و روایات سب ساقط اور ناقابل اعتبار ہو جاتی ہیں اور امام زہری پر سے اعتماد اُٹھ جانے کے معنی یہ ہیں کہ حدیث کی ساری کتابوں پر سے اعتماد اُٹھ جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام زہری کا مقام علم حدیث میں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، بہت بلند ہے (ان کی روایات کا ذخیرہ اتنا وافر ہے کہ حدیث کی کوئی کتاب ان کی روایات سے خالی نہیں) علاوہ ازیں امام زہری ہی نے سب سے پہلے احادیث رسول اللہ کے ذخیرہ کو مدون کیا ہے (اس لئے تمام بعد کے محدثین اور مدونین کتب حدیث کا ماخذ و مرجع امام زہری اور اُن کی مرویات ہیں) لیکن الحمد اللہ ہم نے ان سارے باطل الزامات و اتہامات کا پردہ چاک کر دیا۔ اور اس عظیم الشان امام پر جس نے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے قول کے مطابق ستر سال تک دین اسلام کی خدمت انجام دی ہے" جو ظلم اور زیادتی ہوئی ہے اس کی حقیقت ہم نے بخوبی واضح کر دی۔

زہری جیسے جلیل القدر امام جو کہا کرتے تھے:۔

علم[۱] (کی خدمت) سے بڑھ کر اللہ کی عبادت کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ علم ہی اللہ

---

[۱] اس علم سے مراد علم حدیث ہے یہی کبار صحابہ و تابعین کے زمانہ کی اصطلاح ہے۔

کا وہ "ادب" ہے جس سے اُس نے اپنے محبوب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ادب
سکھایا ہے اور یہ علم ہی اللہ تعالیٰ کی وہ امانت ہے جو اُس نے اپنے معصوم
رسول کو اس لئے سپرد کی ہے کہ وہ بھی اس امانت کو ایسے ہی دوسروں کے سپرد
کر دے جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کو سونپی ہے۔ لہٰذا جو کوئی ان احادیث کو سُنے
اس کو چاہیئے کہ وہ ان کو . . . . اپنے اور خدا کے درمیان حجت بنالے

زہری کہا کرتے تھے کہ:۔

"اس تعلیم حدیث کی راہ میں بھی بہت سی آفتیں ہیں ان آفتوں میں سے (۱) ایک آفت یہ ہے کہ عالم حدیث خود تعلیم حدیث کو چھوڑ دے، یہاں تک کہ اس کا علم حدیث ضائع ہو جائے (۲) دوسری آفت نسیان ہے (۳) اچھی طرح یاد رکھو تیسری آفت اس علم میں جھوٹ بولنا ہے اور یہ سب سے زیادہ سخت اور تباہ کن آفت ہے۔"

اسی لیے یہ عظیم المرتبت اور جلیل القدر امام اپنی پوری زندگی میں تعلیمات سنت (یا ورحدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی کا ایک بلند منارہ بنا رہا ہے جس نے اطراف واکناف عالم کو انوار نبوت سے منور کر دیا اور اللہ جب تک چاہے گا اس کا یہ فیضان جاری رہے گا۔ اور منکرین ومتعصبین اور اس کو جھوٹا کہنے والے معترضین ذلیل اور رسوا ہوں گے۔

اور سب تعریفیں تو اللہ رب العلمین کے لئے ہی ہیں۔

بنو اُمیہ کے متعلق کے دیگر شبہات کی تردید

۹۔ بنو اُمیہ کا دینی زندگی کو تبدیل کر دینا

امام زہری پر جھوٹے الزامات واتہامات لگانے سے فارغ ہو کر مستشرق گولڈ تسہیر کہتا ہے کہ:۔

معاملہ سیاسی احادیث گھڑنے یا اموی خاندان کی بھلائی کے لئے حدیثیں وضع کرنے تک ہی محدود نہ تھا بلکہ یہ وضع حدیث کا سلسلہ دینی شعبہ میں بھی عبادات کے اُن امور تک تجاوز کر چکا تھا جن سے اہل مدینہ متفق نہ تھے جیسا کہ

مشہور ہے کہ جمعہ کے دو خطبے ہوتے تھے اور خلفاء کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے
اور عید کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا، لیکن بنو اُمیہ نے ان امور کو بدل دیا تھا
چنانچہ اموی خلفا نے جمعہ کا دوسرا خطبہ بیٹھ کر دینا شروع کر دیا تھا اور عید کے
خطبہ کو نماز سے پہلے کر دیا تھا اور اُنھوں نے اس کے لئے رجاء بن حیوۃ کی اِس
روایت سے استدلال کیا تھا کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء بیٹھ
کر خطبہ دیا کرتے تھے"۔ جب جابر بن سمرۃ نے صاف اور صریح الفاظ میں
اس کی تردید کی اور کہا کہ "جو شخص تم سے یہ بیان کرے کہ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے وہ جھوٹ بولتا ہے"۔ اسی طرح حضرت معاویہ نے
منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کر دیا تھا اور معاویہ ہی نے ایک "مقصورہ" بھی
بنایا تھا جس کو بعد میں عباسی خلفاء نے منہدم کر دیا تھا۔ جس طرح حدیث
کا معاملہ صرف خاص میلان رکھنے والی (یعنے بنو امیہ کی حمایت کرنے والی)
حدیثوں کی اشاعت ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ اس حد تک پہونچ چکا تھا کہ جو
احادیث حکومتی نظریات کی نمائندگی نہ کرتی تھیں ان کو دبایا بھی جاتا، اور
اُن کو چھپانے اور کم۔ور کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس میں بھی کوئی شبہ
نہیں کہ (اس کے ردعمل کے طور پر) جو حدیثیں بنو اُمیہ کی مصلحتوں کے مطابق تھیں بنو عباس
کے برسر اقتدار آنے کے بعد وہ حدیثیں یکسر غائب ہو گئیں۔

یقیناً یہ یہودی مستشرق نہ صرف ہم مسلمانوں کے متعلق ایک عجیب و غریب انداز سے بلکہ پوری علمی
دنیا کے لئے بالکل اجنبی اور انوکھے انداز میں بحث کر رہا ہے (یعنے درحقیقت اس مستشرق کا یہ انداز فکر اور
یہ ذہنیت نہ صرف ہم مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری علمی دنیا کے لئے ایک اجنبی اور انوکھی چیز ہے) اس
لئے کہ لوگ زمانہ قدیم سے آج تک ایسے حکمرانوں اور بادشاہوں کو ہمیشہ دیکھتے چلے آئے ہیں جنہوں نے
بہت سے ایسے قوانین و احکامات بھی جاری کئے ہیں جو صرف اُن کی زندگی کی حفاظت سے متعلق ہوتے
تھے یا ان کی عظمت و نفوذ کے مظاہر میں اضافہ سے تعلق رکھتے تھے نیز وہ اپنے ملک اور اس کی
عبادت گاہوں وغیرہ سے متعلق ترمیمات و اصلاحات بھی کرتے رہے ہیں۔ اور ان احکامات و اقدامات

کے بارے میں ان بادشاہوں کی مخالفت کرنیوالے بھی ہوتے ہیں جیساکہ ان کی تائید کرنے والے ہوتے ہیں مگر اس اختلاف واتفاق اور کشاکش کے باوجود کسی شخص کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئی ہوگی کہ حکومتوں یا حکمرانوں کے اس قسم کے احکامات واقدامات اور حکومت واقتدار کے مظاہرے "تلاعب بالدین" (دین کو کھیل بنا لینے) کی یا دین کو کھیل بنانے کے لئے علماء کو آلہ کار بنانے کی دلیل بھی بن سکتے ہیں اس قسم کے واقعات آئے دن اپنے زمانہ کے مسلمان حکمرانوں کے متعلق بھی ہم دیکھتے اور سُنتے رہتے ہیں اور ہم سے پہلے بھی ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں اور صحابہ کے زمانہ سے آج تک خلفاء اور بادشاہ اس قسم کے اقدامات کرتے آئے ہیں دیکھئے یہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ہیں قرآن کو ایک مصحف میں جمع کر دیتے ہیں یہ حضرت عمرؓ ہیں لوگوں کو (باجماعت) تراویح پڑھنے کے لئے (ایک امام کے پیچھے) جمع کردیتے ہیں، اور یہ حضرت عثمانؓ ہیں جمعہ کے دن مسجد سے باہر پہلی اذان کا طریقہ جاری کر دیتے ہیں (رضی اللہ عنہم) اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں اضافہ کر دیتے ہیں (مگر آج تک کسی بھی دوست یا دشمن نے اس کو "مداخلت فی الدین" اور "تلاعب بالدین" نہیں کہا)

اسی طرح بہت سے مسلمان بادشاہ اور رؤسا ہمارے سامنے ہیں جو مساجد کی تجدید اور ان میں ترمیم واضافے وغیرہ کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح نماز کو جاتے آتے کسی خیالی یا متوقع خطرہ سے بچنے کی غرض سے احتیاطی تدابیر اور حفاظتی انتظامات اختیار کرتے رہے ہیں۔ پھر ان صحابہ کرام اور سلاطین اسلام کے ان اقدامات کو دین میں مداخلت یا اضافہ کیوں نہیں قرار دیا جاتا اور دین سے انحراف کی دلیل کیوں نہیں کہا جاتا ؟

پھر ہم حضرت معاویہ کی طرف سے "منبر" کی سیڑھیوں میں اضافہ اور "مقصورہ" کی تعمیر کو اس امر کی دلیل کیوں قرار دیتے ہیں کہ بنو امیہ کے حکام دینی زندگی میں تبدیلیاں لا رہے تھے؟ منبر میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی تبدیلی ہو چکی تھی۔ اس لئے کہ ابتداء میں آپ کھجور کے تنہ کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے تھے، اس کے بعد آپ نے تین سیڑھیوں کا منبر بنوایا جبکہ مسجد میں حاضرین کی تعداد بڑھ گئی، اور ایک ایسی اونچی جگہ کی ضرورت محسوس ہونے لگی جہاں سے پاس والوں کی طرح دور کے لوگ بھی خطبہ سن سکیں۔ ایسی صورت میں (آپ کی وفات کے بعد) ممبر کی سیڑھیوں

میں اضافہ سے کیا چیز مانع ہے؟ جبکہ مسجد اُس سے زیادہ وسیع ہو جائے اور لوگوں کی تعداد اُس سے زیادہ بڑھ جائے جتنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہوتی تھی؟ نیز اس اضافہ سے ممانعت اور حرمت کی کسی قسم کی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ نہ دینی اور شرعی اعتبار سے اور نہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے اعتبار سے۔ یہی وہ کچھ ہے جو حضرت معاویہ نے کیا ہے جبکہ اُنھوں نے منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کیا (کیا کوئی بھی خردمند اس کو دینی زندگی میں تبدیلی کہہ سکتا ہے؟)

رہی مقصورہ کی تعمیر، تو حضرت معاویہ نے دینی زندگی کو بدلنے کی غرض سے یہ اقدام ہرگز نہیں کیا تھا بلکہ صرف اچانک حملہ سے اپنی حفاظت اور احتیاط کی غرض سے ایسا کیا تھا۔ جبکہ خوارج ان کے اور حضرت علیؓ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کے ہلاک کرنے کی خطرناک سازشیں کر رہے تھے اور انہی سازشوں کے نتیجہ میں حضرت علیؓ قتل کر دیئے گئے تھے اور حضرت معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ محض ایک اتفاقی امر کی وجہ سے بچ گئے تھے ان واقعات کے بعد اُنھوں نے اسی میں اپنی حفاظت اور احتیاط سمجھی کہ عام لوگوں کے ساتھ مل کر نماز میں کھڑے نہ ہوں، بلکہ ایسی محفوظ محراب (مقصورہ) میں نماز پڑھیں جہاں کسی ناگہانی حملے کا خطرہ نہ ہو، ابن خلدون نے صریح الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے (۱)

باقی رہا جمعہ کے دوسرے خطبہ میں حضرت معاویہؓ کا بیٹھنا تو ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ عبادت کی معروف شکل میں تبدیلی تھی جس کی ابتدا حضرت معاویہ نے ہی کی تھی۔ لیکن اُنھوں نے یہ اقدام دین میں تبدیلی پیدا کرنے کی نیت سے نہیں کیا تھا بلکہ وہ بدرجہ مجبوری ایسا کرنے لگے تھے جبکہ ان کے جسم پر گوشت اور چربی چڑھ گئی اور پیٹ بڑھ گیا۔ اور اس کی وجہ سے زیادہ دیر تک کھڑا رہنا ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ شعبی کا بیان ہے کہ:-

> معاویہ ہی پہلے وہ شخص ہیں جس نے بیٹھ کر خطبہ دیا اور یہ اس وقت ہوا جبکہ ان کے جسم پر چربی چڑھ گئی تھی۔ اور ان کا پیٹ بڑھ گیا تھا (۲)۔

اس اضطراری عذر کے باوجود اُنھیں اس زمانہ کے علماء کی مخالفت اور مزاحمت کا سامنا کرنا

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۲۹۹ (۲) تاریخ الخلفاء ص ۱۴۳ بروایت ابن شعبہ

پڑا (یعنی علماء نے سختی کے ساتھ ان کے اس فعل کی مخالفت کی) یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ ہمارے علماء نے حق کے معاملہ میں کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا جس کے وہ معتقد تھے اور نہ کسی امر کی مخالفت و مزاحمت میں کبھی تساہل برتا۔

چنانچہ بیہقی نے کعب بن عجرہ سے روایت نقل کی ہے کہ:-

وہ جمعہ کے دن مسجد میں گئے۔ دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن الحکم (غالباً صحیح مروان بن الحکم ہے) بیٹھ کر خطبہ دے رہا ہے اس پر انہوں نے کہا کہ: اس خبیث کو دیکھو بیٹھ کر خطبہ دیتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے رسول سے فرماتا ہے

واذا رأوا تجارة او لهوا	جب وہ سامان تجارت یا کھیل تماشے
انفضوا الیها و ترکوک	کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے
قائما۔	ہیں اور تجھے کھڑا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔

لیکن اس تشدد کے باوجود ابن الحکم نے اپنے عمل کے جواز کے لئے کسی حدیث سے استدلال نہیں کیا، اور نہ ہی یہ دعوی کیا کہ یہ فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے (گویا اس نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا اگر وضع حدیث کی ایسی ہی گرم بازاری ہوتی جیسے یہ مستشرق کہتا ہے تو اُسے اعتراض سے بچنے کے لئے فوراً کوئی موضوع حدیث پڑھ دینی چاہیئے تھی یا اگر رجاء بن حیوۃ کی حدیث کی کچھ اصل ہوتی تو اُسے پڑھ دیتا)۔

باقی گولڈ تسیہر کا یہ ادعا کہ رجاء بن حیوۃ نے بیٹھ کر خطبہ دینے والے اموی خلفاء کے حق میں یہ روایت بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے"

یہ تو رجاء پر صریح جھوٹ اور بہتان ہے اور مسلمانوں کے ایک مستند امام پر کھلا ہوا اتہام اور افترا ہے یہ ناممکن ہے کہ ایک ایسے دور میں رجاء اس قسم کی بے اصل حدیث بیان کر سکیں جس میں صحابہ و تابعین کی ایک جماعتِ کثیر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و مدافعت میں جان کی بازی لگائے ہوئے تھے ہمیں تلاش اور جستجو کے باوجود حدیث کی معتبر یا غیر معتبر کتابوں میں سے کسی ایک کتاب میں بھی رجاء کی طرف اس حدیث کی نسبت کا مطلق کوئی نام و نشان نہیں ملا۔ شاید گولڈ تسیہر نے الف لیلۃ و لیلۃ جیسی کہانیوں کی کسی کتاب میں یہ روایت دیکھی ہوگی اسلئے کہ یہ مستشرق

اپنی "علمی" بحثوں میں اس کتاب سے ہی روایات نقل کرنے پر زیادہ تر اعتماد کرتا ہے یا پھر دمیری کی حیات الحیوان میں اس کو یہ روایت ملی ہو گی جس سے وہ بکثرت نقل کیا کرتا ہے

رجاء بن حیوۃ ائمہ حدیث کے نزدیک ثقہ راوی اور حافظ حدیث تھے ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۱۱۱) میں ابن سعد کا بیان نقل کیا ہے کہ :-

"رجاء، فاضل، ثقہ اور کثیر العلم محدث تھے"

ابن عون کہتے ہیں کہ :-

"میں نے شام میں رجاء کی مانند عراق میں ابن سیرین جیسا، اور حجاز میں قاسم کی مانند کوئی شخص نہیں دیکھا"

ذہبی کا بیان ہے کہ :-

"رجاء نے ہی سلیمان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین مقرر کرے"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ثقہ امام کا گناہ بھی گولڈ تسہیر کی نظر میں بالکل وہی تھا جو امام زہری کا تھا کہ وہ "شام (پایہ تخت) میں رہا کرتے تھے، اور خلفاء بنو امیہ سے ان کے روابط و تعلقات تھے" ربیعۃ وہ اس مشورہ دینے اور سلیمان کے اس کو قبول کر لینے پر ہی اپنے مفروضہ کی بنیاد قائم کرتا ہے کہ رجاء حکومت کا آدمی تھا اور اس کی حمایت میں یہ حدیث گھڑی تھی نعوذ باللہ من مکائدھم)

رہا جابر بن سمرۃ کا یہ قول کہ "جو تم سے یہ بیان کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے وہ جھوٹا ہے" تو اس سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کسی موضوع حدیث کی تردید کرنا چاہتے ہیں (جیساکہ یہ مستشرق تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے) بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ حدیث اس خیال کی تردید کے لئے ہو جو اس عمل کو دیکھ کر اس کے جواز کے سلسلہ میں لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے (کہ یہ ہی سنت ہے) اس لئے انھوں نے قطعیت کے ساتھ واضح کر دیا کہ یہ عمل، قطعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے۔

عید کی نماز میں نماز سے پہلے خطبہ دینے کے مسئلہ کی نوعیت بھی یہی ہے، مروان نے خود اس کے لئے معذرت کی تھی کہ اسے مجبوراً ایسا کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ لوگ نماز ختم ہونے کے بعد خطبہ سننے کے لئے نہیں ٹھہرتے (بالفاظ دیگر یہ اس کی اجتہادی غلطی تھی) مروان سے ایسی کوئی روایت نہیں

یا ورنہ اس کا ثبوت ہے) کہ اُس نے اپنے اس فعل کے لئے کسی حدیث سے استدلال کیا ہو، یا اپنے ماتحتوں میں سے کسی کو اس کی تائید میں حدیث گھڑنے پر آمادہ کیا ہو۔ اس کے باوجود صحابہ اور تابعین نے مروان کے اس عمل کی شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے۔

چنانچہ امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ :-

"اُنھوں نے مروان پر جو حضرت معاویہ کی طرف سے مدینہ کا گورنر تھا عید کی نماز سے پہلے خطبہ دینے کے بارے میں سخت نکیر اور مخالفت کی۔ اور اس کا دامن پکڑ کر کھینچ لیا۔ مروان نے ان کے ہاتھ سے اپنا دامن کھینچ کر چھڑایا اور منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا شروع کر دیا ابو سعید کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا "خدا کی قسم تم نے (مسنون طریقہ) بدل دیا ہے۔ مروان نے جواب دیا: "جو تم جانتے ہو اس کا زمانہ گیا" میں (ابو سعید) نے کہا "خدا کی قسم جو (مسنون طریقہ) میں جانتا ہوں وہ اس سے بہتر ہے جو (تم کر رہے ہو اور) میں نہیں جانتا مروان نے کہا کہ : لوگ نماز کے بعد (خطبہ سننے کے لئے) نہیں بیٹھتے"

امام مسلم نے بھی اسی مفہوم کی روایت نقل کی ہے جس سے اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے

(یہ حقائق و واقعات ہیں) بتلائیے مروان (اپنے فعل کے جواز پر) حدیث سے کہاں استدلال کرتا ہے؟ اسی طرح حضرت معاویہ نے بیٹھ کر خطبہ دینے یا مقصورہ بنانے اور منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کرنے کے متعلق حدیث سے کہاں استدلال کیا ہے؟ یہ واقعات بے شک پیش آئے ہیں ان کا نہ ہم انکار کرتے ہیں نہ اختلاف جس بات سے ہم کو شدید اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ گولڈ تسیہر ان واقعات کو جو ان حضرات سے اجتہادی طور پر یا خاص حالات کے تقاضوں کے تحت سرزد ہوئے اپنے اس دعوے کی دلیل بناتا ہے کہ "یہ لوگ دینی زندگی کو بدلنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے اُنھوں نے احادیث وضع کی تھیں" یہ بالکل خلاف واقعہ ہے (اور محض بہتان ہے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود مستشرقین تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں (اور اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں) محض اپنے اوہام اور مفروضہ قیاسات سے باتیں گھڑتے ہیں پھر ان پر حقائق و واقعات ہونے کا قطعیت کے ساتھ حکم لگا دیتے ہیں

اور پھر ان کے بس میں نہیں ہوتا کہ اپنے ان وہمی اور خیالی نتیجوں اور مفروضات کے لئے کوئی ٹھوس دلیل پیش کرسکیں باقی اس مستشرق کا یہ دعویٰ کہ: ایک ایسی بات جس میں کوئی شبہ نہیں یہ ہے کہ بعض ایسی احادیث بھی (رائج) تھیں جو بلاشبہ بنوامیہ کی مصلحتوں کے موافق تھیں لیکن وہ بنوعباس کے برسرِاقتدار آنے کے بعد (غائب اور) پوشیدہ ہوگئیں۔

مستشرق مذکور کو تو اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ تمام و کمال شک ہی شک ہے۔ ہم اس مستشرق سے دریافت کرتے ہیں کہ:۔

(۱) وہ احادیث کہاں ہیں؟

(۲) وہ کس طرح (غائب اور) روپوش ہوئیں؟

(۳) بنوعباس نے ان کو چھپانے کے لئے آخر کیا اقدام کیا تھا؟

(۴) کیا انھوں نے علماء حدیث کو اپنی مسانید میں ان حدیثوں کے ذکر کرنے سے روک دیا تھا۔

ہاں اگر کوئی حدیث ایک زمانہ میں (رائج) تھی اور دوسرے دور میں وہ (غائب اور) روپوش ہوگئی تو یہ تو ہوا ہی کرتا ہے کہ جھوٹ جب رسوا ہوجاتا ہے اور باطل جب پسپا ہوجاتا ہے تو منہ چھپا لیتا ہے۔ مگر ایسی احادیث صرف صحیح اور مستند کتابوں کے صفحات سے ہی روپوش اور غائب ہوتی ہیں لیکن (موضوعات کی کتابوں میں سے) اس حدیث کا اپنا وجود، اور اس کے گھڑنے والوں، راویوں اور مدوّن کرنے والوں کا وجود بھی مخفی ہوجائے یہ تو ایک ایسی بات ہے جس کی ہمیں ایک مثال بھی تاریخ حدیث میں نہیں ملتی۔ (بلکہ محدثین نے تو موضوعات پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں اور مکمل نشاندہی کردی ہے) ہم ان مستشرقین کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ایسی احادیث کی کوئی ایک مثال ہی ہمارے سامنے پیش کریں۔

۱۰۔ صالحین کا کذب اور محدثین کی تدلیس

(بنوامیہ کے دورِ حکومت میں "سنت سے انحراف اور وضع حدیث کے رواج" سے متعلق اپنے خود ساختہ نظریہ کی تائید میں چند بے اصل واقعات اور مفروضہ قیاسات پیش کرنے کے بعد) مستشرق مذکور (گولڈ تسیہر) اپنے ان قیاسات و مفروضات کی تائید کے لئے "علم جرح و تعدیل" کے ان مصطلح الفاظ سے استدلال کرتا ہے جو بعض علما نے جرح رواۃ کے سلسلے میں ذکر کئے ہیں (اور ان الفاظ کو ان

کے اصطلاحی معنی کے بجائے لغوی معنی میں استعمال کرکے اپنے مفروضات کو ثابت کرتا ہے جو کھلی ہوئی بددیانتی ہے) کہتا ہے۔

(۱) ان میں سے ایک مشہور محدث ابو عاصم النبیل کا یہ قول ہے کہ: "میں نے صالح اور نکوکار لوگوں کو حدیث سے زیادہ کسی دوسری چیز میں جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔"

(۲) اسی قسم کا ایک مقولہ یحییٰ بن سعید قطان سے منقول ہے (جیسا کہ امام مسلم نے مقدمہ صحیح مسلم میں نقل کیا ہے)

(۳) وکیع، زیاد بن عبداللہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ: وہ علم حدیث میں بلند مقام رکھنے کے باوجود بہت جھوٹے تھے۔

(۴) یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ:۔ ان کے زمانہ میں ایک کے سوا تمام محدث مدلس تھے (دھوکا دہی کیا کرتے تھے) یہاں تک کہ سفیانین (سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری) کو بھی مدلسین کی فہرست میں ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ اس کتاب کے شروع میں ہم وضع حدیث اور وضاعین حدیث کا مقابلہ کرنے کے لئے علماء حدیث کی مساعی جلیلہ اور بے نظیر کاوشوں کا مفصل تذکرہ کر چکے ہیں۔ مشکوک و مشتبہ راویوں اور روایتوں پر ان کی کڑی تنقید اور پھر مختلف اصناف پر ان کی تقسیم اور رنشاندہی کہ (۱) کن راویوں کی حدیث قبول کی جائے (۲) کن کی رد کی جائے (۳) اور کن کی روایت میں توقف کیا جائے۔ (یہ ان حضرات محدثین کی کوششوں اور کاوشوں کے وہ بے مثل کارنامے ہیں جن کی مثال کسی علم و فن کی تاریخ میں نہیں ملتی) اسی سلسلہ میں ان علماء جرح و تعدیل نے وضاعین حدیث کو چند گروہوں میں تقسیم کیا ہے منجملہ ان کے ایک ان جاہل اور بے علم عابدوں اور زاہدوں کا گروہ ہے جن کی جہالت نے انھیں نیک نیتی کے ساتھ دین کے فروغ کے لئے کار ثواب کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثیں گھڑنے پر آمادہ کیا ہے۔ علماء حدیث نے اس گروہ کی حقیقت پورے طور پر بے نقاب کر دی ہے تاکہ لوگ ان کی نکوکاری کے مظاہر (عبادت گذاری پرہیزگاری وغیرہ) دیکھ کر دھوکہ نہ کھا جائیں اور ان کی جہالت اور لاعلمی کو نظر انداز نہ کر دیں اور بدون تحقیق ان لوگوں کی روایت کی ہوئی حدیثوں پر اعتماد نہ کر بیٹھیں ایسے ہی جاہل نکوکاروں اور عبادت گذاروں کے

متعلق ابوعاصم نبیل کا وہ مذکورہ بالا بیان ہے جس کو مستشرق مذکور نے عام محدثین کے جھوٹی حدیثیں گھڑنے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے کہ "میں نے نیک لوگوں کو کسی معاملہ میں اتنا جھوٹ بولتے نہیں دیکھا جتنا وہ حدیث میں جھوٹ بولتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ اس صلاح ونکوکاری سے وہ حقیقی نکوکاری ودینداری جو قرآن وحدیث کے علم صحیح پر مبنی ہوتی ہے ہرگز مراد نہیں ہے کہ وہ صلاح وتقویٰ تو علماء، ائمہ دین اور حفاظ حدیث کا مخصوص شعار ہے۔ بلکہ اس سے وہ ہی "صلاح" (نیکی) مراد ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے[ل]

اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ابوعاصم نبیل کے مقولہ سے ملتا جلتا یحییٰ بن سعید القطان کا قول:

لم نری الصالحین فی شئی اکذب منھم فی الحدیث (صحیح مسلم صفحہ ۱۴) — ہم نے نیک لوگوں کو حدیث سے زیادہ کسی چیز میں جھوٹ بولتا نہیں دیکھا۔

امام مسلمؒ نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں بسند متصل نقل کیا ہے۔ امام مسلم نے یحییٰ بن سعید ...... کا یہ قول قبول روایت حدیث کے باب میں حزم واحتیاط اور ان راویوں سے روایت نہ لینے کے سلسلہ میں پیش کیا ہے جو (۱) روایت حدیث میں بکثرت غلطیاں کرتے ہیں (۲) جن کا عقیدہ درست نہیں ہے (۳) اور جن کی علم حدیث سے غفلت اور لاعلمی معروف ہے جیسے یہ صالحین جن کے متعلق ابوعاصم اور یحییٰ بن سعید کی جرح اور تنقید ذکر کی گئی ہے پھر امام مسلم یحییٰ بن سعید القطان کے قول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تجری الکذب علی لسانھم — (لاعلمی کی وجہ سے) ان کی زبان سے (بے ارادہ)

ل اور جس سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حدیث ذیل میں پناہ مانگی ہے

قصم ظھری رجلان عالم متھتک وجاھل متنسک (اوکما قال) — میری کمر توڑ دی دو آدمیوں نے بے عمل عالم نے اور جاہل عبادت گذار نے

ورنہ تو پھر لازم آتا ہے کہ نہ صرف سعید بن المسیب، عروہ، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد، حسن بصری اور زہری جیسے محدثین وائمہ کبار، بلکہ خود ابوعاصم نبیل اور یحییٰ بن سعید بھی سب سے زیادہ حدیث میں جھوٹ بولنے والے لوگ ہونے چاہئیں اسلئے کہ یہ سب اعلیٰ درجہ کے نکوکار تھے بھلا کون (خرد باختہ شخص بقائمی ہوش وحواس) ایسا کہہ سکتا ہے؟

ولا یتعمدون الکذب   جھوٹ نکل جاتا ہے وہ قصداً جھوٹ نہیں بولتے

آپ ہی بتلایئے کیا آپ کی رائے میں امام مسلمؒ کے اس بیان میں ان صالحین سے ثقہ، متثبت (محتاط) اور راسخ العلم ائمہ حدیث مراد ہو سکتے ہیں کہ ان کو "جھوٹوں" کی فہرست میں شمار کیا جائے؟ یا امام مسلم ان ثقہ محدثین اور حفاظ حدیث کو صلاح ونکوکاری کے دائرہ سے خارج کر رہے ہیں؟ جس کے نتیجہ میں امام بخاری امام احمد، امام اوزاعی، امام زہری اور خود مسلم بھی "غیر صالح" قرار پاتے ہیں؟

(۲) صالحین کی اس تشریح اور مصداق کے علاوہ جو ہم نے ابھی بیان کیا ہے (کہ ناواقفیت سے بلا ارادہ جھوٹی حدیث بیان کر بیٹھتے ہیں) ایک اور تشریح و مصداق بھی سنئے جو امام شعرانی نے عہود کبریٰ میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

میں نے اپنے شیخ شیخ الاسلام زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ: بعض محدثین نے جو یہ کہا ہے:

اکذب الناس   صالحین سب لوگوں سے زیادہ جھوٹے

الصالحون   ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان صالحین کے قلوب پر انتہائی سلامتی (اور سچائی) کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے وہ لوگوں کے متعلق (عموماً) خیر کا گمان رکھتے ہیں اور یہ کہ کوئی مسلمان کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ[۱] نہیں بول سکتا۔

---

[۱] یعنی یہ حضرات حسن ظن کے غلبہ کی بنا پر کسی بھی راوی اور روایت کی چھان بین نہیں کرتے اور بدون تحقیق و تثبت جو حدیث کسی سے سنی روایت کر دیتے ہیں اور اس طرح جھوٹی حدیثیں روایت کرنے کے مرتکب اور جھوٹے بنتے ہیں نہ یہ کہ یہ حضرات جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر العیاذ باللہ جھوٹ بولتے ہیں۔ دونوں توجیہات میں فرق ہے پہلی توجیہ کے مطابق ان صالحین سے وہ "جہلا" مراد ہوئے جو وضع حدیث کو فروغ دین کا ذریعہ اور کار خیر سمجھ کر جان بوجھ کر حدیثیں گھڑتے ہیں جیسے کرامیہ فرقے کے لوگ، اور دوسری توجیہ کے مطابق ان صالحین سے مراد وہ پاک باطن لوگ ہوئے جو جان بوجھ کر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ ہرگز نہیں بولتے ہاں حدیث کی مزاولت نہ ہونے کی وجہ سے حدیث اور غیر حدیث میں فرق نہیں کر پاتے اور حسن ظن کے غلبہ کی وجہ سے تحقیق و تجسس نہیں کرتے۔ ائمہ حدیث نے دونوں قسم کے صلحا کی الگ الگ نام بنام نشاندہی کی ہے اور مسلمانوں کو ان کی حدیثوں پر اعتماد کرنے سے منع کر کے حفاظت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ادا کیا ہے۔ والحمد للہ علی ذالک ۱۲ نعمانی

(ظنوا المومنین خیراً۔ مومنوں کے متعلق نیک گمان رکھو۔ ان حضرات کا شعار ہے۔)

امام شعرانی کہتے ہیں کہ: ان صالحین سے وہ عابد و زاہد لوگ مراد ہیں جن کو علوم عربیت اور فصاحت و بلاغت میں کوئی مہارت نہیں ہوتی اس لئے وہ کلام نبوت اور غیر نبی کے کلام میں فرق نہیں کر پاتے اس کے برعکس حذاق و عارفین بالحدیث پر (یعنی احادیث کے ماہر اور حدیث کو پہچاننے والے لوگوں) یہ فرق ہرگز پوشیدہ[1] نہیں رہتا۔ (قواعد التحدیث للقاسمی ص ۱۴۷)

(۳) باقی اس یہودی مستشرق گولڈ تسیہر (زیہر) نے وکیع کا جو قول زیاد بن عبداللہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ: "وہ (زیاد) حدیث میں بلند مرتبہ رکھنے کے باوجود جھوٹے تھے" یہ تو اس خبیث مستشرق کی بہت سی تحریفات میں سے ایک (شاہکار) تحریف ہے اس لئے کہ وکیع کی اصل عبارت۔ جیساکہ امام بخاری کی تاریخ کبیر میں موجود ہے۔ یہ ہے:

وقال عقبة السدوسی عن وکیع: هو (ای زیاد بن عبداللہ) اشرف من ان یکذب

عقبہ سدوسی وکیع سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (زیاد بن عبداللہ) اس سے بالاتر ہیں کہ جھوٹ بولیں۔

(حصہ اول جلد دوم ص ۳۲۹)

آپ دیکھتے ہیں کہ وکیع، زیاد بن عبداللہ سے نہ صرف حدیث میں جھوٹ بولنے کی بلکہ مطلقاً جھوٹ بولنے کی نفی کر رہے ہیں: کہ ان کا علمی مرتبہ و مقام اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ وہ جھوٹ بولیں" اس یہودی مستشرق نے وکیع کے اس قول میں کس چالاکی سے تحریف کی کہ" وہ حدیث میں شرف و منزلت رکھنے کے باوجود بہت جھوٹے تھے" یہ ہے اس مستشرق کی علمی امانت اور دیانتداری کا حال۔

---

[1] یعنی مذاق حدیث (حدیث کے ماہر ائمہ) کلام کو سنتے ہی اس کے حدیث رسول اللہ ہونے یا نہ ہونے کا حکم اسی طرح لگا دیتے ہیں جیسے ایک تجربہ کار صراف سونے کو دیکھتے ہی کسوٹی پر پرکھے بغیر ہی کھرا یا کھوٹا ہونے کا حکم لگا دیتا ہے۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مناسبت، مزاولت حدیث میں عمریں صرف کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، یہ منکرین حدیث چاہے "مستشرقین" ہوں یا "مستغربین" اس بصیرت کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۱۲۔ محشی [2] ہمارے زمانہ کے ایک بہت بڑے

(باقی صفحہ ۲۴۲ پر)

(۴) باقی رہا تدلیس کا مسئلہ تو تدلیس بھی علم اصول حدیث کی ایک خاص اصطلاح ہے اس کا مفہوم بھی وہ نہیں جو اس کے لغوی معنی سے متبادر ہوتا ہے اور سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ تدلیس کے لغوی معنی تو کھوٹ ملانے، ملمع سازی اور دھوکہ دینے کے ہیں جس کے مرتکب انسان کو یقیناً جھوٹا اور دھوکہ باز کہا جاتا ہے (علم اصول حدیث میں یہ لفظ اس معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوا) بلکہ تدلیس محدثین کی ایک خاص اصطلاح ہے ان کے نزدیک اس کی دو قسمیں ہیں ہم اس کے سمجھنے کے لئے علم اصول حدیث کے مشہور امام شیخ ابن صلاح رحمہ اللہ کی اصل عبارت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے

> تدلیس کی دو قسمیں ہیں (۱) پہلی قسم تدلیس اسناد ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ایک ثقہ راوی کسی ایسے شیخ سے جس سے اس کی ملاقات ہوئی ہے کوئی ایسی حدیث جو اس سے نہیں سُنی اس طرح روایت کرے جس سے یہ وہم ہوتا ہو کہ راوی نے یہ حدیث براہِ راست (بلا واسطہ) اس شیخ سے سُنی ہے یا ایسے معاصر (ہمعصر) شیخ سے جس سے اس کی ملاقات نہ ہوئی ہو کوئی حدیث اس طرح روایت کرے جیسے راوی کی اس شیخ سے ملاقات ہوئی ہے اور براہِ راست اس ہمعصر شیخ سے یہ حدیث سُنی ہے۔ دوسری قسم تدلیس شیوخ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ راوئ حدیث اپنے شیخ سے کوئی حدیث جو اس سے سُنی ہو، روایت کرے مگر اس شیخ کا کسی ایسے نام یا کنیت یا نسبت یا کسی ایسے وصف کے ساتھ ذکر کرے جس سے وہ معروف نہیں ہے تاکہ اس کو پہچانا نہ جا سکے۔ تدلیس کی پہلی قسم محدثین کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے اکثر علماء نے اس کی مذمت کی ہے

شیخ ابن الصلاح ایسے مدلس کی روایت قبول کرنے کے بارے میں علماء حدیث کا اختلاف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۱) "محقق" اور اسلامی تحقیقاتی ادارہ کے سربراہ اس مستشرق گولڈ تسیہر کے بڑے مداح ہیں وہ اس کو "پہلا اور اکی مفکر" قرار دیتے ہیں۔ "جس نے اسلامی روایات کے ارتقا کو سمجھا ہے"۔ (ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ فکر و نظر بابت ماہ جولائی و اگست ۱۹۶۳ء مقالہ تصور سنت ص ۱۰) ان سے درخواست ہے کہ وہ اس کھلی ہوئی تحریف اور علمی بددیانتی کا جواب دیں۔ محشی

بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

صحیح فیصلہ اس بارے میں بھی تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ (۱) جس روایت کو مدلس راوی نے محتمل الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اور براہِ راست (بلا واسطہ) سماع اور اتصال کی تصریح نہیں کی وہ روایت تو مرسل اور اس کی انواع (منقطع، معضل وغیرہ) کے حکم میں داخل ہے (۲) اور جو روایت سماع کی تصریح اور اتصال کی وضاحت کرنے والے الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے جیسے سمعت (میں نے شیخ سے سُنا) حدثنا (شیخ نے ہم سے بیان کیا) اخبرنا (شیخ نے ہمیں بتلایا) یا اور اسی قسم کے الفاظ، تو وہ روایت قابلِ قبول اور لائق حجت[لہ] ہے

لہ واضح ہو کہ محدثین کے نزدیک کسی راوی کی حدیث کے صحیح، قابلِ قبول اور حجت ہونے کے بارے میں دو قسم کی صفات کا راوی اور اس کی روایت میں پایا جانا ضروری ہے ایک مثبت صفات دوسرے منفی اور سب سے پہلے مثبت صفات کو دیکھا جاتا ہے اگر وہ موجود ہوتی ہیں تو اس کے بعد منفی صفات کو دیکھا جاتا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ شرح نخبۃ الفکر میں حدیث صحیح کی تعریف حسب ذیل کرتے ہیں۔

الصحیح ما رواہ عدل	صحیح حدیث وہ ہے جس کو عادل (ثقہ) اور کامل حافظہ
تام الضبط غیر معلل	والے راوی نے روایت کیا ہو اور اس میں کوئی علت
ولا شاذ	(مانع قبول عیب) بھی نہ ہو اور وہ شاذ (غیر معروف)
	بھی نہ ہو۔

تدلیس (اپنے شیخ کو ظاہر نہ کرنا) منفی صفات میں سے ہے جب کسی راوی کے حالات کی چھان بین کرنے کے بعد اس کا ثقہ اور تام الضبط (پختہ حافظہ والا) ہونا ثابت ہو جائے گا تب دیکھا جائے گا کہ یہ راوی تدلیس تو نہیں کرتا اگر تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ تدلیس کرتا ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اس نے سماع (اپنے شیخ سے حدیث سُننے) کی تصریح کی ہے یا نہیں؟ اگر سماع کی تصریح کر دی ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس روایت میں یقیناً تدلیس نہیں کی اس لئے کہ راوی ثقہ ہے جھوٹ کبھی نہیں بولتا اگر اس شیخ سے یہ حدیث نہ سُنی ہوتی تو سماع کی تصریح ہرگز نہ کرتا اور اگر اس شیخ سے سماع کی تصریح نہیں کی بلکہ ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو اس شیخ سے بلا واسطہ سُننے کی

(باقی صفحہ ۲۴۴ پر)

(اس لئے کہ راوی جو فی نفسہ "ثقہ" ہے جھوٹ ہرگز نہیں بول سکتا اور سماع کی تصریح کر رہا ہے اس لئے اس کے بیان پر اعتماد کیا جائے گا) صحیحین (بخاری ومسلم) اور انہی جیسی قابل اعتماد کتابوں میں اس قسم کے ثقہ راویوں کی روایتیں بکثرت موجود ہیں جیسے قتادہ، اعمش، دونوں سفیان (سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری) اور ہشام بن بشیر وغیرہم۔

اس کے بعد شیخ ابن الصلاح ان ثقہ اور قابل اعتماد مدلس ائمہ حدیث کی روایتیں سماع کی تصریح کی صورت میں لائق قبول اور حجت ہونے کی دلیل بیان کرتے ہیں:۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تدلیس جھوٹ ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ "ایہام" کی ایک قسم ہے جو ایسے الفاظ سے پیدا ہوتا ہے جن میں احتمال سماع موجود ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۳) صورت میں بھی صادق آسکتے ہیں۔ مثلاً عن فلاں (فلاں شخص سے مروی ہے) یا قال فلاں (فلاں شخص نے کہا) تو اس صورت میں اس کی روایت کو قبول کرنے کے بارے میں توقف کیا جائے گا اور جب تک اس شیخ سے بلاواسطہ سننے کا قطعی ثبوت یا درمیانی واسطہ (شیخ) کا حال نہ معلوم ہو جائے گا اس وقت تک اس کی حدیث موقوف رہے گی لیکن اگر کسی راوی کے متعلق چھان بین کے بعد ثابت ہو چکا ہے کہ جس طرح یہ جھوٹ کبھی نہیں بولتا اسی طرح یہ تدلیس بھی کبھی نہیں کرتا (یعنے اپنے شیخ کو چھپاتا بھی نہیں) اور از روے تاریخ اس شیخ سے اس کی معاصرت (ہمعصر ہونا) یا ملاقات بھی ثابت ہے تو بلاتردد اور بلاتوقف اس کی روایت کو قبول کرلیا جائے گا اگرچہ صراحتاً سماع پر دلالت کرنے والے الفاظ نہ بھی استعمال کرے مثلاً عن فلاں یا قال فلاں کہے اس لئے کہ راوی ثقہ بھی ہے اور مدلس بھی نہیں ہے۔

بہر حال تدلیس کے لغوی معنی کسی کو دھوکہ دینا یا جھوٹ بولنا علم حدیث کی اصطلاح میں ہرگز مراد نہیں ہوتے اس لئے کہ دھوکہ دہی یا جھوٹ بولنا تو وہ عیب ہے کہ جو شخص اس کا مرتکب ہو وہ کبھی عادل اور ثقہ ہو ہی نہیں سکتا اس کے متعلق مدلس ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ محدثین اور علم اصول حدیث کی اصطلاح میں تدلیس کے معنی ہیں "کسی ثقہ راوی کا اپنے شیخ کو ظاہر نہ کرنا" خواہ اس طرح کہ غیر معروف نام کے ساتھ اس کا ذکر کردے ــ یہ تدلیس شیوخ ہے ــ خواہ اپنے شیخ سے بلاواسطہ حدیث سننے یا نہ سننے کی بالکل تصریح نہ کرے بلکہ

(باقی صفحہ ۲۴۵ پر)

یہ تو تدلیس کی قسم اول (تدلیس اسناد) کے متعلق بحث تھی تدلیس کی دوسری قسم (تدلیس شیوخ) کے بارے میں شیخ ابن الصلاح فرماتے ہیں:۔

تدلیس کی دوسری قسم (تدلیس شیوخ) کا معاملہ اس سے بھی ہلکا ہے۔

(شیخ ابن الصلاح رحمہ اللہ (متوفی ـــ) علوم حدیث کے مسلم اور متفق علیہ امام ہیں آپ کی مشہور و معروف کتاب مقدمہ ابن الصلاح علم اصول حدیث کا قدیم ترین دستیاب ماخذ ہے جس سے ڈاکٹر مصطفیٰ السباعیؒ نے مذکورہ بالا اقتباس نقل کیا ہے)

اس بیان سے قطعی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں سفیان (ابن عیینہ اور ثوری) اور ان جیسے ائمہ حدیث کی تدلیس موجب جرح اور قابل اعتراض ہرگز نہیں ہے اور ان کی روایتیں کتب صحاح میں (بلا تردد و توقف) مقبول اور ثابت شدہ ہیں۔ ایسی صورت میں اس یہودی مستشرق کا علم حدیث کی ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۴) ایسے الفاظ استعمال کرے جو بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں طرح سننے کا احتمال رکھتے ہوں — یہ تدلیس اسناد ہے — موخر الذکر تدلیس کی صورت میں اس کی روایت کو قبول کرنے میں توقف کیا جائیگا تاآنکہ یا بلا واسطہ اس حدیث کے سننے کی تصریح مل جائے یا درمیانی واسطہ (شیخ) کا پتہ چل جائے۔

یہ علم اصول حدیث کی مصطلح تدلیس (اپنے شیخ کو ظاہر نہ کرنا) کسی بدنیتی پر مبنی ہرگز نہیں ہوتی — کہ ایک عادل اور ثقہ راوی ہرگز ایسا نہیں کر سکتا — بلکہ بسا اوقات یہ تدلیس صحیح اور جائز مصلحتوں پر مبنی ہوتی ہے جن کی تفصیل کے لئے کتب علم اصول حدیث کی مراجعت کیجئے

بہر حال ایک ثقہ اور تام الضبط راوی کا محض مدلس ہونا ہرگز کوئی عیب نہیں ہے زیادہ سے زیادہ انکشاف حال تک اس کی حدیث کو قبول نہیں کیا جائیگا۔ اسی وجہ سے حفاظ حدیث اور ائمہ متقنین (پختہ حفظ اور یادداشت والے اماموں) سے بھی تدلیس ثابت ہے۔

اسی لئے ائمہ حدیث نے جس طرح راویوں کے اور حالات کی چھان بین کی ہے اسی طرح مدلس اور غیر مدلس راویوں کی بھی مکمل نشاندہی کر دی ہے درحقیقت ان غیر مسلم اور متعصب اعدائے اسلام کے تصور سے بالاتر ہیں یہ کاوشیں اور کوششیں جو حضرات ائمہ حدیث نے صفحات تاریخ پر ثبت کی ہیں اسی جہالت یا تعصب و عناد کا نتیجہ یہ ہرزہ سرائی ہے جس کا دندان شکن جواب دے رہے ہیں محقق جلیل ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ محشی

اصطلاح خاص کے اصطلاحی معنی کی بجائے لغوی معنی مراد لے کر جلیل القدر ائمہ حدیث کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کرنا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ: پرہیزگار علماء بھی حدیثیں گھڑا کرتے تھے" اہل علم کے نقطۂ نظر سے انتہائی کمینہ پن اور خباثت کے مظاہرہ کے سوا اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

(۵) مزید برآں یہ کہ جو کچھ اس مستشرق نے ہرزہ سرائی کی ہے وہ بلادِ اسلامیہ میں سے صرف ایک شہر کوفہ کے علماء اور محدثین سے متعلق ہے جبکہ حاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں تصریح کی ہے کہ حجاز، حرمین (مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ) مصر اور عوالی کے محدثین اور حفاظ حدیث تدلیس بالکل نہیں کیا کرتے تھے اسی طرح خراسان، جبال، اصفہان، بلاد فارس، خوزستان اور ماوراء النہر کے علماء و محدثین تدلیس کبھی نہیں کیا کرتے تھے۔ محدثین میں تدلیس کرنے والے زیادہ تر کوفہ کے اور کچھ بصرہ کے محدثین تھے (لہٰذا صرف کوفہ کے محدثین کی تدلیس کی بنیاد پر تمام بلاد اسلامیہ کے محدثین کے متعلق یہ فیصلہ کر دینا کہ "پرہیزگار علماء حدیثیں گھڑا کرتے تھے" انتہائی خباثت کے مظاہرہ کے سوا اور کچھ نہیں)۔

(۶) اس کے علاوہ علماء جرح و تعدیل نے دونوں سفیانوں کے بارے میں معقول اور قابل قبول عذر بھی پیش کئے ہیں چنانچہ سفیان بن عیینہ کے بارے میں تو ائمہ حدیث کا فیصلہ ہے کہ وہ ثقہ راویوں سے ہی تدلیس کیا کرتے تھے اس لئے ان کی تدلیس بھی قابل قبول ہے کیونکہ جب ان سے دریافت کیا جاتا (کہ آپ نے کس سے سنا ہے) تو وہ ابن جریج معمر اور انہی جیسے جلیل القدر مشائخ کا نام لیتے تھے۔ ابن حبان نے بھی سفیان بن عیینہ کے متعلق اسی فیصلہ کو ترجیح دی ہے اور تائید کی ہے اور کہا ہے۔

یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو دنیا میں سفیان بن عیینہ کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے (۱)

باقی سفیان ثوری کے متعلق تو محدثین اس پر متفق ہیں کہ ان کی تدلیس تو صرف نام کو کنیت سے یا اس کے برعکس کنیت کو نام سے بدل دینے کے قبیل سے یعنے تدلیس شیوخ کی قسم سے تھی اور یہ محض ایک تزیین سند یا اپنے تلامذہ کے معلومات میں اضافہ کا ذریعہ تھی یہ (ناپسندیدہ) تدلیس ہرگز نہیں ہے چنانچہ محدثین کے اس قول (فیصلہ) کو بیہقی نے اپنی کتاب مدخل میں ابو عامر سے نقل کیا ہے۔

---

(۱) شرح الفیہ عراقی ج ۱ ص ۸۴۔

محدثین کے نزدیک صحت حدیث کا اعتراف محض شکلا۔ سند اور متن کے اعتبار سے۔ کافی تھا

اس کے بعد یہ مستشرق (گولڈ تسیہر) احادیث رسول اللہ صلی اللہ کے خلاف سب سے زیادہ خطرناک اور گمراہ کن حملہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ :-

دوسری صدی ہجری میں ہی مسلمانوں نے محسوس کر لیا تھا کہ (۱) حدیث کی صحت کا اعتراف محض شکلا۔ یعنے اسناد و متن کے اعتبار سے ہونا چاہیئے۔ (یعنے کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لئے صرف اس کی ظاہری سطح ــــ سند و متن ــــ کا صورتاً صحیح ہونا کافی ہے خواہ معنوی معیار تحقیق کے اعتبار سے صحیح ہو یا نہ ہو) اور یہ کہ (۲) جید اسناد والی احادیث میں بھی بہت سی موضوع حدیثیں موجود ہیں۔

اس ادعا کے بعد اس مزعومہ احساس و شعور کے پیدا ہونے کا سبب بیان کرتا ہے :-

ان کے شعور کو بیدار کرنے میں اس حدیث سے تائید و تقویت حاصل ہوئی جو اس موقعہ پر عام طور سے بیان کی جاتی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے جب تمہارے سامنے مجھ سے بکثرت حدیثیں روایت کی جائیں گی اس وقت جو شخص بھی تم سے کوئی حدیث بیان کرے تو تم اس حدیث کو کتاب اللہ (قرآن) سے مطابق کر کے دیکھنا جو حدیث اس کے موافق ہو وہ میری طرف سے ہے خواہ میں نے اس کو کہا ہو یا نہ کہا ہو"

اس کے بعد یہ یہودی مستشرق "مفروضہ" "تحریک وضع حدیث" کے سلسلہ کی کڑیاں اس طرح ملاتا ہے :-

یہ وہ اصول ہے جو وضع حدیث کے پھیلنے اور عام ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد وجود میں آگیا تھا (گویا یہ حدیث احادیث موضوعہ کی تقویت کے لئے ہی وضع کی گئی تھی)

اس افترا پرداز مستشرق نے اس بیان میں دو پہلو سے علماء اسلام پر شرمناک افترا کیا ہے۔

(۱) پہلا افترا، اس کا یہ بے بنیاد دعویٰ ہے کہ حدیث کی صحت کا اعتراف محض شکلی اور سطحی

(یعنے سند و متن کے ظاہری سطح کے اعتبار سے) تھا۔ اور یہ کہ محدثین کو اس امر کا احساس ہے کہ کہ جید الاسناد احادیث میں بھی بہت سی موضوع حدیثیں موجود ہیں۔

یہ علماء حدیث پر اس مستشرق کا صریح کذب و افتراء ہے انھوں نے یہ بات قطعاً نہیں کہی، آپ خود سوچئے وہ یہ اعتراف کر بھی کیسے سکتے ہیں کہ بہت سی موضوع حدیثیں جید الاسناد (کھری سند والی) ہیں؟ (دراں حالیکہ انھوں نے اپنی ساری عمریں موضوع احادیث اور وضاعین حدیث کی تلاش و جستجو اور نشاندہی میں صرف کی ہیں اور جس حدیث یا راوی کے متعلق ذرا سا شائبہ بھی وضع حدیث یا کذب وغیرہ کا پایا گیا ہے اس کی تصریح کر دی ہے)

علماء حدیث نے جو کچھ کہا ہے (جس کو اس مستشرق نے مذکورہ بالا صورت میں پیش کیا ہے) وہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے "خبر واحد" پر اعتقاد و عمل کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے یہ تنقیح کی ہے کہ آیا خبر واحد مفید یقین ہے؟ (یعنے اس پر قطعی طور پر یقین کرنا ضروری ہے اور اس کا انکار کفر ہے) یا مفید ظن ہے؟ (یعنے اس کی صحت کا گمان غالب رکھنا اور اس پر عمل کرنا کافی ہے قطعی یقین کرنا ضروری نہیں ہے اس کا انکار کفر بھی نہیں ہے) بعض علما کی رائے ہے کہ: "خبر واحد مفید یقین ہے (اور اس کا منکر کافر ہے) لیکن جمہور علما کا مسلک یہ ہے کہ "خبر واحد صرف غالب گمان کے لئے مفید ہے (اس پر عمل کرنا تو واجب ہے مگر منکر کو کافر نہیں کہا جا سکتا) اس لئے کہ صحت حدیث کے عام شروط و قواعد کے اعتبار سے اگرچہ خبر واحد حدیث صحیح ہو لیکن از روئے عقل اس بات کا امکان ہے کہ صحیح نہ ہو (یعنے ہو سکتا ہے کہ وہ فی الواقع رسول اللہ صلی اللہ کا قول و فعل نہ ہو اور راوی سے سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہو) مگر یہ بھی ان حضرات کی جانب سے محض ایک عقلی احتمال ہے جس کو پیش نظر رکھنے پر ان حضرات کو اس کے سوا اور کسی چیز نے آمادہ نہیں کیا کہ وہ "اللہ کے دین" کے معاملہ میں انتہائی احتیاط اور احکام الٰہیہ میں انتہائی تثبت کا دامن نہ چھوڑیں (اس لئے کہ اس فیصلہ پر منکر خبر واحد کے ایمان و کفر کا مدار ہے)

اب ذرا سوچئے کہ کہاں ان حضرات کا (ایمان و کفر کے باب میں) یہ حزم و احتیاط اور کہاں وہ بے بنیاد نتیجہ جو اس غدار دشمن یہود نے اس کی اس بحث سے اخذ کر کے ان پر یہ بہتان باندھا ہے (کہ خود محدثین کو احادیث کی صحت کا یقین نہ تھا اور یہ کہ جید الاسناد احادیث میں بکثرت موضوع احادیث کے موجود ہونے کا محدثین کو اعتراف تھا)

(۲) دوسرا افترا، اس مستشرق کا یہ باطل زعم ہے کہ (تحریک وضع حدیث کا) وہ مبدا (یعنے اصل وبنیاد) جو کچھ ہی عرصہ بعد قائم ہوئی یہ حدیث ہے کہ: تمہارے سامنے بکثرت مجھ سے احادیث روایت کی جائیں گی الخ یہ افترا محض ہے کیونکہ اس حدیث پر تو ائمہ حدیث نے مفصل جرح وتنقید کی ہے اور اس کے "موضوع" ہونے کا حکم لگایا ہے۔ حجیت احادیث پر بحث کے ذیل میں اس حدیث کے متعلق ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور اس سلسلہ میں ہم نے امام شافعی، ابن حزم، یحییٰ بن معین، عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہم کے اقوال بھی نقل کئے ہیں (کہ یہ حدیث موضوع یا غایت درجہ ضعیف ہے) اس لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس حدیث کو یہ حضرات موضوع کہہ چکے ہوں وہی حدیث ان کے لئے ایک ایسا قاعدہ بن جائے جس پر وہ چلتے رہے ہوں اور ایک ایسا اصول قرار دے دیا جائے جس کے وہ قائل رہے ہوں۔

۱۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی ابوہریرہ پر نکتہ چینی

گولڈ تسیہر (زیہر) نے علما حدیث پر "وضع حدیث" کا الزام لگانے کے ذیل میں اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمر نے ابوہریرۃ (رضی اللہ عنہما) پر کلب زرع (کھیت کے کتے) سے متعلق حدیث — جس میں کھیت کی حفاظت کے لئے کتا پالنے کا جواز مذکور ہے — کی بنا پر نکتہ چینی کی ہے — استاذ احمد امین مصری کے اعتراضات کا جواب دیتے وقت اس حدیث پر ہم نے سیر حاصل بحث کی ہے (اس کی مراجعت کیجئے) اس لئے کہ استاذ احمد امین مصری نے اپنی کتاب ضحی الاسلام میں سنت حدیث پر اعتراضات کے سلسلہ میں قدم بقدم اسی مستشرق کے انتقادات کی پیروی کی ہے اور اس سلسلہ میں اس حدیث کو اس طرح اچھالا ہے کہ گویا یہ ان کی طبعزاد (اوریجنل) تحقیق وتنقید ہے (کیا کہنے اس "علم" کے اور کیا کہنے ان "علما" کے)

۱۳۔ لکھے ہوئے صحیفے

اس مستشرق نے اپنی بحث وتحقیق کو اس بہتان پر ختم کیا ہے کہ علما نے اپنے اپنے فقہی مسائل کو ثابت کرنے کے لئے صرف زبانی روایتیں گھڑنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ لکھے ہوئے صحیفے بھی اختراع کئے جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ صحیفے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشار کی ترجمانی کرتے ہیں (یعنے آپ کے ہی لکھائے ہوئے ہیں) ان لکھے ہوئے صحیفوں سے اس مستشرق کی مراد "مقادیر زکوٰۃ" سے متعلق صحیفے ہیں۔ ان صحیفوں کے موضوع ہونے کو ثابت کرنے کی غرض سے اس نے ان روایات پر بھی جرح وتنقید کی ہے جن میں

ان متعدد لکھے ہوئے صحیفوں کے موجود ہونے کی تصریح کی گئی ہے جو ادائیگی زکوٰۃ کے مفصل نظام پر مشتمل تھے (اور ان روایتوں کو بھی صرف اسی بنیاد پر موضوع کہا ہے کہ یہ روایت اُن صحیفوں کی تصدیق کرتی ہیں)

اس کے بعد اس قسم کے وثائق (دستاویزوں) کو مسلمانوں کے بسہولت (اور بے چوں وچرا قبول کر لینے کی مثال اُس لکھے ہوئے "صلحنامہ" سے دی ہے جس کا اعلان، شمال اور جنوب کے عربوں کے درمیان نزاع اور خانہ جنگی واقع ہونے کے موقعہ پر کیا گیا تھا جس کی تاریخ سند تبع بن معدیکرب کے زمانہ سے متعلق تھی۔ اور لوگوں نے اس صحیفے (صلحنامہ) کو اسقدر قدیم الایام ہونے کے باوجود صحیح تسلیم کر لیا تھا اور اس کی تصدیق کر دی تھی تو بھلا وہ حدیث کے ان صحیفوں[1] کو صحیح کیسے تسلیم نہ کرتے اور تصدیق کیوں نہ کرتے جو عہد قدیم کے اس صلحنامہ سے کہیں زیادہ نئے اور قریب زمانے یعنے عہد رسالت سے متعلق ہیں"

بلا شبہ یہ بھی مسلمانوں اور ان کے علماء پر اس مستشرق کا ایک دوسرا رکیک اور گمراہ کن حملہ ہے جس کے لئے یہ مستشرق کوئی تاریخی سند یا ثبوت مطلق پیش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ لکھی ہوئی منصوص احادیث (صحیفے) جو پہلی اور دوسری صدی میں منظر عام پر آئے علماء حدیث اور ائمہ جرح وتعدیل نے ان کی صحت کے متعلق تحقیق وتجسس کئے بغیر یونہی (بے چوں وچرا) تسلیم نہیں کر لیا۔ جیسا کہ یہ مستشرق تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ ان حضرات نے ان کی مکمل تحقیق وتنقید کی ہے اور اپنے اُن دقیق اصول جرح وتنقید پر ان کو پرکھا ہے جن کا تذکرہ ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں اور اسی جرح وتنقید کی بنا پر انھوں نے ابن ہدبہ، دینار، اور الاشج وغیرہم کے نسخوں (صحیفوں) کو موضوع قرار دیا ہے۔

---

[1] بالفاظ دیگر گولڈ تسیہر یہ کہنا چاہتا ہے کہ مسلمان ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے اسقدر سادہ لوح اور زود اعتقاد واقع ہوئے ہیں کہ ان کے سامنے جو بھی لکھی ہوئی تحریر پیش کر دی جائے وہ اسے بے چوں وچرا صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اسی سادہ لوحی اور زود اعتقادی کی بنا پر مسلمانوں نے حدیث کے ان صحیفوں کو تسلیم کر لیا جو موضوع اور زمانہ مابعد کی پیداوار تھے اور فقہی اختلافات کے عروج کے زمانہ کے گھڑے ہوئے تھے اور نقد وتحقیق کے اعتبار سے بالکل بے اصل تھے نہ صرف یہ بلکہ ان کی تصدیق کرنے والی گھڑی ہوئی روایتوں کو بھی صحیح تسلیم کر لیا ۱۲ محشی

باقی وہ "نوشتے" (صحیفے) جن میں زکوٰۃ کی تفصیلات اور اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریوں کے علیحدہ علیحدہ نصاب اور مقادیر زکوٰۃ بیان کی گئی ہیں، ان نوشتوں (صحیفوں) کو علماء حدیث کی توجہ و اہتمام اور تحقیق و تنقید کا پورا پورا حصہ ملا ہے چنانچہ اُس نوشتہ (صحیفے) کی صحت پر علماء حدیث کا اجماع ہے جو خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہٗ نے حضرت انس رضؓ کو لکھ کر بھیجا تھا اور جس کی تخریج بخاری، مسلم، نسائی، ابو داؤد، دار قطنی، شافعی، حاکم اور بیہقی وغیرہ محدثین نے اپنی کتابوں میں کی ہے۔ اس کے علاوہ اور دوسرے نوشتوں (صحیفوں) کے بارے میں محدثین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کو "صحیح" قرار دیا ہے اور بعض کو "حسن" اور ان میں سے بعض کو از روئے سند "مرسل" قرار دیا ہے اور بعض کو "منقطع"۔

بہر حال احادیث کے یہ نوشتے (صحیفے) کسی بھی نوع کے ہوں ان کے متعلق علماء حدیث کی یہ تحقیقی اور تنقیدی بحثیں — ہر اُس شخص کے لئے جو اُن کے متوقع مقامات (جرح و تعدیل) میں ان کی مراجعت کرنا چاہے — قطعیت کے ساتھ یہ واضح کر دیتی ہیں کہ علماء حدیث نے احادیث کے ان صحیفوں کو "تحقیق و تنقید" کے بغیر ہرگز قبول نہیں کیا اور یہ کہ اُنھوں نے فقط "لکھا ہوا متن" ہونے ہی کی شہادت پر ان کو قابل اعتماد نہیں سمجھا ہے (جیسا کہ یہ مستشرق تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے) بلکہ اُنھوں نے ان احادیث کو جن پر یہ صحیفے مشتمل تھے۔ روایت حدیث کے اُنہی معروف طریقوں سے (بسند متصل) روایت کیا ہے جو اُن کے ہاں معمول تھے — یعنے رُو بہ رُو اور راوی بہ راوی تا آخر، بسند متصل — اس طرح ان نوشتوں (صحیفوں) کی صحت پر ان کو دو جہت سے اعتماد حاصل تھا ایک "لکھے ہوئے متن" کے اعتبار سے اور دوسرے "مسلسل سند" کے اعتبار سے۔ بہر حال اس اعتماد کی کوئی بھی صورت ہوئی ہو، وضع حدیث کے معاملہ سے ان صحیفوں کا کیا علاقہ؟ کیا یہ مستشرق کسی بھی "قدیم لکھی ہوئی حدیث" کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود رہی ہو اس امر کی دلیل بنانا چاہتا ہے[1] کہ جب انکو (حسب منشا)

---

[1] یہی منشا ہے اور درحقیقت یہ مستشرق یہی کہنا چاہتا ہے کہ ہر مکتوب حدیث یا مکتوب حدیثوں کا ہر مجموعہ جعلی ہے اس لئے کہ یہ مستشرقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد اور زمانہ مابعد میں کتابت حدیث کے قطعاً منکر ہیں۔ اور کتابت حدیث کا زمانہ دوسری صدی قرار دیتے ہیں اور اسی بنیاد پر احادیث کے موجودہ مدون ذخیرہ کو نا قابل اعتماد اور زمانہ مابعد کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ان مکتوب احادیث (صحیفوں) کا انکار اسی کی "پیش بندی" ہے اس لئے کہ علمائے اسلام

(باقی صفحہ ۲۵۲ پر)

روایتیں میسر نہیں آتی تھیں تو وہ جعلی نوشتے (صحیفے) تیار کرنے لگتے تھے ؟ (کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ استدلال) کیا وہ لوگ جنہوں نے (بقول اس مستشرق کے) تمام مسائل فقہیہ وکلامیہ کے لئے طرح طرح کی حدیثیں بنائیں اس سے عاجز تھے کہ کسی "جعلی نوشتے" (صحیفے) کی پناہ لئے بغیر چند حدیثیں ایسی بھی گھڑ لیں جن میں مقدار زکوٰۃ اور اموال زکوٰۃ وغیرہ کی تفصیلات موجود ہوں ؟ کسی ایسے مسئلہ سے متعلق جس کے بارے میں چند نصوص (احادیث) وارد ہوئی ہوں کسی ایک نص کی صحت میں اختلاف کب اس امر کی دلیل بن سکتا ہے کہ اس مسئلہ سے متعلق ہر نص (حدیث) موضوع ہے۔ جس کی کچھ اصل نہیں ہے؟

ان صحیفوں کو موضوع ثابت کرنے کے سلسلہ میں شمال اور جنوب کے عربوں کے باہمی نزاع کا قضیہ اور عہد تبع کے تحریری متن (صلحنامہ) کو اہل عرب کے قبول کر لینے کا تذکرہ، انتہائی حیرت انگیز اور مضحکہ خیز ہے۔

لوگ ہر چیز میں تساہل برت سکتے ہیں اور شاید وہ ہر چیز کی تصدیق بھی کر دیتے ہوں بجز اس کے کہ کوئی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ اور آپ کی طرف منسوب ہو، یہ تو وہ موقعہ ہوتا ہے جہاں ان کی (عقل وبصیرت کی) آنکھیں کھل جاتی ہیں اور بحث وجستجو، تحقیق وتنقید کا معرکہ گرم ہو جاتا ہے (اور تحقیقی ثبوت کے بغیر کسی چیز کو صحیح تسلیم نہیں کرتے) اس لئے کہ یہ تو "دین" کا معاملہ ہے۔ اس میں کسی بھی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کے دین کو محض اپنے وہم وگمان اور اپنی خواہش و پسند کی بنیاد پر تسلیم کر لے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جن لوگوں نے شمال اور جنوب کے عربوں کے باہمی نزاع سے متعلق نوشتہ متن (صلحنامہ) کو قبول کیا تھا وہ "علماء حدیث" یقیناً نہ تھے اس لئے اس واقعہ کا زیر بحث مسئلہ سے کہ تمام مکتوب احادیث (صحیفے) "موضوع اور جعلی تھے" کیا تعلق ہے ؟

واقعہ تو یہ ہے کہ یہ یہودی مستشرق گولڈ زیہر علم وتحقیق کے میدان میں (خاص طور پر) سب سے زیادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۱) انہی مکتوب احادیث (صحیفوں) سے عہد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں کتابت حدیث کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے اس مستشرق نے اس موقعہ پر ان صحیفوں پر بحث کی ہے تاکہ علماء اسلام کے استدلال کو بیکار بنا دے نعوذ باللہ من دسائسہم۔ محشی

بے حیا اور بے شرم واقع ہوا ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں یہ اپنی طرف سے "جھوٹے افسانے" گھڑتا ہے، اپنی خیال آفرینی سے ان کو دل کش و دل آویز بناتا ہے اور حقائق و واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے ذہن میں ان کا ایک مکمل ڈھانچہ تیار کر لیتا ہے پھر ادھر اُدھر سے ایسی گری پڑی چیزیں جمع کرتا ہے جن سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کر سکے کہ یہ "دلائل" ہیں جو اس کے مفروضہ دعوے کو ثابت کرتے ہیں اس سلسلے میں وہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ صریح نصوص میں جھوٹ بولے، ان کو صحیح صورت میں سمجھنے کے اندر مغالطے پیدا کرے، یا ایسے امور سے استدلال کرے جو واقعتاً دلیل بننے کے لائق ہی نہیں ہیں اور ایسے امور کو بالکل نظر انداز کردے جو فی الحقیقت قطعی دلائل ہیں لیکن اُس کے نظریہ کے خلاف ہیں۔

اس یہودی مستشرق کی حق اور انصاف سے کنارہ کشی اور دوری کی، اور اپنی رائے پر تعصب کی، اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ یہ اُن قطعی نصوص (صریح دلائل) کو بے محابا نظر انداز کر دیتا ہے جن کی صحت پر اہل علم کا اتفاق ہے اور ان کے بجائے دَمیری کی کتاب الحیوان یا الف لیلۃ و لیلۃ یا العقد الفرید یا کتاب الاغانی جیسی ادب کی کتابوں سے — جن میں ہر طرح کی رطب و یابس اور صحیح و غلط چیزیں بھری پڑی ہیں — مشتبہ اور خلط ملط روایتیں پیش کیا کرتا ہے۔

کیا اُس قوم کی شان یہی ہے جو اپنے آپ کو "علم و تحقیق" کے لئے وقف کر دینے کی دعویدار ہے؟ اور کیا یہی وہ "علماء" ہیں جن کو احمد امین مصری جیسے مسلمان مصنفین نے اپنا امام و مقتدا بنایا ہے جن کے نقش قدم پر چل کر تحقیق و تنقید کی جولانگاہ میں یہ حضرات بھی صحابہ کی تکذیب اور تابعین کو مجروح کرنے میں اور خود اپنے علماء محققین پر شرمناک حملے کرنے میں مصروف اور سرگرم ہیں؟

(۱) اے اللہ تیری ذات پاک ہے جسے چاہے تو ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راستہ سے بھٹکا دیتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ اور دم گھٹتا ہوا کر دیتا ہے جیسے وہ آسمان پر چڑھ رہا ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر عذاب مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔

باب سوم

فصل اول: قرآن عظیم اور سنت وحدیث کا مرتبہ

فصل دوم: قرآن کریم سنت وحدیث پر کس طرح مشتمل ہے

فصل سوم: سُنت کا قرآن سے منسوخ ہونا اور قرآن کا سنت سے

فصل اول

قرآن عظیم کے ساتھ سُنّت اور حدیث کا درجہ اور مرتبہ

اللہ جل جلالہٗ نے قرآن کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے رہنما اور مسلمانوں (کی زندگی کے تمام شعبوں) کا دستور بنا کر اُتارا ہے، چنانچہ اللہ جل شانہٗ جن لوگوں کو روحانی امراض کفر و شرک اور نفاق وغیرہ سے) شفا دینا چاہتے ہیں اُن کے لئے قرآن (نسخۂ) شفا ہے اور جن لوگوں کو فوز و فلاح دارین اور ایمان کی روشنی بخشنا چاہتے ہیں ان کے لئے قرآن (کبھی نہ بجھنے والا) روشن چراغ ہے۔ یہ قرآن ان بہت سے مقاصد پر مشتمل ہے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل کو بھیجا ہے چنانچہ قرآن عظیم میں احکام الٰہیہ اور شرعی قانون بھی موجود ہے اور آداب و اخلاق کی تعلیم بھی موجود ہے۔ (اُخروی زندگی کے سنوارنے کے لئے) ترغیب و ترہیب بھی موجود ہے (عبرت کے لئے گذری ہوئی قوموں اور اُمتوں کے) قصّے اور واقعات بھی مذکور ہیں (اسلام کے اساسی عقیدہ) توحید کا سیر حاصل بیان بھی موجود ہے۔

قرآن کریم کی صحت (یعنی اس کا کلام اللہ ہونا) اجمالاً بھی اور تفصیلاً بھی (یعنی مجموعی طور پر بھی اور ہر ہر آیت بلکہ ہر ہر لفظ بھی) یقینی اور قطعی ہے لہٰذا جس شخص کو قرآن عظیم کی کسی بھی آیت یا کلمہ یا حرف میں ذرا بھی شک ہو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کے دین کا علم حاصل کرنے والے عالم دین اور فقیہ کے لئے جس چیز کا اہتمام ازبس ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں (بندوں

کی فلاح و بہبود کے لئے) جو احکام دیئے ہیں ان کا کما حقہ علم حاصل کرے اور اُس نے اپنے بندوں کے لئے جو نظام زندگی اور قوانین معیشت و معاشرت تجویز کئے ہیں ان کو سمجھے اور اُن پر عمل کرے۔

قرآن عظیم کو صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ (منہ زبانی) اخذ کیا (اور یاد کیا) اسی طرح (بالمشافہ) صحابہ کے زمانہ سے آج تک ہر دور کے مسلمان اپنے سے پہلے مسلمانوں سے بطور تواتر و توارث قرناً بعد قرنٍ قرآن (منہ زبانی) پڑھتے اور یاد کرتے چلے آئے ہیں[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ (قرآن اُمت تک پہونچانے کے علاوہ) ایک اور بھی نہایت اہم کام اور فرض منصبی تھا وہ یہ کہ آپ اس کتاب الٰہی کے معانی اور مقاصد کی وضاحت کریں، مبہم آیات کی تشریح کریں، مجمل احکام کی تفصیل بیان کریں اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو اصول کلیہ اور قواعد عامہ مجمل طور پر بیان فرمائے ہیں ان کے تحت احکام شرعیہ نافذ کریں[2]۔

اس بنا پر مسلمانوں کو کتاب اللہ علم حاصل کرنے کی ضرورت کے ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان (قولی اور فعلی) وضاحتوں اور تفصیلات کو جاننے اور ان کا علم حاصل کرنے کی بھی ضرورت تھی کیونکہ قرآن پاک کی بہت سی تعلیمات کی حقیقت کو سمجھنا اور قرآن کی بہت سے احکام کی آیات سے اللہ جل شانہٗ کی مراد اور مصداق کو پانا اُس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یعنے صحابہ کرام کے عہد سے ہی ہر دور میں قرآن کے حاملین اور حفاظ اتنی کثرت سے ہوئے ہیں کہ قرآن میں کسی بھی قسم کی تحریف اور تغیر و تبدل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ قرآن بعینہٖ وہی قرآن اور اللہ کا کلام ہے جو جبرئیل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے ہیں۔ ۱۲ محشی

[2] قرآن کریم میں آیت کریمہ:

انا انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم	بیشک ہم نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ بیان کرو جو ان کے لئے اتارا گیا ہے

میں آپ کے اسی منصب کو بیان فرمایا ہے۔ ۱۲ مح

کی طرف اس مراد کو سمجھنے کے لئے رجوع نہ کیا جائے

اس لئے کہ آپ کی ذات مقدس ہی وہ ذات معصوم ہے جس پر اللہ تعالیٰ و تقدس نے اس کتاب کو اُتارا ہے تاکہ آپ اللہ کی جانب سے بندوں کے لئے نازل شدہ تعلیمات کی تشریح و توضیح فرمائیں۔

اسی بنا پر قدیم و جدید، تمام ادوار میں مسلمانوں کا کلّی طور سے اس پر اتفاق رہا ہے۔ سوائے چند راستے سے بھٹکے ہوئے گمراہ فرقوں کے ـــ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت خواہ وہ آپ کا قول ہو یا فعل یا بیان سکوتی اسلامی قانون کا وہ ماخذ ہے جس سے قانون شریعت پر کوئی بھی عمل کرنے والا حلال و حرام کے احکام جاننے میں مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب کی سابقہ فصلوں میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ یہ حقیقت خدائے وحدہٗ لاشریک کی کتاب سے بھی ثابت ہے اور خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے بھی۔ ہم یہاں جس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ سنت کا مرتبہ و مقام قرآن کے سامنے کیا ہے؟ کیا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا مرتبہ تشریعی حیثیت سے برابر اور یکساں ہے؟ یا مرتبہ کے لحاظ سے سنت و حدیث کا درجہ قرآن عظیم کی نسبت سے ثانوی درجہ ہے؟

اس میں تو کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا کہ قرآن عظیم کا متن قطعی الثبوت ہے (یعنے اس کا کلام اللہ ہونا قطعی اور یقینی ہے) باقی قرآن کریم کی اکثر و بیشتر آیات کا مدلول و مفہوم بھی قطعی اور یقینی ہے ہاں بعض آیات کا مدلول و مفہوم ظنی ہے (یعنے غالب گمان ہے کہ یہی مدلول و مفہوم ہے) رہی سنت اور احادیث تو ان میں سے جو حدیثیں متواتر ہیں (یعنے ان کا قول یا فعل رسول ہونا قطعی اور یقینی ہے اس لئے کہ ان کی روایت کرنے والے صحابہ اور تابعین کے عہد میں بھی اتنی کثرت سے ہوئے ہیں کہ وہ سب کے سب دانستہ یا نادانستہ طور پر جھوٹ نہیں بول سکتے) وہ تو قطعی الثبوت ہیں اور جو حدیثیں متواتر نہیں ہیں وہ تفصیلی طور پر یعنے فرداً فرداً تو ظنی الثبوت ہیں (یعنے غالب گمان یہی ہے کہ وہ رسول کا قول یا فعل ہیں) باقی بحیثیت مجموعی تمام احادیث بھی قطعی الثبوت ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ظنی الثبوت (سنت و حدیث) کی دونوں قسموں یعنی قطعی الدلالت

سلہ نہ سنت و حدیث کے بغیر نماز پڑھنا ممکن ہے نہ روزے رکھنا نہ زکوٰۃ ادا کرنا نہ حج کرنا اس کی تفصیل امام شافعی کے مناظرے کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں ۱۲ محشی

اور ظنی الدلالت کا مرتبہ اور درجہ، قطعی الثبوت (قرآن کریم) کی دونوں قسموں[1] یعنے قطعی الدلالت اور ظنی الدلالت کے بعد آتا ہے اسی بنا پر سنت اور حدیث کا مرتبہ اور درجہ کتاب اللہ کے بعد دوسرا اور ثانوی ہونا چاہیے۔

علاوہ ازیں سنت اور حدیث دو حال سے خالی نہیں (۱) یا تو وہ کتاب اللہ کی تفسیر و توضیح کرتی ہوں گی یا کتاب اللہ پر کسی حکم کا اضافہ کرتی ہوں گی لہٰذا (پہلی صورت میں) اگر سنت و حدیث کتاب اللہ کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں تو اصل کتاب اللہ ہوئی اس کے مقابلہ میں اس کی تفسیر و توضیح کا اعتبار دوسرے درجہ میں ہوگا کیونکہ نص قرآن اصل اور اساس ہے اور تفسیر اس پر مرتب اور متفرع ہے اور (دوسری صورت میں) اگر حدیث و سنت کتاب اللہ پر کسی حکم کا اضافہ کرتی ہے تو قرآن کے مقابلہ میں اس کا کچھ اعتبار نہ ہوگا بجز اس صورت کے کہ قرآن اس حکم کے بیان سے خاموش ہو یعنے قرآن میں سرے سے اس حکم کا ذکر ہی

---

[1] چند اصطلاحات کی وضاحت اس بحث کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہیں:-

قطعی ہر وہ امر جو ایسا یقینی ہو کہ از روئے عقل اس کا خلاف محال اور ناممکن ہو جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں یا ہر مصنوع (بنی ہوئی چیز) کے لئے کسی نہ کسی صانع (بنانے والے) کا ہونا ضروری ہے۔

ظنی ہر وہ امر جس کا خلاف از روئے عقل محال اور ناممکن تو نہ ہو مگر غالب گمان یہی ہو کہ وہ صحیح ہے مثلاً وہ دو گواہ جن کی گواہی پر کوئی عدالت کسی امر کا فیصلہ کرے کہ ان کے متعلق غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ سچی گواہی دے رہے ہیں اگرچہ عقلاً یہ ممکن ہے کہ انہوں نے کسی بھی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ جھوٹ بول دیا ہو۔ دنیا کے بھی تمام کاروبار اسی ظن غالب کی بنیاد پر چل رہے ہیں اور دین میں بھی ظنی دلائل سے ثابت شدہ احکام پر عمل کرنا واجب ہے۔

کسی بھی امر کے حجت اور دلیل ہونے کا مدار اول اس کے ثبوت پر ہے۔ قرآن کا کلام اللہ ہونا ایسا قطعی یقینی امر ہے کہ اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی جیسے دو اور دو چار میں مطلق شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا ایسے ہی قرآن کے کلام اللہ ہونے میں بھی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

باقی متواتر کے علاوہ عام احادیث کا قول و فعل رسول اللہ ہونا ایسا قطعی اور یقینی امر نہیں ہے جس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ ہو اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قول یا فعل کے نقل کرنے والے راوی اگرچہ

(باقی صفحہ ۲۵۹ پر)

نہ ہو نہ نفیاً نہ اثباتاً تو ایسی صورت میں رسول کی اطاعت کے فرض ہونے کی وجہ سے اس کا ضرور اعتبار کیا جائے گا) یہ سنت کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا فرق بھی اس امر کی دلیل ہے کہ کتاب اللہ کو سنت و حدیث پر تقدم حاصل ہے (اور سنت و حدیث کا درجہ ثانوی ہے)

یہ تو تقدم کتاب علی السنۃ کی عقلی دلیل تھی، اس کی تائید احادیث و آثار صحابہ سے بھی ہوتی ہے۔ منجملہ ان کے حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث ہے جس کو ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے حدیث یہ ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو یمن کا حاکم بناتے وقت دریافت فرمایا) جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوگا تو تم اس کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ معاذ نے جواب دیا: اللہ کی کتاب سے (فیصلہ کروں گا) آپ نے فرمایا: اگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۸) کتنے ہی ثقہ اور عادل ہوں پھر بھی غلطی یا خطا سے معصوم نہیں ہوتے اس لئے غلط فہمی یا کوتاہ فہمی اور بھول چوک وغیرہ کا امکان باقی رہتا ہے اگرچہ راوی کے ثقہ اور عادل ہونے کی بنا پر غالب گمان یہی ہے کہ وہ اس قول یا فعل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے اور آپ کا قول یا فعل کہنے میں سچا ہے۔

ثبوت کے بعد دوسرا درجہ اس کلام کے معنی و مفہوم اور مدلول و مصداق کا آتا ہے کہ وہ بھی قطعی ہیں یا ظنی۔ مثلاً قل ہو اللہ احد کہ ان الفاظ کے معنی: اللہ یکتا و یگانہ ہے یہ بھی قطعی ہیں اس کے سوا اور معنی ہو ہی نہیں سکتے لیکن قرآن کے بعض الفاظ یا آیات کے معنی مختلف وجوہ کی بنا پر ایسے قطعی اور یقینی نہیں ہوتے مثلاً ثلٰثۃ قروء میں لفظ قرء کے معنی ازروئے لغت حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی اور تضاد (ایک دوسرے کی ضد ہونے) کی بنا پر دونوں معنی اس آیت میں مراد نہیں ہو سکتے لہٰذا لازمی طور پر خارجی قرائن یا دلائل کی بنا پر کسی ایک معنی کو مراد لیا جائے گا مگر اس کو قطعی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ازروئے لغت دوسرے معنی کا احتمال باقی ہے بلکہ ظنی کہا جائے گا یعنے خارجی قرائن اور دلائل کے پیش نظر غالب گمان کی بنا پر اس معنی کو ہی مراد قرار دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے قرآن کی آیات و الفاظ کی دو قسمیں ہیں قطعی الدلالت اور ظنی الدلالت۔

اسی طرح معنی اور مدلول کے اعتبار سے حدیث کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ احادیث جن کے معنی اور مراد یقینی اور قطعی ہیں مثلاً:۔

البینۃ للمدعی والیمین علی من انکر۔	گواہ مدعی کے ہوتے ہیں اور قسم منکر (مدعٰی علیہ) پر آتی ہے۔

(باقی صفحہ ۲۶۰ پر)

کتاب اللہ میں نہ ملا؟ معاذ نے جواب دیا : تو رسول اللہ کی سنت سے (فیصلہ کروں گا) آپ نے ارشاد فرمایا: اگر سنت میں بھی نہ ملا؟ تو معاذ نے عرض کیا: تو میں اپنی سمجھ اور اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا۔

اس حدیث کی تائید اُس خط سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو لکھا ہے کہ:۔

جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے آئے تو کتاب اللہ سے اس کا فیصلہ کرو اور اگر کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اس کا فیصلہ کرو تا آخر

اسی خط کا مضمون ایک دوسری روایت میں اس طرح ملتا ہے۔

جب تمہیں کتاب اللہ میں کوئی چیز (فیصلے کے لئے) مل جائے تو بس اس سے فیصلہ کرنا اور کسی بھی دوسری دلیل کی طرف مطلق التفات نہ کرو۔

ایک اور روایت میں اس کی وضاحت ذیل کے الفاظ میں کی گئی ہے:۔

کتاب اللہ میں غور وفکر کے بعد جو چیز تم پر واضح ہو اس کے بارے میں تو کسی سے کچھ پوچھو ہی نہیں ہاں جو مسئلہ کتاب اللہ میں غور وخوض کے بعد بھی تم پر واضح نہ ہو اس میں رسول اللہ کی سنت کی پیروی کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۹) دوسرے وہ حدیثیں جن کے معنی اور مدلول ظنی ہوتے ہیں مثلاً:۔

لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب — نماز سورہ فاتحہ کے بغیر نہیں ہوتی۔

یعنے اس حدیث کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بالکل ہی نہیں ہوتی اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس لحاظ سے شرعی دلائل کی چار قسمیں ہیں:۔

(۱) قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت قرآن کریم کی وہ تمام آیات جن کا کلام اللہ ہونا بھی قطعی اور یقینی ہے اور ان کے معنی اور مفہوم بھی قطعی ہیں یا ایسی ہی متواتر حدیثیں۔

(۲) قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت قرآن کریم کی وہ تمام آیات جن کا کلام اللہ ہونا.... تو قطعی اور یقینی ہے مگر ان کا مفہوم و مدلول ظنی ہے

(باقی صفحہ ۲۶۱ پر)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے:-

تم میں سے جس کسی کو جب کسی مقدمہ میں فیصلہ کرنا پڑے تو اس کو چاہیئے کہ وہ کتاب اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ملے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا ہو تو اس کی روشنی میں فیصلہ کرے۔

اس سے قبل ہم یہ بیان کر ہی چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سنت (اور طریق کار) یہ تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہوتا تو وہ کتاب اللہ میں غور و فکر کرتے اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ پاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں اس کا حکم تلاش کرتے۔

صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کے کلام میں بھی اس قسم کے اقوال بکثرت ملتے ہیں

اعتراض اوّل اور اس کا جواب

ہمارے اس دعوے کے مقابلہ میں بعض علماء سے مروی یہ قول پیش کیا جا سکتا کہ :-

سنت کتاب اللہ پر فیصلہ کُن حیثیت رکھتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۰) (۳) ظنی الثبوت اور قطعی الدلالت وہ تمام حدیثیں جن کا قول و فعل رسول ہونا ظنی ہے مگر ان کا مدلول و مفہوم قطعی اور معنی و مراد یقینی ہیں

(۴) ظنی الثبوت اور قطعی الدلالت وہ تمام حدیثیں جن کا قول و فعل رسول ہونا تو ظنی ہے مگر معنی و مفہوم قطعی ہیں۔

ان شرعی دلائل میں فرق مراتب کرتے وقت "قوت" کے اعتبار سے اصل چیز ثبوت کو قرار دیا جائے گا جس دلیل کا ثبوت قطعی اور یقینی ہے خواہ اس کی دلالت قطعی ہو خواہ ظنی وہ اس دلیل سے مقدم اور قوی ہو گی جس کا ثبوت ظنی ہے خواہ دلالت قطعی ہو خواہ ظنی ہو۔

لہٰذا چونکہ قرآن کریم کل کا کل قطعی ہے اور حدیثیں — متواتر کے علاوہ — سب ظنی ہیں اس لئے حجت اور دلیل ہونے کے اعتبار سے قرآن عظیم کا درجہ اور مرتبہ مقدم اور اوّلی ہو گا اور سنت و حدیث کا درجہ مؤخر اور ثانوی ہو گا بالفاظ دیگر قرآن اور سنت و حدیث مرتبہ کے اعتبار سے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ ۱۲ محشی

سنت کے فیصلہ کن ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ :-

سنت کتاب اللہ کے مطلق احکام کو مقید اور عام احکام کو خاص کر دیتی ہے اسی لئے سنت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور ظاہر کتاب کو چھوڑ دیا جاتا ہے اسی طرح بعض مقامات پر نص کتاب (قرآن کے صریح الفاظ) میں دو یا اس سے زیادہ مفہوموں کا احتمال ہوتا ہے تو سنت ان میں سے کسی ایک مفہوم کو متعین کر دیتی ہے تو اسی پر عمل کیا جاتا ہے اور کتاب اللہ کے مقتضیٰ (یعنے دوسرے مفہوم) کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دیکھئے سرقہ کی آیت (فاقطعوا ایدیہما) کا فیصلہ تو یہ ہے کہ ہر چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے لیکن سنت اس میں تخصیص کرتی ہے اور بتلاتی ہے کہ صرف اس چور کا ہاتھ کاٹا جائے جو بقدر نصاب؛ اور محفوظ مال کی چوری کرے نیز آیت سرقہ سے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہاتھ کا مصداق انگلیوں سے کہنیوں تک کا حصہ ہے (تو حد سرقہ میں کہنیوں تک ہاتھ کاٹنے چاہیں) لیکن اس کے بجائے سنت فیصلہ کرتی ہے کہ پہونچوں تک چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اسی طرح زکوٰۃ سے متعلق آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے اموال کی زکوٰۃ ادا کرنی فرض ہے لیکن سنت بتلاتی ہے کہ صرف اموال نامیہ (نمو پذیر اموال) پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اسی طرح قرآن کریم میں محرمات (وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے) کے بیان فرمانے کے بعد ارشاد ہے :-

احل لکم ما وراء ذلک — ان کے علاوہ باقی عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لئے حلال ہے

لیکن سنت نے اس آیت کے عموم میں بھی تخصیص کر دی اور بتلایا کہ اپنی بیوی کی پھوپی یا خالہ سے نکاح کرنا بھی حرام ہے (حالانکہ بظاہر یہ ماوراء کے تحت داخل ہیں ان سے نکاح حلال ہونا چاہیے) اس قسم کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

لہٰذا سنت کی یہ (فیصلہ کن) شان چاہتی ہے کہ سنت کو کتاب اللہ پر تقدم اور اولیت حاصل ہو ورنہ کم از کم سنت کا درجہ کتاب کے برابر تو ضرور ہی ہونا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی تمام صورتوں میں سنت (کا یہ فیصلہ کتاب اللہ کے علاوہ یا اس پر مستزاد کوئی نیا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ دراصل سنت) اللہ تعالیٰ کی مراد اور منشاء ہی کو بیان کرتی ہے چنانچہ سرقہ کی آیت میں سنت بتلاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا پہونچوں تک ہاتھ کاٹنا ہے نہ کہ کہنیوں تک۔ اسی طرح سنت بتلاتی ہے کہ چور سے مراد وہ چور

ہے جو محفوظ مال چرائے جس کی مقدار نصاب تک پہونچتی ہو۔ لہٰذا اس صورت میں سنت نے کوئی نیا حکم (جو کتاب میں نہ ہو) ثابت نہیں کیا بلکہ سنت نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ جو حکم قرآن میں مذکور تھا اس کی تفصیل کردی یا جس حکم میں چند احتمال ہو سکتے تھے ان میں سے ایک مطلوب احتمال کی تعیین کردی۔ یہی مطلب ہے بعض علما کے مذکورہ بالا قول کا کہ: سنت کتاب اللہ پر فیصلہ کرتی ہے یعنے کتاب اللہ کا مطلب اور منشا بتلاتی ہے[1] نہ یہ کہ سنت کتاب اللہ پر مقدم ہے۔

دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

ہمارے اس دعوے پر یہ بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ: معاذ بن جبل کی حدیث کے صحیح ہونے کے بارے میں خود محدثین نے بڑی نکتہ چینی اور سخت تنقید کی ہے چنانچہ امام ترمذی فرماتے ہیں: معاذ بن جبل کی یہ حدیث ہمارے پاس صرف ایک ہی سند سے پہونچی ہے اور وہ بھی سند متصل نہیں ہے۔" محدث جوزجانی نے تو اس حدیث کو "موضوعات" میں شمار کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث باطل ہے ایسی کمزور سند سے مروی ہے کہ اس پر شریعت کے ایک اساسی اصول (یعنے سنت کا مرتبہ و مقام) کے بارے میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔"

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ (ہمارے دعوے کی بنیاد صرف حضرت معاذ کی حدیث پر نہیں ہے بلکہ) حضرت ابو بکر، عمر، ابن مسعود اور ابن عباس وغیرہ اکابر صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے تعامل اور ان سے ثابت شدہ روایات پر نیز ان کے بعد تمام علمائے سلف کے تعامل پر ہمارے دعوے کا مدار ہے یہ متواتر و متوارث تعامل ہمارے دعوے کے ثبوت کے لئے بہت کافی و وافی ہے۔

بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ احادیث آحاد کے ثبوت کے بارے میں جو تنقیدیں اور نکتہ چینیاں ان کے ظنی ہونے کی بنا پر کی گئی ہیں ان کے پیش نظر تو ثبوت کے لحاظ سے یقیناً سنت کا مرتبہ کتاب اللہ کے بعد

---

[1] اور یہ اس لئے کہ صاحب سنت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے خود اپنے کلام کا مطلب تبلایا ہے ارشاد ہے: ثم ان علینا بیانہ ۔ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس قرآن کا مطلب بیان کرنا۔ تو اللہ نے اپنے کلام کا مطلب رسول کو بتلایا رسول نے اُمت کو بتلایا اسی لئے قرآن عظیم کی آیت یا کلمہ کا مطلب وہی ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول یا فعل یا بیان سکوتی سے تبلایا ہے۔ ۱۲ محشی

اور ثانوی ہو جاتا ہے لیکن اجتہاد و استنباطِ احکام[۱] کے نقطۂ نظر سے اور نصوص قرآن کے معانی و مصادیق سمجھنے کے اعتبار سے قرآن کی آیات کے تحت احکام شرعیہ نافذ کرنے سے پہلے، سنت و حدیث کی طرف رجوع کرنا ازبس ضروری ہے کیونکہ کتاب اللہ کی آیات کا مفہوم بیان کرتے وقت یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ مبادا سنت نے ان میں تخصیص یا تقیید کی ہو (یعنے قرآن کے کسی عام حکم کو خاص بتلایا ہو یا مطلق حکم میں کسی قید کا اضافہ کیا ہو) یا اور کوئی اسی قسم کی (خلاف ظاہر) وضاحت یا تشریح کی ہو (تو اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ اطاعت رسول فرض ہے)

لہٰذا اس اجتہادی ضرورت کے لحاظ سے سنت قرآن کے ساتھ برابری کا درجہ رکھتی ہے یعنے ایک مجتہد کو (استنباط احکام کے وقت) کتاب و سنت دونوں کی نصوص (صریح عبارات) کا باہم مقابلہ کرنا ایک

---

[۱] علاوہ ازیں اس میں تو شک نہیں کہ قوتِ ثبوت کے اعتبار سے تو قرآن کریم کل کا کل متواتر اور قطعی ہے اور احکام شرعیہ کا ماخذ اول ہے اور متواتر کے علاوہ عام احادیث ظنی ہیں اور احکام شرعیہ کا ماخذ دوم ہیں لیکن وجود اور نفاذ احکام شرعیہ کے اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو صورت حال اس کے برعکس ہے یعنے سنت و حدیث احکام شرعیہ کا ماخذ اول ہیں قرآن کریم نفاذ کے بعد یا ان کی توثیق و تصدیق کرتا ہے یا ان میں ترمیم و اصلاح، یا کوئی حکم مستانف (نیا حکم) بتلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ تشریعی زندگی اور تنفیذ احکام شرعیہ کا تاریخی جائزہ لیجئے آپ دیکھیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی متلو یعنی نزول قرآن کا انتظار کئے بغیر احکام شرعیہ نافذ کئے ہیں اور امت نے اُن پر عمل کیا ہے اس کے بعد قرآن عظیم کی آیات ان کی تصدیق و توثیق یا ترمیم و اصلاح کی غرض سے یا کسی نئے حکم کے بیان کرنے کی غرض سے نازل ہوئی ہیں بطور مثال ایک طہارت اور نماز ہی کے احکام کو لے لیجئے جس دن سے "لیلۃ الاسراء" کے بعد پنجوقتہ نمازیں اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر فرض ہوئی ہیں اُمت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی تعلیمات کے مطابق پانچوں نمازیں مقررہ اوقات پر با طہارت اور با جماعت ادا کی ہیں طہارت کے احکام وضو اور غسل وغیرہ سے متعلق آیات مدینہ میں جا کر سورہ نساء اور سورہ مائدہ میں سنہ کے بعد نازل ہوئی ہیں مگر نہ آپ نے ان احکام کے نافذ کرنے میں ان آیات قرآن کے نزول کا انتظار کیا اور نہ اُمت نے اُن پر عمل کرنے میں۔ اکثر و بیشتر احکام شرعیہ کے نفاذ کی صورت حال یہی ہے خواہ عبادات سے متعلق ہوں خواہ معاملات سے لہٰذا ثابت ہوا کہ احکام شرعیہ اور ان کے نفاذ کا اصل ماخذ سنت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(باقی صفحہ ۲۶۵ پر)

کو دوسرے کے مطابق و موافق بنانا اگر تعارض ہو، تو اس کو دور کر کے جمع کرنے کی صورت نکالنا از بس ضروری ہے یہ وہ فیصلہ کن بات ہے جس کے بارے میں ان لوگوں کے نزدیک بھی مطلق اختلاف نہیں جو سنت اور حدیث کے حجت (اور دلیل شرعی) ہونے کے قائل ہیں

کیا تنہا سنت، مستقل طور پر قوانین شرعیہ کا ماخذ بن سکتی ہے

علماء دین کے درمیان اس امر میں تو مطلق و نزاع نہیں ہے کہ سنت و حدیث کی تین قسمیں ہیں۔

اول: وہ احادیث جو قرآن کے بالکل موافق اور مؤید ہیں اجمال اور تفصیل دونوں کے اعتبار سے قرآن کے مطابق ہیں۔ اس قسم کی مثال میں وہ احادیث پیش کی جاسکتی ہیں جن میں محض نماز، زکوٰۃ، حج اور روزوں کے فرض ہونے کا ذکر آیا ہے مگر ان کے شرائط، ارکان وغیرہ تفصیلات کا ذکر مطلق نہیں ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث:۔

> اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم ہے (ایک) اس امر کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں (دوسرے) نماز کو قائم کرنا (تیسرے) زکوٰۃ ادا کرنا (چوتھے) ماہ رمضان کے روزے رکھنا (پانچویں) جس شخص میں (مالی اور بدنی) قدرت و طاقت ہو اس کو بیت اللہ کا حج کرنا۔

یہ حدیث قرآن کریم کی مذکورۂ ذیل آیات کے بالکل موافق و مطابق ہے:

(۱) واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ (البقرۃ ۸۳) — اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو

(۲) یاأیہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم (البقرہ ۱۸۳) — اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے

(۳) وللہ علی الناس حج البیت — اور لوگوں کے ذمہ اللہ کے لئے بیت اللہ کا حج فرض ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۶۴) تعلیمات میں قرآن ان کی توثیق و تصدیق کرتا ہے یا ان میں ترمیم و اصلاح کرتا ہے یا کوئی نیا حکم بیان کر دیتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے مقدمہ معارف السنن تالیف شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، مطبوعہ (عربی و اردو)۔ ۱۲ المحشی

من استطاع الیہ سبیلا (آل عمران ۹۷)	ہر اُس شخص پر جو وہاں جانے کی (جانی اور مالی) استطاعت رکھتا ہو (مالی قدرت بھی ہو اور جسمانی طاقت بھی)

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث:۔

لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب من نفسہ۔	کسی مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کا مال (لینا) حلال نہیں بجز اس کے کہ وہ اپنی خوشی سے دے۔

قرآن کریم کی آیت کریمہ ذیل کے مطابق و موافق ہے:

یاایھا الذین آمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم۔ (النساء ۱۹)	اے ایمان والو! تم اپنے مال آپس میں ناحق طریق پر مت کھاؤ بجز اس کے کہ باہمی رضامندی سے (جائز) تجارت ہو۔

دوم! وہ احادیث جو قرآن کریم کے احکام کی وضاحت کرتی ہیں یعنے ان حدیثوں کے ذریعہ قرآن حکیم کے مطلق احکام کا مقید ہونا، مجمل احکام کی تفصیل اور عام احکام میں تخصیص معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مثال وہ تمام احادیث ہیں جو نماز، روزے، زکوٰۃ، حج، بیع و شرا وغیرہ معاملات سے متعلق قرآن کریم کی مجمل یا مبہم آیات کی تفصیلات بتلاتی ہیں یا وضاحت کرتی ہیں۔

اکثر و بیشتر احادیث اسی قسم کے ذیل میں آتی ہیں۔

سوم! وہ احادیث جو کسی ایسے حکم کو بیان کرتی ہیں جس کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے یعنی قرآن نہ اس حکم کو واجب کرتا ہے نہ اس کی نفی کرتا ہے مثلاً وہ حدیثیں جن سے بیوی کے نکاح میں ہوتے اس کی پھوپی یا خالہ سے نکاح کرنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے یا وہ حدیثیں جن سے حق شفعہ کے احکام، شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ زانی کو شہر بدر کرنے کے احکام، نانی کی میراث کے احکام ثابت ہوتے ہیں (قرآن حکیم ان کے ذکر سے بالکل خاموش ہے)

یہ پہلی دونوں قسموں کے بارے میں علماء کے درمیان مطلق اختلاف نہیں یعنے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دونوں قسم کی حدیثیں موجود ہیں، ان کے احکام ثابت اور مسلّم ہیں اور یہ کہ اکثر و بیشتر احادیث انہی دو قسموں کی ہیں۔ اختلاف صرف تیسری قسم کی حدیثوں کے بارے میں ہے یعنے جن سے وہ احکام ثابت ہوتے ہیں جن سے قرآن حکیم نفیاً یا اثباتاً بالکل خاموش ہے اور اختلاف اس امر میں ہے کہ ان احادیث

سے یہ احکام کیونکر ثابت ہوتے ہیں آیا صرف ان حدیثوں ہی سے مستقل طور پر یہ احکام ثابت ہوتے ہیں ؟ (اور ان کا ماخذ یہ احادیث ہی ہیں) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا یہ احادیث قرآن کریم کی کسی نہ کسی صریح آیت کے تحت داخل ہیں اگرچہ تاویل کے ذریعہ ہی کیوں نہ داخل ہوں (اور اس لحاظ سے ان کا ماخذ بھی قرآن ہی ہے)

الموافقات کے مصنف اور دوسرے مصنفین نے دوسری صورت کو اختیار کیا ہے (کہ یہ حدیثیں بھی کسی نہ کسی صریح آیت کے تحت داخل ہیں اسی بنا پر ان سے یہ احکام ثابت ہوتے ہیں۔ گویا مصدر تشریع قرآن ہی ہے) لیکن جمہور علماء دین نے پہلا مسلک اختیار کیا ہے (کہ یہ احکام تنہا ان حدیثوں سے ہی ثابت ہیں اور وہی ان احکام کا ماخذ ہیں)

ذیل میں ہم اول امام شافعیؒ کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں اس کے بعد اس اختلاف کی حقیقت پر روشنی ڈالیں گے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ (الرسالہ صفحہ ۹۱ پر) فرماتے ہیں :۔

اہل علم میں تو ہمارے علم میں کوئی بھی اس کا مخالف نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں اور حدیثیں تین قسم کی ہیں ان میں سے دو قسم کی حدیثوں کے بارے میں تو اہل علم کا اتفاق ہے لیکن تیسری قسم کی حدیثوں کے بارے میں اتفاق بھی ہے اور اختلاف بھی۔

(۱) پہلی قسم ! وہ حدیثیں جن میں ـــ اللہ جل شانہٗ نے کسی حکم کے بارے میں کتاب (قرآن) کی جو نص (صریح آیت) نازل فرمائی ہے ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نص (صریح آیت) کے بالکل موافق و مطابق حکم بیان فرمایا ہے۔

(۲) دوسری قسم ! وہ حدیثیں جن میں ـــ اللہ جل شانہٗ نے جو مجمل آیت نازل فرمائی ہے ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی جانب سے اس مجمل آیت کی (تفصیل بیان کی ہے اور) مراد بتلائی ہے۔

ان دو قسم کی حدیثوں کے بارے میں تو اہل علم کے درمیان مطلق اختلاف نہیں (کہ یہ موجود بھی ہیں اور حجت بھی ہیں لیکن ماخذ ان احکام کا قرآن ہوگا نہ کہ احادیث)

(۳) تیسری قسم : وہ حدیثیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا حکم بیان فرمایا ہے جس کے متعلق کتاب اللہ میں کوئی نص (صریح حکم) موجود نہیں ہے۔

(احادیث کی اس قسم کے بارے میں اتفاق تو اس پر ہے کہ ایسی حدیثیں موجود ہیں جن کے احکام سے قرآن نے سکوت کیا ہے اختلاف اس میں ہے کہ یہ حدیثیں بذات خود حجت ہیں یا نہیں چنانچہ :-

(۱) بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے اور اس کے علم میں پہلے سے یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ آپ کو اپنی مرضی (کے مطابق احکام نافذ کرنے) کی توفیق دے گا اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا ہے کہ جس مسئلہ میں کتاب اللہ میں کوئی نص (صریح آیت) موجود نہ ہو (نہ نفیاً نہ اثباتاً) اس کے بارے میں آپ خود حکم[۱] نافذ فرمائیں۔

(۲) کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم بھی نافذ فرمایا ہے اس کی اصل کتاب اللہ میں ضرور موجود ہے (اور اسی اصل کے تحت آپ نے وہ حکم جاری فرمایا ہے) چنانچہ اسی اصول کے تحت پانچ نمازیں اور ان کی رکعات کی تعداد آپ نے مقرر فرمائی ہے، فرض نماز جس کا ذکر مجمل طور پر قرآن میں موجود ہے آپ نے تفصیلی طور پر (قولاً وفعلاً) اس پر عمل کر کے دکھلایا ہے۔ اسی قبیل سے ہیں بیوع وغیرہ معاملات کے وہ تمام شرعی احکام جو آپ نے احادیث میں تفصیلی طور پر بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تو مجمل طور پر حکم فرمادیا :

ولا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل (النساء ۱۹)	تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریق پر مت کھاؤ۔

اسی طرح حکم فرمایا :-

---

[۱] اسی سلسلہ میں ارشاد ہے فاحکم بما اراک اللہ۔ ۱۲ محشی

احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ (البقرۃ ۲۷۵) — اللہ نے بیع (خرید و فروخت) کو حلال کیا ہے اور سود (کے لین دین) کو حرام کیا ہے۔

لہذا (معاملات کے سلسلہ میں) جو چیزیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں حلال یا حرام فرمائی ہیں وہ (انہی دونوں آیتوں کے تحت) اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی حلال یا حرام فرمائی ہیں (نہ کہ اپنی طرف سے) جیسے نماز کی تمام تفصیلات جو آپ نے (قولی اور فعلی) احادیث میں بیان فرمائی ہیں وہ (دراصل اللہ کی جانب سے ہی بیان فرمائی ہیں (نہ کہ اپنی رائے سے)

(۳) بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے احکام (جو کتاب اللہ میں مذکور نہیں ہیں وہ) آپ کے پاس اللہ کے پیغام (وحی غیر متلو) کے ذریعہ آئے ہیں لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تمام حدیثوں میں خدا کے حکم کے مطابق ہی ان احکام کو بیان فرمایا ہے۔

(۴) بعض علما کہتے ہیں کہ:۔ اس قسم کے جو احکام بھی آپ نے جاری فرمائے ہیں (جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے) وہ (فرشتہ کے واسطہ کے بغیر) آپ کے دل میں منجانب اللہ القاء ہوتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (قولی و فعلی) سنت وہی حکمت ہے جو آپ کے دل میں اللہ کی جانب سے ڈالی جاتی تھی اس لحاظ سے سنت اسی کا نام ہے جس کا القا آپ کے دل میں اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔

امام شافعی کے اس بیان سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان کے نزدیک احادیث کی تیسری قسم کے بارے میں جو اختلاف ہے اس اختلاف سے اس قسم کی احادیث کے وجود کے بارے میں اختلاف مراد نہیں (وجود تو سب کے نزدیک مسلم ہے) بلکہ ان احادیث میں مذکورہ احکام کے ماخذ کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا سنت نے بذات خود ان احکام شرعیہ کو نافذ کیا ہے جیسا کہ پہلے، تیسرے اور چوتھے گروہ کی رائے ہے یا سنت قرآن ہی کی نصوص کے تحت احکام و قوانین نافذ کرتی ہے (از خود نہیں) جیسا کہ دوسرے

گروہ کی رائے ہے (لہٰذا اب تنقیح طلب صرف دو نظریئے ہیں (۱) ایک یہ کہ سنت خود مستقل طور پر احکام شرعیہ نافذ کرسکتی ہے (۲) دوسرے یہ کہ سنت جو بھی احکام نافذ کرتی ہے نصوص کتاب کے تحت نافذ کرتی ہے از خود نہیں (بالفاظ دیگر سنت مستقل طور پر احکام شرعیہ کا ماخذ ہے یا نہیں)

سنت کو مستقل طور پر احکام شرعیہ کا ماخذ ماننے والوں کے دلائل

یہ حضرات کہتے ہیں کہ :-

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم سب یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کی خطا، غلطی اور لغزش سے محفوظ اور معصوم تھے تو آپ کی سنت کو احکام شرعیہ کے نافذ کرنے میں مستقل کہنے اور ماننے میں از روئے عقل کوئی مانع نہیں اللہ پاک کو کلی طور پر اختیار ہے کہ وہ اپنے رسول کو جس طریق پر بھی ہو لوگوں تک اپنے احکام پہونچانے کا اختیار دیدے خواہ آسمانی کتاب (آیات قرآن) کے ذریعہ خواہ کتاب کے بغیر (وحی غیر متلو کے ذریعہ یا القاء فی القلب کے ذریعہ) تو جبکہ یہ عقلاً جائز بھی ہے اور سب مانتے ہیں کہ ایسا ہوا بھی ہے تو پھر ہم اس کے قائل کیوں نہ ہوں (اور کیونکر نہ مانیں کہ کتاب کے بعد سنت بھی احکام شرعیہ کی تنفیذ کا مستقل ماخذ ہے)۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی وہ تمام صریح آیات جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اوامر ونواہی کی طاعت و پیروی کا فرض ہونا ثابت ہے وہ سب کی سب عام ہیں ان میں احکام قرآن کی وضاحت یا تاکید کرنے والی حدیثوں میں یا مستقل احکام پر مشتمل حدیثوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں (کہ اول کی اطاعت کی جائے دوسری کی نہیں بلکہ تمام اوامر ونواہی پر مشتمل حدیثوں کے احکام کی اطاعت کو فرض قرار دیتی ہیں) بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ بعض آیات سے تو سنت کا تنفیذ احکام کے باب میں مستقل ہونا ہی ثابت ہوتا ہے مثلاً ارشاد ہے:

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ	اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت
واطیعوا الرسول واولی الامر منکم	کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے ارباب اقتدار و حکمران
فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ	ہیں۔ پس اگر کسی چیز کے بارے میں تمہارے درمیان
والرسول ان کنتم تومنون باللہ	اختلاف و نزاع ہو جائے تو اس (کے فیصلہ) کو اللہ کی
والیوم الاخر	طرف لوٹاؤ اور رسول کی طرف (جو وہ فیصلہ دیں اس کو قبول
(النساء ۵۹)	کرو) اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں اللہ کی طرف لوٹانے سے مراد یقیناً اللہ کی کتاب کی طرف لوٹانا ہے اور رسول کی طرف لوٹانے سے مراد — آپ کی وفات کے بعد آپ کی (قولی یا فعلی) سنت کی طرف لوٹانا ہے[۱]

نیز ارشاد ہے :-

واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واحذروا	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی
(المائدہ ۵۹)	مخالفت و نافرمانی سے) ڈرتے رہو۔

اور ان آیات کے علاوہ وہ تمام آیات (بھی اسی کی موید ہیں) جن میں رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ وابستہ کیا ہے تو ان تمام آیات سے یہی ثابت ہے کہ جیسے اللہ کے ان اوامر و نواہی کی اطاعت فرض ہے جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرمائے ہیں ایسے ہی رسول کے ان اوامر و نواہی کی اطاعت بھی فرض ہے جو رسول نے اپنی قولی یا فعلی سنتوں میں بیان فرمائے ہیں اور قرآن میں ان کا ذکر نہیں ہے اس لئے کہ اگر وہ قرآن میں مذکور رہوں تو ان کی اطاعت تو اللہ کی اطاعت ہوگی نہ کہ رسول کی۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فلیحذر الذین یخالفون	پس جو لوگ اس (رسول) کی مخالفت کرتے ہیں ان کو
عن امرہ ان تصیبہم فتنۃ الخ	اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ وہ کسی فتنہ (دنیوی عذاب)
(النور ۶۳)	میں نہ مبتلا ہو جائیں۔ (الیٰ آخرہ)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ کچھ خاص چیزیں ایسی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں ان میں آپ کی اطاعت فرض (اور آپ کی مخالفت موجب عذاب) ہے اور یہ وہی احکام ہیں جو صرف سنت و حدیث میں موجود ہیں قرآن میں ان کا ذکر نہیں (اگر وہ قرآن میں مذکور رہتے تو ان کی

---

[۱] یعنی تمام اختلافی امور و نزاعات کا فیصلہ کتاب اور سنت سے کرو جس کی رائے کی تائید کتاب و سنت سے ہوتی ہو وہی حق ہے اسی کو تسلیم کرو معلوم ہوا کہ کتاب کی طرح سنت بھی احکام شرعیہ کا مستقل ماخذ اور حق و باطل کا فیصلہ کرنے والی ہے اسی لئے اطیعوا اللہ والرسول نہیں فرمایا بلکہ واطیعوا الرسول کو الگ اور مستقل طور پر بیان فرمایا۔ ۱۲ محشی

مخالفت تو قرآن کی مخالفت ہوتی نہ کہ رسول کی، اللہ جل شانہ کا فرمان ہے :۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء ۸۰)	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا۔ (الحشر ۷)	جو (حکم) رسول تم کو دے اس کو لے لو (قبول کرو) اور جس (چیز) سے تم کو منع کرے اس سے رک جاؤ (باز آجاؤ)

نیز ارشاد ہے :۔

فلا وربک لایومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (النساء ۶۵)	پس نہیں قسم ہے تمہارے رب کی! وہ ایمان والے نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے آپس کے جھگڑوں میں تم کو حکم نہ بنالیں اور پھر تمہارے فیصلوں سے کسی قسم کی تنگی (ناگواری) بھی اپنے دلوں میں محسوس نہ کریں اور دل و جان سے تسلیم کرلیں۔

یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی ہے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرہ کے برساتی نالے سے انصاری سے پہلے، حضرت زبیر کو اپنے کھیتوں میں پانی دینے کے نزاع میں حضرت زبیر کے حق میں فیصلہ دیا ہے (اور انصاری نے نہیں مانا ہے)

اسی طرح قرآن عظیم کے .... وہ تمام دلائل (بھی سنت وحدیث کے مستقل حجت ہونے کے موئید ہیں) جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی لائیں (یعنے بتلائیں) اور جس چیز کا بھی امر فرمائیں اور جس چیز سے بھی منع فرمائیں وہ سب تعمیل حکم کے اعتبار سے قرآن ہی کے حکم میں ہیں (ان سب احکام کی اطاعت یکساں فرض ہے)! اس کا لازمی تقاضا اور نتیجہ یہ ہے کہ یہ وہی احکام ہیں جو (سنت وحدیث میں مذکور ہیں اور) احکام قرآن کے علاوہ اور اس پر مستزاد ہیں۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ ایسی بہت سی احادیث موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے۔

(۱) کہ شریعت کی تشکیل دو بنیادی چیزوں سے ہوئی ہے ایک کتاب دوسرے سنت (لہٰذا

سنت کتاب کے علاوہ ہونی چاہیئے)

(۲) نیز یہ کہ سنت و حدیث میں بہت سی ایسی چیزیں (احکام) موجود ہیں جو کتاب میں مذکور نہیں ہیں۔

(۳) نیز یہ کہ سنت و حدیث سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں ان کو اسی طرح قبول کرنا واجب ہے جیسے کتاب سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں، ان کو قبول کیا جاتا ہے

ان حدیثوں میں سے ایک حدیث یہ ہے :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قریب ہے کہ (یعنے کچھ بعید نہیں کہ) تم میں سے بعض لوگ یہ کہیں کہ: یہ اللہ کی کتاب موجود ہے جو اس میں حلال ہے ہم اس کو حلال کہیں گے اور جو اس میں حرام ہے ہم اس کو حرام کہیں گے (حدیث و سنت کی ہمیں حاجت نہیں) یاد رکھو! جس شخص کے پاس بھی میری کوئی حدیث پہونچی اور اس نے اس کو نہ مانا اور جھٹلایا تو اس نے اللہ اور رسول کو بھی جھوٹا کہا اور اس شخص (یعنے راوی) کو بھی جھوٹا کہا جس نے وہ حدیث اسکے سامنے بیان کی (۱)

ہم اس سے پہلے بھی ایک حدیث بیان کر چکے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ:

عنقریب تم میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تخت پر تکیہ لگا کر بیٹھیں گے اور کہیں گے .... آخر تک۔

یہ احادیث ثابت کرتی ہیں کہ سنت و حدیث میں ایسے احکام موجود ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی مذکورہ ذیل حدیث:

ہمارے پاس تو صرف اللہ کی کتاب ہے یا وہ فہم و بصیرت ہے جو اللہ کی جانب سے کسی مسلمان آدمی کو عطا ہوتی ہے اور وہ احکام ہیں جو ہمارے اس صحیفہ (یادداشت) میں لکھے ہوئے ہیں (اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صحیفہ کے احکام کتاب اللہ میں نہیں ہیں بلکہ اس پر مستزاد ہیں)

---

(۱) اس حدیث کو حافظ طبرانی نے اپنی کتاب اوسط میں حضرت جابرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رض کی (مذکورہ سابق) حدیث میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یمن بھیجتے وقت) معاذ سے دریافت فرمایا: تم کس چیز (دلیل) سے فیصلے کروگے؟ معاذ نے جواب دیا: کتاب اللہ سے آپ نے فرمایا: اگر تمہیں کتاب اللہ میں (کوئی دلیل) نہ ملی؟ تو معاذ نے عرض کیا: تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت سے"

یہ حدیث تو آفتاب نیمروز سے بھی زیادہ روشن دلیل ہے اس امر کی کہ سنت وحدیث میں ایسے احکام موجود ہیں (اور وہ حجت ہیں) جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ یہی مطلب ہے اس مقولہ کا جو بعض علما سے منقول ہے کہ:-

کتاب اللہ نے سنت وحدیث کے لئے جگہ چھوڑی ہے اور سنت وحدیث نے قرآن کے لیے جگہ محفوظ رکھی ہے (۱)

ان لوگوں کے دلائل جو سنت وحدیث کے مستقل حجت ہونے کے منکر ہیں

ان علما کے بالمقابل وہ علما جو سنت وحدیث کے مستقل حجت ہونے کے منکر ہیں اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ امام شاطبی کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:-

حدیث وسنت اپنے معنی ومفہوم کے لحاظ سے کتاب اللہ کی طرف ہی راجع ہیں (یعنی حدیث قرآن ہی کی ترجمان ہے) چنانچہ حدیث یا قرآن کے اجمال کی تفصیل کرتی ہے یا ابہام کی وضاحت کرتی ہے یا اختصار کی تفصیل بیان کرتی ہے اور یہ صرف اس لئے ہے کہ حدیث وسنت قرآن حکیم ہی کی ترجمان ہے حدیث وسنت کے اسی مرتبہ ومقام کو آیت کریمہ ذیل بتلاتی ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم	ہم نے یہ ذکر (قرآن) تم پر اسی لئے اتارا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اس چیز (دین وشریعت) کی وضاحت کردو جو
(النحل ۴۴)	ان کے لئے اتاری گئی ہے

---

(۱) الموافقات ج ۴ ص ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۲

اسی لئے تم کو حدیث وسنت میں کوئی ایسا حکم نہیں ملے گا جس کے مفہوم کو قرآن عظیم نے اجمالی یا تفصیلی طور پر نہ بتلایا ہو۔

نیز وہ تمام دلائل جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن عظیم اسلامی شریعت کا اساسی قانون اور شرع محمدی کا سرچشمہ ہے ان سے بھی اسی پر روشنی پڑتی ہے (کہ قرآن اصل ہے اور حدیث وسنت اس کی فرع ہیں)

اس لئے کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

وانک لعلی خلق عظیم (القلم ۴) اور تم بیشک عظیم اخلاق کے حامل ہو

اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں فرمایا: "آپ کا اخلاق قرآن ہے" (یعنے آپ سرتا پا قرآن ہیں) اور (کسی سائل کے جواب میں) صدیقہؓ نے آپ کے اخلاق کے بارے میں صرف اسی بیان پر اکتفا فرمایا۔

اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اخلاق وافعال اور سکوتی بیان سب قرآن تھا کیونکہ انسان کے اخلاق انہی تین شعبوں (اقوال وافعال اور بیان سکوتی) کے اندر محدود ومنحصر ہوتے ہیں۔

نیز اللہ جل شانہ نے قرآن عظیم کو "ہر چیز" کی وضاحت کرنے والا (تبیانا لکل شئ) بتلایا ہے تو اس (ہر چیز کے عموم) سے لازم آتا ہے کہ سنت بھی قرآن عظیم میں فی الجملہ (کسی نہ کسی صورت میں) موجود ہے اس لئے کہ کتاب اللہ کے موضوعات میں اہم ترین موضوع اوامر ونواھی ہیں (خواہ قرآن میں ہوں خواہ سنت وحدیث میں)۔

اسی طرح اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

ما فرطنا فی الکتاب من شئ (الانعام ۳۸) ہم نے کتاب (قرآن) میں کسی بھی چیز کو نہیں چھوڑا ہے (سب کچھ بیان کر دیا ہے)[1]

---

[1] یہ ہمہ گیر دعوی جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جبکہ سنت وحدیث کو بھی کتاب کی ترجمانی کی بنا پر کتاب ہی کہا جائے نہ صرف یہ بلکہ کتاب وسنت سے استنباط یا اس پر قیاس کو بھی کتاب وسنت پر مبنی ہونے کی وجہ سے کتاب ہی کہا جائے ۱۲ مجتبی

نیز اللہ جل جلالہٗ کا ارشاد ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدۃ ۳)	آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کمل کردیا اور اپنی نعمت پوری کردی اور اسلام کو تمہارے لئے پسندیدہ دین قرار دیدیا۔

اس تکمیل وتتمیم سے مراد قرآن عظیم کو نازل فرمادینا ہی ہے[۱] لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں حدیث وسنت بحیثیت مجموعی جو کچھ قرآن میں ہے اسی کا بیان اور ترجمان ہوئی۔ یہی مطلب ہے سنت کے قرآن کی طرف راجع ہونے کا۔ علاوہ ازیں احکام شرعیہ کے مکمل استقرا اور جائزہ سے یہی ثابت ہوتا ہے (کہ سنت قرآن ہی کا بیان ہے کوئی علحدہ اور مستقل چیز نہیں ہے)

ان علماء نے پہلے فریق کے (جو سنت وحدیث کو مستقل حجت مانتے ہیں) دلائل کے جوابات بھی دیئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ سنت وحدیث کتاب اللہ کی تفسیر وضاحت اور ترجمانی کرتی ہے (کوئی مستقل چیز نہیں ہے) باقی (اطاعت رسول سے متعلق جو آیتیں آپ نے نقل کی ہیں جن سے اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت بھی فرض معلوم ہوتی ہے تو اس اطاعت سے، قرآن کی تفسیر وتوضیح میں رسول کی اطاعت مراد ہے (یعنے رسول قرآن کی جو تفسیر وتشریح کریں اور مراد بتلائیں اس میں رسول کی اطاعت کرو) چنانچہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کے مطابق (قرآن پر) عمل کیا اس نے اللہ کی بھی اطاعت کی یعنے جو اس کے کلام کا منشا ومراد ہے اس کو تسلیم کیا اور اسی پر عمل کیا اور اللہ کے رسول کی بھی اطاعت کی کہ اس کے بیان کو تسلیم کیا اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا اور اگر اس نے بیان رسول کے خلاف عمل کیا تو اس نے اللہ کی بھی نافرمانی کی کہ اس کی مراد ومنشاء

---

[۱] لہٰذا قرآن عظیم کو نازل فرما دینے سے تکمیل دین بھی جب ہی متصور ہوسکتی ہے جبکہ حدیث وسنت کے مجموعہ کو بھی قرآن کے ساتھ شامل کیا جائے اور قرآن ہی کہا جائے علیٰ ہٰذا کتاب وسنت پر مبنی استنباط واجتہاد کو اور قیاس کو بھی قرآن ہی کے تحت داخل اور قرآن کہا جائے اور اگر ان کو قرآن سے مغائر کہا گیا تو صرف قرآن نازل کردینے سے دین کی تکمیل کا دعویٰ صحیح نہ ہوگا۔ ۱۲ محشی

کے خلاف عمل کیا اور رسول کی بھی نافرمانی کی کہ اس کے بیان کو نہیں مانا لہٰذا دونوں اطاعتوں کے الگ الگ ہونے سے مطاع (جس چیز میں اطاعت کی گئی ہے اس کا الگ الگ اور جدا ہونا لازم نہیں آتا (بلکہ وہ جس کی اطاعت کی گئی ہے وہ ایک ہی ہے یعنے اللہ کا کلام اس حیثیت سے کہ اس کی مراد رسول نے بیان کی ہے اس کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے) ایسی صورت میں یہ اطاعتِ رسول کی آیتیں اس امر کی دلیل نہیں بن سکتیں کہ جو (احکام) سنت و حدیث میں موجود ہیں وہ کتاب اللہ میں نہیں ہیں۔

اور ان علما نے حضرت زبیرؓ کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، فیصلہ کا ذکر کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ کتاب اللہ میں اس کا ذکر نہیں ہے غلط ہے قرآن کریم میں اس قسم کے نزاعات کا فیصلہ کرنے کے اصول متعدد آیات میں مذکور ہیں یہ فیصلہ انہی نصوص کے تحت داخل ہے اس کی مزید تفصیل اگلی فصل میں آتی ہے جس میں ہم یہ بتلائیں گے کہ "قرآن عظیم سنت و حدیث پر کس طرح مشتمل ہے"

علاوہ ازیں ہم (سنت و حدیث میں) ستزاد احکام کا وجود تسلیم کرتے ہیں مگر یہ زیادتی اور اضافہ کسی ایسی چیز کا اضافہ نہیں ہے جو قرآن میں نہ ہو بلکہ یہ اضافہ تو ایسا ہی ہے جیسے شرح کا اضافہ متن پر ہوتا ہے اور اگر (شرح میں) اضافہ نہ ہو تو اس کو شرح کون کہے اور اس قسم کا اضافہ درحقیقت اضافہ نہیں ہوتا (چیز ایک ہی ہوتی ہے اجمال اور تفصیل کا فرق ہوتا ہے اجمال کو متن کہتے ہیں تفصیل کو شرح)

باقی حضرت مقدام کی "یوشک" والی حدیث (جو ان حضرات نے استدلال میں پیش کی ہے اس) کا جواب یہ ہے کہ: اس حدیث کی سند میں ایک راوی زید بن حباب ہیں ان کے بارے میں امام احمد نے کہا ہے کہ: زید بن حباب سچے ضرور ہیں لیکن غلطیاں بہت کرتے ہیں (ان کی روایت کردہ حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا) یہی تنقید زید بن حباب پر ابن حبان نے بھی کی ہے ابن حبان نے زید بن حباب کی ان سب حدیثوں پر کلام کیا ہے جو زید نے سفیان سے روایت کی ہیں (اور اسی سلسلہ میں یہ تنقید کی ہے) اسی لئے امام بخاریؒ و امام مسلمؒ نے اس حدیث کو چھوڑ دیا (اور اپنی کتابوں میں درج نہیں کیا)

تجزیہ

دونوں فریق کے درمیان اختلاف لفظی ہے

(فریقین کے .... بیانات اور دلائل کا جائزہ لینے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ) دونوں فریقوں کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں فریق سنت و حدیث میں ایسے احکام کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں جن کا قرآن حکیم میں نصاً یا صراحتاً ذکر نہیں ہے اب پہلا فریق (مثبتین کا گروہ) تو یہ کہتا ہے کہ یہی تو ہیں سنت و حدیث کے تنفیذ احکام شرعیہ میں مستقل ہونے کے معنی۔ اس لئے کہ سنت و حدیث کے تنفیذ احکام شرعیہ میں مستقل ہونے کی حقیقت یہی ہے (کہ وہ ایسے احکام نافذ کرتی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں) دوسرے فریق (منکرین کے گروہ) کا موقف یہ ہے کہ: ہم مانتے ہیں کہ یہ احکام قرآن کریم میں صراحتاً مذکور نہیں ہیں لیکن یہ احکام قرآن کریم کی نصوص کے تحت ان متعدد صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت کے ذریعہ ضرور داخل ہیں جن کا ذکر اگلی فصل میں آرہا ہے لہذا سنت وحدیث بھی قرآن میں شامل ہیں۔

اسی بنا پر ان (منکرین) حضرات کا دعوی ہے کہ ایسی کوئی ایک بھی صحیح حدیث موجود نہیں جس سے کوئی شرعی حکم ثابت ہوتا ہو اور وہ قرآن کی کسی نص (صریح آیت) کے، یا قرآن حکیم کے قواعد کلیہ عامہ میں سے کسی قاعدہ کے تحت نہ آتی ہو اسی لئے اگر کوئی ایسی حدیث پائی جائے (جس کا حکم نہ صراحتاً قرآن میں مذکور ہو نہ کسی قاعدہ کلیہ کے تحت آتی ہو) تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ وہ حدیث صحیح نہیں ہے اور نہ اس پر عمل کرنا درست ہوگا۔

اس تنقیح سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ علما کے ان ہر دو فریق کے درمیان اختلاف محض لفظی ہے اور فرق صرف تعبیر کا ہے کیونکہ دونوں فریق اس بات کے معترف ہیں کہ سنت اور حدیث میں ایسے احکام موجود ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں اب ایک فریق تو صرف اسی بنا پر سنت کو مستقل حجت اور احکام شرعیہ کا مستقل ماخذ کہتا ہے۔ اور (چونکہ سنت و حدیث کا وہ حکم کسی نہ کسی صورت میں نصوص قرآن کے تحت ضرور داخل ہے اس لحاظ سے) دوسرا فریق سنت و حدیث کو مستقل حجت اور احکام شرعیہ کا مستقل ماخذ نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ احکام شرعیہ کا اصل ماخذ اور مستقل حجت صرف

قرآن ہے حدیث اس کے تابع ہے نتیجہ دونوں کے موقف کا ایک ہی نکلتا ہے (کہ اصل حجت اور احکام شرعیہ کا مستقل ماخذ قرآن ہے اور حدیث وسنت قرآن کی نسبت سے دوسرے درجہ میں ہیں)[۱]

---

۱ مصنف کا یہ بیان اور امام شافعی و امام شاطبی کے اقتباسات اُن تاکیدی، توضیحی اور تفصیلی احادیث احکام کے متعلق تو صحیح ہو سکتے ہیں جو قرآن کریم میں مجمل، مبہم، محتمل اور مختصر آیاتِ احکام نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قولی یا فعلی یا تقریری احادیث کے ذریعہ نافذ فرمائے ہیں مثلاً مناسک حج وغیرہ اس لئے کہ حج ۹ ھ میں ہوا ہے اور عمرہ ۶ ھ میں۔ اور حج وعمرہ سے متعلق اکثر و بیشتر احکام اس سے بہت پہلے سورۃ حج اور سورۃ بقرہ وغیرہ کی مدنی سورتوں میں نازل ہو چکے ہیں اسی طرح قتل وقتال، صلح و جنگ، اسیروں کے قتل و اسر، تقسیم اموال غنیمت و اموال فئ وغیرہ سے متعلق حدیث وسنت کے احکام کی تنفیذ سے پہلے قرآن کریم میں ان امور سے متعلق اجمالی یا تفصیلی احکام پر مشتمل آیات نازل ہو چکی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس حدیث وسنت کے وہ تمام احکام جن سے متعلق آیات قرآن کریم میں اجمالی یا تفصیلی طور پر یا بطور اشارہ ان کی تنفیذ سے پہلے نازل ہو چکی ہیں۔ لیکن حدیث وسنت کے وہ احکام جن سے متعلق آیات کے نزول سے پہلے، بلکہ بہت پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نزولِ آیاتِ قرآن کا انتظار کئے بغیر اُس تشریعِ احکام کے اختیار کے تحت ان کو نافذ فرمایا ہے جس کا ذکر آیت کریمہ ذیل میں آپ کی بعثت سے پہلے کتب سابقہ میں ہی فرما دیا ہے ارشاد ہے۔

یامرھم بالمعروف وینھاھم	وہ (نبی اُمی) ان کو ہر امر معروف (کے کرنے) کا حکم
عن المنکر ویحل لھم الطیبات	دیتا ہے ہر امر منکر (کے کرنے) سے منع کرتا ہے اور حلال
ویحرم علیھم الخبائث و یضع	کرتا ہے پاکیزہ چیزوں کو اور خبیث چیزوں کو حرام
عنھم اصرھم والاغلال	اور ان (تمام) دشواریوں اور تنگیوں کو
التی کانت علیھم	جو اُن پر تھیں دور کرتا ہے۔

اور اُمت نے صرف آپ کی قولی یا فعلی یا سکوتی تشریع کے تحت ہی اُن پر عمل کیا ہے اور اس کے بعد آپ کے نافذ کردہ احکام کی تصدیق و توثیق کی غرض سے یا ان میں ترمیم و اصلاح کی غرض سے یا ان احکام سے متعلق کسی نئے حکم کے اضافہ کی غرض سے قرآن کی آیات نازل ہوئی ہیں اسی طرح وہ حدیث وسنت کے احکام جن کا ذکر قرآن میں بالکل ہی نہیں ہے۔ ایسے حدیثی احکام کا وجود سب کے نزدیک مسلم ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹) ان احکام حدیث کے متعلق مصنف اور امام شافعی و شاطبی کا بیان کسی طرح صحیح نہیں ان احکام کی تنفیذ مستقل طور پر حدیث و سنت کے ذریعہ ہوئی ہے قرآن کی آیات نے ان کی تصدیق و توثیق کی ہے یا ان میں ترمیم واصلاح کی ہے یا کوئی نیا حکم نافذ فرمایا ہے۔ یہی معنی ہیں حدیث و سنت کے تنفیذ احکام میں مستقل ہونے کے اس سے قبل صفحہ ۲۱۴ کے حاشیہ میں اس قسم کے احکام کے ذیل میں ہم نے طہارت اور نماز کے احکام کو پیش کیا ہے یہاں ہم ایک اور مثال پیش کرتے ہیں۔

(۱) ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں تقریباً سترہ مہینے محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے نمازیں بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے پڑھی گئی ہیں اور وہی قبلہ رہا ہے۔ قرآن کریم میں استقبال بیت المقدس کا حکم مطلق نہیں ہے، سترہ مہینہ کے بعد جب قبلہ بدلا گیا اور بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم :-

فول وجھک شطر المسجد الحرام — پس پھیر دو اپنا منہ (رُخ) مسجد حرام کی جانب

نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تحت بیت المقدس کے قبلہ بنانے کے حکم کو ذیل کے الفاظ میں اپنا حکم قرار دے کر اس کی تصدیق و توثیق فرمائی ہے۔

وماجعلنا القبلۃ التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ	اور نہیں بنایا (تھا) ہم نے قبلہ اس (جہت) کو جس پر تم (اس سے پہلے) تھے مگر اس غرض سے کہ ممتاز کردیں ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں، اُن سے جو اُلٹے پاؤں لوٹتے ہیں۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل احکام شرعیہ کے نافذ کرنے میں مستقل نہ ہوتا تو سترہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز کیسے پڑھی جاسکتی تھی اور بیت المقدس کو مسلمانوں کا قبلۂ اول کیونکر کہا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے حدیثی احکام کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل اور بیان سکوتی اُن احکام شرعیہ کے نافذ کرنے میں یقیناً مستقل اور حجت ہے جن احکام کا ذکر قرآن کریم میں بالکل نہیں ہے یا ان کے نفاذ کے بعد قرآن کریم کی آیات نے ان کی تصدیق و توثیق کی ہے یا ان میں ترمیم و اصلاح کی ہے یا کسی نئے حکم کا اضافہ کیا ہے۔

یہ یقینی بات ہے کہ حدیث و سنت میں یہ احکام آپ نے اپنی طرف سے نافذ نہیں فرمائے بلکہ وحی غیر متلو

باقی صفحہ ۲۸۱ پر

یا الہام والقاء فی القلب یا علم لدنی کے تحت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی نافذ فرمائے ہیں لیکن وحی متلو یعنے قرآن کے تحت نافذ نہیں فرمائے۔

اس لئے تنفیذ احکام شرعیہ کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل مستقل حجت ہے قرآن وحدیث میں فرق وہی ہے جو اس سے پہلے حاشیہ میں ہم نے بیان کیا ہے کہ قرآن کریم ثبوت کے لحاظ سے قطعی ہے اور عموماً احادیث ظنی ہیں صرف اس لحاظ سے قرآن ماخذ اول ہے اور حدیث ماخذ دوم۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عوارف المنن مقدمہ معارف السنن تالیف حضرت مولینا محمد یوسف بنوری شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ عربیہ کراچی ۱۲ محشی

فصل دوم

قرآنِ عظیم حدیث و سنت پر کس طرح مشتمل ہے

اگر حدیث و سنت قرآن عظیم ہی کا بیان و ترجمان ہیں اور ہر وہ حکم جو حدیث و سنت میں موجود ہے وہ قرآن عظیم میں تفصیلاً یا اجمالاً ضرور موجود ہے جیسا کہ امام شاطبی اور اُن کے ہمنوا آیت کریمہ: تبیانا لکل شئی اور آیت کریمہ: ما فرطنا فی الکتاب من شئی جیسی آیات کی بنا پر دعویٰ کرتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ) یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے کہ ہم حدیث و سنت میں بہت سے احکام موجود پاتے ہیں جو قرآن کریم میں بالکل مذکور نہیں ہیں۔

علماء نے اس دعوے کے ثبوت (اور اشکال کے حل کرنے) کی غرض سے پانچ مختلف طریقے اختیار کئے ہیں (جن کی تفصیل حسب ذیل ہے)

پہلا طریقہ خود قرآن حکیم (کی متعدد آیات) سے ثابت ہے کہ سنت و حدیث پر عمل کرنا واجب ہے لہٰذا حدیث و سنت کے ہر حکم پر عمل کرنا دراصل قرآن عظیم کے حکم پر ہی عمل کرنا ہے (لہٰذا اصل حجت اور ماخذ احکام شرعیہ قرآن عظیم ہے حدیث و سنت اسی کے تحت داخل اور شامل ہیں مستقل حجت نہیں ہیں)

یہ طریقہ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں ایک عام اور ہر زمانہ میں متداول طریقہ ہے اسی طریقہ کو حضرت

عبداللہ بن مسعودؓ نے اختیار کیا ہے چنانچہ روایت ہے (۱) کہ بنو اسد قبیلہ کی ایک عورت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئی اور کہا: اے ابو عبدالرحمٰن (ابن مسعود کی کنیت ہے) میں نے سنا ہے کہ "آپ نے ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے جو بدن کی کھال گودتی ہیں یا گدواتی ہیں، جو پیشانی کے بال نوچتی یا نچواتی ہیں، جو دانتوں (کو ریت کر ان) کے درمیان آرائش کے لئے خلا کرتی (یا کراتی) ہیں اور اس طرح اللہ کی فطری ساخت اور بناوٹ میں تبدیلیاں کرتی ہیں"؟ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: میں اس فعل پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لعنت کی ہے اور وہ قرآن کریم میں بھی موجود ہے"۔ اس عورت نے عرض کیا: بخدا میں نے اول سے آخر تک پورا قرآن پڑھا ہے مجھے تو قرآن میں کوئی ایسی آیت ملی نہیں"۔ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: اگر واقعی تو قرآن کریم پڑھتی تو تجھے یہ آیت کریمہ ضرور ملتی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:-

وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا۔

رسول تم کو جو (حکم) دیں وہ لے لو (قبول کرو) اور جس سے منع کریں اس سے باز آؤ۔

اسی قسم کا ایک واقعہ (۲) عبدالرحمٰن بن زیاد کا ہے کہ انہوں نے ایک مُحرِم شخص کو (سلے) کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو عبدالرحمٰن نے اس کو (سلے ہوئے کپڑے پہننے سے) منع کیا تو اس مُحرِم نے کہا: تم قرآن کریم کی کوئی ایسی آیت پیش کرو جس سے تم میرا یہ لباس اتروا سکو (یعنی جس میں حالت احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہننے کی ممانعت موجود ہو) تو عبدالرحمٰن نے یہی آیت کریمہ اس کے سامنے پڑھ دی: وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا (دیکھو قرآن کہتا ہے جس کام سے رسول منع کرے اس سے باز آؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں سلے ہوئے کپڑے پہننے سے منع کیا ہے لہٰذا تم قرآن کے اس حکم کے تحت یہ کپڑے اتارو)

اسی طرح ایک روایت (۳) ہے کہ جلیل القدر تابعی) طاؤس عصر کی نماز کے بعد دو رکعت نماز پڑھ رہے تھے تو حضرت ابن عباسؓ نے ان سے فرمایا: ان کو چھوڑ دو"۔ طاؤس نے عرض کیا: رسول اللہ

---

(۱) الموافقات للشاطبی ج ۴ ص ۲۴ جامع بیان العلم لابن عبدالبر ج ۲ ص ۱۸۸ (۲) ایضاً ج ۴ ص ۲۵ و ج ۲ ص ۱۸۹ (۳) حوالہ سابق

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سنت بنانے (پابندی سے پڑھنے) سے منع فرمایا ہے" تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عصر کی (فرض) نماز کے بعد ہر نماز کے پڑھنے سے منع فرمایا ہے اب میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں ان دو رکعتوں پر عذاب ہوگا یا ثواب ملے گا اللہ جل شانہ کا حکم تو یہ ہے:۔

وما کان لمومن ولا مومنة	نہ کسی مومن مرد کے لئے جائز ہے نہ کسی مومن عورت
اذا قضی اللہ ورسولہ امرا	کے لئے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ
ان یکون لھم الخیرة من	فرمادیں تو وہ (اس میں) اپنے اختیار سے اپنے بارے
امرھم	میں کام لیں۔

(دیکھئے ان تینوں حضرات نے حدیث وسنت کے حکم کو ان دو آیتوں کے تحت اللہ کا حکم قرار دیا ہے لہٰذا اس طرح قرآن کا حدیث وسنت پر مشتمل ہونا ثابت ہوگیا)

دوسرا طریقہ علما کے نزدیک (علمی معیار پر) حدیث وسنت کو قرآن میں شامل اور اس کے تحت داخل کرنے کا مشہور طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ (کی آیات عموماً) مجمل ہوتی ہیں حدیث و سنت انہی کی تفصیلات بیان کرتی ہیں مثلاً وہ تمام حدیثیں جو قرآن میں مذکور مجمل احکام کی تفصیل میں وارد ہوئی ہیں۔

اس تفصیل کی مختلف صورتیں ہیں یا تو احادیث اُس مجمل حکم کی عملی کیفیات یا اس کے اسباب اور شروط کو بیان کرتی ہیں یا اس کے موانعات، مفسدات اور متعلقات وغیرہ کی وضاحت کرتی ہیں۔ چنانچہ (نماز سے متعلق احادیث) پنجگانہ نمازوں کی تفصیل کے سلسلہ میں ہر نماز کے مختلف اوقات، رکوع وسجود (قیام وقعود) اور ان کے علاوہ نماز کے تمام احکام کو بیان کرتی ہیں اسی طرح زکوٰۃ کی وضاحت کے سلسلہ میں . . . . (زکوٰۃ سے متعلق احادیث) اموال زکوٰۃ، مقدار زکوٰۃ ہر مال میں نصاب زکوٰۃ، اوقات وجوب زکوٰۃ (غرض زکوٰۃ سے متعلق تمام احکام) کو بیان کرتی ہیں

اسی طرح روزوں کے احکام کی تشریح میں (روزوں سے متعلق احادیث) ان احکام صوم کو بیان کرتی ہیں جو قرآن حکیم میں واضح طور پر مذکور نہیں ہیں۔

اسی طرح مناسک حج، ذبیحہ کے احکام، نکاح اور اس سے متعلق تمام احکام، بیوع (وغیرہ معاملات) اور ان سے متعلق احکام، جنایات (جرائم) مثلاً قصاص ودیت وغیرہ سے متعلق احکام

(غرض ان موضوعات سے متعلق وہ تمام تفصیلی احکام جو احادیث میں بیان ہوئے ہیں اور قرآن میں ان کا ذکر مجمل یا مبہم یا مختصر طور پر آیا ہے) ظاہر یہ ہے کہ سنت و حدیث کے یہ تمام تفصیلی احکام قرآن میں شامل اور اللہ جل شانہٗ کے اس فرمان کے تحت داخل ہیں ارشاد ہے :۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم — ہم نے تم پر یہ ذکر (قرآن) اُتارا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس (دین) کی وضاحت کردو جو ان کے لئے اُتارا گیا ہے۔

عمران بن حصین سے مروی ہے کہ اُنھوں نے ایک شخص سے (جو سنت و حدیث کا منکر تھا) فرمایا :۔

تم نرے احمق ہو، کتاب اللہ میں تم نے کہیں پڑھا ہے کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں جن میں قرآن آہستہ پڑھا جاتا ہے۔

اس کے بعد عمران نے نماز، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام کا اسی طرح ایک ایک کرکے ذکر کیا اور اس سے پوچھا :۔

کیا تمھیں کتاب اللہ میں ان کی تفصیلات ملتی ہیں ؟ (پھر کیوں ان پر عمل کرتے ہو ؟) یقیناً کتاب اللہ میں یہ تمام احکام مجمل اور مبہم طور پر مذکور ہیں۔ اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) احادیث میں انہی احکام کی تفسیر و تفصیل بیان فرمائی ہے (۱)

مُطرِّف بن عبداللہ بن الشّخّیر سے (منکرین سنت و حدیث کی جانب سے) کہا گیا : ہمارے سامنے تو قرآن کے سوا اور کچھ بیان نہ کرو، تو مطرف نے جواب دیا : خدا کی قسم ہم بھی قرآن کے بجائے کسی اور چیز کے طلبگار نہیں ہیں لیکن ہم قرآن کو اس (ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم) سے لینا چاہتے ہیں۔ جو ہم سے زیادہ قرآن کو جانتی ہے (۲)، (اُسی پر قرآن اُترا ہے اور اُسی کو قرآن کے معانی و مطالب تبلائے گئے ہیں، اسی کے بیان کا نام تو حدیث و سنت ہے)

اسی بنا پر امام اوزاعی نے فرمایا ہے : کتاب اللہ سنت و حدیث کی اس سے زیادہ محتاج ہے

---

(۱) الموافقات ۴ - ۲۶ جامع بیان العلم ۲ - ۱۹۱ (۲) حوالہ سابق

بلکہ سنت وحدیث کتاب اللہ کی محتاج ہیں"۔ امام اوزاعی کے اس مقولہ کی شرح حافظ ابن عبدالبر مالکی فرماتے ہیں: سنت وحدیث کتاب اللہ (کے معانی ومطالب) کا دوٹوک فیصلہ کرتی ہیں اور اس کی مراد کو واضح کرتی ہیں (۳)

امام احمد سے (اوزاعی کی) اس حدیث کے متعلق دریافت کیا گیا جس میں آیا ہے کہ: سنت وحدیث کتاب اللہ (کے معنی ومراد) کا قطعی فیصلہ کرتی ہے تو امام احمد نے فرمایا: میں یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کرتا ہاں (اسی بات کو) یوں کہتا ہوں کہ سنت وحدیث کتاب اللہ کی تفسیر اور وضاحت کرتی ہیں"۔

(اس بیان اور اس کی تائید میں پیش کردہ حوالوں کا حاصل یہی ہے کہ سنت وحدیث قرآن ہی کی تفسیر وتشریح کرتی ہیں قرآن کے سوا اور کچھ نہیں بتلاتیں اس لئے وہ قرآن کے تحت داخل ہیں اور قرآن ان پر مشتمل ہے)

تیسرا طریقہ قرآن عظیم نے مختلف نصوص (صریح آیات) میں جن اصول اور قواعد کلیہ کے تحت احکام نافذ کئے ہیں ان پر غور کرنے اور ان کا جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے کہ سنت وحدیث کے احکام بھی انہی اصول وقواعد کے تحت نافذ کئے گئے ہیں نہ ان سے متجاوز ہیں .... اور نہ ان سے باہر (اس لئے تمام سنن واحادیث کے احکام قرآن کے تحت داخل ہیں اور قرآن ان پر مشتمل ہے)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ (انتہائی دقیق نظر سے قرآن عظیم کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ) قرآن، نسل انسانی کو، دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت سے سرفراز کرنے کے لئے آیا ہے۔ یہ سعادت بحیثیت مجموعی (اصولی طور پر) تین چیزوں میں منحصر ہے۔

(۱) ضروریات: (لابدی چیزیں)! لوگوں کے مذہب کا، جان کا، مال کا، نسل کا اور عقل کا تحفظ اور اس کی ضمانت۔

(۲) حاجیات (حوائج البشریہ)! ان سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسانی زندگی میں توسیع اور کشائش پیدا کرے اور تنگی ودشواری کو دور کرے۔ مثلاً سفر یا مرض کی حالت میں روزہ نہ رکھنے کی

---

(۳) جامع بیان العلم ۲ – ۱۹۱

اجازت۔

(۳) تحسینیات (ذاتی خوبیاں) : اس کے ذیل میں انسان کے تمام مکارم اخلاق اور خصائل حسنہ آتے ہیں۔

یہی تین اساسی اصول اور بنیادی مقاصد قرآن کے سامنے ہیں، انہی اصول کے تحت وہ تمام احکام داخل ہیں جو قرآن میں منصوص ہیں۔ حدیث وسنت کے منصوص احکام (کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد بھی ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ) انہی تین اساسی مقاصد واصول پر مبنی تفصیلی اور جزئی احکام حدیث وسنت میں نافذ کئے گئے ہیں لہٰذا حدیث وسُنّت کے تمام تفصیلی احکام (قولی ہوں یا عملی یا تقریری) اس تحلیل وتجزیہ[۵] کی روشنی میں قرآن ہی کے احکام بن جاتے ہیں اور اسی لحاظ سے قرآن سُنت و حدیث پر مشتمل ہے۔

---

[۵] قرآن اور حدیث کے احکام کا یہ تحلیل وتجزیہ نہایت دقیق اور خالص عقلی اور منطقی ہے اس کے مقابلہ میں نہایت سہل اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا تجزیہ خود قرآن کریم کی روشنی میں حسب ذیل ہے:

آیت کریمہ ذیل میں اللہ جل شانہٗ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی آپ کے تشریع وتنفیذ احکام شرعیہ کے پانچ اصول کلیہ بیان فرمائے ہیں، ارشاد ہے:

(۱) یامرھم بالمعروف (۲) ینھاھم عن المنکر (۳) ویحل لھم الطیبات (۴) ویحرم علیھم الخبائث (۵) ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (الاعراف)	وہ (نبی امی) ان کو ہر معروف کام (کرنے) کا حکم دیتا ہے اور ہر منکر کام (کرنے) سے منع کرتا ہے اور ہر پاکیزہ چیز کو حلال کرتا ہے اور ہر خبیث چیز کو حرام کرتا ہے اور جو دشواریاں اُن پر عائد تھیں ان کو دور کرتا ہے۔

(۱) امر بالمعروف کے تحت وہ تمام عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق واعمال آتے ہیں جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) نہی عن المنکر کے تحت وہ تمام شرکیہ و کفریہ عقائد و عبادات، ممنوع معاملات اور افعال واعمال اور اخلاق رذیلہ آتے ہیں جن سے منع کیا گیا ہے۔ (باقی صفحہ ۲۸۸)

چوتھا طریقہ (۱) قرآن حکیم بعض اوقات دو مختلف اور متقابل مسئلوں کے متعلق مختلف واضح احکام بیان کرتا ہے۔ اب وہاں ایسی چیزیں بھی موجود ہوتی ہیں جو ان دونوں میں سے ہر ایک سے مشابہت رکھتی ہیں (جس کی بنا پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو کس کے تحت داخل کیا جائے) تو وہاں حدیث وسنت آتی ہے اور اُن چیزوں کو ان میں سے کسی ایک کے تحت داخل کر دیتی ہے یا دونوں سے الگ) کسی اور خاص حکم کے تحت داخل کر دیتی ہے جو ان دونوں سے مناسبت رکھتا ہے (حدیث وسنت کا یہ حکم خاص اگرچہ قرآن میں مذکور نہیں ہوتا مگر قرآن کے حکم مشابہت ومناسبت کی بنا پر اس کو قرآن کا ہی حکم کہا جائے گا اور قرآن اُس پر مشتمل ہوگا۔)

(۲) اور بعض اوقات کسی چیز کے متعلق قرآن حکیم کسی علت پر مبنی حکم کی تصریح کرتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیاس کے طور پر ہر اس چیز کو جس میں وہ علت موجود ہو قرآن کے حکم کے تحت داخل فرما دیتے ہیں اور اس پر وُہی قرآن کا حکم لگا دیتے ہیں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم چونکہ قرآن

---

(۳) تحلیل طیبات کے تحت وہ تمام پاکیزہ اور پسندیدہ چیزیں آتی ہیں جو حلال کی گئی ہیں خواہ کھانے پینے اور برتنے سے متعلق ہوں خواہ انتخاب واختیار کرنے سے متعلق ہوں۔

(۴) تحریم... خبائث کے تحت وہ تمام ظاہری یا باطنی گندی اور بُری چیزیں آتی ہیں جو حرام کی گئی ہیں خواہ کھانے، پینے اور برتنے سے متعلق ہوں خواہ انتخاب واختیار کرنے سے متعلق ہوں۔

(۵) وضع اصر واغلال کے تحت وہ تمام تنگیاں، دشواریاں اور ناقابل عمل یا ناقابل برداشت پابندیاں آتی ہیں جن کو دور کیا گیا ہے

انہی پانچ اصول کے تحت قرآن کریم میں منصوص، تمام احکام۔ آوامر ہوں یا نواہی بصورت اخبار ہوں یا بصورت انشا۔ داخل ہیں اور انہی پانچ اصول کے تحت حدیث وسنت میں منصوص، تمام احکام۔ اوامر ہوں یا نواہی بصورت اخبار ہوں یا بصورت انشا۔ داخل ہیں۔

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی کتب سابقہ کے اندر اللہ جل شانہٗ نے آپ کے ان اصولِ تشریع احکام کی خبر دی ہے اور قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت کے ذریعہ آپ کو اس سے آگاہ کر دیا ہے اس لئے آپ کی "عصمت" کے پیش نظر یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ تنفیذ احکام میں ان اصول کو نہ اختیار کریں اس لحاظ سے حدیث وسنت کے تمام احکام بھی قرآن ہی کے احکام ہیں اور اس طریقہ پر قرآن عظیم سنت وحدیث پر مشتمل ہے۔ ۱۲ محشی

کے حکم پر قیاس کر کے ہی لگایا گیا ہوتا ہے اس لئے یہ بھی قرآن ہی کا حکم ہے اور قرآن اس پر مشتمل ہے۔

اس بیان کو مثالوں کے ذریعہ سمجھئے۔

(۱) مختلف اور متقابل حکموں کی مثالیں

الف! اللہ جل شانہٗ نے پاکیزہ چیزوں کو حلال کیا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام فرمایا ہے۔ اب کچھ چیزیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کے بارے میں پتہ نہیں چلتا کہ آیا وہ پاکیزہ ہیں (اور حلال ہیں) یا خبیث ہیں (اور حرام ہیں اور مشابہت دونوں سے ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حدیث وسنت کے ذریعہ اس اشکال کو دور فرما دیا اور) وضاحت فرما دی کہ کون کون سی چیزیں طیب کے تحت داخل ہیں (اور ان کا کھانا حلال ہے) اور کون کون سی چیزیں خبیث کے تحت داخل ہیں (اور ان کا کھانا حرام ہے)

چنانچہ آپ نے (چرنے والے) جانوروں میں سے ہر نکیلے دانتوں والے درندوں کو (خبیث قرار دے کر) کھانے سے منع فرما دیا اور پرندوں میں سے ہر نکیلے پنجوں والے پرندے کو (خبیث قرار دے کر) کھانے سے منع فرما دیا نیز پلاؤ گدھوں (کو بھی خبیث کے تحت داخل کر کے ان) کے کھانے سے بھی ممانعت فرما دی (حالانکہ گدھا درندہ نہیں ہے) جیسے کہ آپ نے گوہ کو، حُبارَی (ٹیٹری)، کو خرگوش کو اور انہی سے ملتے جلتے جانوروں کو طیب قرار دے کر) پاکیزہ چیزوں کے تحت داخل (اور حلال) کر دیا (ان جانداروں کے حرام یا حلال ہونے کا ذکر اگرچہ قرآن کریم میں موجود نہیں ہے مگر چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن کریم کی حرام یا حلال کردہ چیزوں کے تحت داخل کر کے ہی حرام یا حلال کیا ہے اس لئے یہ قرآن ہی کا حکم ہے اور قرآن اس پر مشتمل ہے)

(ب) اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں حلال کی ہیں ان میں سمندر کے شکار کو بھی حلال بتلایا ہے اور جن خبیث چیزوں کو حرام کیا ہے ان میں مرے ہوئے جانور کو بھی حرام بتلایا ہے تو اب سمندری جانور جو سمندر میں مر جائیں ان کا معاملہ درمیان میں رہ جاتا ہے اور حرام یا حلال ہونے کا حکم لگانا دشوار ہو جاتا ہے (اس لئے کہ وہ مُردار ہونے کی بنا پر حرام ہونے چاہئیں اور سمندری جانور ہونے کی وجہ سے حلال ہونے چاہئیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حدیث کے ذریعہ اس اشکال کو دور کر دیا اور) ارشاد فرمایا:-

هو الطهور ماؤه　　　　سمندر کا پانی بھی پاک ہے اور اس کا مرا ہوا جانور

والحل میتتہ (۱) — بھی حلال ہے۔

اسی سلسلہ میں آپ نے ارشاد فرمایا:

احلت لنا میتتان و دمان اما المیتتان فالسمک والجراد واما الدمان فالکبد والطحال (۲) — ہمارے لئے دو مُردار جانور (مُردار ہونے کے باوجود) حلال ہیں اور دو خون (خون ہونے کے باوجود) حلال ہیں وہ دو مُردار تو مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون کلیجی اور تلی ہیں۔

(ج) اللہ جل شانہٗ نے مرے ہوئے جانور کو حرام فرمایا ہے اور ذبح کئے ہوئے جانور کو حلال فرمایا ہے اب ذبح کئے ہوئے جانور کے پیٹ سے جو بچہ مَرا ہوا نکلے وہ دونوں طرف داخل کیا جا سکتا ہے (ذبح کئے ہوئے جانور کا جزو ہے اس لئے حلال ہونا چاہیے مگر وہ خود ایک مَرا ہوا جانور ہے اس لئے حرام ہونا چاہیے) تو (اس اشکال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسبِ ذیل حدیث نے رفع کیا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ذکاۃ الجنین ذکاۃ امہ — بچہ کا ذبح ماں کا ذبح کرنا ہی ہے (یعنی ماں کے ساتھ بچہ بھی ذبح ہو گیا)

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ولادت سے پہلے) بچہ کے ماں کا جزو ہونے کی حیثیت کو اس کے مستقل (اور علیحدہ جان دار) ہونے کی حیثیت پر ترجیح دی ہے۔

(۲) دونوں متخالف حکموں سے علیحدہ خاص حکم کی مثالیں

(الف): اللہ جل شانہٗ نے (آزاد عورت سے) نکاح کو حلال فرمایا اور (مملوک کنیز کی) ملکیت کی بنا پر حلال فرمایا (اور ان دونوں صورتوں کے علاوہ) زنا کو حرام فرمایا اور ایسے نکاح کے بارے میں سکوت فرمایا جو ہو تو نکاح مگر شریعت کے خلاف ہو کہ وہ نہ خالص (اور صحیح)

---

(۱) اس حدیث کو ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے ۱۲

(۲) اس حدیث کو ابوداؤد، حاکم اور ترمذی نے روایت کیا اور ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے نیز ابن ماجہ، ابن حبان اور دارقطنی نے بھی بیان کیا ہے ۱۲

نکاح ہے اور نہ خالص زنا ہے (کیونکہ نکاح تو ہوا ہے) تو اس صورت میں فیصلہ کرنا دشوار ہوگیا کہ آیا
اس کو نکاح کے تحت داخل کیا جائے یا زنا کے تحت؟ . . . . حدیث نے آکر
اس اشکال کو رفع کیا چنانچہ) حدیث میں آیا ہے:

ایما امرءۃ نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل فنکاحھا باطل فنکاحھا باطل فان دخل بھا فلھا المھر بما استحل منھا۔	جس عورت کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر ہوا اس کا نکاح باطل ہے باطل ہے باطل ہے اگر شوہر نے اس عورت کے ساتھ جماع کر لیا تو وہ عورت مہر کی مستحق ہے اس لئے کہ شوہر نے اس سے نکاح کا فائدہ حاصل کر لیا۔

(دیکھئے حدیث کا یہ حکم ایک علیحدہ اور تیسرا حکم ہے نہ خالص نکاح کا حکم ہے نہ خالص زنا کا بلکہ
فی الجملہ دونوں سے مناسبت رکھتا ہے نکاح سے بھی اور زنا سے بھی)

(ب) اللہ تعالیٰ نے قتل عمد میں جان کے بدلے میں جان تجویز فرمائی ہے (یعنے مقتول کے
بدلے میں قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے) اور بدن کے اعضا میں سے ہر عضو کے بدلے میں عضو (یعنے
مضروب کے ہر عضو کے بدلے میں ضارب کے اسی عضو کو کاٹ ڈالنے کا حکم دیا ہے) باقی قتل خطا میں
مقتول کے قصاص میں (عاقلہ پر) دیت (خون بہا) (اور قاتل پر کفارہ) تجویز فرمایا ہے اور حدیث و
سنت نے بتلایا ہے کہ (خطا کی صورت میں بھی) اعضا کی دیت آتی ہے (یعنے ہر عضو کا مالی تاوان آتا ہے)
اب ان دونوں حکموں کے درمیان حاملہ عورت کے اُس بچہ کا مسئلہ مشکل ہوگیا جو کسی کی ضرب سے
(مرے اور) ماں کے پیٹ سے گر جائے اس لئے کہ یہ بچہ (پیٹ میں ہونے کے اعتبار سے ماں کے
اور تمام اعضا کی طرح اُس کا ایک عضو ہے اور اپنی خلقت کے اعتبار سے ایک پورا اور مستقل انسان
ہے (اشکال یہ ہے کہ یہ بچہ نہ پورے طور پر ایک مستقل انسان ہے کہ پورا خون بہا دیا جائے اس لئے کہ
ابھی پیدا نہیں ہوا اور نہ پورے طور پر ماں کے بدن کا عضو ہی ہے کہ عضو کا مالی تاوان دلایا جائے،
اس لئے کہ اس کی بناوٹ مکمل ہو چکی جان بھی پڑ چکی) حدیث نے (اس بچہ کا قصاص ان دونوں صورتوں
سے علیحدہ ایک اور خاص حکم کے ذریعہ دلایا اور) بیان کیا کہ "اس بچہ کی دیت (خون بہا) ایک غلام یا
باندی ہے" اور یہ کہ اس بچہ کا حکم دونوں حکموں سے الگ خود اپنا خاص حکم ہے (نہ پورے انسان کا

خون بہا آئے گا نہ محض ماں کے کسی عضو کا مالی تاوان، کیونکہ نہ یہ بچہ پورے طور پر ایک مستقل انسان ہے اور نہ پورے طور پر ماں کے بدن کا کوئی عضو ہے (لہٰذا اس کے بدلے میں ایک غلام یا کنیز آئے گی جو نہ ایک مستقل انسان کی دیت یعنے خون بہا ہے نہ ہی کسی انسانی عضو کی دیت یعنے مالی تاوان ہے)

(۳) دو متخالف حکموں پر قیاس کر کے کسی ایک کے تحت داخل کرنے کی مثالیں

(الف) اللہ جل شانہ نے ربا (سود) کو حرام فرمایا ہے۔ اور (قرآن کے نزول کے وقت عام طور پر مروج) عہد جاہلیت کے ربا کی حقیقت (ایک قرض کو (دوسرے) قرض سے فسخ کرنا تھی (مقررہ مدت گذر جانے کے بعد) قرض خواہ قرض دار سے کہا کرتا تھا: یا تو تم (میرا) قرض ادا کر دو اور یا (آئندہ) اصل (قرض) پر (اتنا) سود دینا قبول کرو (وہ بیچارہ اپنی مجبوری کی وجہ سے اصل پر مقررہ سود دینا منظور کر لیتا تھا) چونکہ اس سود کے حرام ہونے کی علت (وجہ) یہ تھی کہ یہ زیادتی (جو وہ اصل پر لیتا ہے یہ) بلا عوض ہے (اس کے بدلے میں کچھ دیتا نہیں) اس لئے حرام ہے لہٰذا حدیث وسنت نے (کسی بھی لین دین میں)، ہر اس زیادتی کو جو بلا عوض ہو قرآن کے اس حکم کے تحت داخل کر دیا (اور حرام قرار دیدیا خواہ قرض کے لینے دینے میں ہو خواہ نقد خرید و فروخت میں) چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

الذهب بالذهب والفضة	سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی،
بالفضة والبر بالبر والشعير	گیہوں کے بدلے گیہوں جو کے بدلے جو، کھجور کے بدلے
بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح	کھجور، نمک کے بدلے نمک (یعنی جنس کے بدلے جنس)
مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد[1]	برابر برابر دست بدست (یعنے نقد) لیا دیا کرو جس نے
فمن زاد او ازداد فقد	زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے بلاشبہ سود دیا یا لیا۔ اور

---

(۱) اس حدیث کو ابو داؤد اور ترمذی نے لفظوں کے معمولی سے اختلاف اور فرق کے ساتھ روایت کیا ہے۔

لہ حدیث کا یہ حکم — اگرچہ قرآن میں مذکور نہیں مگر — اسی علت پر مبنی ہے جس کی بنا پر قرآن نے سود کو حرام کیا ہے اس لئے کہ اشیا کے تبادلہ کی صورت میں اگر زیادتی ہوگی تو وہ خالی عن العوض ہوگی یہی علت قرآن میں مذکور سود کے حرام ہونے کی ہے لہٰذا حدیث کا یہ حکم ازروئے قیاس قرآن ہی کا حکم ہے اور قرآن اس پر مشتمل ہے۔“ محشی

اس بی واذا اختلفت هٰذه	جب جنسیں مختلف ہوں (مثلاً سونے کے بدلے چاندی)
الاصناف فبیعوا کیف شئتم	تو جیسا چاہو (کم وبیش) خرید و فروخت کرو بشرطیکہ
اذا کان یدًا بید (۱)	(لینا دینا) ہاتھ کے ہاتھ ہو۔

(ب) اللہ جل شانہٗ نے قرآن پاک میں دو بہنوں کو (ایک ساتھ ہو یا آگے پیچھے) نکاح میں جمع کرنے کو حرام فرمایا ہے ارشاد ہے:

وان تجمعوا بین الاختین	اور یہ (حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (نکاح) میں
⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂	جمع کرو۔

اور (تمام محرمات کا ذکر فرمانے کے بعد) ارشاد ہے:۔

واُحل لکم ما وراء ذا لکم	اور تمہاری ان محرمات کے علاوہ عورتیں تمہارے لئے
⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂	حلال ہیں (ان سے نکاح کر سکتے ہو)

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے از روئے قیاس بیوی اور اس کی خالہ یا پھوپی کو نکاح میں جمع کرنے کی بھی ممانعت فرمائی ہے کیونکہ جس علت (یعنے قطع رحمی) کی بنا پر قرآن میں دو سگی بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کو حرام فرمایا ہے وہی علت (قطع رحمی) یہاں یعنے بھانجی اور خالہ، پھوپھی اور بھتیجی کو نکاح میں جمع کرنے کے اندر موجود ہے چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علتِ حرمت کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

فانکم اذا فعلتم ذالک قطعتم	پس بلاشبہ جب تم ایسا کرو گے تو اپنے رشتے منقطع
ارحامکم۔	کرنے (قطع رحمی) کے مرتکب ہو گے (جو حرام ہے)

اس علت کا ذکر فرمانے سے معلوم ہوا کہ آپ حکم قرآن —— وان تجمعوا بین الاختین —— پر قیاس کرنے کی علت کی طرف رہنمائی فرمانا چاہتے ہیں (لہٰذا حدیث کا یہ حکم بھی از روئے قیاس قرآن ہی کا حکم ہے اور قرآن اس پر مشتمل ہے)

(ج) اللہ تعالیٰ نے قرآن میں رضاعی ماؤں اور بہنوں سے نکاح کرنا حرام قرار دیا ہے۔

---

(۱) یہ "مشہور" حدیث ہے اس کو تمام کتب حدیث میں قریب قریب انہی الفاظ میں روایت کیا ہے ہم نے یہاں مسلم، ابو داؤد، ترمذی کے الفاظ نقل کئے ہیں ۱۲

ارشاد ہے :-

وامھاتکم الّاتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعۃ	اور (تم پر حرام ہیں) وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازروئے قیاس قرآن کے حکم کے تحت تمام رضاعی رشتے داخل فرما دیئے ارشاد ہے :

ان اللہ حرم علیکم من الرضاعۃ ماحرم من النسب (۲)	بلاشبہ تم پر (دودھ پینے والوں پر) دودھ کے وہ تمام رشتے حرام کر دیئے ہیں جو رشتے نسب سے حرام ہیں۔

مثلاً رضاعی پھوپی، رضاعی خالہ، رضاعی بہن یا بھائی کی لڑکیاں وغیرہ رضاعی رشتے دار، اس لئے ازروئے قیاس حدیث کا یہ حکم بھی قرآن ہی کا حکم ہے ۔

(۵) پانچواں طریقہ ہر سنت وحدیث کے تفصیلی احکام کو قرآن میں موجود تفصیلی احکام کی طرف لوٹانا (یعنے احکام قرآن کے تحت داخل کرنا) قرآن کے سنت وحدیث پر مشتمل قرار دینے کا پانچواں طریقہ ہے اس طریقہ کی مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(الف) عبداللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دیدی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا :

مرہ فلیراجعھا ثم یترکھا حتی تطھر ثم تحیض ثم تطھر ثم ان شاء امسک بعد وان شاء طلق قبل ان یمس فتلک العدۃ التی امر اللہ ان یطلق	تم اس (اپنے لڑکے) کو حکم دو کہ وہ اپنی بیوی (کی طلاق) سے رجوع کرے پھر اس کو چھوڑے رکھے (پاس جائے) یہاں تک کہ (پہلے حیض سے) پاک ہو جائے پھر اس کو (دوسرا) حیض آجائے ۔ پھر (اس سے بھی) پاک ہو جائے پھر اس کے بعد (تیسرے طہر میں) اسے اختیار ہے چاہے نکاح میں رہنے دے اور چاہے (اس طہر میں) ہاتھ لگانے (پاس جانے) سے پہلے طلاق

---

(۲) اس حدیث کو امام مسلم، ترمذی، نسائی اور شافعی نے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے ۔

لھا النساء (۱) — دیدے یہ ہے وہ (طلاق اور) عدت کا طریقہ جس کے مطابق اللہ نے (عورتوں کو طلاق دینے (اور عدت گذارنے) کا حکم فرمایا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اللہ کے حکم" سے مراد قرآن کا یہ حکم ہے ارشاد ہے :-

یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن	اے نبی جب تم (اور تمہاری اُمت) اپنی عورتوں (بیویوں) کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت کے اعتبار سے (حالت طہر میں) طلاق دو۔

(دیکھئے حدیث کا یہ صریحی حکم قرآن میں اسی صراحت کے ساتھ موجود ہے)

(ب) فاطمہ بنت قیس کی حدیث[۲] میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے لئے (ایام عدت میں) سکونتی مکان اور نفقہ تجویز نہیں فرمایا جبکہ ان کے شوہر نے ان کو طلاق بائن دیدی تھی ۔ حالانکہ طلاق بائن والی عورت کا حق یہ ہے کہ اس کو (عدت میں) سکونت کے لئے مکان ضرور دیا جائے نفقہ چاہے نہ بھی دیا جائے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فاطمہ گھر والوں کے ساتھ بہت بدکلامی اور زبان درازی کرتی تھیں (۳)، (اسی لئے آپ نے اُن کے لئے دوسرا مکان تجویز فرمایا تھا)

لہذا حدیث کا یہ حکم قرآن کے اس حکم ہی کی تفسیر ہے (اور قرآن اس پر مشتمل ہے) ارشاد ہے :-

فلا یخرجن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینہ	پس وہ (مطلقہ عورتیں مکان عدت سے) نہ نکلیں سوائے اس صورت کے کہ کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔

(اس حدیث نے بتلایا کہ گھر والوں کے ساتھ بدکلامی اور بدزبانی فاحشۃ مبینہ کا مصداق ہے)

(ج) سُبَیعہ اَسلمیہ کی حدیث میں آیا ہے کہ ان کے شوہر کی وفات کے پندرہ[۱۵] روز بعد ہی ان کے بچہ پیدا ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتلایا کہ : تم حلال ہوگئیں (۴) (یعنے عدت پوری

---

(۱) یہ حدیث کتب صحاح ستہ میں بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ موجود ہے ۱۲ (۲) بخاری کے علاوہ تمام کتب صحاح ستہ میں یہ حدیث موجود ہے ۔ ۱۲۔ (۳) جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت عائشہ نے اسی حق سکونت

(باقی صفحہ ۲۹۶ پر)

ہوگی اب تم جس سے چاہو نکاح کرسکتی ہو

تو اس حدیث نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی مراد بتلائی ہے (اسی لئے یہ قرآن کے تحت داخل ہے) ارشاد ہے۔

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا	جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں اپنے پیچھے چھوڑ جائیں ان کی بیویوں کو چاہیئے کہ وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں (یعنے انتظار کریں اور کسی سے نکاح نہ کریں کہ وہ عدت میں ہیں)

حدیث سے معلوم ہوگیا کہ یہ چار مہینہ دس دن کا قرآنی حکم غیر حاملہ عورتوں کے ساتھ خاص ہے اور قرآن کریم کا حکم حاملہ عورتوں کے لئے یہ ہے:

واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن	حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے

اور یہ حکم مطلقہ وغیر مطلقہ تمام عورتوں کے لئے عام ہے۔

اس قسم کی حدیثیں (جن کے احکام، قرآن عظیم کی آیات میں تفصیلی طور پر مذکور ہیں) اگرچہ کثرت سے ملتی ہیں لیکن قرآن کریم کی (صریح آیات احکام) اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہیں کہ حدیث وسنت کے تمام احکام کی ایک ایک کرکے آیات قرآن کے ساتھ تطبیق کی گنجائش نکل آئے اگرچہ انتہائی دقت نظر اور باریک بینی سے کیوں نہ کام لیا جائے — اور نصوص قرآن کا عربی انداز بیان اور لطیف اشارات بھی اس کے متحمل ہوسکیں۔

چنانچہ امام شاطبی فرماتے ہیں:-

اس کا پہلا ثبوت — کہ حدیث کے منصوص احکام کا تفصیلی طور پر نصوص

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۵) سے محروم کئے جانے کی ایک اور وجہ یہی بتلائی ہے (۴) سوائے ابوداؤد کے باقی کتب ستہ میں یہ حدیث آئی ہے ۱۲۔

قرآن کے تحت داخل کرنا دشوار ہے ۔ نماز، حج، زکوٰۃ، حیض ونفاس، لقطہ، مضاربت، مساقات، قسامت اوران جیسے امور (کے بے شمار احکام حدیث وسنت میں جو قرآن میں اسطرح تفصیلی طور پر مذکور نہیں ہیں (کہ ان کو ان احکام پر تفصیلی طور سے منطبق کیا جاسکے)

لہٰذا جو شخص بھی احکام حدیث وقرآن کے اس تفصیلی انطباق کا التزام کرتا ہے وہ کبھی بھی اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور اس دعوے کو ثابت نہیں کرسکتا بجز اس کے کہ وہ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے تکلف ایسے طریقے اختیار کرے جن کو عرب کا کلام ہرگز قبول نہیں کرتا اور نہ ہی سلف صالحین اور علماء راسخین اس جیسے طریقوں کو گوارا کرسکتے ہیں (۱)

یہی پانچ طریقے وہ اہم ترین مسلک ہیں جن کو علماء نے اس دعوے کے ثابت کرنے کے لئے دلیل کے طور پر اختیار کیا ہے کہ "قرآن سنت وحدیث کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے اور یہ کہ تمام حدیث وسنت کا ذخیرہ قرآن کے زیر سایہ سمٹا ہوا ہے"

دراں حالیکہ ان میں سے بعض انتہائی عمومی مسلک ہیں جیسا کہ آپ (پہلے طریقہ کے بیان میں) پڑھ چکے ہیں کہ قرآن سنت وحدیث پر عمل کے فرض ہونے کا حکم دیتا ہے (لہٰذا حدیث وسنت کے تمام احکام قرآن کے اس حکم کے تحت داخل ہیں چاہے قرآن میں مذکور ہوں چاہے نہ ہوں)

اور بعض مسلک کسی ایک لڑی ہی میں تمام احکام کو نہیں پروتے بلکہ اپنے اختیار کردہ طریق کے مطابق ہر حدیث کے حکم کو قرآن کے کسی نہ کسی مجمل یا مختصر یا مبہم حکم کے تحت داخل کرتے ہیں (جیسا کہ دوسرے طریقہ کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں)

اور بعض صرف (حدیث کے احکام کو قرآنی احکام کے تحت داخل کردینے کی) گنجائش اور وسعت پیدا کردینے پر اکتفا کرتے ہیں (جیسا کہ تیسرے اور چوتھے طریقہ کے بیان میں آپ پڑھ چکے ہیں اور پانچواں طریقہ تو آپ پڑھ چکے ہیں سے ہے ہی ناکافی)

---

(۱) الموافقات ج ۴ ص ۲۵ - ۱۲

محاکمہ بہتر یہ ہے کہ آپ (کسی ایک طریقہ پر انحصار کرنے کے بجائے) ان پانچوں طریقوں کو مجموعی طور پر (احکام حدیث وسنت کو قرآن کے تحت داخل کرنے کا) طریقہ قرار دیں کہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں (یعنی تمام احکام حدیث وسنت ان میں سے کسی نہ کسی طریقہ پر ضرور قرآن کے تحت داخل ہوجاتے ہیں)

اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ پانچوں طریقے سنت وحدیث کے تمام احکام کو — حتیٰ کہ ان احکام کو بھی جو بالکل نئے ہیں — قرآن کی نصوص (صریح آیات) کے تحت داخل کر دینے کے کفیل ضرور ہیں۔

اور اسی طرح قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کی تفسیر بھی بہترین اور لطیف ترین صورت میں پوری ہو جاتی ہے ارشاد ہے :

ما فرطنا فی الکتاب من شیٔ	ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (سب کچھ بیان کردیا ہے)

سُنت وحدیث میں بیان شدہ قصّوں اور واقعات کی حیثیت

سنت وحدیث کے ذخیرہ میں سے ان احادیث کے متعلق بحث باقی رہجاتی ہے جو واقعات، قصوں مثالوں اور نصیحتوں کے انداز میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ان میں سے بعض حدیثیں تو قرآن حکیم کے قصص وواقعات کی تفسیر وتشریح کرتی ہیں۔ مثلاً وہ حدیثیں جو آیت کریمۂ ذیل کی تفسیر میں بنی اسرائیل کے واقعات کے سلسلہ میں آئی ہیں۔ ارشاد ہے :۔

وادخلوا الباب سجدا	دروازے میں جھکے ہوئے داخل ہونا

حدیث میں آیا ہے :۔

دخلوا یزحفون علی استاھھم	وہ سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے (۱)

اسی طرح آیت کریمہ :۔

فبدل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لھم	ان ظالموں نے جو بات اُن سے کہی گئی تھی اسکو دوسری بات سے بدل ڈالا۔

---

(۱) اس حدیث کو بخاری، مسلم اور ترمذی نے بیان کیا ہے

کی تفسیر میں حدیث میں آیا ہے ۔

قالوا حبة فی شعیرة (۱) جو میں دانہ کہتے ہوئے داخل ہوئے

اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں پیش کی جاسکتی ہیں ۔

اس قسم کی بعض احادیث ایسی بھی ہیں جو نہ قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر کرتی ہیں نہ ہی ان میں کسی عقیدہ یا عمل کے مکلف بنانے کا حکم مذکور ہے ایسی حدیثوں کے لئے لازم نہیں کہ وہ قرآن میں ضرور ہی مذکور ہوں تاہم چونکہ اس قسم کی حدیثوں کے قصے یا واقعات قرآنی قصوں کے انداز میں عبرت کے لئے یا ترغیب و ترہیب کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں اس لئے ان حدیثوں کا شمار پہلی قسم میں ہو سکے گا جیسے وہ طویل حدیث جس میں ایک گنجے ایک کوڑھی اور ایک اندھے کا قصہ بیان کیا گیا ہے یا وہ حدیث جس میں جُرَیج نامی راہب کا واقعہ مذکور ہے یا وہ طویل حدیث جس میں تین آدمیوں کے ایک غار میں پناہ لینے کے وقت پھنس جانے کا قصہ مذکور ہے ۔

---

(۱) بخاری وغیرہ نے اس حدیث کو بیان کیا ہے

فصل سوم

قرآن کریم سے سنت و حدیث کے، اور سنت و حدیث سے قرآن کریم کے منسوخ ہونے یا نہ ہونے کی بحث

سنت و حدیث میں نسخ علما کے درمیان اس امر میں تو مطلق اختلاف نہیں کہ قرآن کریم کا ایک حکم، قرآن حکیم ہی کے دوسرے حکم سے منسوخ ہو سکتا ہے، بجز ابو مسلم اصفہانی کے نظریہ کے جو قرآن حکیم میں سرے سے نسخ کے وجود ہی کا منکر ہے۔ اس امر کی تحقیق کے لئے کہ قرآن حکیم میں نسخ واقع ہے یا نہیں؟ یہ کتاب موزوں مقام نہیں ہے (یہ ایک مستقل بحث ہے جس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی مراجعت کی جائے)

علما کے درمیان اس امر میں بھی مطلق اختلاف نہیں کہ ایک حدیث کے حکم سے دوسری حدیث کا حکم منسوخ ہو سکتا ہے اتنا ضرور ہے کہ اگر منسوخ حدیث متواتر ہے تو ناسخ حدیث کے لئے بھی متواتر ہونا شرط ہے اور اگر منسوخ حدیث اخبار آحاد میں سے ہے تو وہ احادیث آحاد و متواتر دونوں سے منسوخ ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال میں بہت سی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جن میں سے ایک حدیث[1] یہ ہے کہ

---

[1] اس حدیث میں خوبی یہ ہے کہ اس میں منسوخ اور ناسخ دونوں حکم مذکور ہیں۔ ۱۲ محشی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے تم کو قبروں کی زیارت کے لئے جانے سے منع کیا تھا سنو! (وہ حکم منسوخ ہوگیا) اب تم قبروں کی زیارت کے لئے جایا کرو (۱)

نسخ کے سلسلہ میں اصل اختلاف دو مسئلوں میں ہے:

اول:۔ کتاب اللہ (قرآن) کے حکم سے حدیث کا حکم منسوخ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

دوم:۔ حدیث کے حکم سے کتاب اللہ کا حکم منسوخ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

ہم یہاں ان دونوں مسئلوں پر مختصراً بحث کرتے ہیں جو حضرات تفصیل کے خواہاں ہوں وہ کتب اصول فقہ کی طرف مراجعت فرمائیں۔

(۱) کتاب اللہ کے حکم سے حدیث کے حکم کا منسوخ ہونا

(الف) جمہور علما کا کہنا ہے کہ یہ نسخ (عقلاً) جائز بھی ہے اور ہوا بھی ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ منجملہ ان کے (۱) ایک مثال یہ دیتے ہیں کہ:۔

دیکھئے! (قرآن کریم میں) استقبال کعبہ کے حکم سے بیت المقدس کی طرف (نماز میں) رُخ کرنے کا حکم منسوخ ہوگیا۔ اس لئے کہ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ ہجرت کرکے آنے کے ابتدائی زمانہ میں دس سے اوپر کچھ مہینوں تک (سترہ مہینے تک رسول اللہ کے حکم سے ہی) بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی ہے۔ دراں حالیکہ استقبال بیت المقدس سے متعلق کوئی صریح حکم قرآن کریم میں مذکور نہیں ہے اس کے بعد قرآن کریم کی آیت کریمہ ذیل سے یہ حکم منسوخ ہوگیا:۔

قد نری تقلب وجهك فی السماء فلنولينك قبلة ترضاها فول وجهك شطر المسجد الحرام (۲)	ہم تمہارا چہرہ (بار بار) آسمان کی طرف اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں سو ہم ضرور تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو تم کو پسند ہے۔ تو (لو) اب تم اپنے چہرہ کو مسجد حرام کی جانب پھیر لو۔

---

(۱) اس حدیث کو مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے قریب قریب یکساں الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(۲) البقرہ ۱۴۴۔

(۲) دوسری مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ صُلح حدیبیہ میں طے پایا تھا کہ قریش کا جو آدمی بھی مسلمان ہو کر مدینہ آئے گا اس کو واپس قریش کے پاس ضرور بھیج دیا جائے گا لیکن پھر عورتوں کے حق میں (قرآن کریم کے حکم سے) یہ شرط منسوخ ہو گئی اس لئے جو مسلمان عورتیں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آجاتی تھیں ان کو اس اندیشہ کی بنا پر کفار قریش کے پاس واپس نہیں کیا جاتا تھا کہ کہیں ان کا دین و ایمان اور عزت و آبرو خطرہ میں نہ پڑ جائے تو دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئے ہوئے اس معاہدہ کی یہ شرط قرآن کریم کی آیت ذیل سے منسوخ ہو گئی :۔

یا ایہا الذین آمنوا اذا جاء کم المومنات مہاجرات فامتحنوھن اللہ اعلم بایمانھن فان علمتموھن مومنات فلا ترجعوھن الی الکفار لا ھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن (۱)	اے ایمان والو! جب ایمان والی عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آیا کریں تو ان کا امتحان لے لیا کرو۔ (کہ وہ واقعی مسلمان ہو کر آئی ہیں یا کسی اور غرض سے) اور (حقیقت میں تو) اللہ ہی ان کے ایمان کو جانتا ہے پس اگر تم کو تحقیق ہو جائے کہ وہ ایمان والیاں ہیں، تو ان کو (معاہدہ کے تحت) کافروں کو واپس نہ کرو نہ وہ (مسلمان عورتیں) کافروں کے لئے حلال ہیں نہ وہ (کافر مرد) ان (مسلمان عورتوں) کے لئے حلال ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

غرض اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں ۔

(ب) لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں :

سنت و حدیث کا کوئی حکم قرآن کے کسی حکم سے منسوخ نہیں ہوتا

امام شافعی کے اس نظریہ کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ :۔

اگر قرآن سے حدیث کے منسوخ ہونے کو مان لیا جائے گا تو دشمنان رسول اس کو یوں تعبیر کریں گے کہ "خدا نے رسول کے حکم کو پسند نہیں کیا اس لئے اس کو بدل دیا" حالانکہ یہ وہ بات ہے جو نہ کسی مسلمان نے کبھی اور نہ ہی کسی کے خیال میں آئی ہو گی (گویا امام شافعی نے صرف دشمنوں کے طعنوں سے بچنے کے لئے یہ

---

۱ الممتحنہ ۶۰ : ۱۰

نظریہ اختیار (کیا ہے) حالانکہ امام کی شان سے یہ قطعاً بعید ہے)

لیکن درحقیقت امام شافعی کے اس نظریہ کو اختیار کرنے کی صحیح وجہ وہ ہے جو خود انھوں نے الرسالہ میں بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں :

اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو آپ کی سنت کے سوا اور کوئی منسوخ نہیں کرسکتا اور بالفرض اللہ جل شانہٗ اپنے رسول کے لئے کسی مسئلہ میں کوئی ایسا نیا حکم دیں جو اُس سے مختلف ہو جو رسول نے اس سے پہلے (اللہ ہی کے حکم سے) نافذ کیا ہوا ہے تو لازمی طور پر پہلے اپنے رسول کو اس نئے حکم سے آگاہ فرمائیں گے تاکہ رسول لوگوں کو بتلائیں کہ یہ میری سنت کا نیا حکم ہے جو اس سے پہلی سنت کے حکم کے لئے ناسخ اور اس سے مختلف ہے اس لحاظ سے ناسخ حکم بھی سنت ہی کا ہوگا اور منسوخ حکم بھی سنت ہی کا ہوگا [1]

امام شافعی نے اپنے اس نظریہ کے دلائل حسب ذیل بیان کئے ہیں :

اگر یہ کہنا جائز ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں سنت نافذ کی تھی پھر آپ کی وہ سنت قرآن سے منسوخ ہو گئی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی قولی یا فعلی سنت منقول نہ ہو جس نے اس حکم کو منسوخ کیا ہو تو۔

(۱) اس صورت میں ان تمام بیوع کے بارے میں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام فرمایا ہے، یہ کہنا بھی جائز ہوگا کہ ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] حاصل یہ ہے کہ قرآن چونکہ رسول ہی پر نازل ہوتا ہے اس لئے قرآن کے نئے حکم کا علم بھی سب سے پہلے رسول ہی کو ہوگا اور اس نئے حکم کو لوگوں کے سامنے رسول ہی اپنی قولی یا فعلی یا تقریری سنت کے ذریعہ بیان کریں گے لہذا قرآن سنت کے لئے ناسخ نہیں ہوا بلکہ سنت ہی سنت کے لئے ناسخ ہوئی بالفاظ دیگر قرآن کریم میں کسی ایسے حکم کا ذکر جو سنت و حدیث کے حکم سے مختلف یا متناقض ہو نسخ کی دلیل اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی قولی یا فعلی سنت کے ذریعہ نہ بتلائیں کہ یہ حکم پہلے حکم کے لئے ناسخ ہے یہی آیت کریمہ : لتبین للناس ما نزل الیہم کا تقاضہ اور مقام رسالت کا مقتضیٰ ہے۔ قرآن ایک حکم کو منسوخ کرے اور نبی کو اس کی خبر نہ دے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا نہ ہی عقل اس کو باور کرتی ہے۔ ۱۲ محشی

نے ان بیوع کو قرآن کی آیت کریمہ ذیل کے نازل ہونے سے پہلے حرام کیا ہو اور پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کی اس آیت کے ذریعہ ان کو حلال کر دیا ہو۔ آیت کریمہ یہ ہے

احل اللہ البیع وحرم الربا — اللہ نے بیع (خرید و فروخت) کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے (البقرہ ۲۷۵)

(لہٰذا وہ حدیث کی تمام حرام کردہ بیوع جائز ہو جانی چاہئیں)

(۲) اور اسی احتمال کی بنا پر شادی شدہ زانیوں کا حکم یعنے رجم جو حدیث میں مذکور ہے آیت کریمہ ذیل سے منسوخ ہو جانا چاہیئے (کہ ممکن ہے رجم کا حکم آپ نے اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے دیا ہو پھر اس آیت کے نزول کے بعد منسوخ ہو گیا ہو)

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ (النور ۲) — زانی مرد اور زانی عورت پس ان میں سے ہر ایک کے سو کوڑے مارو

(اس لئے کہ یہ آیت کریمہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کے لئے عام ہے لہٰذا شادی شدہ کے لئے رجم کا حکم اس آیت سے منسوخ ہو جانا چاہیے)

(۳) اور اسی احتمال کی بنا پر چرمی موزوں پر مسح کرنے کا حکم جو حدیث و سنت سے ثابت ہے آیت وضو کے نزول کے بعد منسوخ ہو جانا چاہیے (اس لئے کہ ممکن ہے کہ آپ نے یہ حکم آیت وضو کے نزول سے پہلے دیا ہو اور اس آیت نے۔ جس میں ہر صورت میں پیروں کے دھونے کا حکم ہے۔ اس حکم مسح کو منسوخ کر دیا ہو)

(۴) اور اسی احتمال کی بنا پر چور کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس چور نے غیر محفوظ چیز کو چرایا ہو وہ بھی سزا سے نہ بچنا چاہیئے (اور اس کے بھی ہاتھ کٹنے چاہئیں) اور اگر ربع دینار (چوتھائی دینار) سے کم مالیت کی چیز بھی چرائی ہو تو وہ بھی سزا سے نہ بچنا چاہیے (اور اس کے بھی ہاتھ کٹنے چاہئیں) اس لئے کہ محفوظ مال اور ربع دینار کی مالیت کی چیز پر ہاتھ کاٹنے کا حکم حدیث کا حکم ہے ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ احکام حد سرقہ کی آیت کے نازل ہونے سے پہلے جاری کئے ہوں

اور حدِ سرقہ کی آیت نے ان کو منسوخ کر دیا جو آیت یہ ہے:

السارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما (المائدة ۳۸)	چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو

اس لئے کہ اس آیت کریمہ میں لفظ سرقہ تھوڑے مال اور بہت مال دونوں کے لئے عام ہے اسی طرح مال محفوظ اور غیر محفوظ دونوں قسم کے مالوں کو شامل ہے۔

(۵) اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر اس حدیث کو جس کا حکم قرآن میں موجود نہ ہو یہ کہہ کر رد کیا جاسکے گا کہ آپ نے ہرگز نہیں فرمایا (ورنہ قرآن میں ضرور ہوتا)

(۶) اور انہی دونوں طریقوں[1] سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تمام سنتوں اور حدیثوں کو رد کیا جاسکے گا جو کتاب... کی کسی مجمل آیت کے تحت آتی ہوں مگر ان میں یہ احتمال ہو کہ ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب اللہ کے موافق ہوں یا موافق نہ ہوں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو تمام سنتیں اور حدیثیں ہمیشہ کتاب اللہ کے موافق ہی ہوتی ہیں۔

(۷) یا جبکہ ان میں ایسے الفاظ موجود ہوں جو کسی بھی طرح قرآن کے مخالف ہوسکتے ہوں۔

(۸) یا یہ احتمال ہو کہ حدیث کے الفاظ قرآن کے الفاظ سے زیادہ ہیں۔

(۹) یا یہ احتمال ہو کہ وہ کسی بھی طرح قرآن کے خلاف ہوسکتے ہیں۔

حالانکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں اس نظریہ کے قطعاً خلاف، اور ہمارے نظریہ کے مؤید ہیں (۱)

امام شافعی رحمہ اللہ کے دلائل اپنی جگہ ہیں لیکن علمائے شافعیہ میں سے بھی محققین جمہور علماء کے ساتھ

---

[1] دو طریقوں سے مراد ایک احتمال نسخ ہے اور دوسرا احتمال عدم موافقت ہے۔ مترجم

(۱) الرسالة: بتحقیق شیخ احمد شاکر مرحوم ص ۱۰۸ تا ۱۱۳ ـ ۱۲

ہیں (اور کتاب اللہ سے سُنت وحدیث کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں) اور امام شافعی کے مذکورہ بالا موقف کی مختلف طریقوں سے معذرت کرتے ہیں۔

(۲) کتاب اللہ کے کسی حکم کا سنت وحدیث سے منسوخ ہونا

اس مسئلہ میں علماء کی دو رائیں ہیں

(۱) ایک حنفیہ کا مسلک ہے ان کا کہنا ہے کہ کتاب اللہ کا حکم متواتر اور مشہور حدیث سے منسوخ ہو سکتا ہے لیکن اخبار آحاد سے منسوخ نہیں ہو سکتا۔

حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ متواتر حدیث تو قرآن کی طرح قطعی الثبوت ہوتی ہی ہے۔ حدیث مشہور بھی علماء حدیث کے حلقوں میں شہرت پانے اور ائمہ مجتہدین کے اس پر اپنے اجتہاد کی بنیاد رکھنے کی وجہ سے وہی قوت اور قطعیت حاصل کرلیتی ہے جو متواتر حدیث کو (تواتر کی بنا پر) حاصل ہوتی ہے اور یہ دونوں قسم کی حدیثیں بہرحال وحی غیر متلو ہیں اس لئے ان دونوں سے کتاب اللہ کے حکم کا منسوخ ہونا جائز ہے اس کی مثال میں حنفیہ چرمی موزوں پر مسح کی حدیث پیش کرتے ہیں جو حدیث مشہور ہے[۲] (کہ اس حدیث سے پیروں کے دھونے کا حکم منسوخ ہو گیا جو آیت وضو میں مذکور ہے)

دوسری مثال حدیث "لا وصیة لوارث — وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے — پیش کرتے ہیں کہ اس حدیث نے آیت کریمہ ذیل میں مذکور (والدین اور وارث قرابتداروں کے لئے) وصیت کو منسوخ کر دیا ارشاد ہے:۔

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت	جب تم میں سے کسی کو موت آئے تو اگر اس نے مال چھوڑا
ان ترک خیرا، الوصیة للوالدین	ہو تو اس پر ماں باپ اور قرابتداروں کے لئے وصیت
والاقربین بالمعروف (البقرة : ۱۸۰)	فرض کی گئی ہے قاعدہ کے مطابق۔

مذکورہ بالا ناسخ حدیث مشہور حدیث ہے اور ائمہ مجتہدین نے اس پر عمل کیا ہے (اور سب نے وارث کے لئے وصیت کرنے کو اسی حدیث کی بنا پر ناجائز کہا ہے) حتیٰ کہ امام شافعیؒ نے تو کتاب الام میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ حدیث متواتر ہے۔

---

(۲) امام سرخسیؒ نے اس حدیث مسح علی الخفین کو بروایت کرخی عن ابی یوسف اپنی اصول فقہ کی کتاب میں . . . نقل کیا ہے دیکھئے ج ۲ ص ۶۷

(۲) دوسرا مسلک جمہور علما کا ہے ان کا کہنا ہے کہ کتاب اللہ کا حکم حدیث سے منسوخ نہیں ہو سکتا خواہ وہ حدیث متواتر ہو یا خبر واحد۔ امام شافعیؒ نے جمہور علما کی طرف سے آیت کریمہ ذیل بطور دلیل پیش کی ہے۔ ارشاد ہے :-

ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا۔ (البقرہ : ۱۰۶)	ہم جس کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی جیسی آیت لے آتے ہیں (یعنی نازل کر دیتے ہیں)

اور حدیث (ظاہر ہے کہ) نہ قرآن سے بہتر ہوتی ہے اور نہ قرآن کے مثل (لہٰذا حدیث قرآن کو کسی بھی صورت میں منسوخ نہیں کر سکتی) دوسری دلیل آیت کریمہ ذیل پیش کی ہے ارشاد ہے :-

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی (یونس : ۱۵)	تم کہہ دو! میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اس (قرآن) کو اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی بھیجی جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل کی جاتی تھی آپ اسی کا اتباع کرتے تھے اس میں مطلق تبدیلی نہیں کرتے تھے اور نسخ تبدیل کر دینے کو ہی کہتے ہیں (لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ نے خود قرآن کے کسی بھی حکم کو قولی یا فعلی حدیث کے ذریعہ منسوخ نہیں فرمایا)

تیسری دلیل آیت کریمہ ذیل پیش کی ہے ارشاد ہے :

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم ولعلہم یتفکرون (النحل : ۴۴)	ہم نے یہ ذکر (قرآن) تم پر اُتارا ہے تاکہ تم وضاحت کے ساتھ بیان کر دو لوگوں کے سامنے جو ان کے لئے نازل کیا گیا ہے اور شاید وہ خود بھی غور و فکر کریں۔

تو اللہ پاک نے (اس آیت کریمہ میں) خبر دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن نازل ہوتا ہے آپ (اپنی قولی و فعلی احادیث میں) اسی کی وضاحت فرماتے ہیں تاکہ لوگ آپ کی وضاحت (اور بیانِ مراد) کے بعد اس وحی (قرآن) پر عمل کریں تو حدیث و سنت کے ذریعہ کتاب اللہ (قرآن) کا حکم منسوخ ہونے کو جائز قرار دینے کی صورت میں قرآن کریم کا یہ حکم (اور منشا) تو بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے اس لئے کہ حدیث سے قرآن کا حکم منسوخ ہو جانے کی صورت میں عمل ناسخ (یعنی حدیث کے حکم) پر ہو گا نہ کہ

(قرآن میں) نازل شدہ حکم پر۔

علاوہ ازیں حدیث سے قرآن کے منسوخ ہو سکنے کے نظریہ کا انکار کر دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن و تشنیع کرنے والوں کے طعنوں سے آپ کو بچانے کی نسبت زیادہ آسان ہے اور یہ متفقہ طور پر مسلم ہے کہ احکام شرعیہ کے بیان کرنے کے سلسلہ میں اُس طریقہ کو اختیار کرنا ضروری ہے جو طعن و تشنیع سے دور تر اور محفوظ تر ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جبکہ سُنت و حدیث سے کتاب اللہ کے حکم کے منسوخ ہونے کو مان لینے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ جائز قرار دیدیا گیا کہ آپ نسخ کے طور پر وہ حکم دے سکتے ہیں جو ظاہر میں نازل شدہ وحی (قرآن) کے خلاف ہو تو اس پر طعن و تشنیع کرنے والے لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت میں تو رسول ہی سب سے پہلے اس کلام اللہ کے خلاف کہنے والے اور خلاف کرنے والے ہوئے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے جو ان پر نازل ہوا ہے لہٰذا اس وحی منزل (قرآن) کے بارے میں آپ کی کسی بات پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے (کہ یہ وہی قرآن ہے جو اللہ نے اُتارا ہے اور پھر جیسے آپ خود اس کے خلاف کہتے اور کرتے ہیں تو دوسرا اگر ایسا کہتا یا کرتا ہے تو اس کو کافر کیوں کہا جاتا ہے)

اسی طرح جب آپ علانیہ کوئی بات کہتے (اور حکم دیتے ہیں) اور پھر اسی کے خلاف قرآن کی کوئی آیت (آپ لوگوں کے سامنے) پڑھتے ہیں تو فوراً طعن و تشنیع کرنے والے طعنہ دیتے ہیں کہ: محمد نے جو کہا تھا، اس کے رب نے ہی اس کی تکذیب کر دی تو ہم کیسے اس کی تصدیق کریں۔ خود اللہ تعالیٰ شانہٗ نے قرآن عظیم میں اسی طعنہ زنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ۔ واللہ اعلم بما ینزل۔ قالوا انما انت مفتر (النحل: ۱۰۱)	اور جب ہم ایک آیت (حکم) کی جگہ دوسری آیت (حکم) کو بدلتے ہیں۔ اور اللہ ہی خوب جانتا ہے اس کو جو اس نے اُتارا ہے۔ تو یہ لوگ (کفار) کہتے ہیں کہ: اس کے سوا نہیں کہ تم (اپنے رب پر) افترا کرنے والے ہو۔

تو اللہ جل شانہٗ کفار کے آپ پر اس الزام اور طعنہ کو آیت کریمہ ذیل کے ذریعہ دور فرماتے ہیں ارشاد ہے:-

قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق (النحل : ۱۰۲) — تم کہدو! اس (قرآن) کو روح القُدس (جبرئیل) نے تیرے پروردگار کی جانب سے برحق (ہو بہو) اُتارا ہے (جو تبدیلی کی ہے اسی نے کی ہے)

اس بیان سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ قرآن ہی کے کسی حکم سے قرآن کے ہی کسی حکم کو منسوخ ماننے کی صورت میں تو کسی طعن و تشنیع کی گنجائش نہیں ہے لیکن حدیث سے کتاب اللہ کے حکم کے منسوخ ہو سکنے کو مان لینے کی صورت میں طعن و تشنیع کی بہت کافی گنجائش رہتی ہے جیسا کہ آپ پڑھ چکے۔

اس لئے اس طعن و تشنیع کا سدباب ازبس ضروری ہے اور اس کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کا کوئی حکم حدیث سے منسوخ نہیں ہو سکتا یہی نظریہ تمام ممکنہ اعتراضات اور طعن و تشنیع سے محفوظ ہے۔

مصنف کی رائے

اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اس مسئلہ میں جمہور علماء کی رائے (اور نظریہ) حق کے زیادہ قریب ہے بلکہ جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یقینی طور پر کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملتی جس نے قرآن کو منسوخ کیا ہو۔ باقی حنفیہ نے جو چرمی موزوں پر مسح کی اور وارث کے حق میں وصیت کی حدیثیں پیش کی ہیں ان کا اس بحث (جواز و عدم جواز) سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے کہ اصل نزاع ـــ میری رائے میں ـــ اس نسخ کے جواز یا عدم جواز میں ہے (کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں)، نہ کہ وقوع یا عدم وقوع میں (کہ ایسا ہوا بھی ہے یا نہیں)؟ اس لئے کہ حنفیہ نے جو اس نسخ کے واقع ہونے کا دعویٰ کیا ہے (اور دلائل پیش کئے ہیں) وہ ان کے اس مدعا کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہیں کہ یہ دونوں نسخ حدیث و سنت کے ذریعہ ہی واقع ہوئے ہیں اور جو دلائل انھوں نے پیش کئے ہیں ان میں ہر غور و فکر کرنے والے کے لئے سرسری نظر میں بھی واضح ہوتا ہے کہ کافی نقد و جرح اور رد و قدح کی گنجائش ہے۔

حرفِ آخر

سنت و حدیث کے تشریعی مقام کے موضوع پر اس تمام تر بحث سے ہمارا جو مقصد تھا وہ یہاں پورا ہو جاتا ہے کہ سنت و حدیث کی جمع و تدوین کس طرح ہوئی، علماء نے حدیث رطب و یابس کی آمیزش سے پاک و صاف کرنے میں کیسی کیسی کاوشیں اور کوششیں کی ہیں اور گذشتہ یا موجودہ دور میں اس ذخیرہ حدیث کے متعلق جو شکوک و شبہات کئے گئے ہیں ان کو ہم

نے (اپنی بساط کے موافق) کما حقہ دور کر دیا نیز تشریع (قانون شریعت) میں سنت و حدیث کا مرتبہ و مقام اور قرآن عظیم کے ساتھ حدیث و سنت کا تعلق بھی بقدر ضرورت واضح کر دیا۔

اب ہم اس بحث (مقالہ) کو ایک مختصر سے خاتمہ پر ختم کرتے ہیں جس میں ہم سنت و حدیث ..... کے بارے میں ائمہ اربعہ مجتہدین کے موقف اور حدیث میں ان کے مرتبہ و مقام کو بتلانا چاہتے ہیں اور اسی کے ساتھ کتب صحاح ستہ کے مولفین کے مختصر حالات بھی بیان کریں گے اور حدیث کی ہر کتاب کا مختصر سا تعارف بھی پیش کریں گے۔

خاتمہ

ائمہ اربعہ مجتہدین اور کبار محدثین کے مختصر حالات

(۱) امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ
(۲) امام مالک علیہ الرحمۃ
(۳) امام شافعی علیہ الرحمۃ
(۴) امام احمد علیہ الرحمۃ
(۵) امام بخاریؒ
(۶) امام مسلمؒ
(۷) امام نسائیؒ
(۸) امام ابوداؤدؒ
(۹) امام ترمذیؒ
(۱۰) امام ابن ماجہؒ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام ابو حنیفہؒ

۸۰ ——— ۱۵۰

آپ کا نام نعمان، کنیت ابو حنیفہ ہے، سلسلہ نسب یہ ہے: ابو حنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی۔ چاروں اماموں میں آپ کی ولادت کا زمانہ بھی سب سے قدیم ہے اور روئے زمین کے مسلمانوں میں آپ کے پیرو بھی سب سے زیادہ ہوئے ہیں۔

آپ کوفہ میں پیدا ہوئے آپ کے سال پیدائش کے بارے میں مورخین کے تین قول ہیں، بعض نے ۶۱ھ آپ کا سال ولادت بتلایا ہے، بعض نے ۷۰ھ اور بعض نے ۸۰ھ۔ تیسرا قول (۸۰ھ) عام طور پر مشہور ہے اگرچہ بعض محققین، بعض اہم حوالوں اور روایتوں کی بنا پر دوسرے قول (۷۰ھ) کو ترجیح دیتے ہیں اور ان حضرات کے نزدیک انہی روایات بھی اعتماد قابل ترجیح ہے (۱)

آپ کی وفات بغداد میں ۱۵۰ھ کے اندر ہوئی۔ بغداد میں امام ابو حنیفہ کی قبر آج تک مشہور و معروف ہے اور اعظمیہ نامی بستی میں واقع ہے۔ یہ بستی امام اعظم کی طرف ہی منسوب اور زیارت گاہ خاص و عام ہے

پرورش اور تعلیم و تربیت

امام ابو حنیفہ نے کوفہ میں ہی پرورش پائی یہ کوفہ اس زمانہ میں اسلامی شہروں میں سب سے بڑا شہر تھا اور ہر گروہ اور ہر مکتب فکر کے علماء سے لبریز سب سے بڑا علمی مرکز تھا اور لغت، نحو، صرف اور ادب وغیرہ کے شہرہ آفاق

---

(۱) ان مورخین میں ایک محدث ابن حبان بھی ہیں۔ ابن حبان نے اپنی کتاب الضعفاء میں صرف اسی قول (۸۰ھ) کا ذکر کیا ہے اور بس۔ نیز ملاحظہ ہو شیخ کوثری کی تانیب الخطیب ص ۱۹ وما بعد۔۱۲

ائمہ کا سب سے زیادہ مشہور مقام تھا۔

امام ابوحنیفہ نے (عربی زبان و ادب تو آپ کا گھر یلو ورثہ تھا، علوم وفنون میں) ابتدا میں علم کلام حاصل کیا اور اس میں اتنی مہارت حاصل کی اور وہ مقام پیدا کیا کہ لوگ انگلیوں سے آپ کی طرف اشارے کیا کرتے تھے (کہ یہ ہیں علم کلام کے سب سے بڑے امام)۔ اس کے بعد آپ (مشہور محدث وفقیہ) حماد کے حلقہ درس سے وابستہ ہوگئے جو کوفہ کے تمام فقہاء کے شیخ تھے (اور علم حدیث وفقہ حاصل کرنا شروع کردیا) حماد کے حلقہ درس کا سلسلہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اس لئے کہ حماد نے ابراہیم نخعی سے علم (حدیث وفقہ) حاصل کیا اور ابراہیم نے علقمہ بن قیس سے اور علقمہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے (علم حدیث وفقہ حاصل کیا تھا) اس کے بعد (امام ابوحنیفہ کو علم حدیث وفقہ سے اور اپنے شیخ حماد سے اس قدر شغف ہوا کہ) آپ اپنے شیخ حماد کے حلقہ درس میں مستقل طور پر انتہائی پابندی کے ساتھ حاضر رہنے لگے اور یہ (تعلیم وتعلم کا) سلسلہ حماد کی وفات (۱۲۰ھ) تک برابر جاری رہا۔ اسی لئے حماد کے تمام تلامذہ اس پر متفق ہو گئے کہ ابوحنیفہ ہی کو حماد کا جانشین قرار دیا جائے لہٰذا کوفہ کے مکتب فکر کی ریاست وسیادت — جو مکتب "رائی" کے نام سے معروف ہے — امام ابوحنیفہ کے ہاتھ آگئی اور وہ پورے عراق کے فقہا کے بلا اختلاف امام تسلیم کرلئے گئے اور ساری دنیا میں آپ کی علمی اور فقہی شہرت کا چرچا پھیل گیا اور اس زمانہ کے علمی مراکز بصرہ، مکہ اور مدینہ کے شہرۂ آفاق علما اور ائمہ سے علمی ملاقاتیں ہونے لگیں اور جب عباسی خلیفہ منصور نے (پانچواں اسلامی مرکز) بغداد بسایا تو بغداد کے علما اور مشائخ سے بھی ملاقات ہوئی اور ان تمام علماء اور مشائخ سے خوب خوب علمی مباحثے اور مناقشے ہوئے اور ان مباحثوں میں ابوحنیفہ نے ان سرکردہ مشائخ سے اور ان مشائخ نے ابوحنیفہ سے علمی استفادہ کیا اور (اس دو طرفہ علمی افادہ و استفادہ کی بدولت، امام ابوحنیفہ کی علمی شہرت اس قدر پھیلی (اور اطراف واکناف علم سے تشنگان علم ابوحنیفہ کے حلقہ درس میں اس قدر جمع ہوئے) کہ ابوحنیفہ کا حلقہ درس نے ایک عظیم الشان مجلس علمی (اکیڈمی) کی شکل اختیار کرلی جس میں ایک طرف عبداللہ بن مبارک اور حفص بن غیاث جیسے کبار محدثین موجود ہوتے تو دوسری طرف ابو یوسف، محمد بن حسن، زفر اور حسن بن زیاد جیسے فقہا موجود ہوتے تھے تیسری طرف فضیل بن عیاض اور داؤد طائی جیسے عابد وزاہد اولیاء اللہ بھی اس علمی مجلس میں موجود

ہوتے تھے۔

ابو حنیفہ عبادت گزاری میں انتہائی اشتغال، معاملات میں انتہائی استقامت اور دنیا سے بے رغبتی اور کنارہ کشی کے ساتھ ساتھ ہی علمی امانت (حدیث وفقہ) کو اُمت تک پہونچانے کا فرض بھی انتہائی اہتمام کے ساتھ مرتے دم تک ادا کرتے رہے، خدا کی اس کے رسول کی اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی — کہ اسی کا نام دین ہے — ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہی یہاں تک کہ آپ آیت کریمہ:

یا ایتھا النفس المطمئنه ارجعی الی ربک راضیة مرضیه۔	اے مطمئن نفس تو اپنے رب کی طرف لوٹ آ تو اپنے رب سے راضی اور تیرا رب تجھ سے راضی

کے مطابق اس شان سے اپنے پروردگار سے جا ملے کہ خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔

امام ابو حنیفہ کے مسلک (تفقہ واجتہاد) کے اصول

امام بیہقی نے یحییٰ بن ضریس کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یحییٰ نے کہا کہ :-

> میں ایک دن سفیان کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا: آپ ابو حنیفہ سے کیوں ناراض ہیں؟ سفیان نے جواب دیا: (میں ابو حنیفہ سے کیوں ناراض ہوتا) اس کا قصور کیا ہے؟ میں نے تو ابو حنیفہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ: میں (فقہی مسائل میں) اول کتاب اللہ سے احکام لیتا ہوں، اگر وہاں حکم نہیں ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے لیتا ہوں اور اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں میں مجھے حکم نہیں ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے جس صحابی کے قول کو میں (مصالح شرعیہ کے) مناسب سمجھتا ہوں لے لیتا ہوں۔ اور جس قول کو مناسب نہیں سمجھتا چھوڑ دیتا ہوں لیکن تمام صحابہ کے اقوال کو چھوڑ کر کسی دوسرے کا قول کبھی نہیں اختیار کرتا۔ ہاں جب (تمام صحابہ کے اقوال میں کسی مسئلہ کا حکم نہیں ملتا اور) بات ابراہیم نخعی، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء اور سعید بن المسیب جیسے کبار تابعین — اور بھی کئی حضرات کے نام لئے — (کے اقوال وآراء) تک پہونچتی ہے تو (ان لوگوں کے اقوال بھی چونکہ ان کے اپنے اجتہاد پر مبنی ہوتے ہیں) تو میں بھی ایسے ہی (کتاب اللہ اور سنت

رسول اللہ کو سامنے رکھ کر اجتہاد کرتا ہوں جیسے انھوں نے اجتہاد کیا ہوتا ہے"[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ :-

اگر مجھے (کسی مسئلہ کے متعلق) کتاب اللہ میں حکم نہیں ملتا تو رسول اللہ کی سنت اور آپ سے مروی ان صحیح آثار و احادیث سے اخذ کرتا ہوں جو ثقہ راویوں کے ہاتھوں میں معروف و مشہور اور عام ہو ہیں۔ آخر تک۔

اُن مسائل میں ابوحنیفہ کے اجتہاد کا طریقہ جن میں نہ کتاب و سنت میں کوئی نص (صریح آیت یا حدیث) ملتی اور نہ صحابہ کا کوئی قول ملتا تو وہاں ابوحنیفہ اپنے قیاس سے کام لیا کرتے تھے۔ ابوحنیفہ کے قیاس کی قسموں میں سے ایک قسم استحسان بھی تھی جس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ :

استحسان، قیاس جلی کے مقابلہ میں قیاس خفی کا نام ہے۔

امام ابوحنیفہ کے خلاف عظیم ہنگامہ

تفقہ اور اجتہاد سے متعلق ابوحنیفہ کے مسلک کے یہ عام اصول ہیں۔ یہ اصول اجتہاد جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں — دوسرے ائمہ مجتہدین کے اجتہادی اصول کے ساتھ بالکل متفق (اور مطابق و موافق) ہیں، خاص کر (ائمہ اربعہ میں سے) باقی تین ائمہ مجتہدین مالک، شافعی، احمد کے اصول کے تو بالکل ہی موافق ہیں۔ اس لحاظ سے تو ابوحنیفہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کا نام فقہ و اجتہاد کی تاریخ میں رہتی دنیا تک تر و تازہ اور زندہ و تابندہ رہتا ان کی جلالت شان اور فقہ اسلامی کی عظیم تر خدمات کا علمی دنیا متفقہ طور پر اعتراف کرتی کہ ابوحنیفہ نے ہی تفقہ و اجتہاد کے اساسی ستونوں کو مضبوط بنایا ہے اور ابوحنیفہ ہی نے (اپنی علمی و فکری تربیت کے ذریعہ) اُمت کی رہنمائی کے لئے جلیل القدر فقہا اور مجتہدین پیدا کئے ہیں لیکن اس کے بالکل برعکس ہم دیکھتے یہ ہیں کہ اس جلیل القدر امام الائمہ کو ان کی زندگی میں ہی بے پناہ ہنگاموں کا نشانہ بنایا گیا اور ان کی وفات کے بعد بھی اس معاندانہ ہنگامہ آرائی کا سلسلہ جاری رہا ہے یہاں تک کہ ابوحنیفہ کے بارے میں مستقل طور پر دو گروہ صف آرا نظر آتے ہیں ایک تو وہ طبقہ جو ان کے تفقہ اور اہلیت اجتہاد میں فوقیت پر یقین رکھتا اور ان کے علم و فضل کا

---

(۱) مفتاح الجنۃ ص ۴۴۔

اعتراف کرتا ہے فقہ و اجتہاد میں ان کو یگانہ امام مانتا ہے یہ جمہور علماء و ائمہ مجتہدین کا گروہ ہے دوسرا طبقہ وہ ہے جو دراصل ابوحنیفہ کی اس عظمت وجلالت شان پر ان سے جلتا بھنتا ہے اور اُن پر کیچڑ اُچھالتا ہے اور ان سے ان کی فقہ سے لوگوں کو متنفر کرنے میں معروف ہے اور ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب و تربیت کردہ ائمہ کے متعلق بدگمانیاں پھیلانے میں منہمک ہے۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ اس طوفان بدتمیزی کا راز کیا ہے؟ اور یہ طعن و تشنیع کرنے والے کون لوگ ہیں؟

اس ہنگامہ آرائی کے اسباب

(۱) امام ابوحنیفہ اپنے زمانہ میں سب سے پہلے فقیہ تھے جنہوں نے (کتاب وسنت سے) فقہی مسائل کے احکام اخذ کرنے میں، اصول پر فروع کو مرتب کرنے میں، اور ایسے قیاسی مسائل کے احکام دریافت کرنے میں، جو (اگرچہ) اب تک وقوع میں نہیں آئے۔ (مگر پیش آسکتے ہیں) انتہائی وسعت اور ہمہ گیری سے کام لیا ہے۔ ان سے پہلے علما اور مجتہدین اس طرز (پر مسائل کے احکام بیان کرنے) کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس (قیاسی مسائل کے احکام دریافت کرنے کے) کام کو وقت برباد کرنے کے مرادف سمجھتے تھے اور ان کے خیال کے موجب فقہا کا یہ مشغلہ ایک ایسا مشغلہ تھا جس میں کوئی دینی فائدہ نہیں۔ چنانچہ زید بن ثابت کا یہ معمول تھا کہ جب اُن سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ پہلے یہ پوچھتے کہ: یہ مسئلہ پیش بھی آیا ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ملتا تو وہ فرماتے: "پیش تو آنے دو" (جب پیش آجائے تب پوچھنا اور جواب نہ دیتے) لیکن امام ابوحنیفہ کا طریق کار اس سے مختلف تھا ان کے خیال کے بموجب ایک مجتہد کا فریضہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کے لئے فقہ یعنی استنباط مسائل کا راستہ ہموار کرے ایک مجتہد کے سامنے وہ مسائل و واقعات بھی موجود رہنے چاہئیں جو اگرچہ ابھی تک پیش نہیں آئے لیکن وہ پیش آسکتے ہیں۔ ذیل میں ہم امام کے نقطۂ نظر کو ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں جیسا کہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں (ج ۱۳ ص ۳۴۸ پر) امام کا بیان نقل کیا ہے:-

> قتادہ جب بھی کوفہ پہونچتے ابوحنیفہ ان کی خدمت میں آتے اور ان سے خطاب کرکے کہتے: اے ابوالخطاب! ایک مسئلہ بتلایئے ایک شخص اپنی بیوی کو چھوڑ کر کہیں باہر چلا جاتا ہے اور چند سال تک غائب رہتا ہے، اس کی بیوی یہ سمجھ لیتی ہے کہ اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا! اور دوسرے شخص سے نکاح

کر لیتی ہے اسی اثنا میں اس کا پہلا شوہر واپس آجاتا ہے تو اس کے مہر کے بارے میں آپ کا فتویٰ کیا ہے؟ — امام ابو حنیفہ اس سے پہلے اپنے حلقہ درس کے شاگردوں کو بتلا چکے تھے کہ اگر قتادہ (اس مسئلہ کے بارے میں) کوئی حدیث بیان کریں گے تو وہ جھوٹی اور بے اصل ہوگی اور اگر اپنی رائے سے فتویٰ دیں گے تو غلطی کریں گے — اس پر قتادہ نے کہا: خدا تمہارا بھلا کرے پہلے یہ تو بتلاؤ کہ یہ مسئلہ پیش بھی آیا ہے یا نہیں؟ جواب ملا: نہیں۔ تو قتادہ نے کہا: تم مجھ سے ایسا مسئلہ کیوں دریافت کرتے ہو جو پیش ہی نہیں آیا؟ امام ابو حنیفہ نے کہا: ہم مصیبت کے آنے سے پہلے اس کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتے ہیں تاکہ جب وہ مصیبت پیش آئے تو ہم اس میں داخل ہونے اور اس سے باہر آنے کا راستہ سے واقف اور باخبر ہوں[1]

اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ کا مکتب فکر ارأیتیین کے نام سے مشہور ہو گیا تھا یعنے اس مکتب فکر کے پیرو متوقع مسائل کو واقع فرض کر کے اس طرح سوال کرتے ہیں: اگر ایسا مسئلہ پیش آجائے تو اس کے بارے میں آپ کا فتویٰ کیا ہے؟ اور اگر ایسا ہو جائے تو اس میں آپ کی کیا رائے ہے؟

چنانچہ ایک مرتبہ امام مالک رحمہ اللہ کے کسی شاگرد نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا آنحضرت نے بتلا دیا اس شاگرد نے پھر پوچھا: اگر ایسا ہو تو آپ کی کیا رائے ہے؟ تو اس پر امام مالک کو غصہ آگیا اور فرمایا: تم ارأیتیین میں سے تو نہیں ہو؟ عراق سے تو نہیں آرہے ہو؟

حافظ ابن عبد البر امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالک نے فرمایا:۔

میں نے اس حسنک حجاز کے علماء فقہا کو دیکھا ہے وہ (مسائل کی) اس کثرت

---

[1] امام کے اس حکیمانہ قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم کتاب وسنت کی روشنی میں ایسے واقعاتی مسائل پر غور وفکر کر کے ان کے احکام پہلے سے دریافت کر لینا اور ارباب فتویٰ کو بتلا دینا چاہتے ہیں جو اگرچہ ابھی پیش نہیں آئے مگر پیش آسکتے ہیں تاکہ جب وہ ہمارے سامنے آئیں تو ہم بآسانی ان کی جوابدہی کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ایک مجتہد ساز امام الائمہ کی شان یہی ہے۔ ۱۲ محشی

کو نا پسند کرتے ہیں جو آج کل لوگوں میں رائج اور عام ہو گئی ہے۔ ابن وہب کہتے ہیں: امام مالک کا اشارہ فقہی مسائل کی کثرت کی طرف ہے۔

اسی طرح حافظ ابن عبد البر کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں:

عام فقہا جو سنا کرتے یا جو ان کے علم میں آتا اسی کے متعلق فتوی دیا کرتے تھے۔ فقہی مسائل کے دریافت کرنے اور بتلانے کا یہ دستور اس وقت نہ تھا جو آج کل فقہا اور مفتیین کے حلقوں میں رائج ہے۔

اسی طرح حافظ ابن عبد البر نے عبد الملک بن مروان کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:-

عبد الملک بن مروان نے ایک دن امام ابن شہاب زہری سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو زہری نے جواب میں کہا: امیر المومنین! یہ پیش بھی آیا ہے یا نہیں؟ عبد الملک نے کہا: نہیں" تو ابن شہاب نے کہا: تو ابھی اسے رہنے دیجئے جب یہ مسئلہ پیش آئے گا تو اللہ تعالی اس کا حل بھی نکال دیں گے"۔ حافظ ابن عبد البر نے بسند خود امام شعبی سے — جو عراق میں حدیث کے مسلم امام تھے — ایک روایت نقل کی ہے شعبی فرماتے ہیں:

واللہ لقد بغض هؤلاء القوم الی المسجد حتی لهوا بغض الی من کناسة داری قلت من هم یا ابا عمرو قال الارأیتون (کذا ولا اصل ولعل صوابها الارأیتیون) قال ومنهم الحکم والحماد واصحابهم الخ (۱) وحماد شیخ ابی حنیفه	بخدا ان لوگوں نے تو میرے لئے مسجد میں آنا بھی دوبھر کر دیا ان (کے ہجوم) کی وجہ سے اب تو مسجد مجھے گھر کے کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ سے بھی زیادہ بری لگتی ہے میں نے پوچھا: اے ابو عمرو کن لوگوں نے؟ شعبی نے جواب دیا: ارائیوں نے (اصل کتاب میں یہی لفظ ہے غالبا صحیح الارأیتیون ہے) اور کہا انہی لوگوں کے زمرہ میں حکم، حماد اور ان کے شاگرد ہیں۔ مصنف کہتے ہیں: یہ حماد ہی ابو حنیفہ کے شیخ ہیں۔

حافظ ابن عبد البر نے امام شعبی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

ما کان البغض الی من ارأیت (۲)

---

(۱) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۳ - ۱۲ (۲) ایضاً ۱۲

حالانکہ (فقہ کے اصول و فروع کی) تفریع میں کلیات و جزئیات کی تنقیح میں، اور نو بنو مسائل کے احکام کے استنباط میں ابو حنیفہ کے طریق کار کی اسی ہمہ گیر توسع کے نتیجہ میں فقہ حنفی کے مسائل کی تعداد بہت بڑی حد تک پہونچ گئی، ھدایہ کی شرح العنایۃ کے مصنف نے فقہ حنفی کے مسائل کی تعداد بارہ لاکھ ستر ہزار ۱۲۷۰۰۰۰ بتلائی ہے (۳) یہ بڑی بھاری تعداد ہے اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ اس تعداد کے بیان میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے تب بھی (اس کے بجائے) جو کم سے کم تعداد بھی ثابت ہو، وہ بھی اُس سے بہت زیادہ ہوگی جو ائمہ مجتہدین میں سے کسی بھی امام سے مروی ہیں وہاں حالیکہ امام ابو حنیفہ کے بعض طعن و تشنیع کرنے والے اتنی کثرت سے فقہی مسائل اخذ کرنے پر جھنجھلاتے اور اپنے دل کا غبار یہ کہہ کر نکالتے تھے[۱]:

هو اجهل الناس بما كان	ابو حنیفہ پیش آمدہ مسائل میں سب سے زیادہ جاہل تھے
واعلمهم بما لم يكن (۴)	اور متوقع مسائل کے سب سے بڑے عالم تھے۔

(۲) امام ابو حنیفہ حدیثیں قبول کرنے میں (عام محدثین سے زیادہ) سختی برتتے تھے اور قبول حدیث کے لئے سخت سے سخت شرطیں لگاتے تھے اس تشدد کی وجہ صرف یہ تھی کہ (اس زمانہ میں) وضع حدیث کا فتنہ عام ہوگیا تھا کیونکہ ان کے زمانہ میں عراق (عالم اسلام کی تمام) ذہنی اور فکری نیز انقلابی اور فوجی تحریکوں کا مرکز بنا ہوا تھا اس لحاظ سے عراق کی سرزمین وضع حدیث کے لئے نہایت زرخیز زمین اور وضاعین حدیث کے لئے خوش آیند چھپنے والی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی یہی صورت حال امام ابو حنیفہ کے لئے قبول حدیث میں خصوصی تثبت اور احتیاط برتنے کی محرک بنی تھی وہ صرف انہی حدیثوں کو قبول کرتے تھے جو ثقہ (اور قابل اعتماد) راویوں کے درمیان متداول اور معروف ہوتی تھیں (جن میں موضوع ہونے کا احتمال نہیں ہوتا تھا) اس لحاظ سے عام محدثین نے قبول حدیث میں جس احتیاط اور شدت سے کام لیا ہے ابو حنیفہ اس باب میں اُن سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے یہی احتیاط کوشی اور اور سخت گیری امام ابو حنیفہ کے لئے اس کا داعی ہوئی کہ جو حدیثیں عام محدثین کے نزدیک صحیح اور قابل

---

(۳) النکت الطریفۃ ص ۲۵؛ (۴) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۸ - ۲؛

[۱] سچ کہا ہے: الناس أعداء لما جهلوا۔ لوگ جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہوتے ہیں۔ محشی

قبول ہوتی تھیں ابوحنیفہ ان کو بھی ضعیف قرار دے دیا کرتے تھے۔

(۳) (ایک طرف تو یہ تشدد تھا) اور دوسری طرف امام ابوحنیفہ (عام محدثین کے برخلاف) ان مرسل حدیثوں سے استدلال کرنے کو بھی جائز قرار دیتے تھے، جن کے مرسل روایت کرنے والے راوی خود ثقہ (اور قابل اعتماد) ہوتے تھے یہ طرز عمل جمہور محدثین کے بالکل خلاف تھا ان کے ہاں مرسل حدیث مردود و متروک تھی یہی وجہ تھی کہ امام ضعیف ایسی مرسل احادیث سے بھی استدلال کر لیا کرتے تھے جو محدثین کے نزدیک (مرسل ہونے کی وجہ) ضعیف ہوتی تھیں جن پر (محدثین کے نزدیک) عمل نہیں کیا جا سکتا تھا (محدثین کی مخالفت اور پرخاش کی یہ بڑی وجہ تھی)

(۴) حدیث پر عمل کے دائرہ یا اس تنگی کا ان شرائط کی حدود میں رہتے ہوئے جو ابوحنیفہ نے خود قائم کر رکھی تھیں اور انہی سے وہ (عمل بالحدیث کے معاملہ میں) مطمئن تھے ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انہیں (فقہی مسائل میں) قیاس کی طرف رجوع کرنا اور کثرت سے رائے کو کام میں لانا پڑتا تھا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ابوحنیفہ کو اس سلسلہ میں ایسا عجیب و غریب بلکہ اور ایسی بے مثل اور نادر اہلیت وصلاحیت عطا فرمائی تھی جو دوسرے فقہا کو میسر نہ تھی۔ اور بلاشبہ ابوحنیفہ کے قیاس کو اس قدر وسعت دے کر استعمال کرنا ہی ابوحنیفہ اور محدثین کے درمیان بعد اور فاصلوں کو بعید سے بعید تر بنا دینے کا باعث بن گیا جیسا کہ یہی امر (یعنی قیاس کو اتنی وسعت دینا) ابوحنیفہ اور ان فقہا کے درمیان جو قیاس سے انتہائی مجبوری کے وقت کام لینے کے قائل تھے بعد کا باعث بنا تھا اور یہ بعد ہی ان حضرات محدثین اور فقہا کے اور ابوحنیفہ کے درمیان اختلافات اور ہنگامہ آرائی کا باعث بنا تھا)

(۵) (فقہی احکام کے) استنباط میں ابوحنیفہ کا مسلک عجیب و غریب باریک بینی اور دوررس نکتہ آفرینی پر مبنی تھا کہ وہ ہر مسئلہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ استدلال اور استنباط حکم کی مختلف صورتیں اول بدل کر دینے پر اس قدر قدرت رکھتے تھے کہ (نہ صرف محدثین و فقہاء عصر بلکہ) ان کے قریب تر تلامذہ بھی حیران و ششدر رہ جاتے تھے۔

چنانچہ ابن ابی العوام نے اپنی سند سے جو محمد بن الحسن تک پہونچتی ہے روایت کیا ہے کہ محمد بن الحسن نے بیان کیا کہ :-

امام ابوحنیفہ کے بغداد تشریف لانے کی خبر پہونچی تو ان کے تلامذہ اکٹھے

ہوئے اِن تلامذہ میں ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو اور ان کے علاوہ ابوحنیفہ کے قدیم نقہا، تلامذہ بھی شامل تھے تو ان سب نے (باہمی غور و فکر اور بحث و مباحثہ کے بعد) ایک ایسا مسئلہ (امام کے سامنے پیش کرنے کے لئے) تجویز کیا اور اس کی تائید و تقویت کے لئے بہت سی دلیلیں بھی جمع کیں اور اس کو پیش کرنے کے لئے بھی عجیب غریب اور انوکھی صورت تجویز کی (اور آپس میں کہنے لگے) کہ امام کے آتے ہی ہم ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھیں گے (اور ایسی بحث کریں گے کہ امام کو پیچھا چھڑانا دشوار ہو جائے گا) جب امام ابوحنیفہ تشریف لائے تو (حلقۂ درس میں بیٹھتے ہی) سب سے پہلا مسئلہ جو امام سے دریافت کیا گیا وہی (تیار شدہ) مسئلہ تھا تو امام ابوحنیفہ نے اس کا جواب اُس کے خلاف دیا جو اُنھوں نے طے کر رکھا تھا تو ایک دم شور مچ گیا اور مجمع کی مختلف سمتوں سے لوگ چلانے (اور فقرے کسنے) لگے: "اے ابوحنیفہ تمہیں تو سفر نے بالکل ہی حواس باختہ بنا دیا اور عقل و خرد سے خارج کر دیا" امام ابوحنیفہ نے ان سے خطاب کر کے فرمایا: "ٹھہو، ٹھہو، نرمی سے کام لو نرمی سے (شور و غوغا سے کچھ حاصل نہیں) اچھا بتلاؤ تم کیا کہتے ہو؟ وہ کہنے لگے: اس مسئلہ کا یہ جواب ہرگز نہیں جو آپ نے دیا ہے"۔ امام نے فرمایا تم کسی دلیل سے کہتے ہو یا بے دلیل؟ اُنھوں نے کہا: دلیل سے۔ امام نے فرمایا: اچھا اپنی دلیل بیان کرو" اور مناظرہ شروع ہو گیا۔ آخر امام ہی (اپنی دلیلوں کی قوت سے) ان سب پر غالب آ گئے اور اُن سے اپنی بات منوالی اور انہیں یقین ہو گیا اور اعتراف کر لیا کہ ہماری رائے ہی غلط ہے۔ اس پر امام نے فرمایا: اب تو تمہیں اپنے مسئلہ کے صحیح جواب کا علم ہو گیا؟ ان سب نے کہا: جی ہاں، تو اس کے بعد امام نے فرمایا: اب بتلاؤ اس شخص کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے جو تمہارے پہلے جواب کو ہی درست مانتا ہے اور میرے اس جواب کو غلط کہتا ہے" سب نے بیک زبان کہا: یہ ہرگز نہیں ہو سکتا آپ کا یہ جواب (دلائل سے) صحیح ثابت ہو چکا ہے۔ امام نے پھر اُن سے اُس پر مناظرہ شروع کر دیا اور ان سے اپنے جواب کے غلط ہونے

کا اقرار کرا لیا اور وہ سب بے ساختہ کہہ اُٹھے : امام صاحب ! آپ نے ہمارے ساتھ بڑی ناانصافی سے کام لیا حق تو ہمارے ساتھ تھا (یعنے ہمارا جواب صحیح تھا آپ نے اُسے غلط بنا دیا) پھر امام ابو حنیفہ نے اُن سے دریافت کیا : اُس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جو دعویٰ کرتا ہے کہ یہ جواب بھی غلط ہے اور پہلا جواب بھی غلط ہے اور صحیح جواب یہ تیسرا ہے"؛ وہ سب یک زبان ہو کر بولے : یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ دونوں جواب غلط ہوں) تو امام صاحب نے فرمایا ، اچھا سنو ! اور (اس مسئلہ کا) ایک تیسرا جواب اختراع کیا اور اس پر بھی اُن سے مناظرہ شروع کر دیا اور (دلائل کی قوت سے) اس تیسرے جواب اور اس کے صحیح ہونے کا بھی ان سے اقرار کرا لیا تب وہ (زچ ہو کر) کہنے لگے : اے امام خدا کے لئے ہمیں تبلائیے (کہ اصل حقیقت کیا ہے) تب امام ابو حنیفہ نے ان اچوٹی کے فقہا کو بتلایا : فلاں فلاں دلیل کی بنا پر صحیح تو وہ پہلا جواب ہی ہے جو میں نے شروع میں دیا ہے (باقی میرا مقصد آپ حضرات کو یہ تبلانا تھا کہ) یہ مسئلہ ان تین صورتوں سے باہر نہیں ہو سکتا اور ازروئے فقہ ان میں سے ہر صورت کی معقول وجہ (اور دلیل) بھی موجود ہے اور (ارباب مذاہب میں سے کسی نہ کسی کا) مذہب بھی ہے (یہ فرضی قیاس آرائیاں نہیں ہیں) باقی صحیح جواب وہی ہے (جو میں نے بیان کیا) اسی کو تسلیم کرنا چاہئے اور اس کے علاوہ دوسرے جوابات کو ترک کر دینا چاہیئے"۔

بلاشبہ (قیاس مطلق کی طرف سے) جس شخص کو ایک ہی فقہی مسئلہ کی مختلف اور متخالف صورتوں پر غور و فکر اور استنباط حکم کے طریقے اَدل بَدل کرنے پر اور ہر طریقہ کے لئے دلائل قائم کرنے اور دفاع کرنے کی اتنی عجیب وغریب اور زبردست قدرت عطا کی گئی ہو وہ بغیر کسی ادنیٰ شک وشبہ کے سب سے زیادہ دقیق اور نصوص (کتاب وسنت) پر سب سے زیادہ گہری نظر کا اور سب سے زیادہ قوی قوت استدلال کا مالک ہوگا۔ اسی لئے امام مالکؒ نے ابو حنیفہ کے متعلق جو بات کہی ہے اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہے امام مالک فرماتے ہیں :۔

یہ (ابو حنیفہ) تو ایسا شخص ہے کہ اگر یہ اس پر دلائل قائم کرنا چاہے کہ یہ ستون سونے کا ہے تو

(اُسے سونے کا ثابت) کر سکتا ہے۔

لہٰذا یہ ہرگز کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ ابو حنیفہ کی رائے (طریق کار) استنباط احکام شرعیہ میں دوسرے علما کی رائے (طریق کار) کے خلاف ہو اور ان تمام محدثین کی رائے (طریق کار) کے بھی خلاف ہو جو اکثر و بیشتر ظاہر نصوص (کتاب وسنت کے ظاہری الفاظ) پر آکر رک جاتے ہیں (اور عقل و فکر سے مطلق کام نہیں لیتے) کسی منصوص حکم کی علت (وجہ) دریافت کرنے کو اور ایک حکم کی علت کو دوسرے حکم کی طرف لوٹانے کو بہت بُرا سمجھتے ہیں خاص کر جبکہ (ہم دیکھتے ہیں کہ) محدثین کی "بھیڑ" میں ایسے عوام (اور جہلا) بھی با آسانی گھس جاتے (اور محدث بن بیٹھتے) ہیں جن کے بارے میں (مشہور محدث) یحییٰ ابن یمان لکھتے ہیں :۔

> ان (نام نہاد محدثین) میں سے بعض لوگ حدیث (اپنی یادداشت میں) لکھ تو لیتے ہیں لیکن نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں نہ غور و فکر کی۔ جب ان سے کوئی (فقہی) مسئلہ پوچھا جاتا ہے تو اس طرح بیٹھ جاتے (اور اپنی لکھی ہوئی حدیثیں پڑھ پڑھ کر سنانے لگتے) ہیں جیسے ایک منشی (جس کا کام لکھی ہوئی دستاویز سنا دینے کے سوا اور کچھ نہ ہو) (۱)

جی ہاں! ان میں سے بعض اہل حدیث تو غور و فکر اور عقل و خرد کے لحاظ سے بالکل کورے اور اُمّی بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو ان لوگوں کی اسی اُمیّت (اور جہالت) نے ان سے حدیثوں میں تصحیفین (املا کی فحش غلطیاں) تک کرا دی ہیں اور انتہائی مضحکہ خیز فتوے تک دلوا دیئے ہیں۔

(۱) چنانچہ انہی (دشمنان عقل ودین) میں سے ایک صاحب نے ڈھیلوں سے استنجا کرکے بغیر وضو کئے وتر کی نماز پڑھ لی اور اپنے اس عمل کی صحت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا کہ حدیث میں آیا ہے۔ من استجمر فلیوتر — حدیث کے لفظ فلیوتر کے معنی یہ بزرگ (اپنی جہالت کی وجہ سے) پس چاہیے کہ وتر پڑھے سمجھ بیٹھے (اور بغیر وضو کئے وتر پڑھ لئے) حالانکہ حدیث میں فلیوتر کے معنی استنجے کے لئے طاق یعنی تین، پانچ یا سات ڈھیلے استعمال کرنا ہے (اور پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: جو کوئی ڈھیلوں سے استنجا کرے اسے چاہیئے کہ طاق ڈھیلے لے لے)

(۲) اسی قماش کے ایک محدث نے چالیس سال سے جمعہ کی نماز سے پہلے سر نہیں منڈوایا کیونکہ انھوں نے ایک حدیث کا مطلب یہی سمجھا تھا حدیث یہ ہے:۔ نھیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الحلق قبل الصلوٰۃ یوم الجمعۃ" (اور اپنی جہالت کی وجہ سے لفظ حِلَق کو حَلْق بمعنے سر منڈوانا پڑھ کر چالیس سال تک جمع کے دن نماز جمعہ سے پہلے سر نہیں منڈوایا) حالانکہ حدیث میں (لفظ حِلَق حلقہ کی جمع ہے اور حدیث کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن نماز جمع سے پہلے (مسجد میں) حلقے اور مجمع لگانے سے منع فرمایا ہے کہ یہ فعل جمعہ کے دن مسجد میں نمازیوں کو رصف بنا کر بیٹھنے میں) تنگی کا موجب ہے۔

(۳) اسی قماش کے ایک نام نہاد محدث نے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی حدیث: نھیٰ ان یسقی الرجل ماءہ زرع غیرہ کے معنی (اپنی جہالت سے) یہ سمجھ لئے کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے کھیتوں کو اپنے پانی سے سیراب کرنے سے منع فرمایا ہے حالانکہ حدیث کی مراد (جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے)، یہ ہے کہ آپ نے (بطور استعارہ) اسیران جنگ میں جو عورتیں حاملہ ہوں اُن سے جماع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

(۴) اسی نوع کے ایک محدث صاحب سے درس حدیث کی مجلس میں مسئلہ پوچھا گیا کہ:۔ ایک مُرغی کنویں میں گر پڑی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ تو سائل کو جواب ملا کہ: تم نے کنویں کو ڈھانکا کیوں نہیں تھا (کہ نہ مُرغی گرتی نہ مسئلہ پوچھنے کی نوبت آتی)

(۵) اسی طرح ایک محدث صاحب سے فرائض (میراث) کا ایک مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے فتوے کا جواب لکھا: اللّٰہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرائض کے مطابق تقسیم کر دیا جائے [۱]

---

[۱] اگر ڈاکٹر مصطفیٰ حسن السباعی کی اس انتہائی محتاط حق گوئی اور اظہار حقیقت سے اگر کسی کی پیشانی پر شکنیں پڑیں تو اس کو چاہیئے کہ وہ امام مسلم کی کتاب کا مقدمہ ص ۱۰ سے ص ۱۵ تک کلیجہ تھام کر پڑھے اور ان نام کے محدثین کی متن حدیث اور روایات حدیث سے متعلق رسوا کن جہالتوں کی داستان نام بنام پڑھے تو اس کی پیشانی کی ساری شکنیں کھل جائیں گی اور وہ محسوس کریگا کہ اس حدیث د محدثین کو بدنام اور رسوا کرنے والے گروہ کے متعلق ڈاکٹر مصطفیٰ نے آئینہ کچھ بھی نہیں لکھا اور اگر اس کا دل جاہلانہ عصبیت سے ا باقی صفحہ ۳۲۶ پر

اس میں شک نہیں کہ انہی جیسے لوگ ـــ نام کے محدث عوام ـــ ابوحنیفہ کی دقت نظر اور باریک بینی و نکتہ رسی کو ہضم نہیں کر سکتے بلکہ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے اور کتاب و سنت کی نصوص (صریح عبارات) سے فقہی احکام اخذ کرنے میں ابوحنیفہ کی گہری رسائی کو یہ جہلا بھونچکے بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے یہ نام نہاد محدث ہی ہیں جو ابوحنیفہ کے متعلق بدگمانی پھیلاتے ہیں، ان سے مسلمانوں کو متنفر اور بیزار کرتے ہیں، اُن کے تدین ـــ دینداری و دیانتداری ـــ کے متعلق بری بری باتیں پھیلانے میں اور اُن پر توہین حدیث کا الزام لگانے میں سب سے آگے آگے اور پیش پیش ہوئے ہیں۔

(۶) یہ بھی حقیقت ہے کہ ابوحنیفہ کے بہت سے ہمعصر اور ہمسر علما بھی تھے اور ان کا زمانہ اہل علم کا زمانہ تھا اور انسان کی فطرت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور فوقیت حاصل کرنے کا جذبہ پیدائشی طور پر رکھا ہوا ہے اور اس جذبہ کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ علم و فضل میں اس سے ممتاز ہوتے ہیں یا شہرت میں اس سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں یا لوگوں میں قبول عام ان کو اس سے زیادہ حاصل ہوتا ہے ان سے وہ اپنے دل میں ایک قسم کی تنگی اور گھٹن محسوس کرتا ہے (اور کچھ کر سکتا نہیں تو وہ اُن پر کیچڑ اُچھالنے پر مجبور ہوتا ہے خواہ وہ اپنے . . . .

. . . .

اوپر ہی پڑے) یہ ایک ایسی بری فطرت (اور کمینہ جذبہ) ہے کہ شاید ہی کوئی انسان اس سے بچا ہوا ہو حتیٰ کہ علما بھی اس (حسد و رشک) سے بہت ہی کم بچے ہیں، بجز ان نفوس قدسیہ کے جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس کمینہ جذبہ اور رذالت سے پاک و صاف اور بالاتر رکھا ہے اور علم و حکمت سے ان کے قلوب کو بھر دیا ہے (کہ اس قسم کے کمینے جذبات کی ان میں گنجائش ہی نہیں چھوڑی) اور انبیاء علیہم السلام کی سی ہدایت اور صدیقین کی سی طمانیت کا ان کو وارث بنا دیا ہے (وہ بیشک نہ صرف اپنے ہمسروں بلکہ اپنے سے کمتر علما کے علم و فضل اور ہنر و کمال کا بھی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے برملا اعتراف کرتے ہیں وقلیل ما ہم)

(بقیہ ص ۱۷۹) پاک و صاف اور سینہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منور اور تابناک ہوگا تو وہ خود بھی اس دشمن حدیث گروہ کو رسوائے عام کرنے کو اپنا فرض سمجھے گا ۱۲ محشی

حافظ ابن عبد البر مالکی رحمہ اللہ نے تو اپنی کتاب جامع بیان العلم میں اہل علم کی باہمی رقابت و حسد کے موضوع پر ایک مستقل فصل خصوصی طور پر قائم کی ہے اور اس تنافس (اور باہمی رقابت و حسد) کے نتیجہ میں جو بعض لوگوں کے اقوال منظر عام پر آئے، وہ پیش کئے ہیں اس فصل کے شروع میں تو انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ :-

علماء کے علم کو تو کان لگا کر سنو لیکن ان میں سے کسی ایک کی دوسرے کے مقابلے پر (تنقید و تنقیص اور طعن و تشنیع کی) تصدیق نہ کرو۔ اس لئے کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ جیسے مینڈھے اپنے باڑوں میں ایک دوسرے کو ٹکریں مارتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اہل علم رقابت کے مارے ایک دوسرے پر رکیک حملے کرتے (اور کیچڑ اچھالتے) ہیں۔ (۱)

اس کے بعد اہل علم نے جو ایک دوسرے پر الزامات لگائے (اور رکیک حملے کئے) ہیں ان کا بھی حافظ ابن عبد البر نے بطور نمونہ تذکرہ کیا ہے مثلاً (۱) محمد بن اسحاق کے متعلق امام مالک کا قول (۲) امام شافعی کے بارے میں یحییٰ بن معین کا قول (۳) اہل مکہ کے متعلق حماد کا قول (۴) اسی طرح اہل مکہ کے بارے میں زہری کا قول وغیرہ (تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب مذکور ج ۲ ص ۱۵۱ وما بعد)

اور امام ابوحنیفہ تو بخدا علمی رفعت شان، علو مرتبت اور قبول عام کے اس مقام پر پہونچے ہوئے تھے جس نے اُن کے بعض ہمسروں کو اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ (از راہِ رقابت) ابوحنیفہ کے متعلق اپنی مجالس میں ایسی باتیں کہیں جو کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتیں اور حکمران وقت کو ان کے متعلق ایسی باتیں پہونچائیں جن کی حقیقت کچھ ہوتی ہی نہ تھی۔ حتیٰ کہ خود امام ابوحنیفہ کو ان (رقابت زدہ کینہ پروروں) میں سے ایک بزرگ کے متعلق — جن کا نام عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ ہے اور اس زمانہ میں وہ کوفہ کے قاضی تھے — یہ کہنا پڑا :

"یہ حقیقت ہے کہ ابن ابی لیلیٰ تو میرے اوپر ایسے (رکیک) حملے کرنا بھی حلال سمجھتے ہیں جو میں ایک جانور پر بھی جائز نہیں سمجھتا" (۲)

یہ حقیقت ہے کہ انہی مذکورہ بالا محرکات و عوامل کا بحیثیت مجموعی یہ نتیجہ ہوا کہ عام لوگوں

---

(۱) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۱- ۱۲ (۲) مناقب ابی حنیفہ از الموفق المکی ۱۲-

نے بھی ابو حنیفہ کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور بے سرو پا باتیں ایک دوسرے سے نقل کرنی شروع کر دیں جن میں سے بعض باتیں تو بالکل ہی ناحق اور بے اصل تھیں اور بعض نکتہ چینیاں ایسی تھیں جو ابو حنیفہ کے (اصول اجتہاد اور) طرق استنباط احکام کی حقیقت کو نہ پاسکنے اور ان سے ناواقفیت پر مبنی تھیں اور بلاشبہ ابو حنیفہ کے متعلق یہ چہ میگوئیاں دور دراز ملکوں میں رہنے والے علماء کے کانوں تک بھی پہونچتی تھیں جیسا کہ ابو حنیفہ کے مسائل شرعیہ سے متعلق بعض ایسے فتوے بھی ان تک پہونچے تھے جن میں ابو حنیفہ نے ان علماء سے خلاف کیا تھا اور وہ (بالمشافہ گفتگو نہ کر سکنے کی بنا پر) ابو حنیفہ کی مخالفت کی وجوہ سے ناواقف تھے اور ساتھ ہی ان کا عقیدہ تھا کہ جو احادیث و آثار ہمارے پاس موجود ہیں ابو حنیفہ کا فتویٰ ان کے خلاف ہے (لہٰذا صحیح نہیں ہو سکتا) اسی لئے ان کی زبانوں پر کبھی کبھی ایسی (طنزیہ) باتیں بھی آجاتی تھیں جو ابو حنیفہ کے بارے میں ان کی سوءظنی (بدگمانی) کی غمازی کرتی تھیں لیکن ایسے ذمہ دار علما اور ارباب فتویٰ کی یہ غلط فہمی (اور سوءظنی) جلد ہی دور بھی ہو جاتی تھی اور وہ ان کے بارے میں حق کی طرف رجوع بھی کر لیتے تھے جبکہ یہ حضرات ابو حنیفہ کے ساتھ کہیں مل بیٹھتے اور (بالمشافہ گفتگو کر کے) ابو حنیفہ کے نقطۂ نظر سے واقف ہو جاتے . . . . اور ابو حنیفہ کی دیانت و امانت اور باریک بینی و نکتہ رسی کو بچشم خود مشاہدہ کر لیتے اور بے ساختہ ابو حنیفہ (کے علم و فضل) کی تعریفیں کرنے لگتے۔

اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے وہ واقعہ جو الخیرات الحسان کے مصنف نے (صفحہ ۳۳ پر) نقل کیا ہے کہ: شروع شروع میں جب امام ابو حنیفہ (کے تفقہ و اجتہاد) کی شہرت (ممالک اسلامیہ میں) پھیلی تو (شام کے) امام اوزاعی ابو حنیفہ کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہو گئے اور ابھی تک ابو حنیفہ سے ملاقات (اور تبادلۂ افکار) کا اتفاق ہوا نہ تھا چنانچہ امام اوزاعی نے ایک مرتبہ عبداللہ بن المبارک سے یہ تک کہا تھا کہ:- کوفہ میں یہ کون بدعتی پیدا ہوا ہے جس کی کنیت ابو حنیفہ ہے؟ تو ابن مبارک نے اوزاعی کے اس طنز کا تو کوئی جواب نہ دیا بلکہ چند مشکل ترین فقہی مسائل اور اُن پر غور و فکر کی صورتوں اور ہر صورت پر شرعی احکام اور فتوے بیان کرنے شروع کر دیئے امام اوزاعی کے مُنہ سے بیساختہ نکلا: یہ فتوے دینے والا کون ہے؟ ابن المبارک نے کہا: یہ ایک شیخ نے فتوے دیئے ہیں جن سے میں عراق میں ملا ہوں تو اوزاعی نے برملا کہا: یہ تو بڑے پایہ کے شیخ معلوم ہوتے ہیں میں بھی ان سے جا کر

ملوں گا اور ایسے ہی دشوار فقہی مسائل دریافت کروں گا" تب ابن المبارک نے بتلایا۔ یہی تو ابوحنیفہ ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کے کچھ دن بعد ہی امام اوزاعی اور امام ابوحنیفہ کی مکۃ المکرمہ میں ملاقات ہوئی۔ اور ان مسائل پر مذاکرہ و مباحثہ شروع ہوا جن کا ابن المبارک نے امام اوزاعی سے ذکر کیا تھا تو امام ابوحنیفہ نے ان کی سیر حاصل وضاحت فرمائی۔ اس علمی ملاقات کے بعد جب دونوں امام ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو امام اوزاعی نے ابن المبارک سے کہا: اس شخص کی علمی وسعت و فراوانی اور وفور عقل و فہم پر تو مجھے رشک آتا ہے میں اللہ تعالیٰ سے اپنی سوء ظنی کی معافی چاہتا ہوں بخدا میں تو کھلی ہوئی غلط فہمی میں مبتلا تھا اب تو میں اس شخص کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا (اور اس سے ضرور استفادہ کروں گا اس لئے کہ) یہ تو بالکل اس کے برعکس ہے جو مجھے اس کے متعلق بتایا گیا تھا۔

امام ابوحنیفہ کے بارے میں امام مالک اور دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال و آراء

امام ابوحنیفہ کے متعلق اس پہلو سے بحث کا سلسلہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم یہاں ابوحنیفہ کے زمانہ کے دوسرے علماء کبار اور ائمہ مجتہدین کے موافق و مخالف اقوال و آراء پر بھی کچھ روشنی ڈالیں اس لئے کہ امام مالک، ثوری، اوزاعی، سفیان بن عینیہ وغیرہ سے ابوحنیفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے سلسلہ میں مختلف اور متضاد اقوال کتب تاریخ و تذکرہ میں منقول ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں ابوحنیفہ کی تعریف و تنقیص کے سلسلہ میں جو روایات ائمہ کبار سے نام بنام نقل کی ہیں ان میں آپ واضح طور پر محسوس کریں گے کہ وہ بالکل برابر برابر ہیں۔

اگرچہ اس سے پہلے ہمارا خیال بھی وہی تھا جو ملک معظم عیسیٰ بن ابی بکر ایوبی کا مسلک ہے کہ ابوحنیفہ پر طعن و تشنیع کی غرض سے یہ جھوٹی روایات ان ائمہ کبار کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں (۱) مگر اب ہم کچھ بعید نہیں سمجھتے کہ ان ائمہ کبار سے منسوب کر کے جو روایتیں بیان کی گئی ہیں ان میں کچھ روایتیں صحیح بھی ہوں اور اس کا سبب وہی (غلط فہمی و ناواقفیت) ہو جس کی مثال میں ہم نے امام اوزاعی اور امام ابوحنیفہ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ملاقات (اور تبادلۂ خیالات و شخصی تعارف) سے پہلے اوزاعی کی رائے ابوحنیفہ کے متعلق کیا تھی اور ملاقات کے بعد کیا ہو گئی لہٰذا اب میرے نزدیک ان تمام صحیح روایات کا ـــ جو امام ابوحنیفہ کی تنقیص میں ان کے بعض معاصر علماء اور ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ـــ صحیح محمل یہی ہے اور مجھے اس میں مطلق شک نہیں کہ آخر میں ان حضرات میں سے ہر ایک کو ابوحنیفہ سے حسن ظن نصیب ہوا ہے اور ان کی تعریفیں کی ہیں ان کے علم و فضل کا برملا

اعتراف کیا ہے۔ یہ صورت حال اس زمانہ میں رونما ہوئی جب ابوحنیفہ نے مکہ، مدینہ، بصرہ اور بغداد کے کثرت سے سفر کئے ہیں چنانچہ ارباب تاریخ و تذکرہ نے لکھا ہے کہ ابوحنیفہ نے پچپن[۵۵] حج کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ابوحنیفہ کی ہر حج کے موقعہ پر (اطراف واکناف عالم سے حج کے لئے آنے والے کبار علما اور ائمہ مجتہدین سے علمی ملاقاتیں، مذاکرے اور مباحثے، اہم علمی مسائل پر تبادلہ خیالات ہوئے ہیں ابوحنیفہ نے ان کے سامنے اپنے نقطہ ہائے نظر اور طرق استنباط احکام کو واضح کیا ہے اور ان کے نقطہ ہائے نظر اور طرق استدلال کو سمجھا ہے (اور طرفین سے افادہ واستفادہ کے مواقع میسر آئے ہیں) اور بلاشبہ اس (افہام وتفہیم اور تبادلہ افکار وانظار) کا ابوحنیفہ کے فقہی مسلک، طرز اجتہاد، طریق استنباط احکام سے متعارف ہونے میں بہت بڑا دخل ہے اور ابوحنیفہ نے جس قسم کی احادیث وآثار کو جن وجوہ کی وجہ سے چھوڑا ہے ان سے واقف ہوتے کے بعد وہ ابوحنیفہ کو معذور سمجھنے لگے ہیں۔

توان حقائق وواقعات کو جان لینے کے بعد یہ بات کچھ بھی بعید از فہم اور تعجب خیز نہیں رہتی کہ علماء اعلام اور فقہاء اسلام سے ابوحنیفہ کے بے مثل تفقہ کی شہادتیں اور اجتہاد واستنباط احکام شرعیہ میں اپنے سے پہلے اہل علم (سلف صالحین و صحابہ وتابعین) کے طریق پر استقامت کے اعترافات تواتر کی حد تک پائے جائیں۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ قاضی عیاض نے مدارک میں بیان کیا ہے کہ ایک دن مدینہ میں امام مالک اور امام ابوحنیفہ کی ملاقات ہوئی (اور کافی دیر تک دونوں کے درمیان علمی مذاکرہ ومباحثہ ہوتا رہا) اس کے بعد امام مالک وہاں سے نکلے تو پسینہ میں نہائے ہوئے تھے۔ لیث بن سعد نے پوچھا: کیا بات ہے آپ پسینہ پسینہ ہو رہے ہیں؟ امام مالک نے جواب دیا: میں ابوحنیفہ کے ساتھ (مناظرہ ومناقشہ میں) پسینہ پسینہ ہوگیا، بلاشبہ یہ تو اے مصری! بڑا بھاری فقیہ ہے۔"

اور امام مالک سے تو صحیح روایت کے بموجب یہ بھی منقول ہے کہ "وہ ابوحنیفہ کی کتابیں مطالعہ کیا کرتے تھے" یعنے ابوحنیفہ کی وہ کتابیں جو انھوں نے اپنے شاگردوں کو املا کرائی تھیں۔ یہاں تک کہ امام مالک کے پاس ساٹھ ہزار فقہی مسائل جمع ہوگئے تھے جیسا کہ ابن ابی العوام السعدی، ابو عبداللہ بن علی الضمیری، موفق اور خوارزمی وغیرہ نے نقل کیا ہے (۱)

---

(۱) تانیب الخطیب ص ۳ - ۱۲

امام مالک کے (براہ راست) شاگردوں اور مالکی مذہب کے بڑے بڑے مولفین ومصنفین نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ امام مالک، امام ابو حنیفہ کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اور امام مالک سے جو ابو حنیفہ کی تنقیص اور جرح وتنقید منقول ہے اُس کے اُنھوں نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔

چنانچہ (۱) امام ابو جعفر داؤدی ـــ جنہوں نے موطا کی شرح نامی لکھی ہے ـــ امام مالک کی طرف سے اس کا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ: امام مالک نے یہ باتیں غیظ وغضب کی حالت میں کہی ہیں۔ اور کہا کہ ایک عالم کا جب دل تنگ ہوتا اور وہ زچ ہو جاتا ہے، تو وہ ایسی تیز وتند باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے وہ خود بعد میں استغفار کرتا اور اللہ سے معافی چاہتا ہے

(۲) حافظ ابن عبد البر کی رائے یہ ہے کہ ابو حنیفہ پر امام مالک کی طعن وتشنیع کی روایتیں امام مالک کے اُن شاگردوں سے مروی ہیں جو کہ اہل حدیث تھے۔ چنانچہ امام مالک کے جو شاگرد فقیہ ہوئے ہیں ان سے کوئی ایک بھی ایسی روایت ثابت نہیں۔

(۳) اس کے برعکس ابو الولید باجی نے اپنی موطا کی شرح میں امام مالک کی طرف ان اقوال کی نسبت کو غلط بتلایا ہے اور کہا ہے کہ امام مالک نے فقہا (اور ائمہ مجتہدین) پر کبھی کوئی کلام کیا ہی نہیں اُنھوں نے تو صرف بعض راویان حدیث پر ان کے حفظ وضبط کے اعتبار سے کلام کیا ہے (اور ان کو مجروح وضعیف قرار دیا ہے) اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ:۔ امام مالک کے دل میں عبد اللہ بن المبارک کی انتہائی عظمت تھی اور ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے حالانکہ ابن المبارک ابو حنیفہ کے خاص الخاص شاگردوں میں سے تھے۔

ابو حنیفہ کے متعلق امام شافعی کی رائے

رہے امام شافعی تو اُن اقوال کے جھوٹ ہونے میں تو ذرہ برابر بھی شبہ کی گنجائش نہیں جو ابو حنیفہ کی مذمت وتنقیص سے متعلق امام شافعی کی طرف منسوب ہیں اس لئے کہ امام شافعی نے تو ابو حنیفہ کو پایا ہی نہیں تھا (ابو حنیفہ نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی ہے اور شافعی ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ہیں) ہاں امام شافعی نے ابو حنیفہ کے شاگردوں کو خاص کر امام محمد بن الحسن کو ضرور پایا ہے اور محمد کے واسطہ سے ہی شافعی ابو حنیفہ کی فقہ (اور تفقہ) سے واقف ہوئے تھے (اور ابو حنیفہ کے اجتہادی علوم سے خوشہ چینی کی تھی) اور بغداد سے روانہ ہوتے کے وقت برملا اعتراف کیا تھا کہ میں محمد بن

حسن سے ایک بار[۱] شتر کے بقدر علم اپنے ساتھ لیجارہا ہو لہذا یہ بات کسی طرح بھی باور نہیں کی جاسکتی کہ وہ امام ابوحنیفہ کے متعلق کوئی بھی بری بات کہیں اس کے برعکس امام شافعی ہی وہ شخص ہیں جن کا یہ مقولہ مشہور اور زبان زد خاص و عام ہے :

الناس عیال فی الفقہ علی ابی حنیفۃ ۔ (۱)

لوگ فقہ (اور اجتہاد) میں ابو حنیفہ کے پروردہ (اور خوشہ چین) ہیں ۔

امام ابوحنیفہ کے متعلق امام احمد کی رائے

امام احمد بن حنبل نے بھی ابوحنیفہ کا زمانہ نہیں پایا (اس لئے کہ امام احمد تو ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے ہیں) امام احمد نے تو صرف امام ابو یوسف کو پایا ہے اور اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں ابو یوسف کے حلقۂ درس میں رہے ہیں چنانچہ احمد کا یہ قول مشہور ہے :۔

کتبت عن ابی یوسف ثلاث قماطر فی ثلاث سنوات ۔ (۱)

میں نے تین سال میں امام ابو یوسف سے (علمی یادداشتوں کے) تین بڑے بستے لکھے ہیں ۔

امام احمد، امام محمد کی کتابیں ہمیشہ مطالعہ کیا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا گیا کہ یہ دقیق فقہی جوابات آپ کہاں سے دیتے ہیں؟ فرمایا :۔ محمد کی کتابوں سے " (۲)

ہاں ہمیں اس بارے میں بیشک کوئی تعجب نہیں کہ امام احمد سے امام ابوحنیفہ کے فقہی مسلک (اور طریق اجتہاد) کے بارے میں ـــ نہ کہ ان کی ذات اور شخصیت کے بارے میں ـــ کوئی تنقید منقول ہو کیونکہ سنت و حدیث سے مسائل شرعیہ اخذ کرنے کے دائرہ اور حدود کے بارے میں ان دونوں اماموں کے مسلک اور ذوق ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے ۔ اس امر میں کلی طور پر اتفاق کے باوجود کہ احکام شرعیہ کا ماخذ (اور سرچشمہ کتاب اللہ کے بعد) حدیث و سنت ہیں اختلاف ذوق و مسلک کا یہ عالم تھا کہ : احمد کہا کرتے تھے کہ : ضعیف حدیث میرے نزدیک کسی

---

[۱] یعنی تین سال کی مدت میں اتنی یادداشتیں لکھی ہیں کہ ایک اونٹ کی باربرداری کے لئے درکار ہے ۱۲ محشی

(۱) حسن التقاضی فی سیرۃ ابی یوسف القاضی ص ۲۸ ۔ ۱۲

(۲) تانیب الخطیب ص ۱۸ ۔ ۱۲

فقیہ کی رائے سے بہتر ہے"[51] اس کے برخلاف امام ابوحنیفہ حدیث کی صحت کو پرکھنے (اور اس سے استدلال کرنے) کے بارے میں بہت سختی برتتے تھے اور صرف اسی حدیث کو قبول کرتے (اور قابل استدلال سمجھتے) تھے جو ثقہ راویان حدیث کے حلقوں میں مقبول اور مسلم ہوتی تھی۔

اس قسم کے اختلاف ذوق و مسلک کو کسی بھی طرح موجب طعن و تشنیع نہیں قرار دیا جاسکتا۔ حدیث سے استدلال کرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کے ارشاد:-

لکل وجهة هو موليها — ہر شخص کی ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کئے ہوئے ہے

کے تحت اُستنباط احکام شرعیہ کے بارے میں ہر فقیہ اور مجتہد کا اپنا اپنا نقطۂ نظر اور طریق کار الگ ہے اور اسی پر وہ کاربند ہے۔

اس ہنگامہ آرائی کے نتائج

امام ابوحنیفہ کی زندگی میں ہی ان کے خلاف جو ہنگامہ آرائی کا طوفان برپا کیا گیا تھا اس کے اسباب و محرکات میں سے یہ چند حقائق ہم نے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اس فتنہ انگیزی کی تیز و تُند آندھیوں نے امام ابوحنیفہ کی شخصیت کو ہر طرف سے اور ہر پہلو سے اپنی زد میں لے لیا تھا۔ امام کی طرف ایسے ایسے افکار و خیالات منسوب

---

[51] امام احمد رحمہ اللہ نے حدیث پر عمل کرنے کے ذوق و شوق میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ دشمنانِ دین نے حدیث سے مستنبط احکام شرعیہ کو بے اثر بنانے کی غرض سے صدہا حدیثیں خصوصاً احکام سے متعلق احادیث اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر ذخیرۂ احادیث میں ملا دی ہیں اور محدثین کے حلقوں میں ان کو چلتا کر دیا ہے جیسا کہ آپ وضع حدیث کی بحث کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں اسی لئے وہ ضعیف حدیث کو فقیہ کی اجتہادی رائے پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ ہر فقیہ اور مجتہد کا مسلک بھی یقیناً کتاب و سنت پر ہی مبنی ہوتا ہے امام ابوحنیفہ نے شدت کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کیا اور حدیث پر عمل کرنے سے پہلے اس امر کی چھان بین ضروری سمجھی کہ یہ حدیث صحیح ہے بھی یا نہیں؟ ورنہ تو ابوحنیفہ کا تو کہنا یہ ہے کہ: ما ثبت عن رسول اللّٰہ فهو على الراس والعين (جو حدیث رسول اللہ سے ثابت ہو وہ سر آنکھوں پر) بھلا صحیح حدیث سے بھی کوئی فقیہ (فقیہ تو کیا کوئی مسلمان بھی) انحراف کر سکتا ہے؟ اسی بنا پر امام احمد جیسے محدثین "ظاہریہ" کہلاتے ہیں ۱۲ محشی

کئے گئے جو وہ زبان پر بھی نہیں لا سکتے اور ایسے ایسے عقیدے لوگوں کے سامنے ان کی طرف منسوب کئے گئے جن کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا بعض عیب گیروں کے نزدیک وہ "مرجئی" تھے اور بعض نکتہ چینیوں کے نزدیک وہ "قدری" (منکر تقدیر) تھے۔ اور (انہی شیطان صفت افترا پردازوں کا) ایک گروہ ان کو تناسخ (آواگون) کا قائل بتاتا تھا اور (جہلا کی) ایک جماعت کے خیال میں وہ "منکر حدیث" تھے اور بہت سے (عوام کالانعام قسم کے) لوگوں کی نگاہ میں وہ اللہ کے دین میں اپنی خواہشات واغراض کے تحت اپنی شخصی رائے سے تصرف کیا کرتے تھے (العیاذ باللہ)

یہ تمام بہتان اور الزامات، ابو حنیفہ کی وفات کے بعد اور روئے زمین کے ملکوں میں ان کی فقہ (حنفی مسلک) کے عالمگیر قبولیت حاصل کر لینے اور ان کے شاگردوں کے تمام اسلامی ملکوں میں پھیل جانے (اور منصب افتا وقضا پر قابض ہو جانے) کے بعد حق اور صداقت کے روح پرور جھونکوں کے ساتھ خشک تنکوں کی طرح ہوا ہو گئے (اور نام ونشان تک باقی نہ رہا۔)

لیکن ابو حنیفہ کے مخالفین نے جو الزامات ان پر چسپاں کئے تھے ان میں سے "دو الزام" آج تک باقی ہیں اور شاید آئندہ بھی باقی رہیں حالانکہ یہ "دو الزام" بھی درحقیقت ایک طرف مذہبی عصبیت کی بنا پر لگائے گئے ہیں اور دوسری طرف ائمہ مجتہدین کے احکام شرعیہ کے استنباط کے طریقوں سے ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہیں۔ انہی دو الزاموں کا ذکر آج تک بھی موجود ہے نہ صرف یہ بلکہ دشمنان حدیث وسنت نے بھی ان میں سے ایک الزام کی آڑ لے کر سرے سے تمام ذخیرۂ حدیث وسنت میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس کی تفصیل آپ مؤلف فجر الاسلام کے ... طرز عمل کی بحث میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

وہ دو تہمتیں جو آج تک بھی باقی ہیں یہ ہیں: (۱) ایک یہ کہ ابو حنیفہ حدیث کے سرمایہ سے بالکل تہی دست (اور ناواقف) تھے (۲) دوسرے یہ کہ ابو حنیفہ صحیح حدیث پر بھی اپنی رائے اور قیاس کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

ذیل میں ہم ان دونوں تہمتوں پر گفتگو کریں گے اور ان کا تاریخی ماخذ بتلائیں گے اور ان حقائق کی کسوٹی پر ان کو پرکھیں گے جو ابو حنیفہ کی تاریخ میں ثابت اور یقینی ہیں اور ان کی فقہ و

اجتہاد سے متعلق مشہور و معروف ہیں۔

کیا ابوحنیفہ کے پاس حدیث کا ذخیرہ بہت ہی کم تھا

اس سلسلہ میں خطیب بغدادی ہمارے سامنے متعدد ایسے اقوال پیش کرتے ہیں جن کے قائلین ابوحنیفہ پر الزام لگاتے ہیں کہ ان کے پاس حدیث کا سرمایہ بہت ہی کم (نہ ہونے کے برابر) تھا اور یہ کہ وہ روایت حدیث میں ضعیف تھے، اس کے ثبوت میں وہ (۱) ابن المبارک کا یہ قول نقل کرتے ہیں: کان ابوحنیفہ یتیما فی الحدیث (ابوحنیفہ حدیث میں یتیم تھے) (۲) ابن قطن کا یہ قول نقل کرتے ہیں: کان زمنا فی الحدیث (ابوحنیفہ تو حدیث میں بالکل اپاہج تھے) (۳) یحییٰ بن سعید القطان کا یہ قول نقل کرتے ہیں: لم یکن بصاحب حدیث (ابوحنیفہ حدیث کے آدمی نہ تھے) (۴) یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ایش کان عند ابی حنیفہ من الحدیث حتی تسأل عنہ (ابوحنیفہ کے پاس حدیث ہے کہاں جو تم ان سے دریافت کرتے ہو) (۵) احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کرتے ہیں: انہ لیس لہ رائی و لا حدیث (ابوحنیفہ کے پاس تو نہ رائے تھی نہ حدیث) (۶) ابوبکر بن داؤد کا یہ قول نقل کرتے ہیں: جمیع ما روی عن ابی حنیفہ من الحدیث مأۃ و خمسون حدیثا اخطأ فی نصفھا (ابوحنیفہ سے مروی کل ڈیڑھ سو حدیثیں ہیں جن میں سے آدھی (پچھتر) حدیثوں میں ان سے غلطیاں ہوئی ہیں) (۷) عبدالرزاق کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ما کتبت عن ابی حنیفہ الا لاکثر بہ رجالی و کان یروی عنہ نیفا و عشرین (میں نے تو صرف اپنے راویوں کی تعداد بڑھانے کی غرض سے ابوحنیفہ سے حدیثیں لکھ لی ہیں۔ عبدالرزاق ابوحنیفہ سے کچھ اوپر بیس حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔)

(۸) ابوالمدینی کا یہ قول نقل کرتے ہیں: انہ روی خمسین حدیثا اخطأ فیھا (ابوحنیفہ نے کل پچاس حدیثیں روایت کی انہیں بھی بہت سی غلطیاں کی ہیں) (۱)

ہم ان اقوال کو سند کے اعتبار سے یہ کہنا نہیں چاہتے (کہ ان ائمہ حدیث سے یہ اقوال نقل کرنے والے کون ہیں اور وہ قابل اعتماد ہیں یا بوگس!) اس لئے کہ محققین نے خود ہی ان اقوال کو احمقانہ

---

(۱) یہ تمام اقوال خطیب بغدادی کی تاریخ میں (ج ۳ ص ۴۴۴ اور مابعد صفحات پر) مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں۔

بکو اس قرار دیدیا ہے اور ان اقوال کو نقل کرنے اور گنانے میں خطیب بغدادی کی بد دیانتی کی نشاندہی کی ہے (۱)

لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہم سرے سے اس نظریہ کو ہی تحقیق کی کسوٹی پر پرکھیں جو امام ابوحنیفہ اور خود سنت و حدیث کے مخالفین کی زبانوں پر وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کو دہراتے رہتے ہیں اور بعض مورخین نے بھی اس نظریہ کو خلوص قلب کے ساتھ (نہ کہ بربناء مخالفت) دہرایا ہے جیساکہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں کہا ہے وہ لکھتے ہیں — اگرچہ "ازراہ احتیاط کہا جاتا ہے" کے الفاظ سے اس قول کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے کو ظاہر کردیتے ہیں —

ان مرویاته بلغت — علی مایقال	ابوحنیفہ سے مروی احادیث کی تعداد — جیساکہ کہا
— سبعة عشر حدیثا	جاتا ہے — سترہ تک پہونچتی ہے

بلاشبہ ابن خلدون کا یہ بیان انتہائی خطرناک ہے کہ چوٹی کے مجتہد اماموں میں سب سے بڑا امام — جس کا مذہب احکام فقہیہ کی تفصیلات اور استنباط احکام کے طریقوں کے لحاظ سے تمام فقہی مذاہب میں سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے (جس کے مسائل فقہیہ کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے) اور روئے زمین کے چپہ چپہ پر مشرق ہو یا مغرب اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی تعداد کروڑوں تک پہونچتی ہے اور اس امام کے پاس حدیث کا کل سرمایہ کچھ اوپر دس یا ڈیڑھ سو حدیثیں ہوں" کیا یہ بات صحیح ہوسکتی ہے ؟ (اور بقائمی ہوش و حواس کوئی اس کو باور کرسکتا ہے)

غور فرمایئے :-

(۱) موافقین اور مخالفین سب ہی کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ دین کے مسلم امام اور مجتہد تھے اور (مسلمہ طور پر) مجتہد کے شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ وہ "احکام" سے متعلق احادیث پر پوری طرح حاوی ہو اور احادیث احکام کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے اور

---

(۱) ملاحظہ ہو علامہ کوثری کی کتاب تأنیب الخطیب علی ماساق فی ترجمة ابی حنیفة من الاکاذیب شیخ کوثری مرحوم نے ان اقوال پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان ائمہ کی طرف ان اقوال کی نسبت جعلی بتلائی ہے ۱۲

کم سے کم اندازہ کے مطابق بھی (ہزاروں نہ سہی تو چند سو احادیث احکام تو ضرور ہیں جیسا کہ بعض حنبلی علما کا کہنا ہے، تو پھر ابوحنیفہ کے لئے احکام شرعیہ میں اجتہاد کرنا کیسے جائز ہو گیا جبکہ اُنھوں نے اجتہاد کی اتنی اہم شرط بھی پوری نہیں کی؟ اور دوسرے ائمہ مجتہدین نے ان کے اجتہاد کا اعتبار کیسے کیا؟ اور ان کی فقہ کے ساتھ اتنا اہتمام و اعتنا کیونکر ہوا کہ اُنھوں نے ابوحنیفہ کی فقہ کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا؟ اور ابوحنیفہ کے اجتہاد اور فقہ پر تنقید یا اس کی تائید میں اپنا وقت کیوں ضائع کیا جبکہ اس فقہ کی عمارت کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہ تھی؟

(۲) جو شخص بھی امام ابوحنیفہ کے مذہب کا مطالعہ کرے وہ یہ ضرور محسوس کرے گا کہ ابوحنیفہ کا مذہب سینکڑوں مسائل میں صحیح احادیث کے بالکل موافق (و مطابق) ہے سید مرتضیٰ زبیدی شارح قاموس رحمہ اللہ نے تو ان تمام احادیث احکام کو جن پر ابوحنیفہ کا مذہب قائم ہے ایک مستقل کتاب میں جمع کر دیا ہے جس کا نام الدرر المنیفہ فی ادلۃ ابی حنیفہ رکھا ہے تو آخر احادیث سے نابلد اور تہی دامن ہونے کے باوجود ابوحنیفہ کا اجتہاد سیکڑوں صحیح احادیث کے موافق کیسے ہو گیا؟ (کیا ابوحنیفہ کے پاس وحی آتی تھی یا الہام ہوتا تھا) جبکہ ان کے پاس حدیث کی کل کائنات کچھ اوپر دس یا پچاس یا ڈیڑھ سو تھی اور ان میں بھی آدھی حدیثوں میں ان سے غلطیاں ہوئی تھیں؟

(۳) امام ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف کبیر میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس میں اُنھوں نے اس کی نشاندہی کی ہے کہ ابوحنیفہ نے کتنے مسائل میں صحیح احادیث کے خلاف مسلک اختیار کیا ہے تو اس قسم کے مسائل کی تعداد ایک سو پچیس تک پہونچی ہے لہٰذا اگر ہم ابن ابی شیبہ کے بیان کے مطابق تسلیم کر لیں کہ اُنھوں نے ابوحنیفہ پر مخالفت حدیث کا الزام لگانے کے سلسلہ میں جو مسائل جمع کئے ہیں وہ سب ایک سو پچیس (۱۲۵) ہیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ باقی (ہزاروں) مسائل جو ابوحنیفہ سے منقول ہیں وہ سب حدیث کے موافق ہیں اور اُن میں سے ہر مسئلہ میں (ابوحنیفہ کے پاس) حدیث موجود ہے اور جبکہ کم سے کم اندازہ کے مطابق ابوحنیفہ سے منقول مسائل کی تعداد تراسی (۸۳) ہزار ہی ہو ے حالانکہ ایسی روایات موجود ہیں جن کے مطابق اِن مسائل کی تعداد بارہ لاکھ تک پہونچتی ہے ـــــ تو دریافت طلب یہ ہے کہ (کیا باقی ماندہ مسائل کی یہ بھاری تعداد (۸۲۸۷۵) ـــــ جس کے متعلق ابن ابی شیبہ اعتراف کرتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے ان مسائل میں حدیث

کی مخالفت نہیں کی ہے ۔ ان مسائل کے متعلق احادیث وارد ہوئی ہیں یا نہیں ؟ اگر ان تمام مسائل یا ان میں سے کچھ مسائل سے متعلق بھی حدیثیں موجود ہیں (اور ابو حنیفہ نے ان سے استدلال کیا ہے) تو اس سے تو لازم آتا ہے کہ جو حدیثیں ابو حنیفہ کے پاس موجود تھیں (جن سے انھوں نے ان مسائل میں استدلال کیا ہے) ان کی تعداد سیکڑوں اور ہزاروں ہونی چاہیئے اور اگر ان (باقی ماندہ) مسائل شرعیہ سے متعلق احادیث موجود نہیں ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ جن مسائل شرعیہ سے متعلق احادیث آئی ہیں ان کی تعداد فقط ایک سو پچیس ہونی چاہیئے ۔ حالانکہ نہ مسلمانوں کا کوئی امام اس کو تسلیم کر سکتا ہے اور نہ کوئی محدث (اس لئے کہ احادیث احکام کی تعداد ہزاروں نہیں تو سیکڑوں تک ضرور پہونچتی ہے)

(۴) امام ابو حنیفہ ان ائمہ حدیث میں شمار ہوتے ہیں جن کی "آراء" کا (حدیث اور رواۃ حدیث کے بارے میں) علم مصطلح حدیث (یعنے علم اصول حدیث) میں ذکر کیا جاتا ہے (کہ مثلاً مرسل احادیث کو ابو حنیفہ قبول کرتے ہیں یا مثلاً جابر جعفی کذاب ہے) تو بھلا ایسا شخص بھی حدیث میں بے بضاعت (اور تہیدست) ہو سکتا ہے ؟ یہی نہیں بلکہ ابو حنیفہ کا شمار علماء حدیث کے نزدیک ان ائمہ حدیث میں ہوتا ہے جن کے آراء و نظریات کو علم قواعد حدیث و رجال حدیث کی کتابوں میں (یعنے کتب مصطلح حدیث و کتب اسماء الرجال میں) مدون کیا جاتا ہے اور ان کا مسلک ائمہ حدیث و رجال حدیث کے درمیان اعتماد کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور رد یا قبول (تردید یا تائید) کے اعتبار سے اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے (کہ جس حدیث یا راوی حدیث کو وہ رد کر دیں اس کو مردود اور جس کی وہ تائید کر دیں اس کو قبول کیا جاتا ہے) تو ایسے امام حدیث سے تہی دست کہنا اس پر تہمت نہیں ہے ؟)

(۵) امام ابو حنیفہ نے چار ہزار مشائخ حدیث سے حدیثیں (حاصل کیں اور) لکھی ہیں یہاں تک کہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے مشائخ کی اس فہرست کو ثبت الحفاظ (حفاظ حدیث کی مستند فہرست) میں شمار کیا ہے ۔ یحییٰ بن نصر نے امام ابو حنیفہ سے ایک حدیث روایت کی ہے وہ کہتے ہیں : میں ابو حنیفہ کے پاس ان کے گھر گیا تو میں نے ان کا مکان کتابوں (یادداشتوں) سے بھرا ہوا پایا تو میں نے ان سے پوچھا : یہ کیا ہے ؟ تو ابو حنیفہ نے جواب دیا : یہ احادیث (کی یادداشتیں) ہیں میں نے ان میں سے تھوڑی سی حدیثیں جو (مسائل فقہیہ میں) قابل انتفاع ہیں (اپنے شاگردوں کے سامنے) بیان کی ہیں"۔

(۵) امام ابوحنیفہ اگرچہ عام محدثین کی طرح "حلقۂ درس حدیث" میں حدیثیں روایت کرنے کے لئے نہیں بیٹھے نہ ہی انھوں نے بذات خود کوئی احادیث و آثار کی کتاب تصنیف کی جیسے امام مالک نے مؤطا تصنیف کی ہے لیکن (ان سے استفادہ کرنے والے) ان کے شاگردوں نے (ان کی لکھائی ہوئی) حدیثیں مستقل کتابوں اور مسندوں میں (پورے اہتمام کے ساتھ) لکھی اور جمع کی ہیں جن کی تعداد دس سے زیادہ مسندوں تک پہونچتی ہے۔

ان مصنفات ومسانید میں سب سے زیادہ مشہور امام ابویوسف کی کتاب الآثار ہے۔ امام محمد کی صرف مرفوع احادیث پر مشتمل کتاب الآثار المرفوعہ ہے اور امام محمد ہی کی دوسری کتاب مرفوع اور موقوف دونوں قسم کی احادیث پر مشتمل کتاب الآثار المرفوعہ والموقوفہ ہے ایک مسند حسن بن زیاد کی جمع کردہ مسند حسن بن زیاد ہے ایک امام ابوحنیفہ کے صاحبزادہ حماد کی جمع کردہ مسند، مسند حماد ہے۔

ان کے علاوہ جن علماء ومحدثین نے امام ابوحنیفہ کی مسندیں تصنیف کی ہیں ان کے نام یہ ہیں (۱) الوھبی (۲) البخاری (۳) الحارثی (۴) ابن المظفر (۵) محمد بن جعفر (۶) ابونعیم الاصبہانی (۷) قاضی ابوبکر الانصاری (۸) ابن ابی العوام السعدی (۹) ابن خسرو البلخی (یہ کل چودہ مسندیں ہوئیں)

پھر قاضی القضاۃ ابوالمؤید محمد بن محمود الخوارزمی۔ متوفی ۶۶۵ھ۔ نے ان سب مسندوں کو ایک بڑی ضخیم کتاب میں جمع کر دیا جس کا نام انھوں نے جامع المسانید رکھا ہے۔ خوارزمی نے جامع المسانید کو (مسانید کے طرز کے بجائے) فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے اپنی اس کتاب کے خطبہ میں وہ لکھتے ہیں:

> میں نے شام میں بعض جاہلوں سے ابوحنیفہ کی حدیثوں کی مقدار کے بارے میں ایسی حقیر مقدار کا ذکر سنا جس سے امام کی تحقیر وتنقیص ہوتی تھی اور اسی بنا پر وہ امام کی طرف قلت حدیث کو منسوب کرتے تھے اور اس قلت حدیث کی دلیل میں وہ مسند شافعی اور موطا مالک کو پیش کرتے تھے اور دعوی کرتے تھے ...... کہ ابوحنیفہ کی کوئی (ایسی) مسند (یا حدیث کی کتاب)

نہیں ہے وہ تو صرف چند حدیثیں ہی روایت کرتے تھے۔ اس پر دینی غیرت وحمیت دامن گیر ہوئی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ بڑے بڑے علماء حدیث نے ابو حنیفہ کی (لکھائی ہوئی) حدیثیں جو پندرہ مسندوں میں جمع کی ہیں ان کو ایک جا کر دوں"

یہ کتاب جامع المسانید چھپ چکی ہے اور آٹھ سو صفحات پر حاوی ہے جن علماء ومحدثین نے امام ابو حنیفہ سے ان کو پڑھ کر سنکر اور لکھ کر روایت کیا ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:-

(۱) ملک شام کے محدث حافظ شمس الدین ابن طولون نے اپنی کتاب الفہرست الاوسط میں (۲) اور ملک مصر کے محدث حافظ محمد بن یوسف الصالحانی نے اپنی کتاب العقود الجمان میں ان احادیث کو امام ابو حنیفہ سے روایت کیا ہے۔

صالحانی اپنی کتاب العقود الجمان میں لکھتے ہیں:-

امام ابو حنیفہ کبار حفاظ حدیث اور سرفہرست محدثین میں سے تھے اگر وہ حدیثوں کے حاصل کرنے (اور یاد رکھنے) میں اتنا اہتمام واعتنا نہ کرتے تو فقہ کے مسائل کی اتنی بڑی مقدار کا استنباط کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوتا اور حافظ ذہبی نے امام ابو حنیفہ کا ذکر طبقات الحفاظ میں کیا ہے اور (ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

اس کے بعد صالحانی عقود الجمان کے تیئیسویں (۲۳) باب میں لکھتے ہیں:-

ابو حنیفہ اگرچہ حفظ حدیث میں بہت بڑی وسعت کے مالک تھے (اور بہت زیادہ حدیثیں ان کو یاد تھیں) اس کے باوجود ان سے حدیثیں کم روایت کی گئیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ابو حنیفہ (ساری عمر) حدیثیں روایت کرنے کے بجائے اُن سے فقہی مسائل اخذ کرنے میں ہمہ تن مشغول رہے ......

...... بالکل اسی سبب (استنباط احکام فقہیہ) کی بنا پر امام مالک وامام شافعی نے بھی جتنی حدیثیں اُنھوں نے سُنی اور یاد کی تھیں اُن کی بہ نسبت بہت

تھوڑی حدیثیں اُن سے روایت کی گئی ہیں (ان ائمہ کے پاس حدیثیں روایت کرنے کے لیئے بیٹھنے کا وقت ہی نہ تھا) جیسا کہ صحابہ میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے بھی اُن کی حدیثوں سے وسیع اطلاع اور واقفیت کی نسبت بہت تھوڑی حدیثیں روایت کی گئی ہیں (اسی لیئے کہ امور خلافت میں مشغول و منہمک رہنے کی وجہ سے ان کے پاس حدیثیں بیان کرنے کے لیئے وقت نہ تھا) اس کے برعکس ان حضرات سے بہت چھوٹے صحابیوں سے ان کی نسبت بہت زیادہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔

اس کے بعد صالحانی نے ایسی روایتیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے پاس حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا بعد ازاں صالحانی نے ان سترہ آدمیوں کی (ابوحنیفہ تک) اسنادیں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں جنہوں نے ابوحنیفہ کی مسانید جمع کی ہیں جس سے ثابت ہو سکے کہ ابوحنیفہ کے پاس کتنی کثرت سے حدیثیں موجود تھیں (اور ان کی حدیثوں کو جمع کرنے والے کیسے پایہ کے محدثین ہیں) اسی طرح شمس الدین حافظ ابن طولون نے بھی اپنی کتاب الفہرست میں ان سترہ مسانید کی اسنادیں بیان کی ہیں بلکہ جب خطیب بغدادی دمشق جانے لگے ہیں تو اپنے ہمراہ دارقطنی کی جمع کردہ مسند ابی حنیفہ، ابن شاہین کی جمع کردہ مسند ابی حنیفہ اور خود خطیب کی جمع کردہ مسند ابی حنیفہ دمشق لے گئے ہیں۔ یہ تینوں مسندیں ان سترہ مسندوں کے علاوہ ہیں (گویا ابوحنیفہ کے مسندیں بیس ہوگئیں)

حافظ بدرالدین عینی اپنی کتاب تاریخ کبیر میں لکھتے ہیں کہ :-

تنہا ابن عقدہ کی جمع کردہ مسند ابوحنیفہ ایک ہزار سے اوپر احادیث پر حاوی ہے (یہ اکیسویں ہوئی)

حافظ ابن عقدہ کے متعلق حافظ جلال الدین اپنی کتاب التعقبات میں لکھتے ہیں :-

ابن عقدہ بہت بڑے حفاظ حدیث میں سے ہیں اکثر و بیشتر علماء رجال نے ان کو ثقہ کہا ہے۔ صرف متعصب علماء حدیث نے ہی ان کو ضعیف کہا ہے

امام محمد کی ایک اور کتاب الآثار بھی ہے جس میں وہ کثرت سے ابوحنیفہ سے حدیثیں روایت

کرتے ہیں۔ حاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں امام زفر کی ان دونوں[5] کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

یہ ہے امام ابوحنیفہ کے سرمایۂ حدیث کا تحقیقی بیان اس تحقیق و تفصیل کے بعد جیسے ابوحنیفہ پر لگایا ہوا قلت حدیث کا بہتان ساقط اور ختم ہو جاتا ہے — جیسا کہ آپ دیکھ چکے — اسی طرح اس بیان سے ایک دوسرا بہتان بھی ختم ہو جاتا ہے وہ یہ کہ ابوحنیفہ کے پاس صرف کچھ اوپر دس حدیثیں تھیں۔

علاوہ ازیں یہ ایک ایسا افترا ہے جس کا کسی بھی معتبر کتاب میں نام تک نہیں ہے مقدمہ ابن خلدون کے سوا اور کسی بھی مورخ کی کتاب میں ہمیں یہ بیان نہیں ملتا۔ (۲)

ابن خلدون کی عبارت بھی بہت مبہم ہے اس لئے کہ وہ لکھتے ہیں کہ: ابوحنیفہ کی "مرویات" کی تعداد سترہ ہے (ہوسکتا ہے کہ "مرویات ابوحنیفہ" سے ابن خلدون کی مراد ابوحنیفہ کی یہی سترہ مسانید ہوں نہ یہ کہ ابوحنیفہ کے پاس صرف . . . سترہ روایتیں تھیں ورنہ) یہ تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ ابوحنیفہ کی حدیثوں کی تعداد ہی سترہ ہے۔ (نہ ہی لبقائمی ہوش و حواس کوئی یہ کہہ سکتا ہے

---

(۱) تانیب الخطیب ص ۱۵۶ — ۱۲

(۲) ممکن ہے کہ ابن خلدون کے اس قول کا منشا یہ ہو کہ امام محمد نے پورا موطا امام مالک سے روایت کیا ہے اسمیں صرف تیرہ ایسی حدیثیں اضافہ کی ہیں جو امام مالک بجائے امام ابوحنیفہ سے روایت کی ہیں اور چار حدیثیں ابویوسف کے واسطہ) سے روایت کی ہیں ان سترہ حدیثوں کو دیکھ کر بعض بے علم یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ ابوحنیفہ سے بس یہی سترہ حدیثیں مروی ہیں۔ ابن خلدون کے بیان کی اس توجیہ کے باوجود ہمیں اس بحث و تحقیق کے سلسلہ کو جاری رکھنا چاہئے تاآنکہ ہمیں یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ ابن خلدون نے یہ سترہ حدیثوں والی کہانی کہاں سے لی ہے۔ ۱۲

[5] یعنے امام زفر کی ایک کتاب الآثار تو وہ ہے جس کا نام امام ابویوسف اور امام محمد کی کتاب الآثار کے ساتھ لیا جاتا ہے (اس میں صرف امام ابوحنیفہ سے مروی حدیثیں ہیں اس کے علاوہ امام زفر کی ایک اور کتاب الآثار بھی ہے جس میں ابوحنیفہ کے علاوہ اور مشائخ سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں لیکن اس میں بھی زیادہ تر روایتیں ابوحنیفہ سے ہی مروی ہیں ۱۲ محشی

بجز اس شخص کے جس کو تعصب نے بالکل ہی اندھا کر دیا ہو)

اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو مسندیں امام ابوحنیفہ سے صحیح اسانید کے ساتھ ثابت ہیں ان میں جتنی حدیثیں مذکور ہیں اور جو حدیثیں فقہی مسائل کے ذیل میں (کتب فقہ میں) مذکور ہیں جن پر ابوحنیفہ نے عمل کیا ہے ان سب کی تعداد ہی سیکڑوں ہزاروں تک پہونچی ہے جیساکہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ابن خلدون کے اس بیان کی تردید و تکذیب کرتی ہے اور اس بیان کو کھلا ہوا بہتان ثابت کر دیتی ہے۔

اس مقام پر ہم چاہتے ہیں کہ ایک اور غلطی یا غلط فہمی کی حقیقت بھی طشت ازبام کر دیں جس میں بعض اہل قلم، مصنفین و مولفین بھی گرفتار ہیں (۱) وہ غلطی یہ ہے کہ یہ مصنفین ابوحنیفہ کی اس مزعومہ) قلت حدیث کا عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ ابوحنیفہ کوفہ میں تھے اور کوفہ میں حدیثیں بہت ہی کم تھیں اس لئے کہ کوفہ حدیث کا شہر (یعنی مرکز) نہ تھا"

اس غلط فہمی (اور غلط نگاری) کا شکار یہ حضرات صرف اس لئے ہوئے ہیں کہ ان کو ابوحنیفہ کے عہد میں کوفہ کے علمی مقام و مرتبہ کا پتہ نہیں چل سکا اور نہ ہی ان حضرات کو اس حقیقت کا علم ہو سکا کہ ابوحنیفہ نے کس قدر مشہور ترین شہروں (اور علمی مرکزوں مکۃ المکرمہ مدینہ طیبہ اور بغداد وغیرہ) کے کتنے سفر کئے ہیں۔

سنئے! کوفہ کا شہر ۱۷ھ میں (حضرت عمر کے حکم اور آزمودہ کار صحابہ کے مشورہ سے حربی مصالح کے تحت اسلامی چھاؤنی کے طور پر) بسایا گیا ہے اور اُسی وقت سے کوفہ بڑے بڑے صحابہ کرام کا مستقل مسکن[۱] بن گیا ہے اور (کوفہ کی اسی اہمیت کی بنا پر) حضرت عمر نے عبداللہ

---

(۱) ان مصنفین میں سے ایک شاہ ولی اللہ دہلوی ہیں جنہوں نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں بھی بات لکھی ہے ۱۲۔

[۱] عالمگیر اسلامی فتوحات کے لئے عساکر اسلامیہ کی قیادت صحابہ کرام ہی کیا کرتے تھے اور کوفہ سے ہی ان کی قیادت میں اسلامی فوجیں اطراف واکناف عالم میں روانہ کی جاتی تھیں اور ہر محاذ جنگ سے وہیں واپس آتی تھیں اسی لئے مکہ اور مدینہ تو صحابہ سے تقریباً خالی ہو گئے تھے اور کوفہ ہی صحابہ کا مستقل مسکن بن گیا تھا اور حضرت علی کے عہد خلافت میں تو کوفہ ہی دارالخلافہ بن گیا تھا (باقی صفحہ ۳۴۴ پر)

ابن مسعود کو جو ابن ام عبدؓ کے نام سے معروف تھے اہل کوفہ کے پاس بھیجا تھا — یہ ابن مسعود (سابقین اولین میں) اسلام لانے والے چھٹے آدمی تھے — تاکہ ابن مسعود اہل کوفہ کو (جو عام طور پر نو مسلم تھے) قرآن کی تعلیم دین اور ان میں دین کے احکام و مسائل کی سمجھ پیدا کریں۔ اور ابن مسعود کو بھیجتے وقت حضرت عمر نے اہل کوفہ سے کہا تھا ؛ عبداللہ بن مسعود کو تمہارے پاس بھیجکر میں نے تم کو اپنے پر ترجیح دی ہے"۔ اس فرمانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ عبداللہ بن مسعود کا (صحابہ میں) علمی مقام و مرتبہ اتنا بلند تھا کہ خلیفۂ وقت بھی اپنے دار الخلافہ (مدینہ طیبہ) میں اُن سے مستغنی نہیں ہو سکتے تھے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے :

من اراد ان یقرأ القرآن غضا کما انزل فلیقرأہ علی قراءۃ ام عبد	جو شخص چاہے کہ قرآن کو اسی تر و تازگی کے ساتھ پڑھے جیسے وہ اُتارا گیا ہے تو اسے چاہیئے کہ ابن ام عبد (ابن مسعود) کی قرأت کے مطابق پڑھے۔

حضرت عمرؓ ابن مسعودؓ کے متعلق فرمایا کرتے تھے :۔

کنیف مُلئی علما	ابن مسعود تو علم سے بھرا ہوا خزانہ ہیں۔[1]

ابن مسعود کی وسعت علم اور جلالت شان سے متعلق اور حدیثیں بھی کثرت سے مروی ہیں۔

ایسے کثیر العلم اور جلیل القدر صحابی کے متعلق اہل کوفہ کو فقیہ بنانے کا کام سپرد ہوا تھا چنانچہ جب سے حضرت عمرؓ نے ابن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا تھا اس وقت سے حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور کے آخر تک ابن مسعود انتہائی جد و جہد اور اہتمام کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے اور (اس تقریباً پندرہ برس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۳) اور حدیثوں کا سرچشمہ صحابہ کرام ہی ہیں اس لئے یہ کسی طرح بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں اتنی کثرت سے صحابہ آباد ہوں وہ جگہ حدیثوں سے خالی ہو جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حجۃ الوداع کے عظیم ترین اجتماع میں یہ حکم دیا ہے : فلیبغ الشاھد الغائب (جو موجود ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ غیر موجود لوگوں کو پہونچا دیں۔) ۱۲ مترجم

[1] کنیف عربی لغت میں اس خشک درختوں سے بنائے ہوئے باڑے کو کہتے ہیں جو گلہ بان بکریوں کے ریوڑ کے لئے بناتے ہیں تاکہ رات کو ریوڑ اس میں بند کر دیئے جائیں یہ باڑہ بکریوں بھیڑوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے ہم نے "خزانہ" سے ترجمہ کر دیا ہے ۱۲ محشی

کے عرصہ میں) قراء اور فقہا کی ایک بہت بڑی تعداد ابن مسعود سے علم حاصل کرکے اور فارغ التحصیل ہوکر نکل چکی تھی یہانتک کہ کوفہ کے فقہا کی اس کثرت سے متاثر ہوکر ہی حضرت علی نے (جب کوفہ کو دار الخلافہ بنایا تو) ابن مسعود سے فرمایا تھا:۔

ملئت ھذہ القریۃ علما وفقھا۔ — تم نے تو اس بستی کو علم (حدیث) اور فقہ سے بھر دیا ہے۔

بلکہ ابن مسعود کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد تو چار ہزار تک پہونچی ہے جن میں سے ہر ایک اس اسلامی بستی کا روشن چراغ ہوا ہے

(کوفہ کو دار الخلافہ بنانے کے بعد) حضرت علی اور بڑے بڑے سرکردہ صحابہ کے کوفہ منتقل ہونے کے بعد تو کوفہ کے باشندوں کو (دینی احکام کی تعلیم دینے اور) فقیہ بنانے کا کام اور بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ ہونے لگا یہاں تک کہ کوفہ فقہا، محدثین اور قرآن و عربی لغت کے حاملین و ماہرین کی کثرت کے لحاظ سے تمام اسلامی شہروں میں یکتا اور بے نظیر بن گیا تھا۔ کیونکہ (دار الخلافہ بن جانے کے بعد تو) کوفہ اور اس کے گردو نواح میں (نہ صرف صحابہ بلکہ) خالص عربی النسل اور فصیح اللسان قبائل بھی وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے۔ (اس لئے حدیث و فقہ کے علاوہ علوم عربیت کا بھی مرکز بن گیا تھا)

اگر (حربی مصالح کے تحت) کوفہ میں آباد ہونے والے کبار صحابہ کی کثیر تعداد اور عبد اللہ بن مسعود اور حضرت علی کے بڑے بڑے شاگردوں کی کثیر تعداد سے متعلق کوئی مستقل تصنیف مرتب کی جائے تو یقیناً بہت بڑی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ محدث عجلی نے صرف ان صحابہ کی تعداد جو کوفہ میں آباد تھے ڈیڑھ ہزار[۵۱] بتلائی ہے۔ صحابہ کی یہ تعداد ان صحابہ کے علاوہ ہے جو عراق کے باقی شہروں میں آباد تھے۔

۵۱؎ اور فرمان نبوی علیہ الصلاۃ والسلام فلیبلغ الشاھد الغائب کے تحت تمام صحابہ کا فریضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو دوسروں تک پہونچانا تھا اس لئے یہ ممکن نہیں کہ جس ملک میں وہ آباد ہوں اس ملک کے باشندوں کو وہ حدیثیں نہ پہونچائیں اس لئے ڈیڑھ ہزار صحابیوں کی کم از کم ڈیڑھ ہزار حدیثیں تو کوفہ میں ضرور ہی ہونی چاہئیں ۱۲ محشی

جلیل القدر بلند پایہ تابعی مسروق بن الاجدع فرماتے ہیں:

وجدت علم اصحاب محمد ینتھی الی ستۃ: الی علی وعبد اللّٰہ وعمر وزید وابی الدرداء وابی بن کعب ثم وجدت علم ھؤلاء الستۃ انتھی الی علی وعبد اللّٰہ

(حسن التقاضی)

میں نے (تجربہ کے بعد) محسوس کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا علم (احادیث) چھ آدمیوں کے پاس آکر جمع ہوجاتا ہے حضرت علی[1]، ابن مسعود[2]، عمر[3]، یزید[4]، ابوالدرداء[5]، ابی بن کعب[6] پھر میں نے دیکھا کہ ان چھ آدمیوں کا علم (حدیث) حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود کے پاس آکر جمع ہوجاتا ہے[1]

امام ابوحنیفہ کے علمی سفر

رہے امام ابوحنیفہ کے علمی سفر تو وہ دس مرتبہ تو بصرہ گئے ہیں اور دس مرتبہ مدینہ طیبہ کی زیارت کی ہے اور ہم بیان کرچکے ہیں کہ ۱۳۰ھ سے ۱۳۶ھ تک (چھ سال مسلسل) ابوحنیفہ مکۃ المکرمہ میں مقیم رہے ہیں اور دونوں مقدس شہروں (مکہ و مدینہ) میں (حج کے موقعہ پر) بیشتر علماء حرمین کے علاوہ امام اوزاعی وغیرہ بعض مشہور ائمہ مجتہدین سے بھی ابوحنیفہ کی ملاقاتیں ہوئی ہیں اسی زمانۂ قیام مکۃ المکرمہ میں حضرت ابن عباس کے شاگردوں سے ان کا علم (احادیث و آثار) حاصل کیا ہے اور مدینہ میں حضرت عمر کا علم (احادیث و آثار) ان کے تلامذہ سے حاصل کیا ہے اور مدینہ میں ہی بعض ائمہ اہل بیت سے بھی علم (حدیث) حاصل کیا ہے ان ائمہ میں حضرت زید بن علی، امام زین العابدین، امام محمد الباقر اور محمد عبداللہ بن الحسن کے نام قابل ذکر ہیں (۱)

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ بغداد میں بیان کیا ہے کہ ابوحنیفہ ایک دن عباسی خلیفہ منصور کے پاس گئے اس وقت منصور کے پاس عیسیٰ بن موسیٰ بھی موجود تھے تو انھوں نے منصور سے کہا: یہ شخص

---

[1] بالفاظ دیگر اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا تمام ذخیرہ حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود کے پاس جمع ہوجاتا ہے اور یہ دونوں بزرگ کوفہ میں رہتے تھے اس لحاظ سے احادیث کا پورا ذخیرہ کوفہ میں تھا پھر کوفہ سے اور تمام اسلامی شہروں میں پہونچا ہے۔ دیکھا آپ نے یہ ہے کوفہ میں قلت حدیث کی حقیقت۔ محشی

(۱) حوالہ کے لئے مناقب ابی حنیفۃ المکی ملاحظہ فرمایئے۔

آج دنیا کا سب سے بڑا عالم ہے" تو منصور نے ابو حنیفہ سے پوچھا: اے نعمان تم نے علم[1] کن لوگوں سے حاصل کیا ہے؟ ابو حنیفہ نے جواب دیا: حضرت عمرؓ کا علم ان کے شاگردوں سے اور حضرت علیؓ کا علم ان کے شاگردوں سے اور عبداللہؓ بن مسعود کا علم ان کے شاگردوں سے اور حضرت ابن عباسؓ کے وقت میں تو روئے زمین پر ان سے بڑھ کر عالم کوئی تھا ہی نہیں (یعنی ابن عباس کا علم ان کے شاگردوں سے حاصل کیا ہے)" منصور نے اس پر کہا: بیشک تم نے اپنے پاس قابل اعتماد علم جمع کیا ہے"

تو اب ابو حنیفہ جیسا امام جس نے مشہور ترین صحابہ کے علوم (احادیث و آثار) کے ذخیرے اپنے پاس جمع کئے ہوں اور ان کو اپنے سینہ میں کمل طور پر محفوظ کیا ہو کیا اس کی طرف سے یہ عذر خواہی کرنا کہ وہ کوفہ جیسے شہر میں رہتے تھے جہاں "حدیث[2] کم تھی" کسی طرح بھی صحیح (اور معقول) ہو سکتا ہے؟ حالانکہ کوفہ تو کوفہ ہی تھا۔ علماء حدیث کی کثرت کی وجہ سے احادیث و آثار سے مالامال، حاملین حدیث صحابہ و تابعین سے لبالب بھرا ہوا حد بڑے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی وہاں مستقل طور پر آباد کیا شان ہے کوفہ کی۔

---

[1] صحابہ اور تابعیں کے عرف میں علم سے مراد علم حدیث ہوتا ہے جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے حافظ ابن عبدالبر نے بھی اپنی کتاب جامع بیان العلم میں اس کی تصریح کی ہے ۱۲ محشی

[2] پھر یہ نہیں کہ ابو حنیفہ ساری عمر کوفہ میں ہی رہے ہوں باہر نہ نکلے ہوں، آپ ابو حنیفہ کے علمی سفروں کا مختصر سا حال پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے مکۃ المکرمہ، مدینہ طیبہ، بصرہ اور بغداد وغیرہ علم و حدیث کے مراکز کے نہ صرف ایک دو بلکہ دسیوں سفر کئے ہیں اور وہاں مہینوں قیام کر کے احادیث و آثار کے جتنے ذخیرے جہاں جہاں موجود تھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع اور محفوظ کئے ہیں خصوصاً مکۃ المکرمہ کے چھ سالہ قیام میں تو حج کے مواقع پر تمام عالم اسلام سے آئے ہوئے علماء حدیث سے استفادہ کیا ہے اس لئے امام ابو حنیفہ کے اس قول میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ عندی صنادیق من حدیث ما حدثت منها الا الیسیر الذی ینتفع ـــ میرے پاس حدیثوں سے بھرے ہوئے صندوق ہیں میں نے ان میں سے بہت تھوڑی حدیثیں بیان کی ہیں جن کی مسائل فقہیہ کے اخذ کرنے کے لئے ضرورت تھی ـــ یہ "تھوڑی سی حدیثیں" وہی ہیں جن سے اکیس مسندیں تیار ہوئی ہیں جن کا حال آپ پڑھ چکے ہیں ۱۲ محشی

کیا ابوحنیفہ "رائے" کو حدیث پر مقدم[۱] رکھتے اور ترجیح دیا کرتے ہیں

امام ابوحنیفہ کے فقہی مذہب کے اصول ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ اصول آفتاب نیمروز سے بھی زیادہ روشن دلیل ہیں اس امر کی کہ ابوحنیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر کسی بھی چیز کو ترجیح نہیں دیتے تھے جبکہ وہ حدیث صحیح سند سے ثابت اور ثقہ راویوں کے حلقہ میں معروف ہو، نہ "رائے" کو نہ "قیاس" کو نہ "استحسان" کو۔ ابن ابی العوام نے اپنی سند سے جو ابویوسف تک پہنچتی ہے ایک روایت نقل کی ہے کہ :۔

> ابویوسف نے بیان کیا: ابوحنیفہ کے سامنے جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا تو اپنے شاگردوں سے خطاب کرکے فرماتے : اس مسئلہ میں تمہارے پاس احادیث و آثار ہیں تو بیان کرو؟ تو جب ہم احادیث و آثار پیش کرتے اور (ان کے تحت) اپنی رائے بیان کرتے اور وہ خود اس (فقہی) نظر کو بیان کرتے جو ان کے سامنے ہوتی تو ان دونوں قولوں (رائیوں) میں سے جس رائے کی تائید میں احادیث و آثار زیادہ ہوتے وہ انہی آثار و احادیث (سے تائید شدہ قول) کو اختیار کر لیتے اور اگر دونوں طرف کے آثار قریب قریب اور برابر ہوتے تو وہ غور کرتے اور پھر انہی میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیتے (۱)

موفق خوارزمی نے اپنی سند سے جو ابومقاتل حفص بن سلم السمرقندی تک پہونچتی ہے اپنی کتاب العالم والمتعلم میں روایت کیا ہے کہ :۔

> امام ابوحنیفہ نے فرمایا: ہر وہ بات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے (اور صحیح سند سے ثابت ہے)۔ خواہ ہم نے (اپنے مشائخ سے) اس کو سنا ہو یا نہ سنا ہو وہ ہمارے سر آنکھوں پر ہے۔ بیشک ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ بات ویسی ہی ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

---

(۱) "تأنیب الخطیب الکوثری ص ۸۶ – ۱۲

[۱] یہ دوسرا بہتان ہے جو آج تک بھی تعصب پیشہ لوگوں کی زبان و قلم پر جاری وساری ہے ۱۲ محشی

حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب انتقاء میں امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :-

اللہ تعالیٰ کی اس شخص پر لعنت ہو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے (کسی بھی بات میں) خلاف کرتا ہو۔ آپ ہی کی بدولت تو اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایمان کے شرف سے نوازا اور سرفراز فرمایا ہے اور آپ ہی کے ذریعہ اُس نے ہمیں ہلاکت سے بچایا ہے

امام بیہقی نے اپنی کتاب المدخل میں حافظ ابن المبارک کا قول نقل کیا ہے :-

میں نے ابوحنیفہ کو یہ کہتے سُنا ہے : جب کوئی بات (قولی یا فعلی حدیث) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے (صحیح سند کے ساتھ) ثابت ہو جائے تو وہ تو سر آنکھوں پر ہے (آمنا وصدقنا) اور جب آپ کے صحابہ کی کوئی بات (صحابہ کا قول یا فعل) آجائے تو ہم ان کے (مختلف) اقوال میں سے کسی ایک قول کو (جو مصالح شرعیہ سے زیادہ قریب ہو) اختیار کر لیتے ہیں (ان سے باہر نہیں جاتے) اور جب تابعین سے ہمیں کوئی بات (ان کا قول یا فعل یا فتویٰ) پہونچتی ہے تو ہم (اجتہادی نقطۂ نظر سے) ان (کے اقوال) سے بحث کرتے ہیں (اس کے بعد ان کی یا اپنی رائے کو اختیار کر لیتے ہیں) (۱)

حافظ ابن عبدالبر نے امام محمد بن الحسن سے روایت کیا ہے کہ :-

علم کی چار قسمیں ہیں (۱) ایک وہ علم ہے جو اللہ کی ناطق (فیصلہ کن) کتاب میں موجود ہو یا جو (قطعیت میں) اس سے ملتا جلتا ہو (۲) دوسرے وہ علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت (قولی یا فعلی حدیث) میں موجود اور متوارث طور پر منقول ہو یا جو اس سے ملتا جلتا ہو (۳) تیسرے وہ علم جس پر صحابہ کا اجماع اور اتفاق ہو چکا ہو یا جو اس سے ملتا جلتا ہو (۴) چوتھے اسی طرح جس مسئلہ

---

(۱) مفتاح الجنۃ للسیوطی امام ابوحنیفہ کے قول "زاحمناھم" کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ابوحنیفہ خود تابعی تھے اُنھوں نے چار صحابہ کو دیکھا تھا۔ ۱۲

میں صحابہ کے اندر اختلاف ہو اس کا علم بھی ان سب صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جا سکتا پس اگر ان اقوال صحابہ میں سے کسی بھی قول کو اختیار کر لیا گیا تو وہی اس مسئلہ کا علم (اور حکم) ہے اسی (مختار قول) پر ہم اس سے ملتی جلتی چیزوں کو قیاس کریں گے اور عام فقہا نے جن چیزوں کو مستحسن قرار دیا ہے ان کو اور اُن سے ملتی جلتی چیزوں کو بھی جو ان کی نظیر ہوں اُسی (مختار قول) پر قیاس کریں گے (گویا وہی مختار قول سب کے لئے مقیس علیہ اور معیار ہوگا) کسی بھی مسئلہ کا علم ان چاروں صورتوں سے باہر نہیں ہو سکتا۔ (۱)

امام شعرانی اپنی کتاب میزان میں خود امام ابو حنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں :۔

خدا کی قسم جھوٹ بولا اور ہم پر تہمت لگائی اس شخص نے جس نے (ہمارے متعلق) یہ کہا: کہ ہم قیاس کو قرآن یا حدیث کی نص پر مقدم رکھتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ کیا قرآن وحدیث کی نص کے ہوتے بھی قیاس کی ضرورت باقی رہ سکتی ہے ؟

امام شعرانی نے ابو حنیفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے :

ہم انتہائی شدید ضرورت (اور مجبوری) کے وقت ہی قیاس کرتے ہیں اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ہم مسئلہ کی دلیل کی تلاش وجستجو کرتے ہیں۔ (اول) کتاب اللہ میں (پھر) سنت وحدیث رسول اللہ میں یا پھر صحابہ کے اجتہادی فیصلوں میں، جب ہم کو (زیر نظر مسئلہ کی) دلیل کہیں بھی نہیں ملتی تو پھر ہم قیاس سے کام لیتے ہیں اس اصول کے تحت کہ مسکوت عنہٗ (یعنے جس حکم سے کتاب وسنت اور صحابہ کے اجتہاد میں سکوت اختیار کیا گیا ہے نفیاً یا اثباتاً کہیں ذکر نہیں اس) کو (کتاب وسنت میں) منطوق ومذکور حکم پر قیاس کرتے ہیں۔

امام شعرانی نے ابو حنیفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے :۔

---

(۱) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۳۶ امام سرخسی نے بھی اپنی کتاب اصول السرخسی میں اس قول کو نقل کیا ہے مگر سرخسی نے چوتھی صورت یہ نقل کی ہے کہ: مسلمان جس امر کو اچھا سمجھیں اور جو اس سے ملتا جلتا ہو۔ ج ۱ ص ۳۱۸

ہم اول کتاب اللہ سے (زیر نظر مسئلہ کا) حکم معلوم کرتے ہیں پھر سنت و حدیث سے پھر صحابہ کے (اجتہادی) فیصلوں سے اور جس امر پر صحابہ متفق ہوتے ہیں اسی پر ہم بھی عمل کرتے ہیں اگر صحابہ میں اختلاف ہوتا ہے تو ہم اپنے (اجتہادی) فیصلہ کو ان صحابہ (میں سے کسی ایک) کے فیصلہ پر قیاس کر لیتے ہیں یہ قیاس اُس جامع علت (وصف مشترک) کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جو دونوں میں مشترک ہوتی ہے تاکہ مسئلہ اور اس کے حکم کی حقیقت واضح ہو جائے۔

امام ابوحنیفہ کا یہ قول بھی شعرانی نے نقل کیا ہے:-

جو بات (قولی یا فعلی حدیث) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت ہو وہ تو سر آنکھوں پر، ماں باپ آپ پر قربان، ہمیں اس کی مخالفت کا کوئی حق نہیں اور جو بات (قولی یا فعلی اثر) صحابہ سے ثابت ہو (اگر اس میں اختلاف ہوتا ہے تو) ہم اس میں سے (مصالح شرعیہ سے قریب تر قول کو) انتخاب کرتے ہیں، اور جو بات (اجتہادی رائے) صحابہ کے علاوہ تابعین سے ثابت ہو (اگر وہ ہماری اجتہادی رائے کے موافق ہوتی ہے تو ہم اس کو قبول کرتے ہیں اور نہ خود اجتہاد کرتے ہیں اس لئے کہ وہ بھی آدمی تھے ہم بھی آدمی ہیں (جیسے انھیں اجتہاد کا حق ہے ہمیں بھی اجتہاد کا حق ہے)

علاوہ ازیں امام محمد بن الحسن نے اپنی کتاب المبسوط میں اخبار آحاد سے استدلال کے موضوع پر ایک علیحدہ فصل قائم کی ہے اور اس میں خبر واحد سے استدلال کے جواز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے عمل سے دلائل پیش کیے ہیں یہی وہ دلائل ہیں جن کو امام شافعی نے اپنی کتاب الرسالہ میں اسی عنوان کے تحت نقل کر دیا ہے۔

الغرض یہ بے شمار تصریحات میں سے چند صریح عبارتیں ہیں جو اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ ابوحنیفہ اجتہادی رائے کو خواہ وہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو، صحیح حدیث پر ہرگز مقدم نہیں رکھتے (اور ترجیح نہیں دیتے) تھے بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ابن حزم جیسے ناقد نے بھی فقہاء عراق کا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ان فقہاء کے نزدیک ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح حاصل تھی۔

حافظ ابن قیم بھی اپنی کتاب اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں :-

ابوحنیفہ کے شاگردوں کا اس پر اتفاق واجماع ہے کہ ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث بھی قیاس اور اجتہادی رائے سے مقدم اور راجح ہے اسی پر ابوحنیفہ نے اپنے مذہب (فقہ حنفی) کی بنیاد رکھی ہے چنانچہ (۱) ابوحنیفہ نے قہقہہ فی الصلوٰۃ (نماز میں قہقہہ مار کر ہنسنے) کی حدیث کو ضعیف ہونے کے باوجود قیاس اور اجتہادی رائے پر مقدم رکھا (۲) اور سفر میں کھجور کے نبیذ سے جواز وضو والی حدیث کو ضعیف ہونے کے باوجود قیاس اور اجتہادی رائے پر مقدم رکھا اور (۳) دس درہم سے کم میں چور کا ہاتھ کاٹنے کو ممنوع قرار دیا حالانکہ حدیث (جس میں یہ حکم مذکور ہے وہ) کمزور ہے اور (۴) حیض (ایام ماہواری) کی زیادہ سے زیادہ مدت دس دن مقرر کی حالانکہ حدیث (جو اس سلسلہ میں آئی ہے وہ) کمزور ہے اور (۵) جمعہ کی نماز کے جواز کے لئے ابوحنیفہ نے شہر کی شرط لگائی حالانکہ حدیث (جو اس سلسلہ میں آئی ہے اس) کا حال بھی یہی ہے (یعنے ضعیف ہے) اور (۶) کنوؤں کے پاک ہونے کے مسائل میں انھوں نے قیاس محض کو چھوڑ دیا ان غیر مرفوع آثار کی وجہ سے جو اس سلسلہ میں آئے ہیں لہذا ضعیف حدیث اور صحابہ کے آثار کو قیاس اور اجتہادی رائے پر مقدم رکھنا اور ترجیح دینا تو ابوحنیفہ کا مذہب ہے ایسے ہی جیسے امام احمد کا مذہب ہے۔ (واضح ہو) یہ ضعیف حدیث (جس کا اوپر ذکر آیا ہے) متقدمین کی اصطلاح کے مطابق وہ ضعیف حدیث نہیں ہے جس کو متاخرین کی اصطلاح میں "ضعیف" کہتے ہیں بلکہ اس ضعیف سے مراد وہ حدیث ہے جس کو متاخرین "حسن" کہتے ہیں، متقدمین ایسی حدیث (حسن) کو ہی ضعیف کہا کرتے ہیں۔[1]

---

[1] متقدمین کی اصطلاح میں حدیث کی دو ہی قسمیں ہیں صحیح اور غیر صحیح ہر وہ حدیث جو اعلیٰ درجہ کی صحیح نہ ہو وہ اسی کو ضعیف کہہ دیتے ہیں اس کے برعکس متاخرین نے مقبول حدیث کی چار قسمیں قرار دی ہیں (باقی صفحہ ۳۵۳ پر)

مصنف کی رائے

میری رائے یہ ہے کہ جن احادیث کو ابوحنیفہ نے اختیار کیا ہے اور وہ محدثین کے نزدیک اُسی معنی میں ضعیف ہوں جو سلف صالحین کی اصطلاح میں معتبر ہیں تب بھی اس (سلف کے ان کو ضعیف قرار دینے) سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ابوحنیفہ کے نزدیک بھی ضعیف ہوں بلکہ لازمی طور پر وہ حدیثیں ابوحنیفہ کے قائم کردہ اصول عامہ کے معیار پر صحیح ہونی چاہئیں (ورنہ ابوحنیفہ ان کو کیسے اختیار کرسکتے ہیں)

بات یہ ہے کہ اس قسم کی احادیث (کی صحت یا ضعف کے بارے) میں مجتہدین کے نقطہ ہائے نظر بسا اوقات مختلف ہوتے ہیں جس حدیث کو ایک امام صحیح (یا ضعیف) کہتا ہے بسا اوقات وہ حدیث دوسرے امام کے نزدیک ویسی (صحیح یا ضعیف) نہیں ہوتی (آئندہ مثالوں میں یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجائے گی)

جو کچھ بھی ہو، ابن حزم اور ابن قیم جیسے ناقدین ــ جو سب سے بڑھ چڑھ کر اس سلسلہ میں ابوحنیفہ پر تنقید کرتے ہیں ــ کا یہ اعتراف کہ: ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دیا کرتے تھے" ہمارے زیر بحث مسئلہ میں (یعنے ابوحنیفہ پر سے اس الزام کی تردید میں کہ ابوحنیفہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں) بہت مفید ہے (اور اُردو مثل "جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے" کا مصداق ہے)

نیز ہم اس سے پہلے بتلا چکے ہیں کہ ابوحنیفہ "مرسل" احادیث کو بھی قبول کرتے اور ان کو رائے اور قیاس پر مقدم رکھتے (اور ترجیح دیتے) تھے۔ دراں حالیکہ امام شافعی بھی مُرسل حدیثوں کو بعض شرطوں کے ساتھ قبول کرلیتے ہیں اُن کے علاوہ اور محدثین تو سب کے سبھی، متفقہ طور پر مُرسل حدیثوں کو رَد کرتے ہیں اور قبول نہیں کرتے (اس کے باوجود ابوحنیفہ پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ قیاس اور اجتہادی رائے کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں؟ حیرت ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۲) (۱) صحیح لذاتہ (۲) صحیح لغیرہ (۳) حسن لذاتہ (۴) حسن لغیرہ۔ جو حدیث ان چاروں سے خارج ہو وہ اس کو ضعیف کہتے ہیں اس لحاظ سے متاخرین کی اصطلاح کے مطابق مقبول حدیث کی تینوں پچھلی قسمیں متقدمین کے نزدیک ضعیف کہلاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر متقدمین کے نزدیک صحیح حدیث کا دائرہ بہت محدود ہے۔ ۱۲ المحشی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرسل حدیثوں کے بارے میں ابوحنیفہ کا یہ مذہب یقیناً اسی شخص کا مذہب ہو سکتا ہے جو قیاس کی صرف اسی وقت پناہ لیتا ہو جبکہ استنباط احکام کے اور تمام راستے بند ہو جائیں اور کوئی صحیح اور قابل اعتماد اثر (حدیث) اس کو نہ ملتی ہو۔ اب کوئی ہمیں تبلائے کہ ابوحنیفہ پر آخر یہ تہمت کیونکر اور کہاں سے لگادی گئی کہ ابوحنیفہ رائے کو حدیث پر مقدم رکھتے (اور ترجیح دیتے) تھے (بقول شاعر: ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے)

خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں متعدد رواۃ حدیث سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ابوحنیفہ کے سامنے بہت سی احادیث پیش کیں لیکن انھوں نے ان کو نہیں مانا۔ اسی طرح خطیب، یوسف بن اسباط سے نقل کرتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار سو یا اس سے بھی زیادہ حدیثیں رد کی ہیں"۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ان چار سو حدیثوں میں سے صرف چار حدیثیں (ثبوت کے طور پر) پیش کر سکے ہیں۔

اسی طرح وکیع کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:- ہم نے ابوحنیفہ کو دو سو حدیثوں کا مخالف پایا ہے" (مگر ایک حدیث بھی پیش نہیں کر سکے)

اسی طرح حماد بن سلمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے احادیث و آثار اور سنن کو خوش آمدید تو کہا ہے لیکن اپنی رائے سے ان کو رد کر دیا ہے۔

ان اقوال کی نسبت ان کے قائلین کی طرف جیسی بھی ہو اتنی بات یقینی ہے کہ ان قائلین میں بعض کا تو امام صاحب (کی شاگردی میں ان) کے ساتھ رہنا اور ان سے علم (حدیث وفقہ) حاصل کرنا معروف و مشہور ہے یہ ہی ان حضرات کی طرف ان اقوال کی نسبت کی تکذیب و تردید کے لئے بہت کافی ہے

تاہم اس میں بھی شبہ نہیں کہ ابوحنیفہ کی زندگی میں ہی (یہ حضرات نہ سہی اور) بعض محدثین ......ایسے ضرور موجود تھے جنہوں نے ابوحنیفہ پر ان احادیث و آثار کے ترک کرنے پر جو ان کے نزدیک صحیح تھے گرفت کی تھی (اور ترک حدیث کا الزام لگایا تھا)

چنانچہ (آپ پڑھ چکے ہیں کہ) ابن ابی شیبہ نے ابوحنیفہ پر ایک سو پچیس مسئلوں میں حدیث کی مخالفت کرنے کا یعنی ایک سو پچیس حدیثوں کے ترک کرنے کا الزام لگایا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ابوحنیفہ کے لئے یہ مخالفتِ حدیث یا ترکِ حدیث کیسے جائز تھی جبکہ امام شافعی تو اہل علم کا اس پر اجماع اور اتفاق نقل کرتے ہیں کہ "جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہو کسی بھی مسلمان کے لئے اس کی مخالفت جائز نہیں" اور خود ابوحنیفہ کا بھی یہ مقولہ معروف ہے : جو بات (قولی یا فعلی حدیث) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے (صحیح سند کے ساتھ) ثابت ہو وہ سر آنکھوں پر"

اس سوال کے متعدد جوابات ہیں :

(ا) راویانِ حدیث کے اعتبار سے حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے بارے میں محدثین کے نقطہ ہائے نظر بسا اوقات مختلف ہو جاتے ہیں مثلاً کسی راوی حدیث کو امام ابوحنیفہ ثقہ اور عادل سمجھتے ہیں لیکن اسی راوی کو بعض اوقات دوسرے محدثین روایت میں معیوب اور مجروح سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں کہ ابوحنیفہ نے جن مشائخ سے (بالمشافہ) حدیثیں سنی ہیں ان سے وہ (شخصی طور پر) اچھی طرح واقف تھے اس لئے کہ ابوحنیفہ زمانہ کے اعتبار سے ان لوگوں سے بہت پہلے ہوئے ہیں جنہوں نے ان مشائخ کی وفات کے بعد ان پر جرح و تنقید کی ہے حتیٰ کہ بہت سی حدیثیں تو ایسی ہیں جن میں صحابی اور ابوحنیفہ کے درمیان صرف دو ہی راوی ہوتے ہیں ایسی صورت میں ابوحنیفہ (شخصی طور پر) بآسانی انکو پرکھ سکتے ہیں اس لئے کہ یا وہ دونوں راوی خود ابوحنیفہ کے زمانے میں موجود تھے یا ان کو جاننے والے موجود تھے .... جن سے ابوحنیفہ (تسلی بخش طریق پر) ان راویوں کا حال معلوم کر سکتے تھے (بہرصورت جن راویوں کی حدیثوں پر ابوحنیفہ نے اعتماد کیا اور صحیح کہا ان کی عدالت و ثقاہت کا جو علم ابوحنیفہ کو میسر تھا بعد کے محدثین کو وہ علم یقیناً حاصل نہیں ہو سکتا) باقی جو محدثین ابوحنیفہ کے براہِ راست اساتذہ نہیں تھے مثلاً حجاز اور شام کے مشائخ ـــ تو ان کی احادیث کے بارے میں ابوحنیفہ بیشتر توقف کیا کرتے تھے (اور قبول یا رد کا قطعی فیصلہ نہ کرتے تھے) اسی لئے ان مشائخ کے تلامذہ ان کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے بعض اوقات ابوحنیفہ کی رائے ان سے مختلف ہوتی تھی اسی (اختلافِ رائے کی) وجہ سے ابوحنیفہ نے ایسی بعض احادیث پر عمل ترک کر دیا تھا جو

دوسرے محدثین کے نزدیک صحیح ہوتی تھیں بالکل اسی طرح جیسے ان محدثین نے ایسی بعض احادیث پر عمل ترک کردیا تھا جو ابوحنیفہ کے نزدیک صحیح[1] ہوتی تھیں۔

(۲) بعض اوقات ایک مجتہد ایسی حدیث میں جو اس کے نزدیک بھی صحیح ہے اور دوسرے محدثین کے نزدیک بھی صحیح ہے کوئی ایسی وجہ محسوس کرتا ہے جس کی بنا پر وہ اس حدیث کو ظاہری معنی کے بجائے کسی دوسرے معنی پر محمول کرتا ہے جس کی دلیل اس کے پاس موجود ہوتی ہے یا وہ وجہ اسکو اس حدیث پر بالکل ہی عمل ترک کردینے پر مجبور کرتی ہے اس لئے کہ اس حدیث میں کوئی پوشیدہ علت ہوتی ہے یا وہ حدیث اس دلیل کے معارض ہوتی ہے جو محدث کے نزدیک اس حدیث سے زیادہ قوی ہوتی ہے یا اس کے نزدیک یہ محقق ہوتا ہے کہ اس حدیث کے راوی کو وہم ہوا ہے یا یہ حدیث منسوخ ہے یا کسی عام حکم کی اس حدیث سے تخصیص ہوتی ہے (یعنے اصل حکم تھا عام اس حدیث سے خاص ہوجاتا ہے) یا کسی مطلق حکم کی تقیید ہوتی ہے (یعنی اصل حکم میں کوئی قید نہ تھی اس حدیث سے قید کا اضافہ ہوجاتا ہے تو ان صورتوں میں بھی وہ اس حدیث پر عمل ترک کردیتا ہے۔ اسی کو دوسرے محدثین یا عام لوگ یہ سمجھتے ہیں (اور طعنہ دیتے ہیں) کہ دیکھو ابوحنیفہ نے صحیح حدیث پر عمل نہیں کیا (حالانکہ یہ کچھ ابوحنیفہ ہی کی خصوصیت نہیں ہر مجتہد کو ایسا کرنا پڑتا ہے چنانچہ) مصر کے امام لیث بن سعد نے اپنے ایک مکتوب میں جو انھوں نے امام مالک کو لکھا تھا ایسی ستر حدیثیں گنوائی ہیں جن پر امام مالک نے عمل نہیں کیا (۱) حالانکہ ان حدیثوں کو خود امام مالک نے اپنی کتاب موطا میں روایت کیا ہے (تو اگر ان وجوہ کی بنا پر ترک حدیث کوئی عیب ہے تو امام مالک کو بھی اس پر مطعون کرنا چاہیے)

شاید ہی آپ کو کوئی ایسا امام مجتہد ملے جس نے اُن قوی ترین دلائل کی بنا پر جو اس کے

---

[1] غرض خواہ ابوحنیفہ ہوں خواہ مخالف محدثین ہم دونوں کے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں کہ ہر ایک نے راویان حدیث کے متعلق اپنے اپنے ذاتی علم اور اتنیت کی بنا پر ان کی احادیث کو قبول یا رد کیا ہے ہم کسی ایک کو بھی ترک حدیث کا مرتکب نہیں کہتے ۔ ۱۲ محشی۔

(۱) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۸ - ۱۲

سامنے موجود ہوتے ہیں ایسی احادیث کو ترک نہ کیا ہو جو خود اس کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں لہذا ایک بڑا محدث نہ ہی ائمہ مجتہدین کے اس موقف کو سمجھ سکتا ہے نہ ہی اس راز کو پا سکتا ہے یہیں سے ایک محدث اور ایک فقیہ و مجتہد کے انداز فکر اور طریق کار کے درمیان نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے اسی فرق کو امام ابو حنیفہ نے ایک تمثیل کی صورت میں بیان فرمایا ہے ارشاد ہے :-

> جو شخص حدیث تو حاصل کرتا ہو (اور یاد کرتا کراتا ہو) لیکن احادیث سے استنباط احکام کے طریقوں سے نابلد ہو اس کی مثال عطار (دوا فروش) کی سی ہے جو دوائیں تو جمع کر لیتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ کونسی دوا کس مرض کے لئے ہے؟ یہاں تک کہ طبیب آتا ہے اور بتلاتا ہے (کہ یہ دوا فلاں مرض کے لئے مفید ہے اور یہ دوا فلاں مرض کے لئے) اسی طرح ایک حدیث کا طالب (محدث) اپنی حدیث کی فقہی توجیہ (طریق استنباط حکم) کو نہیں جانتا یہاں تک کہ فقیہ آتا ہے (اور اس حدیث سے احکام نکالتا ہے اور بتلاتا ہے) (۱)

حافظ ابن عبد البر نے امام ابو حنیفہ کے شاگرد ابو یوسف سے ایک روایت نقل کی ہے اس روایت سے آپ اس حقیقت کو سمجھئے روایت یہ ہے :-

> ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ (مشہور امام حدیث) اعمش نے مجھ سے ایک مسئلہ پوچھا اور اس وقت وہاں میرے اور ان کے سوا اور کوئی نہ تھا میں نے ان کو مسئلہ بتلایا انھوں نے مجھ سے دریافت کیا : اے یعقوب! تم یہ مسئلہ کہاں سے بیان کرتے ہو (یعنی اس کی دلیل کیا ہے)؟ میں نے جواب دیا اسی حدیث سے جو خود آپ نے مجھ سے بیان کی تھی ۔۔ ابو یوسف کہتے ہیں ۔۔ اس کے بعد میں نے وہ حدیث پڑھی (اور اس سے مسئلہ کا حکم نکال کر بتلایا) کہنے لگے : اے یعقوب! تمہارے باپ اور ماں کے ملنے (اور استقرار حمل) سے بھی پہلے سے مجھے یہ حدیث یاد ہے مگر آج تک مجھے اس حدیث کی یہ مراد معلوم نہ تھی (کہ اس سے

---

(۱) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۸ - ۱۲

یہ حکم نکلتا ہے)

اسی طرح ابن عبدالبر نے اپنی سند سے جو عبیداللہ بن عمرو تک پہونچتی ہے روایت کیا ہے کہ عبیداللہ بن عمرو نے کہا کہ :۔

میں ایک دن اعمش کی مجلس میں موجود تھا کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور اُن سے ایک مسئلہ پوچھا وہ اس کا جواب نہ دے سکے اور ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو ابوحنیفہ نظر آ گئے تو اُن سے کہا : اے نعمان ! تم ہی اس مسئلہ کا جواب دو" ابوحنیفہ نے جواب دیا کہ اس مسئلہ کا جواب یہ ہے اور یہ ہے" اعمش نے پوچھا : تم یہ بات کہاں سے کہتے ہو ؟ (یعنی اس کی دلیل کیا ہے ؟) ابوحنیفہ نے کہا : یہ جواب فلاں فلاں حدیث سے ماخوذ ہے جو آپ ہی نے ہم سے بیان کی ہے" اس پر اعمش بولے : سچ یہ ہے کہ ہم (محدث) تو عطار (دوا فروش) ہیں اور طبیب تم ہو"[1]

(۳) ہمیں اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کچھ حدیثیں ابوحنیفہ پر مخفی رہی ہوں (اور ان کے علم میں نہ آئی ہوں) کیونکہ (حضرت عمر کے زمانہ سے ہی) صحابہ مختلف اسلامی شہروں میں پھیل گئے تھے (اس کی وجہ سے) ہر شہر میں کچھ نہ کچھ ایسی حدیثیں موجود و متداول ہو گئی ہیں جو بعض اوقات دوسرے شہروں میں معروف و متداول نہ ہوتی تھیں (اسی وجہ سے) صحابہ و تابعین کے عہد سے ہی — اور اس کے بعد بھی — کسی بھی محدث اور امام نے یہ دعوی نہیں کیا کہ اس کو تمام سنت (اور سب حدیثوں) کا علم ہے (کوئی بھی حدیث اس کے علم سے باہر نہیں ہے) یہ لیجیے امام شعبی ہیں ایک نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں : یہ حدیث تو ہم نے کبھی نہیں سُنی" اس پر نوجوان نے پوچھا : کیا آپ نے سب حدیثیں سُن رکھی ہیں ؟ شعبی نے کہا : نہیں"۔ اس نے پھر پوچھا : آپ نے نصف حدیثیں سُنی ہیں ؟ شعبی نے جواب دیا نہیں :

تو وہ نوجوان بولا : اس حدیث کو بھی آپ انہی نصف حدیثوں میں ... سمجھ لیجیے جو آپ نے نہیں سُنیں۔

---

(۱) جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۳۱

بلکہ متعدد جلیل القدر صحابہ کرام بھی بہت سی حدیثوں سے ناواقف ہوئے ہیں حالانکہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی قریب (اور آپ کے زمانہ میں ہی موجود) تھے مثلاً حضرت عمر کو "مجوسیوں" سے جزیہ لینے سے متعلق حدیث اور "وبا" سے متعلق حدیث معلوم نہ تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ دونوں حدیثیں ان کو بتلائی ہیں (اور انھوں نے اُن پر عمل کیا ہے) اسی طرح (کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے) اجازت لینے کی حدیث حضرت عمر کو معلوم نہ تھی ابو موسیٰ اشعری نے یہ حدیث ان کو بتلائی ہے اسی طرح حضرت عمر اور عبداللہ مسعود دونوں کو (جُنبی کے لئے) تیمم کی حدیث یاد نہ تھی حالانکہ عمار اور دوسرے صحابہ کو اس کا علم تھا (اور ان کو بتلایا ہے) حضرت عائشہ، ابن عمر اور ابوہریرہ (چرمی موزوں پر) مسح کی حدیث سے واقف نہ تھے حضرت علی اور حذیفہ وغیرہ کو معلوم تھی (اور انھوں نے ان کو بتلایا ہے) حضرت عمر اور زید بن ثابت کو یہ حدیث معلوم نہ تھی کہ حیض (ایام ماہواری) والی عورت کو (حج کے بعد) طواف وداع کئے بغیر واپس چلے جانے کی اجازت ہے حضرت ابن عباس اور اُم سلیم نے ان کو یہ حدیث بتلائی ہے۔ (ابن عباس کو متعہ کی حرمت (کی حدیث) کا علم نہ تھا۔ دوسرے صحابہ نے ان کو حدیث تحریم متعہ بتلائی ہے۔ حضرت طلحہ، ابن عباس اور ابن عمر کو بیع صرف (سونے کے بدلے میں سونے کی اور چاندی کے بدلے چاندی کی خرید و فروخت) معلوم نہ تھی حالانکہ حضرت عمر اور ابوسعید وغیرہ صحابہ کو معلوم تھی (اور انھوں نے ان کو بتلائی ہے)

غرض صحابہ کرام کے عہد میں اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں مگر اس ناواقفیت کی بنا پر نہ کسی نے اُن پر (ترک حدیث کا) الزام لگایا اور نہ کبھی کسی نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے جاہل ہونے کا طعنہ دیا حالانکہ بہت سے مسائل میں ان حضرات نے متعلقہ حدیث معلوم ہونے سے پہلے اُس کے خلاف فیصلے بھی دیئے ہیں تو ابوحنیفہ تو اس قسم کے مواقع میں معذور سمجھے جانے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں (اس لئے کہ ان کا زمانہ تو اس عہد سے سو سال بعد کا ہے)

(۴) یقیناً ابوحنیفہ نے (استنباط احکام شرعیہ کے نقطہ نظر سے) احادیث قبول کرنے کے بارے میں نہایت دقیق (اور سخت) شرطیں لگائی ہیں اس (سخت گیری) پر ابوحنیفہ کو اس چیز نے مجبور کیا تھا کہ ان کے زمانہ میں حدیث میں جھوٹ بولنے کی وبا عام ہو گئی تھی اس لئے ابوحنیفہ نے

اللہ کے دین بارے میں انتہائی احتیاط کی بنا پر حدیث قبول کرنے میں سختی سے کام لیا تھا۔ ابو حنیفہ کے شرائط قبول حدیث حسب ذیل ہیں۔

امام ابو حنیفہ کے حدیث قبول کرنے کی شرطیں:

(۱) احکام شرعیہ کے ماخذوں (ادلۂ شرعیہ) کی تلاش وجستجو اور تفتیش و تحقیق کے بعد جو اصول (دلائل) ان کے نزدیک محقق تھے، خبر واحد اُن سے نہ ٹکرانی چاہیے۔ لہٰذا جب بھی کوئی خبر واحد اُن اصول سے متصادم ہوتی وہ اس حدیث کو ترک کر دیا کرتے تھے کیونکہ (یہ مسلمہ اصول ہے کہ) دو دلیلوں میں جو زیادہ قوی دلیل ہو اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور (اسی بنا پر) اُس خبر واحد کو وہ شاذ قرار دیتے تھے۔

(۲) حدیث (خبر واحد) کتاب اللہ کے عمومات (عام احکام) اور واضح تصریحات سے متصادم (اور مخالف) نہ ہونی چاہیئے لہٰذا جب کوئی حدیث ظاہر کتاب سے ٹکراتی تو وہ ظاہر کتاب پر عمل کرتے اور اس خبر واحد کو چھوڑ دیتے (کیونکہ کتاب اللہ قطعی اور یقینی ہے اور خبر واحد ظنی ہے) اس سلسلہ میں بھی وہ قوی تر دلیل پر عمل کرنے کے (مسلمہ) اصول کو اختیار کرتے تھے لیکن اگر حدیث قرآن کے کسی مجمل حکم کا بیان ہوتی (اور وضاحت کرتی) یا کسی نئے حکم کے لئے نص (دلیل صریح) ہوتی (جس سے قرآن خاموش ہوتا) تو اس حدیث کو (خبر واحد ہونے کے باوجود) قبول کر لیتے (اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں حدیث قرآن سے متعارض نہیں ہوتی)

(۳) حدیث (خبر واحد) مشہور سنت (حدیث مشہور) کے بھی مخالف نہ ہونی چاہیے۔ خواہ قولی ہو خواہ فعلی۔ اگر خبر واحد حدیث مشہور کے مخالف ہوتی تو اس کو قوی تر دلیل پر عمل کرنے کے اصول کے تحت ترک کر دیتے۔ (کیونکہ حدیث مشہور خبر واحد سے زیادہ قوی ہوتی ہے)

(۴) کوئی حدیث (خبر واحد) اسی جیسی حدیث (خبر واحد) سے متعارض نہ ہونی چاہیئے اگر دونوں حدیثوں کے درمیان تعارض ہوتا تو (مقررہ) وجوہ ترجیح کی بنا پر ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دیتے (اور دوسری کو ترک کر دیتے) مثلاً ان دونوں حدیثوں کے روایت کرنے والے صحابیوں میں سے ایک صحابی دوسرے صحابی سے زیادہ فقیہ ہوتا یا ایک صحابی فقیہ ہوتا دوسرا غیر فقیہ ہوتا یا ایک صحابی جوان ہوتا دوسرا بوڑھا۔ یہ (تمام احتیاط اور پیش بندی) اس لئے کرتے تھے کہ حتی الوسع غلطی کے امکانات سے بچ سکیں۔

(۵) راوی حدیث کا عمل خود اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف نہ ہونا چاہیے۔ (ایسی صورت میں بھی اس حدیث کو ترک کر دیتے تھے) مثلاً ابو ہریرۃ کی حدیث کہ اگر کتا برتن میں منہ ڈالدے تو اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہیے۔ خود ابو ہریرۃ کا فتویٰ اِس حدیث کے خلاف تھا (وہ عام نجاسات کی طرح تین مرتبہ برتن کو دھونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے)

(۶) حدیث میں کوئی ایسی زیادتی نہ ہو جو صرف اسی حدیث میں ہو (اور کسی بھی دوسری حدیث میں نہ ہو) خواہ وہ زیادتی متن میں ہو خواہ سند میں ایسی صورت میں ابو حنیفہ اس حدیث پر عمل کرتے جس میں زیادتی نہ ہوتی (اور زیادتی والی حدیث کو ترک کر دیتے) یہ (طریق کار بھی) اللہ کے دین میں انتہائی احتیاط برتنے کے اصول پر مبنی تھا۔

(۷) حدیث (خبر واحد) میں کوئی ایسا حکم مذکور نہ ہونا چاہیے جس کا تعلق عموم بلویٰ سے ہے (یعنے سب ہی لوگ اس میں مبتلا ہوتے ہوں اور سب ہی کو اس کی ضرورت پیش آتی ہو) اس لئے کہ ایسی صورت میں تو اس حدیث کو مشہور یا متواتر ہونا چاہئے تھا (اور اس کے روایت کرنے والے بہت سے لوگ ہونے چاہئیں تھے نہ کہ صرف ایک شخص۔ یہی اس کے ضعف کی دلیل ہے اسی لئے ابو حنیفہ اس کو ترک کر دیتے تھے)

(۸) جس حدیث (خبر واحد) کو کسی ایک ہی صحابی نے روایت کیا ہو دراں حالیکہ اس حدیث میں مذکور حکم کے بارے میں صحابہ کے درمیان اختلاف رہا ہو مگر کسی ایک صحابی نے بھی اِس حدیث سے استدلال نہ کیا ہو (یہ عدم التفات) اس کی دلیل ہے کہ یہ (زیر نظر) حدیث ثابت نہیں ہے۔ ورنہ کوئی نہ کوئی صحابی تو ضرور اس سے استدلال کرتا (ایسی حدیث پر بھی ابو حنیفہ عمل نہیں کرتے تھے)

(۹) سلف صالحین (صحابہ و تابعین) میں سے کسی نے کبھی اس حدیث (خبر واحد) پر اعتراض نہ کیا ہو (ورنہ صحابہ یا تابعین کا اس حدیث پر طعن کرنا اُس کے معتبر نہ ہونے کی دلیل ہے، ایسی حدیث پر بھی ابو حنیفہ عمل نہیں کرتے تھے)

(۱۰) جو احادیث (اخبار آحاد) "حدود" اور "شرعی سزاؤں" سے متعلق ہوں اور ان میں اختلاف روایات پایا جاتا ہو ابو حنیفہ ان مختلف روایات میں سے جو روایت سب سے ہلکے حکم (سزا)

والی ہوتی اس پر عمل کرتے (اور دوسری روایات کو ترک کر دیتے اس لئے کہ مسلمہ اصول ہے الحدود تندرئی بالشبہات ــ شرعی سزائیں ذرا سے شبہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہیں ــ آج کل کی عدالتی اصطلاح میں اسی کو "شبہ کا فائدہ" کہا جاتا ہے)

(۱۱) راوی حدیث کا حافظہ حدیث سننے کے وقت سے لے کر ادا کرنے (یعنے دوسروں کے سامنے بیان کرنے) کے وقت تک یکساں برقرار رہا ہو اس درمیان میں اس کے حافظہ میں کسی طرح کا فتور نسیان وغیرہ نہ پیدا ہوا ہو۔ (ورنہ ابو حنیفہ ایسے راوی کی حدیث کو قابل اعتماد نہ سمجھتے اور اس پر عمل نہ کرتے تھے)

(۱۲) حدیث (خبر واحد) ایسے متوارث عمل کے خلاف نہ ہو جس پر صحابہ اور تابعین ــ کسی شہر یا خطہ کی تخصیص کے بغیر ــ برابر اور مسلسل عمل کرتے چلے آئے ہوں (کیونکہ یہ عملی توارث د تواتر خبر واحد کی بہ نسبت قوی تر دلیل ہے لہٰذا خبر واحد کے مخالف ہونے کی صورت میں قوی تر دلیل پر عمل کے اصول کے تحت اس توارث پر عمل کیا جائے گا اور خبر واحد کو ترک کر دیا جائے گا)۔

(۱۳) خبر واحد کا راوی محض اپنی تحریر (یادداشت) پر اعتماد نہ کرے جب تک کہ وہ روایت اس کو یاد (اور حافظہ میں محفوظ) نہ ہو (اگر صرف تحریر پر اعتماد کرتا ہے تو ایسے راوی کی حدیث کو ابو حنیفہ قابل اعتماد نہیں سمجھتے اور قبول نہیں کرتے)

یہ وہ اہم شرائط[لہ] ہیں جو امام ابو حنیفہ نے (اپنے فریضۂ استنباط احکام شرعیہ کے تقاضہ

لہ ظاہر ہے کہ ایک محدث کے لئے ــ جس کا فریضہ صحیح احادیث کو غیر صحیح احادیث سے الگ کر کے جمع اور محفوظ کر دینا ہے اور بس ــ تقریباً یہ تمام ہی شرائط خارج از بحث بلکہ اس کی مہم کی راہ میں رکاوٹ کا موجب ہیں لیکن ایک مجتہد کے لئے ــ جس کا فریضہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احکام شرعیہ اخذ کرنا ہے۔ یہ تمام شرائط از بس ضروری اور لابدی ہیں ان شرائط کو پیش نظر رکھے بغیر وہ اپنا فریضہ ــ استنباط الاحکام الشرعیہ عن ادلتہا التفصیلیہ (تفصیلی دلائل شرعیہ سے احکام شرعیہ اخذ کرنا) ــ ادا کر ہی نہیں سکتا خواہ وہ ابو حنیفہ ہوں (باقی صفحہ ۳۶۳ پر)

کے تحت) اخبار آحاد کی صحت کو پرکھنے اور اُن پر عمل کرنے کے لئے اختیار کی تھیں (۱)

اس میں شک نہیں کہ حضرات محدثین ــــ سب نہیں تو ــــ اِن میں سے بیشتر شرطوں کے بارے میں ابو حنیفہ کے ساتھ متفق نہیں ہیں نیز دوسرے ائمہ مجتہدین بھی ان میں سے بعض شرائط کے بارے میں ابو حنیفہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔

ہم اس موقعہ پر امام ابو حنیفہ کے موقف کا دفاع کرنے یا دوسرے ائمہ کے مقابلہ میں ان کی حمایت کرنے کے درپے نہیں ہیں ہم تو یہاں قارئین کو صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ (فنی) مجبوریاں کیا تھیں جن کی بنا پر ابو حنیفہ نے بعض اخبار آحاد کو ترک کیا ہے۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد آپ بآسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ابو حنیفہ پر جو یہ تہمت لگائی گئی ہے کہ وہ سُنت اور حدیث کو ترک کرکے اپنی رائے سے کام لیا کرتے تھے ــــ جبکہ یہ ترک کرنا اجتہاد یعنی استنباط احکام شرعیہ ــــ کے تقاضوں پر مبنی تھا ــــ اس سے ابو حنیفہ پر کوئی حرف نہیں آنا چاہیے دراں حالیکہ ابو حنیفہ سے پہلے ائمہ مجتہدین بھی ایسا کر چکے ہیں اور ان کے بعد کے مجتہدین بھی ایسا کرتے رہتے ہیں (تنہا ابو حنیفہ ہی نے یہ جرم نہیں کیا بلکہ ہر مجتہد کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہے)

اور اگر کوئی (دشمن دین وایمان) یہ کہے کہ ابو حنیفہ نے نفسانیت اور حدیثوں سے عناد کی بنا پر ایسا کیا ہے (تو وہ جانے اور اس کا ایمان) باقی حاشا وکلا کہ ابو حنیفہ جیسی شخصیت ایسا کر سکے جس کی امامت، ورع وتقویٰ پر اور اللہ ورسول کی قائم کردہ حدود پر استقامت (موافق ومخالف) ہر شخص کے نزدیک مسلم اور مانی ہوئی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۲) خواہ مالک خواہ شافعی خواہ احمد بن حنبل۔ اس لئے محدثین اپنے نقطۂ نظر کی روشنی میں ان شرائط کو تسلیم نہ کرنے میں اور ان شرائط کے تحت حدیثوں کو ترک کرنے والے کو تارک عمل بالحدیث کہنے میں معذور ہیں باقی (کل فن رجالی کے تحت ہر فریق کو اپنا اپنا فرض ادا کرنا چاہیے ایک دوسرے کو مطعون نہ کرنا چاہیئے۔ ۱۲ محشی

(۱) ملاحظہ ہو اصول السرخسی ج ۱ ص ۳۶۴۔ کشف الاسرار شرح اصول بزدوی۔ التقریر اور اس کی (باقی صفحہ ۳۶۴)

بعض احادیث کے بارے میں امام ابوحنیفہ کے نقطۂ نظر کی مثالیں

لیجئے اس کے بعد ہم آپ کے سامنے امام ابوحنیفہ کے اجتہاد کی ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن میں انھوں نے چند حدیثوں کے خلاف کیا ہے اور ان کے اجتہادی نقطۂ نظر کی ان مثالوں سے وضاحت ہوتی ہے

(۱) ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی مکہ المکرمۃ کے محلے دار الحناطین میں ملاقات ہوئی (اور علمی مباحثہ شروع ہوگیا) امام اوزاعی نے امام ابوحنیفہ سے خطاب کرکے فرمایا:

لماذا لا ترفعون ایدیکم عند الرکوع وعند الرفع منه؟

تم رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت ہاتھ کیوں نہیں اٹھاتے؟

امام ابوحنیفہ نے فرمایا:-

لانه لم یصح فیه شئی عن النبی صلی اللہ علیه وسلم

اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس (دائمی رفع) کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں۔

امام اوزاعی نے کہا:-

وکیف وقد حدثنی الزھری عن سالم عن ابیه ان النبی صلی اللہ علیه وسلم کان یرفع یدیه اذا افتتح الصلوٰۃ وعند الرکوع وعند الرفع منه؟

یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ مجھ سے تو زہری نے روایت کیا اور زہری سے سالم نے اور سالم سے ان کے باپ (عبداللہ بن عمر) نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو ہاتھ اٹھایا کرتے تھے اور جب رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے اس وقت بھی ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہ نے جواب دیا:-

حدثنی حماد عن ابراھیم عن علقمة والاسود عن عبداللہ بن مسعود ان

مجھ سے حماد نے حدیث بیان کی اور حماد نے ابراہیم نخعی سے اور ابراہیم نے علقمہ اور اسود سے اور ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۳) شرح مسلم الثبوت اور اس کی شرح۔ ان تمام کتابوں میں خبر آلآحاد کی بحث دیکھئے۔ ۱۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان لا یرفع یدیہ الا عند افتتاح الصلوٰۃ ولا یعود الی شیء من ذلک۔

دونوں نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز شروع کرتے وقت ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے اور پھر کہیں بھی ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے۔

اس پر امام اوزاعی نے کہا:

أحدثک عن الزھری عن سالم عن عبداللہ بن عمرو تقول حدثنا حماد عن ابراھیم الخ؟

میں تو زہری عن سالم عن عبداللہ بن عمر کی سند سے حدیث بیان کرتا ہوں اور تم کہتے ہو: حماد نے ابراہیم کی سند سے ہم سے حدیث بیان کی؟ (بھلا کیا نسبت ہے حماد کو زہری سے اور ابراہیم کو سالم سے)

﴿ ﴿ ﴿ ﴿ ﴿

امام ابوحنیفہ نے جواب دیا:-

کان حماد افقہ من زھری وکان ابراھیم افقہ من سالم وعلقمۃ لیس بدون ابن عمرو ان کان لابن عمر صحبۃ فالاسود لہ فضل کبیر۔

حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے اور ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ تھے اور علقمہ بھی ابن عمر سے کم (فقیہ) نہ تھے اگرچہ ابن عمر صحابی ہیں (اور علقمہ صحابی نہیں ہیں) باقی اسود کو بھی بڑی بھاری فضیلت حاصل ہے (گو وہ بھی صحابی نہیں ہیں)

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

ابراھیم افقہ من سالم ولولا فضل الصحبۃ قلت ان علقمہ افقہ من عبداللہ بن عمرو عبداللہ ھو عبداللہ

ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ تھے اور اگر صحابی ہونے کی فضیلت (ابن عمر کو حاصل) نہ ہوتی تو میں کہتا کہ:- علقمہ ابن عمر سے زیادہ فقیہ تھے اور عبداللہ بن مسعود تو ابن مسعود ہی ہیں (ان کے تفقہ کا کون مقابلہ)

اس پر امام اوزاعی خاموش ہو گئے[ل] (۱)

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۳۲۱ - ۱۲

ل۔ امام اوزاعی نے جس سند سے ابن عمر کی حدیث پیش کی وہ بھی علماء اصول حدیث کے نزدیک (باقی صفحہ ۳۶۶ پر)

(۲) ایک مرتبہ سفیانؒ بن عیینہ کی امام ابوحنیفہ سے ملاقات ہوئی سفیانؒ نے ابوحنیفہ سے دریافت کیا:-

هل صحيح انك تفتي ان المتبايعين	کیا یہ صحیح ہے کہ تم فتویٰ دیتے ہو کہ بائع و مشتری
ليس لهما الخيار اذا انتقلا من	(بیچنے والا اور خریدنے والا) جب خرید و فروخت
حديث البيع الى حديث	کی گفتگو سے (فارغ ہو کر) دوسری بات چیت
آخر غيره ولو ظلا	میں مشغول ہو جائیں تو (واپسی کے بارے میں) ان
مجتمعين في مكان واحد	کو اختیار نہیں رہتا اگر وہ دونوں دن بھر ایک جگہ ہی
* * * * *	موجود رہیں۔

امام ابوحنیفہ نے جواب دیا نعم ـــ جی ہاں ـــ سفیان نے کہا:

كيف؟ وقد صح الحديث عن رسول	یہ کیسے (صحیح ہو سکتا ہے)؟ درآں حالیکہ رسول اللہ
الله صلى الله عليه وسلم: البيعان	صلی اللہ علیہ وسلم سے تو یہ صحیح حدیث مروی ہے کہ: بائع
بالخيار مالم يتفرقا	و مشتری جب تک جدا نہ ہوں ان کو (واپسی کا)
* * * * * *	اختیار رہتا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے اس پر سفیانؒ سے کہا:-

ارأيت ان كانا في سفينة؟ ارأيت	ذرا آپ بتلایئے اگر وہ دونوں کشتی میں (سفر کر رہے)
ان كانا في سجن؟ ارأيت ان	ہوں؟ یا اگر وہ دونوں قید خانہ میں (بند) ہوں؟
كانا في سفر؟ كيف يفترقان	یا وہ (ایک ساتھ) سفر کر رہے ہوں تو (ایک دوسرے
	سے) کیونکر جدا ہو سکتے ہیں؟ (تو ان صورتوں میں
	اختیار ختم ہو ہی نہیں سکتا)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۵) اصح الاسانید (صحیح تر سندوں) میں سے ہے اور امام ابوحنیفہ نے جس سند سے ابن مسعود کی حدیث پیش کی وہ بھی اصح الاسانید میں سے ہے اس لحاظ سے تو دونوں سندیں برابر ہیں لیکن ابوحنیفہ نے (اپنی چوتھی شرط کے مطابق) راویوں کے افقہ ہونے کی بنا پر ابن مسعود کی حدیث کو ترجیح دی اور اوزاعی اس ترجیح کا انکار نہ کر سکے اس لئے خاموش ہو گئے۔ ۱۲ محشی

(اس پر سفیان لاجواب ہو گئے)

آپ نے دیکھا؟ ابو حنیفہ نے (اس مثال میں) حدیث کو رد نہیں کیا بلکہ انہوں نے تفرق سے جو حدیث میں آیا ہے "خرید و فروخت کی گفتگو سے الگ ہونا" سمجھا ہے نہ کہ جسموں کے اعتبار سے جدا ہونا اس لئے کہ عقود (خرید و فروخت کے معاملوں) میں جو چیز مقصود ہوتی ہے (یعنے معاملہ کا طے ہو جانا) ابو حنیفہ نے اسکو اور واپسی کے اختیار کی حکمت کو پیش نظر رکھا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں مثلاً بحری سفر میں ایک جہاز کے مسافر یا خشکی کے سفر میں ایک قافلہ کے مسافر یا قید خانہ میں بند قیدی کیونکہ یہ سب لوگ کئی دن کیا بلکہ مہینوں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ تو ان صورتوں میں ہم یہ کہیں گے کہ جب تک یہ لوگ ایک جگہ رہیں گے بیع تام نہ ہوگی؟ اور یہ کہ ان میں سے ہر شخص کو جب تک وہ چاہے خرید و فروخت کا معاملہ فسخ کر دینے (اور سودا واپس کر دینے) کا اختیار ہے (یہ تو مقصد بیع و شرا کے بھی منافی ہے اور ناقابل عمل بھی ہے)

اور یہ تفرق کا لفظ گفتگو سے علیحدہ (اور فارغ) ہو جانے کے لئے برابر استعمال ہوتا ہے بلکہ قرآن و حدیث میں بھی اس معنی میں آیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا۔	اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو (یعنے ایک بات پر متفق رہو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

افترقت الیہود الخ	یہودی (مختلف فرقوں میں) بٹ گئے

اس فقہی استنباط میں امام ابو حنیفہ کی دقت نظر (اور باریک بینی) کو جو شخص پیش نظر نہیں رکھتا اور سنتا ہے کہ ابو حنیفہ فتویٰ دیتے ہیں کہ "بائع و مشتری نے جب بیع کا ایجاب و قبول پورا کر لیا۔ (اور لینا دینا منظور کر لیا) تو (واپسی کا) اختیار ختم ہو گیا اگرچہ وہ ایک جگہ ہی موجود رہیں" تو وہ چھوٹتے ہی یہ فیصلہ دیدیتا ہے کہ دیکھو ابو حنیفہ نے یہ حدیث کی مخالفت کی ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے (بلکہ ابو حنیفہ نے حدیث کی صحیح مراد بتلائی ہے)

(۳) ایک اور مثال لیجئے۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی سند سے جو محمد بن نعمان بن بشیر تک پہونچتی ہے ایک حدیث نقل کی ہے وہ حدیث یہ ہے کہ (راوی حدیث) محمد کو ان کے والد نعمان نے

ایک غلام عطیہ کے طور پر دیدیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ آپ کو اس (عطیہ) پر گواہ بنائیں تو آپ نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اپنے ہر لڑکے کو ایسا ہی عطیہ دیا ہے؟ نعمان نے جواب دیا: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: تو اسے واپس لے لو" (مت دو) اس کے بعد ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کی دو اور روایتیں مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیں اور آخر میں کہا کہ: ابوحنیفہ کہتے ہیں: اس (قسم کے) عطیہ میں کوئی حرج نہیں (یعنے جائز ہے حالانکہ حدیث سے ممانعت ثابت ہوتی ہے)

اس کا جواب علامہ کوثری نے اپنی کتاب النکت الطریفہ میں حسب ذیل دیا ہے:-

نعمان بن بشیر کی حدیث میں راویوں کے الفاظ اس عطیہ کے متعلق مختلف آتے ہیں جس کی وجہ سے اس مسئلہ میں ائمہ فقہ کے اجتہاد کا دائرہ کافی وسیع ہوگیا ہے۔ چنانچہ (۱) جمہور ائمہ کے نزدیک اس حدیث میں برابری کا حکم استحباب کے لئے ہے (یعنی سب اولاد کو برابر عطیہ دینا مستحب ہے) ان جمہور ائمہ میں امام مالک، لیث، ثوری، شافعی، ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد (ابو یوسف، محمد وغیرہ) شامل ہیں لہذا ان تمام ائمہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ انسان اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو خصوصی عطیہ اور تحفہ دے سکتا ہے (اگرچہ خلافِ اولیٰ ہے) لیکن (۲) بعض ائمہ نے اس خصوصی عطیہ کو مکروہ قرار دیا ہے باقی (اولاد کو کچھ دینے دلانے میں) برابری تو بہر حال سب کے نزدیک ہی مستحب ہے اور (۳) بعض فقہاء نے اس حدیث کے بعض ظاہری الفاظ کی بنا پر اولاد کو عطیہ دینے میں مساوات اور برابری کو واجب قرار دیا ہے (ان کے نزدیک فرق اور ترجیح قطعاً جائز نہیں) ان ائمہ میں ابن المبارک، احمد اور ظاہریہ شامل ہیں۔ اسحاق بھی اول انہی ائمہ کے ساتھ تھے لیکن بعد میں جمہور کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا۔

لیکن تمام ائمہ مجتہدین کا اس مسئلہ پر اتفاق اور اجماع ہے کہ انسان (بحالت صحت) اپنا تمام مال کسی بھی اجنبی شخص کو ہبہ کر سکتا ہے۔ اس سے جمہور ائمہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ جب اجنبی کو تمام مال دیدینا جائز ہے تو اولاد میں سے

کسی ایک کو دیدینا بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے) اور اس مسئلہ میں کوئی نصِ صریح
دلیل ، ہے نہیں جس سے مخالفت کا احتمال ہو اس لئے جمہور ائمہ کے مسلک کے
خلاف یہ اعتراض کرنیکے کوئی معنی نہیں کہ ۱۔ یہ (اجنبی پر) قیاس محل اجتہاد
میں نہیں ہے (بلکہ نص کے مقابلہ میں ہے لہٰذا درست نہیں)
اور امام بیہقی نے تو ایسے دس وجوہ (دلائل) بیان کئے ہیں جن سے اس کی تائید
ہوتی ہے کہ اس مسئلہ میں مساوات کا حکم محض استحباب کے لئے ہے (یعنی برابری
مستحب ہے نہ کہ واجب) اگرچہ بعض علما نے ان دلائل پر کچھ اعتراضات کئے ہیں۔
(دراصل) ان احادیث کو وجوب یا استحباب پر محمول کرنے کے بارے میں فقہا کے درمیان
اختلاف کا باعث اس حدیث کے الفاظ کا اختلاف ہے مثلاً اس (مذکورہ بالا)
روایت میں فارجعه (اس عطیہ کو واپس لے لو) کا لفظ یا دوسری روایت میں
إشهد علی هذا غیری (میرے علاوہ کسی دوسرے کو گواہ بنا لو) کے الفاظ
یا تیسری روایت میں الیسرك ان یکونوا فی البر سواء (کیا تمہارے لئے یہ مسرت
کا باعث نہ ہوگا کہ یہ سب تمہارے ساتھ یکساں حسن سلوک کریں) کے الفاظ۔ یہ
تین روایتوں کے الفاظ تو استحباب کو ثابت کرتے ہیں۔ لیکن بعض روایتوں میں
ایسے الفاظ بھی آئے ہیں جن سے (برابری کا) واجب ہونا ظاہر ہوتا ہے مثلاً ایک روایت
کے الفاظ ہیں لا اشهد علی جور (میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا)۔ (اس لئے کہ ان الفاظ
میں عدم مساوات کو ظلم سے تعبیر کیا ہے) اِلّا یہ کہ اس روایت کے لفظ جور کو موجود
قرائن کی بنا پر محض (کسی ایک اولاد کی طرف) میلان پر محمول کیا جائے۔ نہ کہ جور بمعنے
ظلم پر (تو اس صورت میں وجوب مساوات ثابت نہ ہوگا)۔

قاضی عیاض نے تو کہا ہے :-

اس مسئلہ سے متعلق مختلف احادیث کے درمیان موافقت پیدا کرنا (تاکہ ان سب
پر عمل ہو سکے) ان میں سے بعض احادیث کو بالکل چھوڑ دینے (اور بعض پر عمل کرنے)
سے یا الفاظ کے اضطراب کی بنا پر اصل حدیث ہی کو ضعیف قرار دینے سے

(اور کسی پر بھی عمل نہ کرنے) سے بہت بہتر ہے اور تمام روایتوں میں موافقت پیدا کرنے اور جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان سب روایات کو استحباب پر محمول کیا جائے (اور مساوات کو مستحب کہا جائے)

اس کے بعد ان تمام روایات کو استحباب پر محمول کرنے کی معقول صورت صحیح مسلم کی شرح میں تفصیل سے بیان کی ہے۔

اس مسئلہ کو جتنی تفصیل کے ساتھ ہم نے یہاں بیان کیا ہے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہم نہیں محسوس کرتے کیونکہ ابوحنیفہ ہی اس مسئلہ میں منفرد نہیں ہیں بلکہ جمہور اہل فقہا اور ائمہ مجتہدین بھی ابوحنیفہ کے ساتھ ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق کا اپنی بیٹی عائشہ کو عطیہ میں دوسری اولاد پر ترجیح دینے کی اور حضرت عمر کا (اپنی اولاد میں) عاصم کو ترجیح دینے کی تو خود امام شافعی نے تصریح کی ہے اسی طرح اور بہت سے صحابہ نے (اپنی اولاد کے معاملہ میں) ترجیحی سلوک کیا ہے۔ ان تمام صحابہ کا یہ تعامل اس امر کی روشن دلیل ہے کہ اس حدیث میں مساوات کا حکم استحباب پر محمول ہے (نہ کہ وجوب پر) (۱)

یہ چند مثالیں ہیں اُن ایک سو پچیس مسائل میں سے چند مسائل کی جن کے متعلق ابن ابی شیبہ نے ابوحنیفہ پر "ترک حدیث" کا الزام لگایا ہے آپ مذکورہ بالا جوابات سے یقیناً یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ امام ابوحنیفہ نے محض اپنی رائے کو مقدم رکھنے کی بنا پر کسی بھی حدیث کو نہیں چھوڑا بلکہ انھوں نے (مسائل شرعیہ میں) اجتہاد کے تقاضہ کی بنا پر ایسا کیا ہے اور اجتہاد کے تقاضہ کی بنا پر یہ طرز عمل اختیار کرنے میں ابوحنیفہ ایسے ہی معذور ہیں۔ جیسے ہر امام مجتہد کو اُس اجتہادی رائے میں معذور سمجھا جاتا ہے جس کو وہ (احکام شرعیہ میں) اجتہاد کے تقاضہ سے اختیار کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ابن ابی شیبہ نے جن مسائل کا ذکر کیا ہے اور ان میں ابوحنیفہ پر مخالفت حدیث کا الزام لگایا ہے ان میں صرف ابوحنیفہ ہی نے اجتہاد کی ضرورت سے حدیث

---

(۱) النکت الطریفہ ص ۲۱، ۲۲

کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ بیشتر مسائل میں کوئی نہ کوئی امام مجتہد یا جمہور ائمہ مجتہدین میں سے اکثر، اس مخالفت حدیث میں اُن کے ساتھ متفق ہیں۔

امام ابوحنیفہ کا علمی حلقہ (اکیڈیمی)، اور شورائی اجتہاد،

جو شخص بھی امام ابوحنیفہ کے اپنے تلامذہ (اور مستقل حاضرین مجلس علما) کے ساتھ ملکر (باہمی مشورہ سے) مسائل فقہیہ میں اجتہاد کے طریق کار سے اور اُن ایکتا وفن علما رفحول سے واقف ہوگا جو ان کی علمی مجلس کے مستقل ارکان تھے، اُسے اس امر کا قطعی یقین ہوگا کہ امام ابوحنیفہ پر اس قسم کے الزامات عائد کرنا اور اُن پر طعن و تشنیع کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

ابن ابی العوام بیان کرتے ہیں کہ :۔

طحاوی نے مجھ سے بیان کیا کہ ابن ابی ثور نے مجھے لکھا کہ نوح بن ابی سفیان نے مجھے خبر دی ہے کہ مغیرہ ابن ابی عمرہ نے مجھ سے روایت کیا ہے کہ ابوحنیفہ کے وہ رفقاء جنہوں نے ان کے ساتھ ملکر فقہ ابوحنیفہ کی کتابوں کو مدون اور مرتب کیا ہے وہ عظماء رجال میں سے چالیس بڑے بڑے علماء تھے۔

ابن ابی العوام ہی اپنی سند سے جو اسد بن الفرات تک پہونچتی ہے نقل کرتے ہیں کہ :۔

امام ابوحنیفہ کے اُن چالیس عظماء رجال میں سے ___ جو ان کی مجلس شوریٰ کے ارکان تھے ___ دس سر فہرست ائمہ اور رفقاء قدیم میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ امام ابو یوسف، امام زفر بن الہذیل امام داؤد طائی، امام اسد بن عمر، امام یوسف بن خالد السمتی، امام یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ___ یہ یحییٰ ہی وہ بزرگ ہیں جو تیس سال تک فقہ حنفی کے طے شدہ مسائل لکھتے رہے ہیں۔ (یعنی امام ابوحنیفہ کی مجلس علمی ___ اکیڈمی کے تیس سال تک محرر رہے ہیں)۔

ابن ابی العوام ہی اپنی سند سے جو اسد بن الفرات تک پہونچتی ہے یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ :۔

زیر بحث مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے رفقاء (ارکان مجلس) کے جواب مختلف ہوتے چنانچہ ایک کا جواب یہ ہوتا دوسرے کا جواب وہ ہوتا پھر وہ مسئلہ امام صاحب کے سامنے پیش کرتے اور ان کی رائے دریافت کرتے تو (عموماً) امام کا جواب ان

کے قریب ہی قریب ہوتا (پھر ان جوابات پہ بحث ہوتی) تین تین دن تک بحث جاری رہتی، آخر میں جو جواب منقح ہوتا اُس کو مسائل فقہ حنفی (کے رجسٹر) میں درج کرتے۔

ابن ابی العوام اسحاق بن ابراہیم سے روایت نقل کرتے ہیں کہ :-

امام ابوحنیفہ اور ان کے رفقاء (بعض اوقات) کسی مسئلہ میں غور و خوض اور بحث شروع کر دیتے تو اگر عافیہ بن یزید اس بحث میں موجود نہ ہوتے تو امام صاحب فرماتے جب تک عافیہ نہ آجائیں اس مسئلہ کی بحث کو ختم نہ کرو جب عافیہ آجاتے اور ان (شرکاء بحث) کے جواب سے اتفاق کر لیتے تب ابوحنیفہ فرماتے: اب اس کو لکھ لو اور اگر عافیہ ان کے جواب سے متفق نہ ہوتے تو ابوحنیفہ فرماتے: اس مسئلہ کو ابھی نہ لکھو (بلکہ مزید بحث جاری رکھو)

یحییٰ بن نعیم اپنی کتاب معرفة التاریخ والعلل میں فضل بن دکین سے روایت نقل کرتے ہیں کہ :-

میں نے امام زفر کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم ابوحنیفہ کے پاس (ان کی مجلس میں) جاتے قاضی ابویوسف اور امام محمد بن الحسن بھی ہمارے ساتھ ہوتے تو ہم سب ابوحنیفہ (کی مجلس میں) طے شدہ مسائل ان سے دریافت کرتے اور لکھا کرتے تھے زفر کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہ نے ابویوسف سے کہا : اے یعقوب! ہر وہ بات جو میری زبان سے سنو نہ لکھ لیا کرو کیونکہ میں آج ایک رائے قائم کرتا ہوں اور کل اس کو چھوڑ دیتا ہوں اور کل ایک رائے قائم کرتا ہوں اور پرسوں اس کو چھوڑ دیتا ہوں (اس لئے مجلس شوریٰ میں طے شدہ مسائل ہی لکھا کرو)

اس روایت سے موفق المکی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ :-

ابوحنیفہ نے اپنے مذہب (فقہ حنفی) کی بنیاد شوریٰ پر رکھی ہے اور اہل شوریٰ کی رائے کو نظر انداز کر کے صرف اپنی شخصی رائے پر مدار نہیں رکھا۔ اس (طریق کار) کا مقصد اللہ کے دین میں امکانی حد تک جد و جہد صرف کرنا اور خدا، رسول

اور اہل ایمان کے حق میں انتہائی خیر خواہی سے کام لینا تھا (۱)

اسی تحقیق سے خطیب بغدادی نے جو ابن کرامۃ سے ایک طرفہ روایت نقل کی ہے اس کی صداقت بھی واضح ہو جاتی ہے وہ روایت یہ ہے کہ :-

> ابن کرامہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں (مشہور محدث) وکیع کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے کہا کہ ابوحنیفہ نے فلاں مسئلہ میں غلطی کی ہے " وکیع بولے : ابوحنیفہ کیونکر غلطی کر سکتے ہیں جبکہ ان کے ہمراہ (شریک بحث و تحقیق) ابو یوسف اور زفر جیسے " قیاس " میں یدطولیٰ رکھنے والے اور یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان اور مندل جیسے " حفاظ حدیث " اور قاسم بن معن جیسے عربی زبان اور علوم عربیت کے ماہرین کے ماہر، اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زہد و تقویٰ میں شہرۂ آفاق حضرات موجود ہوتے ہیں جس شخص کے ایسے ہم نشین ہوں وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا کیونکہ اگر بالفرض اس سے کوئی غلطی سرزد بھی ہو تو یہ حضرات فوراً اس کو ٹوک دیں گے ۔

ہم وکیع کی اس بات سے تو اگرچہ اتفاق نہیں کرتے کہ ابوحنیفہ سے غلطی نہیں ہو سکتی تاہم وکیع سے اس امر میں ضرور اتفاق کرتے ہیں کہ ایک ایسا امام جس کو ایسے جلیل القدر رفقاء میسر ہوں، ماحول بھی خالص علمی ہو صحابہ کرام سے اس کا زمانہ بھی قریب ہو، اللہ کے دین کے بارے میں خود اس کو اعلیٰ درجہ کی فہم و بصیرت اور اجتہاد میں ایسی (فوق العادہ) مہارت نصیب ہو اس پر ایسے ظالمانہ حملے ہرگز روا نہیں رکھے جا سکتے جن کی ابتدا خود اس کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی اور جن کی محرک صرف اور محض معاصرانہ رقابت (اور چشمک)، راویوں کی کوری جہالت اور (بلا تحقیق) اٹکل پچو ہانکنے والوں کی زبان درازی تھی پھر اسی زمانہ سے ان حملوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ خلق قرآن کے فتنہ کے بعد تو یہ معاندانہ حملے انتہائی نقطۂ عروج پر پہونچ گئے ۔ اس زمانہ میں تو اہل حدیث نے ان پر اور ان کے رفقاء پر بے پناہ حملے کئے اور ان پر اور ان کے بیشتر رفقاء پر شدید تر جرح و نقد (اور طعن و

---

(۱) حسن التقاضی ص ۱۲ ۔

تشنیع) کا طوفان برپا کر دیا یہ (معاندانہ) کارروائی اور کسی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اور محض معتزلہ سے انتقام لینے کے لئے کی گئی جنہوں نے (اسی مسئلہ خلق قرآن کی بنا پر عباسی حکومت کی پشت پناہی میں) محدثین کے گروہ پر ظلم وستم کے بے پناہ پہاڑ توڑے تھے اور طرح طرح کی ایذائیں پہونچائی تھیں اور (سوء اتفاق سے) عام طور پر معتزلہ مسائل فقہیہ میں ابوحنیفہ کا مذہب اختیار کرتے تھے (اسی وجہ سے یہ محدثین معتزلہ کے بجائے امام ابوحنیفہ اور ان کے رفقاء پر طعن وتشنیع کی بوچھار کیا کرتے تھے) لہذا ابوحنیفہ اور اُن کے رفقاء پر ان پچھلی یورشوں اور حملوں کا راز تو یہ (معتزلہ کا انتقام) ہے اور اُن پہلی یورشوں اور حملوں کا راز وہ (معاصرانہ چشمک ورقابت اور جہالت) ہے چنانچہ خود خطیب بغدادی لکھتے ہیں:۔

> نہ ابوحنیفہ، ابویوسف، زفر، محمد نے کبھی (خلق) قرآن کے بارے میں کوئی بات کہی اور نہ ہی ابوحنیفہ کے کسی اور شاگرد نے۔ (خلق) قرآن کے بارے میں تو صرف بشر المریسی اور ابن ابی داؤد نے کلام کیا ہے۔ انہی لوگوں نے ابوحنیفہ (اور اُن کے رفقاء) کو ہدف طعن وتشنیع بنایا ہے (۱)

انصاف کی بات اس مقام پر مجھے تو حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی وہ بات دل کو لگتی ہے جو اُنھوں نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں (ج ۲ ص ۱۴۸) پر کہی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

> اصحاب حدیث نے ابوحنیفہ کی مذمت میں انتہائی افراط سے کام لیا اور اس معاملہ میں وہ حد سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے زعم کے مطابق ابوحنیفہ کا قصور یہ ہے کہ ابوحنیفہ نے "رائے" اور "قیاس" کو احادیث وآثار میں بھی دخل دیا ہے اور ان کا اعتبار کیا ہے (یعنے حدیث سے استدلال کرتے وقت بھی رائے اور قیاس کو پیش نظر رکھتے ہیں) حالانکہ اہل حدیث کا تو کہنا یہ ہے کہ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو قیاس ونظر (اجتہادی رائے) باطل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ابوحنیفہ نے جب

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۷۴

بھی اخبار آحاد کو رد کیا ہے کسی نہ کسی محتمل تاویل کی بنا پر رد کیا ہے اور (اخبار آحاد کے متعلق) یہ طرز عمل ابوحنیفہ سے پہلے بھی بہت سے ائمہ مجتہدین اختیار کر چکے ہیں اور انکے بعد کے اُن لوگوں (ائمہ مجتہدین) کا طرز عمل بھی یہی رہا ہے جو (استنباط احکام شرعیہ میں) اجتہاد کے قائل ہوئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ابوحنیفہ نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب کچھ اپنے اہل شہر (ائمہ کوفہ) مثلاً ابراہیم نخعی اور تلامذہ ابن مسعود کے اتباع میں کیا ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ ابوحنیفہ اور ان کے رفقاء ... (ایک جامع اور ہر زمانہ میں کام آنے والی فقہ مدون کرنے کی غرض سے) آئندہ پیش آنے والے متوقع مسائل کو موجود قرار دینے اور ان کو اپنی اجتہادی رائے اور قیاس و استحسان سے حل کرنے اور جواب دینے میں (اپنے ہمعصروں سے) بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور افراط سے کام لیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اور سلف (قدماء مجتہدین) کے درمیان کے اختلافات کی بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی اور اُن پر طعن و تشنیع کی بوچھار کی گئی اس لئے کہ ابوحنیفہ کے مخالفین (قدماء مجتہدین) کے عقیدہ کے مطابق یہ (طریق کار) ایک بدعت تھی (یہ حافظ ابن عبدالبرؒ کی رائے ہے آگے فرماتے ہیں) حالانکہ جتنے اہل علم کو میں جانتا ہوں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے قرآن کریم کی کسی نہ کسی آیت میں کوئی تاویل نہ کی ہو یا حدیث و سنت کے (قبول کرنے) کے بارے میں اس کا کوئی خاص مسلک نہ ہو جس کی وجہ سے اُس نے دوسری (مخالف) حدیث کو کسی قابل قبول تاویل کی بنا پر رد نہ کیا ہو یا اسی جیسی کسی صحیح حدیث کی بنا پر اُس (مخالف حدیث) کے منسوخ ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہو۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ) ابوحنیفہ کے ہاں (اجتہاد کا دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے) اس عمل کی بہت کثرت ہے اور دوسرے ائمہ کے ہاں یہ عمل کم ہے۔ یہ ہے حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی رائے۔

بعد ازاں ابن عبدالبر اُن تمام احادیث کا ذکر کرنے کے بعد جو۔ (مصر کے امام) لیث نے امام مالک کے خلاف سنت عمل کرنے کے سلسلہ میں شمار کرائی ہیں۔ فرماتے ہیں:

علماء امت میں سے کسی بھی عالم کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جب اس کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہ اس حدیث کو یا اسی جیسی صحیح حدیث سے منسوخ ثابت کئے بغیر یا اس کے نزدیک جن اصول کی پیروی فرض ہے اُن پر عمل کا دعویٰ کئے بغیر یا اس کی سند میں کوئی عیب ثابت کئے بغیر رد کر دے اگر کسی عالم نے ایسا کیا (یعنے کسی معقول وجہ کے بغیر صحیح حدیث کو رد کر دیا) تو اس کی تو عدالت بھی ساقط ہو جائے گی چہ جائیکہ اس کو امام تسلیم کیا جائے بلکہ اس پر "توفسق" (فاسق ہونے) کی مہر لگ جائیگی (اور فاسق کے نام سے پکارا جائے گا)

اس کے بعد حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:۔

محدثین نے امام ابو حنیفہ پر ارجاء کا عیب بھی لگایا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کہتے ہیں: میری تحقیق تو یہ ہے کہ ابوحنیفہ کا ارجاء خالص[۵] سنت ہے۔ حالانکہ اہل علم (اور محدثین)

---

۵ وہ عقیدۂ ارجاء جو محض سنت اور قرآن وحدیث کے عین مطابق ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان توبہ کئے بغیر مرجائے آخرت میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سپرد ہے وہ چاہیں اس کو اس گناہ کے بقدر جہنم میں ڈال کر سزا دیں اور اس کے بعد جنت میں داخل کریں اور چاہیں اپنی رحمت سے گناہ معاف فرمادیں اور سزا دیئے بغیر ہی جنت میں داخل فرمادیں۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:۔

(۱) ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء۔ — تحقیق اللہ اس کو تو ہرگز معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک گردانا جائے اور اس (کفر وشرک) سے کمتر گناہ جس کے چاہے معاف کر دے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

شفاعتی لاھل الکبائر من امتی۔ — میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے ہے۔

(۳) اہل سنت کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ مخلد فی النار (ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں) صرف کافر ومشرک ہوں گے۔ (باقی صفحہ ۳۷۷ پر)

میں تو ایسے لوگ بڑی کثرت سے موجود ہیں جن کو متشیعہ میں شمار کیا گیا ہے لیکن ارجاء کے عنوان سے جو طوفان ابو حنیفہ کے خلاف برپا کیا گیا ہے ایسا طوفان کسی بھی دوسرے محدث کے خلاف برپا نہیں کیا صرف اسلئے کہ ابو حنیفہ (ائمہ مجتہدین کے نزدیک بھی) مسلم امام تھے کہ) محدثین ان سے بہت جلتے تھے اور ان کی جانب ایسی (بری بری) باتیں منسوب کرتے تھے جن سے ان کا دامن بالکل پاک تھا اور از خود گھڑ گھڑ کر ان پر ایسی تہمتیں لگاتے تھے جو ان کے (تو کیا کسی معمولی عالم کے بھی) شایان شان نہ تھیں حالانکہ ذمہ دار علماء (اور محدثین) کے ایک جلیل القدر گروہ نے ابو حنیفہ کی تعریفیں کی ہیں اور ان کی فضیلت و برتری کا اعتراف کیا ہے۔

مع ہے۔ اس کے علاوہ یہ کوئی حقیقت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۶) ان کے علاوہ بڑے سے بڑا گناہ کرنے والا بھی مسلمان ... اگر توبہ کئے بغیر مر گیا تو آخرت میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے چاہے اس کا گناہ اپنی رحمت سے معاف فرما دیں اور جنت میں داخل کر دیں اور چاہیں تو گناہ کے بقدر جہنم میں عذاب دے کر پھر جنت میں داخل فرمائیں بہرحال ہر مومن مسلمان کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے کے باوجود مسلمان ہے جنت میں ضرور داخل ہوگا خواہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد خواہ اس کے بغیر ہی۔ ابدی جہنم صرف کافروں اور مشرکوں کے لئے ہے۔

اس کے برعکس خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب انسان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد کافروں اور مشرکوں کی طرح مخلد فی النار ہوگا فرق صرف اتنا ہے کہ معتزلہ اس کو کافر نہیں کہتے مگر مسلمان بھی نہیں مانتے اور خوارج اس کو کافر کہتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ نے تقریباً بیس سال تک اہل سنت کی حمایت میں خوارج اور معتزلہ سے پیہم مناظرے کئے ہیں اس لئے ان کو محض خوارج اور معتزلہ سے مقابلہ کرنے کی بنا پر ارجاء (بمعنی مذکور) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن ابو حنیفہ کے مخالفین نے از راہ طعن ان کو "مرجئی" کہا ہے۔ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔

اس لئے کہ ارجاء کا وہ عقیدہ جو اہل سنت کا عقائد کے خلاف اور گمراہ فرقہ مرجئہ کا عقیدہ ہے اس کی حقیقت تو یہ ہے کہ ہر مسلمان قطعاً جنتی ہے چاہے کتنے ہی بڑے سے بڑے گناہ کرتا رہا ہو۔ مرجئہ کا تو عقیدہ یہ ہے **لا یضر مع الایمان معصیة کما لا تنفع مع الکفر طاعة** ۔ ایمان کے ہوتے کوئی بھی معصیت نقصان نہیں پہونچاتی جیسے کفر کے ہوتے کوئی بھی طاعت نفع نہیں دیتی۔ یہ عقیدہ قرآن و حدیث (باقی صفحہ ۳۷۸ پر)

کی ہیں ان کا ذکر کرنے کرنے کے بعد ابن عبد البر لکھتے ہیں :-

(گذشتہ زمانہ میں) کہا جاتا تھا (یعنے بطور ضرب المثل کہا جاتا تھا) گذرے ہوئے لوگوں میں سے کسی شخص کے بارے میں ناقدین کا اختلاف اور تضاد ہی اس شخص کی شرافت وجلالت شان کا ثبوت ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب ہی کو دیکھو اُن کے بارے میں دو گروہ ہلاک ہو گئے ایک محبت والفت میں انتہا پسند۔ (یعنے شیعہ اور رافضی) اور دوسرا بغض وعداوت میں انتہا پسند (یعنے ناصبی اور خارجی) خود حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے متعلق فرمایا :-

بیشک علی کے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے (۱) انتہائی محبت میں ان کو حد سے بڑھا دینے والے (۲) انتہائی بغض وعداوت کی وجہ سے ان پر بہتان لگانے والے۔

یہی شان ہوتی ہے شرفا اور عظماء رجال کی اور ان مردان علم ودین کی جو دین اور علم وفضل کی انتہائی بلندیوں اور چوٹیوں پر پہونچے ہوئے ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۰) کی نصوص (تصریحات) کے بھی خلاف ہے اور اجماع امت کے بھی خلاف ہے۔ حاشا وکلا کہ ابو حنیفہ اس عقیدہ کے اعتبار سے مرجئی ہوں۔ محشی

ــه حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ کے اس بیان کا حاصل یہ ہے کہ ابو حنیفہ اور ان کے رفقاء کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھوں نے کتاب وسنت اور اجماع امت کی روشنی میں ایک عالمگیر اور ہر زمانہ وہر ماحول میں رہنمائی کرنے والی فقہ اسلامی مدون اور مرتب کرنے کے عظیم مقصد کے تحت انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق متوقع مسائل کو واقع قرار دے کر کتاب وسنت اور اجماع امت سے ان کے تفصیلی احکام اخذ کر کے مدون ومرتب کر دیئے تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے ـــ علماء مجتہدین، مفتیین اور عوام سب کے لئے ـــ مشعل راہ کا کام دے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا اللہ کا دین ملاحدہ وزنادقہ اور ہوا پرستوں کی دستبرد اور قطع وبرید (اتارکی) سے محفوظ ہو جائے ـــ ان کے زمانہ میں بھی اور وفات کے بعد بھی ـــ

یہ وہ عظیم کام تھا جس کو محدثین تو کیا ابو حنیفہ اور ان کے رفقاء کے ہمعصر ائمہ مجتہدین بھی نہ کر سکے تھے چنانچہ عالی ظرف انصاف پسند اور حق گو ائمہ اور محدثین کے طبقہ نے تو اسی کارنامہ کی بنا پر ان کو امام الائمہ اور مجتہد سازامام اعظم کے امتیازی لقب سے یاد کیا اور اُمت پر ان کے احسان عظیم کا اعتراف کیا لیکن پست فطرت حاسد اور جاہل طبقہ نے ـــ ان کی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی ـــ اسی کارنامہ پر ان کے خلاف خوب گندے اچھالا اور بہتان تراشی وافتراء پردازی کا طوفان بدتمیزی برپا کر دیا اور اپنے عمل سے نادانستہ طور پر اپنی پست فطرتی اور دنائت کا ثبوت مہیا کیا اور امام ابو حنیفہ اور ان کے رفقاء کی عظمت وجلالت شان کا غیر ارادی طور پر اعتراف کیا۔ واللہ الموفق۔ محشی

امام مالکؒ

۹۳ ——— ۱۷۹ھ

امام مالک کا پورا نام ابو عبد اللہ مالک بن انس الاصبحی ہے آپ کا لقب امام دار الہجرۃ اور محدث المدینۃ الاشہر تھا۔ ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے ابن الشیبانی نے تیسیر الاصول کے مقدمہ میں ۹۵ھ میں ولادت بتلائی ہے۔ مدینہ طیبہ ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی اور وہیں چھیاسی برس کی عمر میں ۱۷۹ھ میں انتقال فرمایا (جنت البقیع میں آج تک آپ کی قبر شریف موجود اور زیارت گاہ عوام وخواص ہے)

امام مالکؒ نے (مدینہ کے معروف مجتہد ربیعۃ الرائی سے علم حدیث وفقہ حاصل کیا ہے انکے علاوہ اور بڑے بڑے فقہا و تابعین سے بھی استفادہ کیا۔ حدیث کا اکثر و بیشتر حصہ تو امام ابن شہاب الزہری سے ہی سنا (اور روایت کیا) ہے اسی لئے امام مالک کو زہری کے مشہور ترین شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے نافع مولیٰ ابن عمر سے بھی بکثرت حدیثیں سنی (اور روایت کی) ہیں اور نافع سے تو روایتِ حدیث میں نمایاں شہرت حاصل کی ہے یہانتک کہ مالک کی روایت نافع سے بعض محدثین کی اصطلاح میں السلسلۃ الذھبیہ (سونے کی زنجیر) کہلاتی ہے وہ سند یہ ہے مالک عن نافع عن ابن عمر۔

امام مالک سالہا سال مسلسل طلب حدیث اور تحصیل علم میں لگے رہے یہاں تک کہ امام مالک کو حجاز کا امام تسلیم کر لیا گیا اور عالم المدینۃ امام دار الہجرۃ کے ناموں سے یاد کئے جانے لگے اطراف عالم میں ان کی شہرت پھیل گئی اور دنیا کے چپہ چپہ سے لوگ علم حدیث وفقہ حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس جوق در جوق آنے لگے۔ امام مالک حدیث کا درس دینے کے لئے مسجد نبوی — علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں (اسطوانۃ وفود کے پاس) انتہائی اہتمام، وقار، ادب اور

عزت واحترام کے ساتھ بیٹھتے تھے خاص طور پر درس حدیث کے وقت پاکیزہ اور صاف ستھرا لباس پہنتے، خوشبو لگاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلال اور رعب و دبدبہ کے اثر سے درس میں آپ کی آواز کبھی بلند نہ ہوتی تھی [1]

امام مالکؒ فقہ اور حدیث دونوں علموں میں یکساں شہرۂ آفاق امام مانے گئے ہیں اور امام ابو حنیفہ کی طرح مُرسل حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں بھی (محدثین کے حلقوں میں) مشہور و معروف ہوئے ہیں چنانچہ اپنی کتاب موطا میں کافی تعداد میں مُرسل حدیثیں درج کی ہیں (اور اُن سے استدلال کیا ہے)

امام مالک کے مذہب کے اصول (استنباط احکام شرعیہ میں) بھی وہی اصول تھے جو عام ائمہ مجتہدین کے نزدیک معتبر اور مسلم ہیں یعنی کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔ امام مالک نے ان اصول اربعہ پر دو چیزوں کا اضافہ کیا ہے (۱) ایک اہل مدینہ کا تعامل (متفقہ عمل) (۲) دوسرے مصالح [2] مُرسلہ

مصالح مُرسلہ کے تو اکثر ائمہ مجتہدین قائل ہوئے ہیں باقی رہا اہل مدینہ کا تعامل تو امام مالک نے اس کو حجت اور دلیل قرار دینے کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ اہل مدینہ کا تعامل عملاً ہو حالاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی کا متوارث عمل اور اسی عہد کا مروج دستورالعمل ہے (جو قدرتی طور پر مدینہ والوں میں ہی قومی روایات کے طور پر محفوظ رہ سکتا ہے) چنانچہ ان کے نزدیک اہل مدینہ کا تعامل اسی وقت حجت ہے... جبکہ اہل مدینہ کا اس پر اتفاق ہو اور نسلاً بعد نسل وہ عمل مسلسل چلا آرہا ہو یہاں تک کہ اس کی انتہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر ہوتی ہو۔ امام مالک کی رائے ہے کہ اہل مدینہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی قرب کی بنا پر) اسی صورت میں کسی امر کا التزام اور اس پر متفقہ طور پر عمل کر سکتے ہیں جبکہ وہ عمل شرعی طور پر ثابت ہو لیعنے صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس پر عمل کیا ہو اور آپ نے ان کو اس عمل پر برقرار رکھا ہو (یعنی اس سے

---

[1] فرمان الٰہی یا ایہا الذین آمنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی الآیۃ پیش نظر رہتا تھا۔ ۱۲ محشی

[2] احکام شرعیہ منصوصہ کی وہ مصلحتیں جن کی تصریح تو نہیں کی گئی مگر وہ ان احکام میں ملحوظ ضرور ہیں۔ ۱۲ محشی

منع نہ کیا ہو، پھر صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین اسی طرح متوارث طریق پر عمل کرتے چلے آئے ہوں اور اہل مدینہ (مقامی روایات کے طور پر) اسی عمل پر چلتے رہے ہوں۔

چنانچہ امام مالکؒ کے نزدیک اہل مدینہ کا عمل حدیث آحاد سے قوی تر ہے[1] جب بھی خبر واحد اور تعامل اہل مدینہ میں تعارض ہوتا ہے تو امام مالکؒ موخر الذکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی بنا پر (مصر کے) امام لیث بن سعد نے امام مالک پر ستر حدیثوں کے بارے میں گرفت کی ہے جو صحیح ہیں اور (موطا میں موجود ہیں لیکن امام مالک نے ان کو اختیار نہیں کیا، لیث کی طرح بعد میں آنے والے بقیہ ائمہ مجتہدین اور علماء حدیث نے بھی امام مالک سے اس بارے میں اتفاق نہیں کیا ہے اور (عجیب بات یہ ہے کہ) جن لوگوں نے اس سلسلہ میں امام مالک سے بڑی بحثیں کی ہیں اور سخت گرفتیں کی ہیں ان میں امام شافعی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام شافعی کے بعد بھی علماء حدیث اور ائمہ مجتہدین اس معاملہ میں مسلسل امام مالکؒ پر اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں۔

تعامل اہل مدینہ کے حجت ہونے کی جن لوگوں نے تردید کی ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور ابن حزم ہیں انھوں نے اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں اس پر نہایت سخت اور انتہائی مدلل تنقید کی ہے اسی طرح محلی میں بھی متفرق بحثوں کے ذیل میں نہایت شدید تردید کی ہے۔ باقی ابن حزم علمی بحثوں میں اپنے مخالفین پر تنقید و تردید کرنے میں ہیں بھی بہت ہی سخت۔

امام مالکؒ کا مذہب ــ فقہ مالکی ــ دنیائے اسلام کے بہت سے ملکوں میں کافی پھیلا پھولا اور مقبول ہوا ہے ان ممالک میں مغرب اور مصر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

موطا: اس کا علمی مرتبہ و مقام، روایات و احادیث اور شروح

غالباً امام مالکؒ کا وہ سب سے زیادہ مشہور و معروف کارنامہ جس کی بدولت امام مالک (آج تک) معروف (اور زندہ) ہیں ان کی کتاب موطا ہے اس کتاب کو امام مالکؒ نے (عباسی خلیفہ دوم) منصور کے اشارہ

---

[1] اس لئے کہ یہ مسلسل و متوارث اجتماعی عمل خبر متواتر کے حکم میں نہ بھی ہو تو کم از کم خبر مستفیض (مشہور) کے درجہ میں ضرور ہے۔ اور خبر مستفیض خبر واحد سے قوی تر ہے ۱۲۔ محشی

سے تصنیف کیا تھا جبکہ خلیفہ حج کے لئے حجاز گئے تھے تو اُنھوں نے امام مالکؒ سے درخواست کی تھی کہ آپ ایک ایسی کتاب تصنیف کردیں جو علم حدیث کی جامع کتاب ہو اور اس میں عبداللہ بن عمر کی سختیوں (تشدد پر مبنی احادیث و آثار) سے اور عبداللہ بن عباس کی رخصتوں (سہولتوں پر مبنی احادیث و آثار) سے احتراز ہو اور یہ کہ اُسے عام لوگوں کے لئے (دین کا) ایک ہموار راستہ بنائیں چنانچہ امام مالک نے یہ کتاب موطا تصنیف کی اور اسی مناسبت سے اس کا نام موطأ (ہموار راستہ) رکھا۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے اس نام کے رکھنے کی ایک اور وجہ بتلائی ہے وہ کہتے ہیں کہ خود امام مالک سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں :-

> میں نے اس کتاب کو (بغرض توثیق) مدینہ کے ستر فقہاء ائمہ حدیث کے سامنے پیش کیا ان سب نے مجھ سے (اس کی احادیث و آثار اور فقہی استنباطات) پر اتفاق کیا۔ اس لئے میں نے اس کا نام مؤطا (متفق علیہ) رکھا ہے۔

پھر کچھ عرصہ بعد مہدی (تیسرا عباسی خلیفہ) حج کے لئے آیا تو اس نے امام مالک سے (براہ راست) اس کتاب کا سماع کیا (سُنا اور پڑھا) اور مالک کے لئے پانچ ہزار دینار (اشرفیاں) اور ان کے شاگردوں (طلبہ حدیث) کے لئے فی کس ایک ایک ہزار دینار دینے کا فرمان جاری کیا۔ اس کے بعد (پانچواں عباسی خلیفہ) ہارون الرشید حج کے موقعہ پر امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے لڑکوں (امین و مامون) کو بھی ساتھ لایا چنانچہ رشید اور اس کے دونوں لڑکوں نے امام مالک سے اس کتاب کے سماع کا شرف حاصل کیا نیز رشید نے خواہش ظاہر کی کہ اس کتاب کو (تقدس کے نقطۂ نظر سے) خانہ کعبہ میں لٹکا دیا جائے اور تمام عالم اسلام کے لوگوں کو اس کتاب کے مسائل و احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور کیا جائے۔

امام مالکؒ نے جواب دیا : امیر المؤمنین ایسا نہ کریں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے مابین فروع (یعنی فقہی اور اجتہادی مسائل و احکام) کے بارے میں اختلاف رہا ہے اور وہ (غزوات یا تعلیم دین کے سلسلہ میں) دور دراز شہروں میں پھیل چکے ہیں (اور اس طرح ان صحابہ سے مروی احادیث اور ان سے مستنبط اجتہادی احکام و مسائل بھی تمام عالم اسلام میں پھیل چکے ہیں) اور (یہ یقینی بات ہے کہ) ان میں سے ہر ایک حق پر تھا (لہذا تمام عالم اسلامی کو کسی ایک مسلک پر مجبور کرنا اسلامی وحدت کی تباہی اور انتشار کا باعث ہوگا) اس جواب کی بنا پر ہارون الرشید اس ارادہ سے باز رہا۔

اللہ جل ذکرہٗ نے (اس حسن نیت کے صلہ میں) مسلمانوں کے قلوب میں اس کتاب کو ایسا قبول عام کا شرف بخشا کہ لوگ جوق درجوق امام مالک سے اس کتاب کو پڑھنے اور سننے پر ٹوٹ پڑے۔

امام مالک سے جن شہرۂ آفاق ائمہ مجتہدین نے موطا کو سنا (اور پڑھا) ہے ان میں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں وہ یہ حضرات ائمہ ہیں: امام اوزاعی، امام شافعی اور امام محمد۔ امام محمد بن الحسن کی موطا کی روایت بھی (امام مالک کے دوسرے تلامذہ کی طرح) مشہور و معتبر روایتوں میں سے ہے۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

امام مالک نے اس کتاب کی تالیف میں اور اس میں صحیح احادیث جمع کرنے میں انتہائی اہتمام سے کام لیا ہے یہاں تک کہ علما نے کہا ہے کہ امام مالک چالیس سال تک موطا کی کاٹ چھانٹ اور صاف ستھرا بنانے میں لگے رہے ہیں۔ اس بیان کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو سیوطی نے موطا کی شرح میں امام اوزاعی سے نقل کی ہے:

> اوزاعی کہتے ہیں: ہم نے صرف چالیس دن میں امام مالک سے موطا پڑھ لیا تو امام مالک نے اس پر فرمایا: یہ وہ کتاب ہے جس کو میں نے چالیس سال میں تالیف کیا ہے تم نے اس کو مجھ سے صرف چالیس دن میں حاصل کر لیا (ظاہر ہے کہ) تم نے اس میں کتنے تفقہ (اور غور و فکر) سے کام لیا ہے۔

موطا کی ترتیب میں امام مالک نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پہلے وہ علم فقہ کے مختلف ابواب قائم کرتے ہیں پھر ہر باب کے ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک یا چند (مرفوع) حدیثیں بیان کرتے ہیں اس کے بعد اس مسئلہ سے متعلق صحابہ اور تابعین کے آثار و اقوال ذکر کرتے ہیں۔ عموماً یہ حضرات مدینہ کے رہنے والے ہی ہوتے ہیں ــ کیونکہ امام مالک نے مدینہ کو کبھی نہیں چھوڑا (یعنے کسی اور اسلامی شہر کا سفر نہیں کیا) کبھی کبھی پوری حدیث بیان کرنے کے بعد اس کے الفاظ کی شرح بھی کرتے ہیں، اس کی بعض عبارتوں کی مراد بھی بتلاتے ہیں اور جن مسائل میں خبر واحد تعامل اہل مدینہ کے خلاف ہوتی ہے وہاں عمل اہل مدینہ کی تصریح فرماتے ہیں۔

کتب حدیث میں موطا کے مرتبہ کے بارے میں محدثین کے درمیان اختلاف رائے

محدثین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ موطا صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) پر بھی

مقدم ہے اس لئے کہ امام مالک کا رتبہ (مؤلفین کتب ستّہ سے) بہت بلند ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ امام مالک حدیث کو پرکھنے، چھان بین کرنے (اور قبول کرنے) میں انتہائی محتاط اور پختہ کار مشہور ہیں اور مؤطا (کی عظمت) کے بارے میں تو آپ کے لئے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے کہ امام مالک چالیس سال تک مؤطا کی تالیف میں لگے رہے ہیں۔ جن لوگوں کی مؤطا کے متعلق یہ رائے ہے اور جنہوں نے اپنی اس رائے کو صحیح ثابت کرنے اور مؤطا کی طرف سے دفاع کرنے کا حق ادا کیا ہے ان میں علاوہ مالکی مذہب کے پیرو حضرات کے ابن العربی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کچھ محدثین مؤطا اور صحیحین کو ایک درجہ میں رکھتے ہیں (یعنی رتبہ میں صحیحین کے مساوی قرار دیتے ہیں) حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کتب حدیث کے درجات و مراتب بیان کرتے وقت مؤطا اور صحیحین کو طبقہ اولیٰ میں رکھتے ہیں

لیکن عام محدثین مؤطا کو درجہ اور رتبہ میں صحیحین سے کمتر قرار دیتے ہیں۔ جمہور محدثین کی رائے یہی ہے۔ حافظ ابن حجر اس راز کی عقدہ کشائی ذیل کے الفاظ میں فرماتے ہیں :

> امام مالک کی کتاب مؤطا امام مالک کے نزدیک صحیح اور ان مالکیہ کے نزدیک بھی صحیح ہے جو قبول حدیث میں امام مالک کے نقطۂ نظر کے مقلد ہیں کہ مرسل و منقطع وغیرہ حدیثوں سے استدلال کرنا درست ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ جمہور محدثین مرسل، منقطع اور حدیث متصل کے علاوہ باقی اور تمام قسم کی حدیثوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے (اور ان سے استدلال کرنے کو درست نہیں سمجھتے) اس لئے لازمی طور پر ان محدثین کے مسلک کے اعتبار سے مؤطا کا مرتبہ صحیحین سے کمتر ہونا چاہیئے۔

> پہلی دو رایوں کے متبع محدثین (جو مؤطا کو صحیحین سے اعلیٰ یا مساوی مانتے ہیں)۔ موطا میں موجود مرسل اور منقطع حدیثوں کے بارے میں یہ جواب دیتے ہیں کہ :۔

> (امام مالک کے طریق کے علاوہ) دوسرے طرق (یعنی سندوں) سے یہ حدیثیں متصل السند ثابت ہیں اس لئے لازمی طور پر یہ حدیثیں بھی صحیح ہیں۔

مؤطا میں موجود مرسل، منقطع اور معضل حدیثوں کو متصل ثابت کرنے میں جن محدثین نے

انتہائی کاوش سے کام لیا ہے ان میں حافظ ابن عبدالبر خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ فرماتے ہیں:

وہ تمام حدیثیں جن میں امام مالکؒ نے بلغنی (مجھے حدیث پہونچی ہے) کے الفاظ استعمال کئے ہیں یا جن حدیثوں کی سند میں انھوں نے کہا ہے: عن الثقة (ثقہ راوی سے مروی ہے) اور ان کی سندیں بیان نہیں کی ہیں یا راوی کا نام نہیں بتلایا ہے ان کی کل تعداد اکسٹھ ہے یہ سب کی سب حدیثیں امام مالک کی سند کے علاوہ دوسری سندوں سے متصل ثابت ہیں ان میں صرف چار حدیثیں ایسی ہیں جو (ابن عبدالبر کی تحقیق کے مطابق) متصل ثابت نہیں ہوسکی ہیں۔ وہ چار حدیثیں یہ ہیں:-

(۱)۔ (وہ حدیث جس کے الفاظ یہ ہیں) میں خود نہیں بھولتا بلکہ مجھے بھلا دیا جاتا ہے تاکہ (عملی طور پر) نسیان کے احکام بتلاؤں۔

(۲) (وہ حدیث جس میں آیا ہے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے پہلی اُمتوں کے لوگوں کی عمریں دکھلائی گئیں یا جو اللہ نے چاہا اس سلسلہ میں (مغیبات) سے متعلق دکھلایا گیا تو گویا آپ نے اپنی اُمت کی عمروں کو بہت کم محسوس کیا کہ میری اُمت اعمال خیر کے اس مبلغ (مقدار) کو نہ پہونچ سکے گی جس پر دوسری اُمتیں اپنی دراز عمروں میں پہونچی ہوں گی تو اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو شب قدر عطا فرمائی (جو ایک رات ہزار راتوں سے بھی بہتر ہے)

(۳) حضرت معاذ بن جبل کی یہ حدیث کہ آخری وصیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے (یمن جاتے وقت) اونٹ کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے فرمائی وہ یہ تھی کہ لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا۔

(۴) (وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا:) جب کوئی بحریہ (یعنے سمندر کی جانب سے آنے والا بادل آسمان پر) نمودار ہو اور پھر وہ شام کا رُخ کرے تو سمجھ لو کہ یہ (پانی سے بھری ہوئی) جھیل ہے۔ (یعنے اس میں پانی بہت ہے بارش خوب ہوگی)

علماء حدیث نے ان چاروں حدیثوں کے بارے میں جواب دیا ہے کہ ان حدیثوں کا بھی مفہوم صحیح ہے اور ان احادیث کی تائید میں کتب حدیث سے شہادتیں پیش کی ہیں۔ لیکن شیخ شنقیطی نے اپنی کتاب اضاءة الحالک میں ابن الصلاح سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ان چاروں حدیثوں کو بھی متصل ثابت کیا ہے اور حافظ جلال الدین سیوطی نے تو پوری قوت کے ساتھ کہا ہے:

> کلی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ موطا پورا کا پورا بلا استثناء صحیح ہے اس لئے کہ موطا میں جو حدیثیں مرسل ہیں وہ امام مالک کے نزدیک تو بغیر کسی شرط کے صحیح ہیں ہی اور ان ائمہ کے نزدیک بھی صحیح ہیں جو مرسل حدیث سے استدلال کرنے کے بارے میں امام مالک سے متفق اور ان کے ہمنوا ہیں باقی ہمارے (یعنے جمہور محدثین کے) نزدیک بھی مرسل حدیث کی جب قرائن سے تقویت ہو جائے تو وہ حجت ہو جاتی ہے اور موطا میں جو بھی مرسل حدیثیں ہیں ان سب کی تائید میں ایک یا چند روایتیں موجود ہیں۔

یہ بحث تو ایک طرف لیکن ابن حزم کا تو دعویٰ یہ ہے کہ "موطا میں ایسی کم و در روایتیں بھی موجود ہیں جن کو علماء حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے" لیکن مولانا عبد الحئی لکھنوی نے ابن حزم کے اس دعویٰ پر سخت گرفت کی ہے کہ ان احادیث کا ضعف سقوط یا وضع کی حد تک نہیں پہونچتا (یعنے ضعیف تو ہیں لیکن بالکل بے اصل یا موضوع یقیناً نہیں ہیں)

ظاہر یہ ہے کہ ابن حزم نے جو یہ کہا ہے کہ: علماء حدیث نے موطا کی بعض حدیثوں کو ضعیف قرار دیا ہے اُن علما کا یہ فیصلہ یقیناً ان اسنادوں پر مبنی ہے جن سے یہ حدیثیں ان علماء حدیث تک پہونچی ہیں لیکن امام مالک کو جن سندوں سے یہ حدیثیں پہونچی ہیں وہ سندیں امام مالک کے نزدیک قطعاً صحیح ہیں اور ظاہر ہے کہ امام مالک کی رائے اپنے اساتذہ یا ان سے روایت کرنے والے راویوں کے متعلق یقیناً قابل ترجیح ہے کیونکہ امام مالک اپنے مشائخ یا ان سے روایت کرنے والے راویوں سے براہ راست اور شخصی طور پر واقف اور متعارف ہیں (لہذا امام مالک کی رائے زمانہ مابعد کے لوگوں کی بہ نسبت یقیناً زیادہ صحیح ہے)

روایت موطا کے متداول نسخے تیس[۳۰] کے قریب ہیں (یعنے جن صدہا تلامذہ نے امام مالک سے موطا

سُنا اور پڑھا تھا ان میں سے تیس کے قریب محدثین نے موطا کے نسخے اپنے اپنے زمانہ میں مرتب اور محفوظ کئے ہیں، جن میں مشہور نسخے یہ ہیں: (۱) موطا یحیٰ بن یحییٰ بن مصمودی (۲) موطا ابن بکیر (۳) موطا ابو مصعب (۴) موطا ابن وہب (۵) اور موطا امام محمد بن الحسن۔ ان نسخوں میں ابواب و احادیث کے تقدم و تاخر یعنے ترتیب اور کمی بیشی یعنے تعداد کے لحاظ سے کافی تفاوت اور اختلاف ہے۔ یہ اختلاف راویان موطا کے امام مالک سے موطا سننے کے زمانوں کے اختلاف پر مبنی ہے (جس نے جس زمانہ میں جو موطا سُنا اسی کو کتابی صورت میں محفوظ کر دیا) کیونکہ خود امام مالک بھی ہر سال اپنے نسخہ پر نظر ثانی فرمایا کرتے تھے اس لئے کچھ مستبعد نہیں ہے کہ وہ خود بھی اس نظر ثانی اور غور و فکر کے نتیجہ میں کبھی کچھ (ابواب و احادیث کا) اضافہ کر دیتے ہوں اور کبھی کچھ کم کر دیتے ہوں۔

چونکہ مختلف زمانوں میں مختلف نسخے متداول رہے ہیں اسی لئے موطا کی حدیثوں کی تعداد کے بارے میں بھی مختلف اقوال ہیں چنانچہ (۱) ابوبکر الابھری کہتے ہیں:۔

> موطا میں کل احادیث و آثار کی تعداد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اصحابہ اور تابعین سے مروی ہیں ایک ہزار[۱۷۲۰] سات سو بیس ہے ان میں سے چھ سو مسند حدیثیں ہیں اور دو سو بائیس[۲۲۲] مرسل حدیثیں ہیں اور چھ سو تیرہ[۶۱۳] موقوف یعنے آثار صحابہ ہیں اور دو سو پچیس[۲۲۵] تابعین کے اقوال ہیں۔

موطا امام محمد کا نسخہ جو موطا کے سب سے زیادہ مشہور نسخوں میں سے ہے۔ حرمین شریفین اور ہند و پاکستان میں اس کو بڑی شہرت حاصل ہے اس میں مرفوع احادیث، موقوف آثار صحابہ و تابعین کی تعداد ایک ہزار ایک سو اسی[۱۱۸۰] ہے۔ ان میں مرسل اور منقطع ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔ امام مالک سے ایک ہزار پانچ[۱۰۰۵] امام ابو حنیفہ سے تیرہ[۱۳] اور امام ابو یوسف سے چار[۴] حدیثیں مروی ہیں باقی اٹھاون[۵۸] حدیثیں دوسرے مشائخ سے مروی ہیں۔

علماء حدیث ہمیشہ سے موطا کی شرحیں اور تخریجیں لکھتے چلے آئے ہیں چنانچہ حافظ ابن عبدالبر (متوفی ۴۶۳ھ) نے موطا کی دو شرحیں لکھی ہیں۔

اول: تمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید۔ اس شرح میں ابن عبدالبر نے امام مالک کے شیوخ (اساتذہ) کے نام بھی حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کئے ہیں۔ ابن حزم

لکھتے ہیں: میرے علم میں حدیث کے معنی و مراد سمجھنے (اور بیان کرنے) کے اعتبار سے تمہید جیسی کوئی کتاب بھی نہیں پیش کی جاسکتی چہ جائیکہ اس سے بہتر کتاب۔

دوم: کتاب الاستذکار فی شرح مذاھب علماء الامصار

ابن عبد البر کے علاوہ مندرجہ ذیل علما نے بھی موطا کی شرحیں لکھی ہیں۔

(۱) حافظ ابوبکر محمد بن العربی (متوفی ۵۴۶ھ) (۲) حافظ جلال الدین السیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) (۳) زرقانی مصری (متوفی ۱۱۲۲ھ) (۴) ملا علی القاری المکی (متوفی ۱۰۱۴ھ) (۵) شاہ ولی اللہ الدہلوی (۶) مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے موطا محمد پر تعلیقات لکھی ہیں جس کا نام التعلیق الممجد علی موطا الامام محمد۔

بہت سے محدثین نے موطا کو مختصر کیا ہے (خلاصہ لکھا ہے) ان میں ابو سلیمان الخطابی (متوفی ۲۸۸ھ) ابن عبد البر (متوفی ۴۶۳ھ) اور ابن رشیق قیروانی (متوفی ۴۵۶ھ) قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح احادیث موطا کے غریب (نامانوس) الفاظ کی شرح میں اور اس کے شواہد، رجال اور اختلاف نسخ کے موضوعات پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء امت نے حدیث کی اس جلیل القدر کتاب کی خدمت میں کس قدر اہتمام کیا ہے۔

موطا فقہ کی کتاب ہے یا حدیث کی کتاب ہے

امام مالک نے جس وقت سے موطا تصنیف کی ہے اس وقت سے ہمارے اس دور تک علماء حدیث نے اس امر میں کبھی بھی اختلاف نہیں کیا کہ دوسری صدی کے سلف کی تصانیف میں موطا حدیث کی سب سے قدیم کتاب ہے جو ہم تک پہونچی ہے اور جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں ہر زمانہ میں علماء حدیث نے اس کتاب کے ساتھ انتہا درجہ اہتمام کیا ہے اور وقعت کی نظر سے دیکھا ہے جب بھی یہ حضرات حدیث کی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں تو موطا کا بھی حدیث کی اور کتابوں کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ہاں حدیث کی کتابوں میں موطا کے درجہ اور مرتبہ کے بارے میں اختلاف ضرور رہا ہے۔ جیسا کہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔

لیکن جب سے ہمارے اس زمانہ میں مستشرقین نے ہماری تاریخ، ہمارے علما و محدثین اور ہمارے رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے صحابہ پر زبان درازیاں اور حملے شروع کئے ہیں ـــ جس

کی تفصیل آپ سنت کی بحث میں پڑھ چکے ہیں۔ اس وقت سے (بدقسمتی سے) مسلمانوں میں بھی ایسے اہل علم دیکھنے میں آئے ہیں جو (استشراقی تربیت کے مسموم اثر سے) یہ کہتے ہیں کہ موطا مالک تو فقہ کی کتاب ہے حدیث کی کتاب نہیں ہے"۔ یہ کہنے والے ڈاکٹر حسن علی عبدالقادر ہیں جنہوں نے اپنی کتاب نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی میں یہ (استشراقانہ) دعویٰ کیا ہے۔

ایک دھوکا: موطا تو فقہ کی کتاب ہے

ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر (نظرۃ عامہ کے ص ۲۴۴ تا ۲۵۲ پر) دعویٰ کرتے ہیں کہ:۔

> موطا، زید کے مجموعہ کو چھوڑ کر، اسلام میں فقہ کی پہلی کتاب شمار کی جاتی ہے جو ہم تک پہونچی ہے اور یہ کہ موطا کو حدیث کی سب سے پہلی کتاب نہیں کہا جا سکتا خواہ موطا اور اس کے مؤلف کا اسلام میں کتنا ہی اعلیٰ وارفع مقام کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ موطا کو حدیث کی کتابوں میں شمار ہی نہیں کیا جاتا اور نہ ہی کتب ستۂ حدیث کے پہلو میں موطا کوئی درجہ اور مرتبہ حاصل کر سکا ہے لیکن یہ متاخرین کا تقویٰ ہے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ جس نے انہیں موطا کو بھی کبھی کتب صحاح میں داخل کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف پوری قوت کے ساتھ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ:۔

> صحیح معنی میں موطا حدیث کی کتاب ہے ہی نہیں کیونکہ مؤلف کا مقصد فقط صحیح احادیث کو پیش کرنا ہی نہیں ہے بلکہ صاحب موطا کی غرض تو اصل میں یہ ہے کہ وہ فقہ، قانون، عرف اور تسلیم شدہ اجماع مدنی کو سامنے رکھ کر مسائل فقہیہ پر بحث کریں اسی لئے وہ ہر زیر بحث مسئلہ میں معتبر ائمہ کے فتوے بھی نقل کرتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں وہ اپنی اجتہادی رائے قائم کر سکیں اگر امام مالک محدث ہوتے تو وہ زیر بحث مسئلہ میں ہمارے سامنے صرف احادیث پیش کرتے نہ کہ فتوے۔

اسی سلسلہ میں طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

> اسی وجہ سے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ امام مالک صرف حدیثیں جمع کرنے والے محدث ہی نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ تو اس سے کبھی آگے بڑھ کر عملی نقطۂ نظر سے اُن احادیث

کی شرح کرنے والے فقیہ اور مجتہد ہوئے ہیں۔

پھر یہ ذکر کرنے کے بعد — کہ امام مالک موطا میں کبھی کبھی (حدیث کے بجائے) اپنی اختیار کردہ اجتہادی رائے ہی بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں — لکھتے ہیں :۔

> اس (طرزِ عمل) سے بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ امام مالک محدث نہ تھے۔ اور یہ کہ ان کی نظر میں تنہا حدیث ہی قابل اعتماد چیز نہ تھی کیونکہ انھوں نے اہل مدینہ کے تعامل کو بھی حجت قرار دیا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اگرچہ وہ خود محدث نہ تھے لیکن انھوں نے محدثین کو فائدہ بہت پہونچایا ہے اور تاریخی تنقید کو بھی قیمتی ذرائع سے بہت آگے بڑھایا ہے اور (اس کا ثبوت یہ ہے کہ) امام مالک کے نزدیک حدیث کے لئے اسناد بھی کوئی ضروری چیز نہ تھی اس کی دلیل یہ ہے کہ امام مالک نے موطا میں بہت سی مرسل حدیثیں بھی ذکر کی ہیں

ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے ان دلائل کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے ہم نے تو یہاں صرف اس کا خلاصہ بیان کیا ہے اس تمام بیان کا حاصل دو امر ہیں۔

(۱) اول یہ کہ امام مالک محدث نہ تھے۔

(۲) دوم یہ کہ موطا حدیث کی کتاب نہیں، فقہ کی کتاب ہے۔

اس دھوکہ کا جواب

(۱) یہ بات کہ امام مالک محدث نہ تھے یہ تو حق پر صریح ظلم اور زاول سے لے کر آخر تک، تمام علماء حدیث جس بات پر متفق ہیں اس کی صریح خلاف ورزی ہے اس لئے کہ امام مالک یقیناً کبار محدثین میں سے تھے (تاریخ قطعی طور پر اس کی شاہد ہے) ان کے حلقہ ہائے درس مسجد نبوی میں (تمام دنیا میں) مشہور و معروف تھے اور شائقین حدیث دنیا کے مختلف خطوں سے ان کے پاس حدیث پڑھنے کے لئے جوق در جوق آیا کرتے تھے یہ اتنا مشہور و معروف تاریخی واقعہ ہے کہ سوائے دشمن حق معاند کے اور کوئی اسکا انکار یا اس سے اختلاف کرنے کی جرأت تک نہیں کر سکتا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ امام مالک حدیث کے زبردست عالم اور حدیث میں امام ہونے کے

ساتھ ہی ساتھ، ائمہ مجتہدین میں بھی بلند پایہ مجتہد اور مسلّم امام تھے ان علماء و حفاظ حدیث میں سے یقیناً نہ تھے جو فقط حدیث بیان کرنے کے لئے حلقہ درس میں بیٹھتے ہیں اور حدیث سے مستنبط ہونے والے احکام شرعیہ سے مطلق بحث نہیں کرتے یا یہ کہ اجتہادی مسائل میں ان کا کوئی خاص مسلک نہیں ہوتا یعنی وہ مثلاً یحییٰ بن معین اور اعمش کی طرح نرے محدث نہ تھے (بلکہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی وغیرہ ائمہ مجتہدین کی طرح احادیث سے فقہی احکام بھی اخذ کیا کرتے تھے اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ) عام طور پر فقہاء تابعین حدیث اور فقہ حدیث دونوں کے جامع ہوتے تھے لہذا یہ استدلال کہ امام مالک جن مسائل میں (کتاب یا سنت کی) کوئی نص (صریح دلیل) نہیں ہوتی ان میں اپنی رائے سے کام لیا کرتے تھے لہذا وہ محدث نہیں بلکہ فقیہ تھے، عہد صحابہ سے (لے کر زمانہ مابعد تک کے) محدثین کے میلانات و رجحانات سے جہالت پر یا دانستہ نادان بننے پر مبنی (بلکہ کھلا ہوا فریب) ہے دیکھئے ایک طرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے راویوں میں سے ہیں وہ بھی جن مسائل میں کوئی نص نہ ہوتی ہمیشہ اجتہاد کیا کرتے تھے اس کے برعکس دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں کہ وہ بھی بہت بڑے راویان حدیث میں سے ہیں لیکن وہ نصوص (صریح آیات و احادیث) پر سختی کے ساتھ قائم رہنے والے لوگوں میں سے تھے، رائے سے مطلق کام نہیں لیتے تھے) لہذا نہ یہ صحیح ہے کہ ہر وہ شخص جو اجتہاد کرے اور نصوص کتاب و سنت سے فقہی استنباط کرے وہ محدثین کے زمرہ سے خارج ہو جاتا ہے اور نہ یہ صحیح ہے کہ محدث وہی ہے جو پیش نظر نصوص میں اپنی رائے سے کام نہ لے۔ آپ (صحابہ کی طرح) اس کی مثال تابعین میں لیجئے، دیکھئے امام ثوری یا امام اوزاعی ایک طرف، یہ دونوں مانے ہوئے ائمہ حدیث میں سے ہیں دوسری طرف اسی کے ساتھ ساتھ یہ دونوں مانے ہوئے ائمہ مجتہدین میں سے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو دین کی فہم اور حفظ حدیث دونوں دولتوں سے سرفراز فرمائیں اس کو دونوں جانبوں — امامت حدیث اور امامت اجتہاد — کا جامع ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ امام مالک نے اپنی کتاب موطا میں "مرسل" حدیثیں بھی بیان کی ہیں تو اس کی وجہ تو صرف یہ ہے کہ امام مالک کا مسلک ہی یہ تھا کہ مرسل اور منقطع حدیثوں سے استدلال کرنا

درست ہے۔ نہ یہ کہ امام مالک سند کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے جتنی محدثین اہمیت دیتے ہیں (یہ تو استشراقی ذہن کی اپج ہی ہوسکتی ہے) بھلا امام مالک سند کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں جب کہ خود ان سے منقول ہے :

مالک کہتے ہیں، بعض اوقات ایک حدیث کا شیخ ہمارے پاس بیٹھتا اور سارے دن حدیثیں بیان کرتا رہتا ہے اور ہم اس سے ایک حدیث بھی نہیں لیتے۔

اور امام مالک کا ہی یہ مقولہ بھی مشہور ہے کہ : علم حدیث تو بس چار آدمیوں سے لینا چاہیے" تا آخر یہ پورا مقولہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

امام مالک کی حدیث میں جلالت شان اور اُن پر حدیث میں اعتماد کو اس امر سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ ان کے معاصر ائمۂ حدیث اعتراف کرتے ہیں کہ امام مالک حدیث میں امام اور نہایت محتاط و پختہ کار ہیں چنانچہ :۔

(۱) سفیان بن عینیہ کہتے ہیں : مالک صرف وہی حدیث اپنے تلامذہ کے سامنے بیان کرتے تھے جو صحیح ہوتی تھی اور یہ کہ مالک ثقہ راویوں سے ہی حدیث روایت کیا کرتے تھے۔

(۲) یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں : مالک حدیث میں امام تھے۔

(۳) ابو قدامہ کہتے ہیں : مالک اپنے زمانہ میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔

(۲) باقی ڈاکٹر حسن علی عبدالقادر کا یہ دعویٰ کہ موطا حدیث کی کتاب نہیں ہے" اس کی تردید و تکذیب کے لیے تو علماء حدیث کا وہ اہتمام و اعتنا رہی بہت کافی ہے جو مختلف مسلک رکھنے والے علما نے مذہبی اختلاف کے باوجود اس کتاب کے بارے میں روا رکھا ہے۔ لیجیئے یہ امام محمد بن الحسن شیبانی ہیں جو موطا کو انتہائی اہتمام کے ساتھ منضبط کرتے ہیں[1] حالانکہ وہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد اور حنفی المسلک امام ہیں۔ یہ (شام کے صاحب مذہب امام) اوزاعی ہیں جو امام مالک سے انتہائی اہتمام کے ساتھ موطا روایت کرتے ہیں حالانکہ اوزاعی خود امام مجتہد ہیں۔ ان کا مستقل مذہب معروف

---

[1] امام محمد نے پورے تین سال امام مالک کے پاس رہ کر سبقاً سبقاً موطا .... پڑھا ہے یہ اہتمام شاید ہی امام مالک کے کسی دوسرے شاگرد نے کیا ہو۔ ۱۲ محشی

ہے (سب جانتے ہیں) اور لیجئے یہ امام شافعی ہیں جو امام مالک کے پاس جاکر براہ راست اُن سے موطا کا سماع کرتے ہیں حالانکہ امام شافعی خود صاحب مذہب اور ائمہ اربعہ متبوعین میں سے ایک امام مجتہد ہیں۔ یہی شافعی، حنفی مختلف المسلک علماء حدیث ہیں جو اختلاف مسلک کے باوجود موطا کی شرحیں لکھتے اور تلخیصیں کرتے ہیں (صرف اس لئے کہ موطا حدیث کی کتاب ہے فقہ مالکی کی کتاب نہیں ہے)۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ مالکی مذہب کے متبع علماء نے اس کتاب موطا کے بارے میں دوسرے علماء کے مقابلہ میں زیادہ اعتناء اور اہتمام سے کام لیا ہے اس لئے کہ یہ ان کے (مذہب کی اور ان) کے مقتدیٰ امام کی کتاب ہے اور ان کے صاحب مذہب کی تصنیف ہے۔

اگر موطا صرف فقہ مالکی ہی کی کتاب ہوتی تو یہ مختلف مذاہب کے علما اس طرح متفقہ طور پر اس کتاب کی طرف اتنی توجہ نہ دیتے اور اتنی خدمت نہ کرتے (صرف مالکی مذہب والے ہی اس کی طرف توجہ کرتے)

رہی یہ بات کہ موطا کے ابواب، فقہ اور فقہی مباحث و مسائل کی ترتیب کے مطابق رکھے گئے ہیں تو اتنی سی بات پر موطا کتب حدیث کے دائرہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔ امام بخاری نے بھی اپنی کتاب صحیح بخاری کے ابواب، فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق قائم کئے ہیں حالانکہ تمام دنیا کا اس پر اتفاق ہے کہ امام بخاری نے صحیح بخاری حدیث کی کتاب کی حیثیت سے لکھی ہے باوجود اس کے کہ انھوں نے فقہی ابواب پر صحیح بخاری کو مرتب کیا ہے اور امام بخاری نے امام مالک کی طرح صحیح بخاری میں صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ اور آرا، کا بھی ذکر کیا ہے امام ترمذی کی جامع ترمذی کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو ہر باب میں علما کے درمیان اختلافات، ان کے اقوال و آراء اور ان کی تفصیلات بیان کرنے کے انتہائی حریص واقع ہوئے ہیں یہی کچھ امام ابو داؤد نے سنن ابو داؤد میں کیا ہے (تو کہئے کہ یہ کتابیں بھی حدیث کی کتابیں نہیں ہیں)

حدیث کی کتاب میں کسی صحابی یا تابعی کے فتوے یا رائے کے ذکر کر دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کتاب، کتب حدیث کے زمرہ سے بھی خارج ہو جائے بالخصوص ان علما کے نزدیک جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال سب کے لئے حدیث کا لفظ استعمال

کیا جاتا ہے۔

باقی کتب ستہ حدیث میں موطا کو شمار نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ امام مالک نے موطا میں مرسل روایتیں کثرت سے ذکر کی ہیں۔ اس لئے کہ امام مالک کے نزدیک مرسل حدیث پر عمل کرنا جائز ہے جبکہ عام محدثین اس کو جائز نہیں سمجھتے ۔ تو صرف یہی (اختلاف) وہ شے ہے جس کی بنا پر پچھلے محدثین موطا کو صحاح ستہ میں شمار نہیں کرتے علاوہ ازیں محدثین کے نقطہ ہائے نظر اور آراء بھی اس سلسلہ میں مختلف ہیں ۔ جیسا کہ آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں ۔ مسند احمد ہمارے سامنے موجود ہے یہ کتاب بالاتفاق حدیث کی کتاب ہے لیکن خاص وجوہ کی بنا پر بیشتر محدثین اس کو صحاح ستہ میں شمار نہیں کرتے۔

باقی ڈاکٹر موصوف کا یہ کہنا کہ :- یہ متاخرین کا تقوی ہی ہے جس نے موطا کو کتب صحاح میں شمار کرنے پر مجبور کیا ہے[1]۔ درحقیقت یہ مستشرقین کا انداز تحریر اور اسلوب تعبیر ہے ورنہ تو یہاں تقوی کے کیا معنی ؟ کیا متقدمین کے پاس تقوی نہ تھا جو ان کو اس فعل پر آمادہ کرتا ؟ اور اس میں آخر تقوی کا دخل کیا ؟ اور یہ کہنا درست بھی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ امام شافعی موطا کے متعلق فرماتے ہیں :

> روئے زمین پر حدیث کی کوئی بھی کتاب امام مالک کی کتاب موطا سے زیادہ صحیح میرے علم میں نہیں ہے (کیا امام شافعی متقدمین میں سے نہیں ہیں یا وہ بھی خاکم بدہن تقوی سے محروم ہیں ؟)

اور ابن الصلاح کو اس کا جواب یہ دینا پڑا ہے :

> یہ بیان امام بخاری اور امام مسلم کی کتابیں (صحیح بخاری و صحیح مسلم) تصنیف ہونے سے پہلے تک درست تھا (المقدمہ)

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ علماء متقدمین بھی موطا کو انتہائی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کو کس پایہ کی حدیث کی کتاب سمجھتے تھے نہ کہ فقہ کی؟ ورنہ تو ابن الصلاح کو امام شافعی سے یہ عذر خواہی کرنی نہ پڑتی وہ سیدھا سادہ جواب یہ دیدیتے کہ "امام مالک کتاب موطا تو فقہ کی کتاب ہے اور بخاری و مسلم کی کتابیں (صحیح بخاری، صحیح مسلم) احادیث کی کتابیں ہیں"

[1] درحقیقت یہ انتہائی جسارت اور شرمناک طنز ہے بلکہ محدثین کی نیتوں پر حملہ ہے جو بدترین اخلاقی جرم ہے ۱۲ محشی

امام شافعیؒ

امام شافعی کا پورا نام و نسب یہ ہے: ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن العباس بن الشافع۔ آپ کا سلسلۂ نسب "قصی" تک پہونچتا ہے اور عبد مناف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ ۱۵۰ھ میں ملک شام کے صوبہ غزہ میں پیدا ہوئے تھے ابھی آپ دو سال کے ہی تھے کہ آپ کی والدہ آپ کو مکۃ المکرمۃ لے آئی تھیں۔ مکۃ المکرمہ ہی میں آپ نے ہوش سنبھالا نشو ونما پایا اور وہیں آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی، قرآن کریم پڑھا اس کے بعد دس سال تک قبیلہ ھذیل کے درمیان مقیم رہے اور ان سے علم لغت اور شعر گوئی کا فن سیکھا اسی لئے امام شافعی قبیلہ ہذیل کے اشعار کے سب سے زیادہ معتبر راویہ سمجھے جاتے تھے کہتے ہیں کہ ادب و لغتِ عربی کے امام اصمعی نے بھی امام شافعی سے ہذیل کے اشعار کی تصحیح کی ہے۔ اس کے بعد امام شافعیؒ مکہ کے مفتی مسلم بن خالد زنجی سے فقہ پڑھی، پھر مدینہ طیبہ چلے آئے اور امام مالک کی شاگردی اختیار کرلی اور ان سے براہ راست پوری موطا پڑھی امام مالک نے اس اثنا میں امام شافعی کے کے غیر معمولی ذہانت، ذکاوت، قوتِ حافظہ اور بے نظیر شرافت کے جوہر مشاہدہ کئے اس لئے وہ اپنے اس ہونہار شاگرد کی عزت کرنے لگے۔

اس کے بعد امام شافعی نے یمن کے ایک صوبہ میں سرکاری ملازمت اختیار کرلی اسی زمانہ میں کسی حاسد نے خلیفہ ہارون الرشید سے ان کے خلاف جھوٹی شکایت کردی چنانچہ انھیں بغداد لایا گیا، شیعوں کی حمایت اور اہل بیت کی دعوت (پروپیگنڈے) کا ان پر الزام لگایا گیا تھا یہ ۱۸۴ھ

کا واقعہ ہے امام محمد بن الحسن نے اس معاملہ میں مداخلت کی اور خلیفہ کے سامنے امام شافعی کی طرف سے صفائی پیش کی یہانتک خلیفہ اس الزام سے امام شافعی کی براءت کے بارے میں مطمئن ہوگیا اور انہیں باعزت طریقہ پر بری کر دیا۔

اس واقعہ کی بنا پر امام شافعی کا تعلق امام محمد سے بہت گہرا ہوگیا (اور امام محمد کی شاگردی اختیار کرلی) اور امام محمد کے تلامذہ کی مکتوب یادداشتیں بھی اُن سے حاصل کرلیں (بغداد سے روانگی کے وقت) امام شافعی نے امام محمد کے اس علمی احسان کا اعتراف ذیل کے الفاظ میں کیا ہے:

میں بغداد سے روانہ ہوا اور محمد بن الحسن کے علم (حدیث وفقہ ولغت) کا ایک بار شتر اپنے ساتھ لایا۔

امام شافعی بغداد سے (اپنے اصلی وطن) مکۃ المکرمہ واپس آگئے (اور مکہ میں مستقل قیام اختیار کرلیا) اس کے بعد وہ (علمی استفادہ اور افادہ کی غرض سے) برابر عرق وحجاز جاتے آتے رہے ہیں یہاں تک ۱۹۹ھ میں امام شافعی نے مصر میں قیام اختیار کرلیا۔ مصر میں ہی امام شافعی نے اپنے جدید اور مستقل مذہب کو مدون ومرتب کیا اور ۲۰۴ھ میں اس دار فانی سے انتقال فرما گئے، اس کے بعد کہ انھوں نے علم حدیث وفقہ اور اجتہادی مسائل سے دُنیا کو مالا مال کردیا تھا اور اس کے بعد کہ عراق ومصر میں دنیا کے بہترین اور یکتا افراد ان سے شاگردی کا شرف حاصل کرچکے تھے۔ اہل علم کے قلوب ان کی محبت سے مملوا اور جلالت قدر سے سرشار تھے کیونکہ اللہ جل شانہٗ نے امام شافعی کو وافر علم عطا فرمایا تھا اور (مخالفین سے مناظرے اور بحث وتحقیق کی بڑی زبردست قوت وقدرت عطا فرمائی تھی، عجیب وغریب ذکاوت وذہانت سے سرفراز کیا تھا، حقائق کی تہ تک پہونچنے والا ذہن عطا کیا تھا، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انتہائی وسیع مطالعہ اور احاطہ بخشا تھا۔ علوم لغت وادب وشعر کے یکتا زمانہ ماہر تھے۔

فقہی اور اجتہادی بلند پایہ مرتبہ ومقام کے علاوہ علماء حدیث اور محدثین کے زمرہ میں بھی امام شافعی کو بہت ہی اعلیٰ وارفع مقام حاصل تھا اس لئے کہ امام شافعی ہی نے روایت حدیث کے قواعد وضوابط وضع کئے اور حدیث وسنت کی حمایت میں بالکل اچھوتے انداز سے دفاع کیا اور منکرین سنت کے منہ بند کئے) اور علی الاعلان امام ابوحنیفہ اور امام مالک سے اختلافی مسائل

میں اپنی اجتہادی رائے کا اظہار کیا کہ جب کسی حدیث کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا واجب ہے اس قید کے بغیر کہ اہل مدینہ کا عمل اس حدیث کے موافق ہو۔ جیسا کہ امام مالک شرط لگاتے ہیں ۔ اور ان متعدد شرائط کے بغیر جو امام ابوحنیفہ لگاتے ہیں امام شافعی اپنے اسی موقف کی وجہ سے علماء حدیث کے (زبردست حامی اور) طرفدار بن گئے تھے اور اسی وجہ سے محدثین نے ان کو ناصر السنة کے لقب سے نوازا ہے ۔

امام شافعی نے اپنی کتاب الرسالة اور الام میں سنت سے متعلق جو بحثیں کی ہیں در حقیقت یہ بحثیں ۔ اُن تمام تصنیفی وتالیفی کارناموں کے مقابلہ میں جو علماء حدیث نے حدیث کے حجت ہونے اور اسلامی قانون میں اس کے مرتبہ ومقام کی عظمت و وقعت ثابت کرنے کے سلسلہ میں تصنیف کی ہیں ۔ نہایت قیمتی سرمایہ ہیں جنمیں نہایت قوی اسلوب اور محکم انداز بیان میں باطل شکن پرشکوہ دلائل وبراہین کے ذریعہ اس موضوع کا حق ادا کیا گیا ہے ۔

امام شافعی کے بعد علماء اصول میں سے جس شخص نے بھی آج تک علم مصطلح حدیث (اصول حدیث) اور کتاب وسنت کے مباحث پر کچھ لکھا ہے وہ اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی تصنیف میں امام شافعی کا خوشہ چین اور رہین منت ہے اسی سے امام محمد کے اس قول کی صداقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ :-

اصحاب حدیث جب بھی حدیث . وسنت پر کلام کریں گے تو امام شافعی کی زبان سے کلام کریں گے ۔

امام زعفرانی بھی یہی فرماتے ہیں :

اصحاب حدیث (خواب غفلت میں) سوئے ہوئے تھے امام شافعی نے ان کو جگا دیا ۔

اسی بنا پر علماء حدیث (اور ائمہ حدیث) امام شافعی کی بیحد تعظیم کرتے ہیں اور ہمیشہ بھلائی کے ساتھ ان کا ذکر خیر کرتے ہیں چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں :-

جس شخص نے بھی قلم دوات کو کبھی ہاتھ لگایا (اور کچھ لکھا) امام شافعی کا اس کی گردن پر احسان ہے ؛؛

نیز فرماتے ہیں :۔

ہمیں مجمل و مفسر اور ناسخ و منسوخ حدیث میں اس وقت تمیز ہوئی جب ہم امام شافعی کی صحبت میں بیٹھے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے :۔

جب میں نے امام شافعی کی کتاب الرسالۃ دیکھی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اس کتاب میں میں نے ...... ایک ایسے شخص کا کلام دیکھا جو انتہا درجہ عقلمند، اعلیٰ درجہ فصیح اور (دین کا زبردست) حامی اور بہی خواہ ہے اسی لئے میں کثرت سے دعائیں دیتا ہوں۔

کرابیسی کا قول ہے :۔

ہم نہیں جانتے تھے کہ کتاب و سنت کیا ہیں ان کی حقیقت (وعظمت) ہمیں امام شافعی سے معلوم ہوئی نہ ہم نے امام شافعی جیسا کوئی آدمی دیکھا اور نہ امام شافعی نے ہی اپنا جیسا کوئی دوسرا آدمی دیکھا۔ میں نے امام شافعی سے زیادہ فصیح بشستہ بیان اور اُن سے زیادہ علوم و معارف سے آگاہ کسی کو نہیں پایا۔

امام شافعی کے مذہب کے اصول بھی وہی ہیں جو دوسرے ائمہ مجتہدین کے ہیں یعنے کتاب و سنت قیاس اور اجماع فرق اتنا ہے کہ امام شافعی کے ہاں خبر واحد کو علی الاطلاق قبول کرنے کی وجہ سے عمل بالسنہ کا دائرہ اگر ایک طرف امام مالک اور ابو حنیفہ کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہو گیا ہے تو دوسری طرف مرسل حدیث پر عمل ترک کرنے کی وجہ سے یہ دائرہ تنگ بھی ہو گیا ہے۔ امام شافعی مرسل حدیث کو صرف اس صورت میں قبول کرتے ہیں جبکہ وہ مرسل حدیث کبار تابعین کی ہو مثلاً سعید بن المسیب کی مرسل حدیثیں۔

امام شافعی کے اصول میں " استصحاب حال " بھی معتبر ہے حنفیہ نے استصحاب حال کا اعتبار کیا ہے مگر صرف رد میں نہ کہ اثبات میں (یعنے کسی دعوے کو استصحاب حال کی بنا پر رد تو کیا جا سکتا ہے لیکن دعوے کے ثبوت کے لئے استصحاب حال کافی نہیں ہے)۔

امام شافعی کی حدیث میں کوئی کتاب تو ثابت نہیں بجز مسند الشافعی کے جو ابو العباس اصم کی

روایت سے ثابت ہے اور بجز سنن الشافعی کے جو طحاوی کی روایت سے ثابت ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں بھی ان کے تلامذہ کی ضبط کردہ تحریریں (یادداشتیں) ہیں نہ کہ خود امام شافعی کی اپنی تصنیف —(یہی حال امام ابوحنیفہ کی مسانید کا ہے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں)

اس کا سبب بھی وہی ہے کہ امام شافعی بھی عام محدثین کی طرح مستقل طور پر حدیث کا درس دینے کے لئے نہیں بیٹھے (ان کو اس کی فرصت ہی نہیں تھی) اسی طرح امام شافعی نے حدیثوں کی روایتوں اور سندوں کے جمع کرنے کا بھی اہتمام نہیں کیا وہ تو صرف امام مجتہد تھے (کتاب وسنت سے دفاع کرنا اور احکام شرعیہ اُن سے اخذ کرنا ان کا کام تھا جسے اُنھوں نے بطریق احسن انجام دیا) حدیث وسنت کے ذخیرہ میں سے وہ صرف انہی چیزوں سے بحث کرتے تھے جنکے اصول تشریع احکام میں اصل کی حیثیت سے معتبر ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ان کو حدیث کی جستجو صرف اس لئے تھی کہ وہ ان کے اجتہاد اور فقہ کی بنیاد بن سکے نہ کہ محض یادداشتیں اور مکتوب نوشتے بھرنے کے لئے — یہی ہے وہ فرق جو ان محدثین کے درمیان — جو حدیثیں (یاد کرنے کے لئے) وقف ہوتے ہیں — اور ان ائمہ مجتہدین کے درمیان — جو تدوین فقہ اور تشریع احکام کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اسی میں مصروف و منہمک رہتے ہیں۔

امام احمدؒ

۱۶۴ــــــــ۲۴۱

امام احمد کا پورا نام وکنیت ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی ہے آپ بغداد میں ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے وہیں نشوونما پایا اور جوان ہوئے۔ طلب حدیث کے سلسلہ میں اول امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام ابویوسف کی مجلس درس حدیث میں حاضر ہوئے اس کے بعد طلب حدیث کی دھن میں لگ گئے اور زمانہ دراز تک اسی دھن میں لگے رہے۔ شیوخ حدیث کے پاس جاتے اور ان سے حدیثیں (سنتے اور لکھتے یہاں تک کہ حدیث وسنت کے (ذخیرے) جمع اور محفوظ کرنے اور اُن پر پوری طرح احاطہ کرنے میں انتہائی بلند چوٹیوں پر پہونچ گئے اور اپنے زمانہ میں بلاکسی اختلاف کے۔ حدیث وسنت کے (مسلم) امام بن گئے۔ اس کے بعد اول تو احمد نے امام شافعی سے فقہ حاصل کی اور پھر امام شافعی نے احمد سے حدیث حاصل کی۔ بخاری اور مسلم (جیسے محدثین) بھی امام احمد کے شاگردوں میں سے ہیں۔

امام احمد پرہیزگاری میں، دنیا سے بے رغبتی میں، دین میں، امانت میں اور حق کے معاملہ میں انتہائی سخت گیری کے بہت بلند مقام پر پہونچے ہوئے تھے (محدثین کے خلاف معتزلہ اور عقلیت پرست فقہا کے کھڑے کئے ہوئے فتنہ) خلق قرآن کی آزمائشوں کا انتہائی ثابت قدمی ویامردی سے مقابلہ کیا (اور کامل صبر واستقامت کے ساتھ۔) مامون کے عہد سے لے کر متوکل کے زمانہ تک (پورے چار عقلیت پرست عباسی خلفاء کے دور میں) ہر طرح کی سختیاں جھیلتے رہے (نہ صرف قید وبند بلکہ برہنہ جسم پر تازیانوں کی سزائیں بھی سہنی پڑیں لیکن پائے استقامت میں ذرا فرق نہ آنے دیا)

لیکن اس مسئلہ خلق قرآن میں امام احمد کے اس عظیم موقف کا دائمی اثر عام مسلمانوں کو حق پر

قائم رکھنے کے بارے میں ہمیشہ ہمیشہ کام کرتا رہے گا (اور دنیا اس سے سبق حاصل کرتی رہے گی)
خود امام احمد کا مرتبہ و مقام بھی اس آزمائش میں ثابت قدم رہنے کی وجہ سے مسلمانوں کی نظروں میں بہت بلند ہو گیا اور وہ متفقہ طور پر ان کی امامت کا اعتراف کرنے لگے۔ علما کی شہادتیں امام احمد کے حق میں بکثرت اور بے شمار ملتی ہیں۔ چنانچہ امام شافعی کا یہ قول (احمد کی عظمت و جلالت شان کے ثبوت کے لئے) بہت کافی ہے :-

> میں بغداد سے روانہ ہوا تو وہاں میں ایسے کسی بھی شخص کو چھوڑ کر نہیں آیا، جو احمد بن حنبل سے بڑھ کر علم و فضل میں، تقویٰ اور پرہیزگاری میں۔

امام احمد کی وفات بھی بغداد ہی میں ۲۴۱ھ میں ہوئی۔ ان کے جنازہ میں بے شمار مخلوق شریک تھی۔

امام احمد کے مذہب کے اصول بھی وہی ہیں جو عام ائمہ مجتہدین کے مذہب کے اصول ہیں: کتاب و سنت و اجماع و قیاس (نمایاں فرق یہ ہے کہ) حدیث و سنت کو امام احمد بہت زیادہ اختیار کرتے ہیں (اور قیاس سے بہت کم کام لیتے ہیں اسی لئے محدثین سے امام شافعی سے بھی زیادہ قریب ہیں) اس سلسلہ میں امام احمد کا ایک (مشہور) قول ہم اس سے پہلے نقل کر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> میرے نزدیک ضعیف حدیث لوگوں کی رائے سے زیادہ بہتر ہے۔

صحابہ کی آراء اور فتاویٰ کا بہت زیادہ اتباع کرتے ہیں اگر کسی مسئلہ میں صحابہ کی دو یا تین رائیں ہوتی ہیں تو احمد کے بھی اس میں دو یا تین قول ہوتے ہیں (اسی لئے تقریباً ہر مسئلہ میں امام احمد کے ایک سے زائد اقوال اور روایات ہوتی ہیں) اسی وجہ سے بعض محققین ان کو ائمہ مجتہدین اور فقہا میں شمار نہیں کرتے جیسا کہ حافظ عبد البر نے اپنی کتاب الانتقاء میں اختیار کیا ہے (کہ ائمہ مجتہدین کے مناقب کے ذیل میں صرف ابو حنیفہ، مالک اور شافعی کے حالات بیان کئے ہیں، امام احمد کو چھوڑ دیا ہے)
لیکن حق یہ ہے کہ احمد امام مجتہد اور فقیہ بھی تھے اس میں شک نہیں کیا جا سکتا ہاں یہ ضرور ہے کہ

حدیث کا رنگ اُن پر غالب تھا۔

مسند احمد، کتب حدیث میں اس کا مرتبہ، اور اس کی احادیث

امام احمد کے زندۂ جاوید کارناموں میں سے ایک کارنامہ ان کی کتاب مسند ہے جس نے اُمت کو سب سے زیادہ نفع بخشا ہے اور سنت و حدیث کے (شائقین کے) لئے عظیم برکت کی موجب ہے اس کتاب میں امام احمد نے چالیس[۴] ہزار حدیثیں جمع کی ہیں جن میں دس[۱] ہزار مکرر ہیں یہ چالیس ہزار حدیثیں سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں کے مجموعہ میں سے — جو انہیں حفظ یاد تھیں — انتخاب کی ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں امام احمد نے (متقدمین کے اتباع میں) یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ ایک صحابی سے مروی تمام حدیثیں یکجا جمع کر دیتے ہیں (خواہ کسی بھی موضوع سے متعلق ہوں) مثلاً حضرت ابو بکر صدیق سے جو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں ان کو ایک باب میں جمع کر دیا ہے اگرچہ ان کے موضوعات مختلف ہوں (نماز سے متعلق ہوں یا زکوٰۃ سے یا حج سے علیٰ ہذا القیاس)

مسند احمد کے درجہ اور مرتبہ کے بارے میں اختلاف۔

کتب حدیث کے درمیان، مسند احمد کے درجہ اور مرتبہ کے بارے میں علماء حدیث کے درمیان اختلاف ہے۔

چنانچہ محدثین کے ایک گروہ کا کہنا ہے — جن میں ابو موسیٰ المدینی بھی شامل ہیں۔ کہ:-

مسند ساری کی ساری حجت ہے اس میں جتنی حدیثیں ہیں وہ سب صحیح ہیں۔

ان حضرات نے یہ رائے امام احمد کے اس قول کی بنیاد پر قائم کی ہے جو مسند ہی میں موجود ہے کہ:-

جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کے بارے میں تمہارے درمیان اختلاف ہو، تم اس (مسند) کی طرف رجوع کرو اگر وہ حدیث مسند میں مل جائے تو فیہا ورنہ تو وہ حجت نہیں ہے۔

لیکن محدثین کی ایک جماعت کی تحقیق یہ ہے کہ:- مسند احمد میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر قسم کی احادیث موجود ہیں۔ یہ ابن الجوزی اور ان کے ہمنواؤں کا مسلک ہے ابن جوزی نے اپنی

کتاب "موضوعات" میں مسند احمد کی اُنتیس[29] حدیثیں ذکر کی ہیں اور اُن پر موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے حافظ عراقی نے ان انتیس پر نو حدیثوں کا اور اضافہ کیا ہے ان پر بھی موضوع ہونیکا حکم لگایا ہے اور ان لوگوں کے قول کی تردید کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ۱ امام احمد نے اپنی کتاب میں "صحیح" ہونے کی شرط لگائی ہے اور بتلایا ہے کہ امام احمد کے مذکورہ بالا قول کا کہ:۔

جو حدیث اس (مسند) میں نہیں ہے وہ حجت نہیں ہے۔

مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنی حدیثیں بھی اس میں ہیں وہ سب کی سب حجت ہیں۔

اور کچھ محدثین نے درمیانہ موقف اختیار کیا ہے کہ:

مسند میں صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی حدیثیں ہیں لیکن وہ ضعیف حدیثیں بھی حدیث حسن" کے قریب قریب ہیں۔ یہ موقف مذکورہ ذیل محدثین کا ہے۔

حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ جلال الدین السیوطی

ان حضرات نے ابن الجوزی اور حافظ عراقی پر اُن احادیث کے بارے میں جن کو ان دونوں نے موضوع کہا ہے سخت گرفت اور تردید کی ہے اور ان حدیثوں کے شواہد (مویدات) پیش کئے ہیں (جو ان کی صحت کا ثبوت ہیں) اور ان مزعومہ موضوع حدیثوں کی طرف سے دفاع کیا ہے (اور جواب دینے کی کوشش کی ہے) جس میں بڑی حد تک تکلف اور سخن سازی سے کام لیا گیا ہے یہاں تک کہ حافظ ابن حجر کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "مسند میں تین یا چار حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں" اور ان حدیثوں کے بارے میں معذرت یہ پیش کی ہے کہ:۔ امام احمد نے وفات سے پہلے مسند میں ان حدیثوں کو نکالدینے کی وصیت کی تھی اس لئے یہ حدیثیں یا تو سہواً رہ گئی ہیں یا ان کو کاٹ دیا گیا تھا لیکن (مٹایا نہیں گیا تھا اس لئے) وہ کاٹنے کے باوجود لکھدی گئی ہیں۔

لیکن جب یہ چند حقیقتیں آپ کے علم میں آچکی ہیں کہ (۱) امام احمد فضائل کی حدیثوں کے معاملہ میں بہت سہولت پسند ہیں (زیادہ چھان بین نہیں کرتے) اور (۲) یہ کہ وہ جرح و تعدیل کے معاملہ میں معتدلین میں سے ہیں اور (۳) یہ کہ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ نے اور ان کی مسند کے راوی ابوبکر قطیعی نے مسند میں کچھ منکر حدیثیں بڑھادی ہیں، تو آپ کو مسند کا مقام سمجھ لینا چاہیئے (کہ کیا ہے) اور یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ اصل بات وہی ہے جو ابن الجوزی

اور عراقی نے کہی ہے۔ یہ دونوں حضرات نقد حدیث (حدیثوں کو پرکھنے) کے زبردست ماہرین میں سے ہیں یہ حدیث کے پرکھنے میں صرف سند کے پرکھنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ متن کا جائزہ بھی لیتے ہیں (کہ یہ حدیث ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟) اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو جانا چاہے کہ ابن حجر اور سیوطی نے جو دفاع کیا ہے وہ محض ایک مذہبی عصبیت پر مبنی ہے جو محض ایک امام السنۃ کی حمایت میں برتی گئی ہے۔ حالانکہ امام احمد کو اس سے کچھ بھی نقصان نہیں پہونچتا۔

چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں کہا ہے کہ :۔

> امام احمد نے مسند میں صرف یہ شرط رکھی ہے کہ جو لوگ ان کے نزدیک جھوٹ بولنے میں مشہور ہیں وہ ان کی حدیثیں روایت نہیں کریں گے۔ اگرچہ ان میں بعض راوی ضعیف بھی ہوں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ احمد کی وفات کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ نے کچھ منکر حدیثیں اضافہ کی ہیں اور ان کو مسند کی روایتوں کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔

اسی طرح ابوبکر قطیعی نے بھی اضافے کئے ہیں اور ان اضافوں میں بہت سی موضوع احادیث بھی ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کو اس "حادثہ" کا علم نہ تھا انھوں نے یہی سمجھا کہ یہ روایتیں بھی امام احمد نے روایت کی ہیں۔ والی اللہ المشتکیٰ

امام بخاری

۱۹۴ھ ——— ۲۵۶ھ

امام بخاری کا پورا نام ونسب اور کنیت یہ ہے: ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراهیم بن المغیرۃ بن بردزبۃ الجعفی مولاھم (یعنے قبیلہ جعفہ کی طرف نسبت موالات کے اعتبار سے ہے نہ کہ نسب کے اعتبار سے)

امام بخاری اپنے زمانہ میں علی الاطلاق (یعنے بلاتخصیص وبلا استثنا) محدثین کے امام اور حفاظ حدیث کے شیخ تھے۔ جمعہ ۱۳ر شوال ۱۹۴ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے، آپ کی عمر ابھی دس برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ آپ نے حدیثیں حفظ کرنی شروع کر دی تھیں اور اسی (حفظ حدیث) کو اپنا مستقل مشغلہ بنا لیا تھا اور حدیث کی جستجو میں ان تمام اسلامی شہروں کے سفر شروع کر دئے تھے جو حدیث کے لئے مشہور تھے خود فرماتے ہیں:-

میں نے (حدیث کے لئے) شام و مصر و جزیرہ کا تو دو مرتبہ سفر کیا، بصرہ کا سفر چار مرتبہ کیا اور چھ سال حجاز میں مقیم رہا اور کوفہ و بغداد کے سفر تو میں شمار بھی نہیں کر سکتا کہ کتنی مرتبہ محدثین کے ساتھ میں وہاں گیا ہوں۔

حدیث کے جس شیخ کا نام بھی سنتے فوراً اس کے پاس سفر کر کے پہونچ جاتے (اول) اس (کے علم حدیث) کو آزماتے، سوالات کرتے (مطمئن ہونے کے بعد) اس سے حدیثیں لیتے (یعنے سنتے یاد کرتے اور لکھتے)۔ حافظہ کی قوت میں، یادداشت میں، (حدیث کی) سندوں اور متنوں کی علل (پوشیدہ عیوب) کی بصیرت میں تو امام بخاری آیت من آیات اللہ (قدرت الٰہی کا ایک

کرشمہ) تھے۔

بغداد میں علماء حدیث نے امام بخاری (کی قوت یادداشت اور بصیرت) کا جو امتحان لیا تھا اس کا قصہ تو مشہور رہی ہے یہ واقعہ امام بخاری کی قوت حافظہ اور اس فن حدیث میں ان کی امامت کا روشن ثبوت ہے۔

حدیث وسنت (حاصل کرنے اور محفوظ کرنے) کی راہ میں امام بخاری کے صبر واستقامت اور تکلیفیں اُٹھانے، مصیبتیں جھیلنے کا صلہ اللہ کریم نے یہ دیا کہ ان کو قبول عام نصیب ہوا شائقین حدیث چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور ان کی شہرت وفضیلت کے چرچے لوگوں کی زبانوں پر عام ہو گئے چنانچہ محمود بن الناظر بن سہل شافعی کہتے ہیں:

> میں بصرہ، شام، حجاز، کوفہ گیا ہوں وہاں کے محدثین سے ملاقاتیں کی ہیں میں نے دیکھا جہاں محمد بن اسماعیل بخاری کا ذکر آجاتا تو سب ان کو اپنے اوپر فضیلت (اور ترجیح) دیتے۔

ایک مرتبہ بخاری نے اپنے شیخ اسحٰق بن راہویہ کو اپنے شاگردوں سے خطاب کرکے (جن میں بخاری بھی شامل تھے) یہ کہتے سنا:

> کیا اچھا ہو اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کو ایک مختصر سی کتاب میں جمع کردو۔

امام بخاری کہتے ہیں کہ:

> (اسی وقت سے) میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا اور میں نے (اسی دن سے) الجامع الصحیح (کے لئے خالص صحیح حدیثوں) کو جمع کرنا شروع کردیا۔

امام بخاری ان (صحیح) حدیثوں کو جمع کرنے، ان میں چھان بین اور کاٹ چھانٹ کرنے اور اس کے بعد مرتب کرنے میں سولہ۱۶ سال تک لگے رہے ہیں (طریق کار یہ تھا کہ بحث وتجسس کے بعد جب کوئی حدیث صحیح بخاری میں لکھتے تو پہلے غسل کرتے، دو رکعت نماز پڑھتے اس کے بعد اس حدیث کو درج کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتے (جب پوری طرح دل مطمئن ہوجاتا تب لکھتے۔)

اس کتاب — صحیح بخاری — میں امام بخاری نے صرف وہی حدیثیں جمع کی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح اور متصل سندوں سے ثابت ہیں جن کے راویوں کی عدالت، حفظ وضبط اور شیخ سے ملاقات کا ثبوت انکو وافر طور پر میسر آگیا ہے۔ امام بخاری کے نزدیک راوی حدیث کا اپنے شیخ کا ہمعصر ہونا ہی (صحت حدیث کے لئے) کافی نہ تھا بلکہ شیخ سے حدیث سننے کی تصریح اور اور ملاقات کا ثبوت بھی ضروری تھا اسی بنا پر حدیث کی یہ پہلی کتاب ہے جو ان دقیق شرائط کے ساتھ مدون ومرتب ہوئی ہے اور (نہ صرف) "ضعیف" (بلکہ) "حسن" احادیث سے (بھی) بالکل خالی ہے اور صرف "صحیح" احادیث کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے (اسی لئے یہ صحیح بخاری کے نام سے دنیا میں مشہور ہے)

امام بخاری نے اس کتاب کو حدیث وفقہ کے ابواب پر ہی ترتیب دیا ہے مگر اسی کے ساتھ امام بخاری استنباط احکام شرعیہ میں بھی بیحد باریک بین تھے ان کی نگاہ انتہائی دور رس واقع ہوئی تھی (لیکن ازراہ احتیاط ان تمام احکام شرعیہ ومسائل فقہیہ کو کتاب میں ذکر کرنے کے بجائے "ترجمۃ الباب" میں ذکر کرتے ہیں اور احادیث سے ان کو ثابت کرتے ہیں) اس لئے ابواب کے تراجم اور احادیث سے ان تراجم کی مطابقت (اور ثبوت) کے سمجھنے میں بعض اوقات بڑی دشواری[۱] پیش آتی ہے اور اسی لئے جب آپ کسی حدیث کو (اس کے مناسب مقام پر) تلاش کریں تو وہ حدیث وہاں آپ کو نہ ملے گی بلکہ وہ حدیث آپ کو کسی ایسے باب میں ملے گی جس کا آپ کو خیال تک بھی نہ ہوگا۔

صحیح بخاری میں امام بخاری نے (اسی استنباط احکام کی غرض سے موقوف آثار، معلق احادیث

---

[۱] اس دشواری کی وجہ یہ ہے کہ احکام ومسائل جن کو امام بخاری ثابت کرنا چاہتے ہیں بیشمار ہیں اور امام بخاری کی شرط پر صحیح حدیثیں بیحد محدود ہیں انہی محدود حدیثوں سے وہ لامحدود احکام ومسائل اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ لامحالہ ان استنباط میں انتہائی دقت نظر اور باریک بینی سے کام لینا پڑا ہے جس کو سمجھنے میں قارئین کو دشواریاں پیش آتی ہیں کہ امام بخاری کیا کہنا چاہتے ہیں اور وہ حدیث سے کیونکر ثابت ہوتا ہے اسی لئے محدثین کے حلقہ میں مشہور ہے فقہ البخاری فی تراجمہ — امام بخاری کی فقہ ان کے ترجموں میں ہے - ۱۲، محشی

صحابہ وتابعین کی آرا و فتاوی اور علما کے اقوال کا بھی ذکر کیا ہے مگر ضمناً (یعنے ترجمۃ الباب) میں) جیساکہ (اسی غرض کے تحت) وہ ایک حدیث کے کئی کئی ٹکڑے کرکے ہر ٹکڑے کو اس باب کے ذیل میں مدرج کرتے ہیں جو اس کے مناسب ہوتا ہے (یعنے جس سے ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے)

اس کتاب میں احادیث کی تعداد مکرر کو ملاکر جیساکہ حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں بیان کیا ہے، ۷۳۹۷ ہے اس تعداد میں معلق حدیثیں، متابع روایات اور موقوف آثار شامل نہیں ہیں (وہ اس پر مستزاد ہیں) اور مکرر کو چھوڑ کر صرف متصل احادیث کی تعداد ۲۶۰۲ ہے۔

امام بخاری نے جب (سولہ سال کی طویل کاوش و کاہش کے بعد) اس کتاب کو مکمل کرلیا اور (نظر ثانی میں) کاٹ چھانٹ بھی پوری ہوگئی تو امام احمد بن حنبل، یحیٰی بن معین اور ابن المدینی جیسے ائمہ و اساطین حدیث کے سامنے پیش کیا تو ان تمام ائمہ نے اس تالیف کو بیحد پسند کیا اور سراہا اور چار حدیثوں کے سوا تمام احادیث کی صحت کی شہادت دی۔ عقیلی کہتے ہیں کہ: ان چار حدیثوں کے بارے میں بھی امام بخاری ہی کا قول معتبر ہے (کہ وہ صحیح ہیں)

جب امام بخاری نے (ائمہ حدیث کی توثیق کے بعد) صحیح بخاری کو اپنے حلقہ درس میں مشتاقان حدیث کے سامنے رکھا اور اس کا درس دینا شروع کیا تو اس کی شہرت (بن کی آگ طرح) ساری دنیا میں پھیل گئی اور دور دراز سے تشنگان حدیث امام بخاری سے صحیح بخاری حاصل کرنے کیلئے دوڑ دوڑ کر آنے لگے یہاں تک کہ (کچھ ہی عرصہ میں) امام بخاری سے صحیح بخاری حاصل کرنے (اور پڑھنے) والے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہونچ گئی اور صحیح بخاری کے نسخے ہاتھوں ہاتھ تمام اسلامی شہروں میں پھیل گئے اور محدثین نے (اور کتابوں کے بجائے) صحیح بخاری ہی کو پڑھنا پڑھانا، یاد کرنا کرانا اور اس کی شرحیں لکھنا، تلخیصیں کرنا ہی اپنا مشغلہ بنالیا اور علماء حدیث کا طبقہ اس کتاب کے منظر عام پر آجانے سے بیحد خوش ہوا (کہ خالص صحیح احادیث کا ایک یقینی ذخیرہ دنیا کے ہاتھ آگیا)۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:-

> امام بخاری کی الجامع الصحیح اسلامی کتابوں میں اللہ کی کتاب (قرآن) کے بعد سب سے زیادہ صحیح اور اعلیٰ و افضل کتاب ہے لہذا اگر کوئی طالب حدیث اس کتاب کو (مؤلف یا ان کے کسی شاگرد سے سننے (اور پڑھنے) کے لئے

ایک ہزار فرسخ کا سفر بھی طے کرے تو اس کا سفر رائیگاں نہ ہوگا۔

ائمہ نقد حدیث نے صحیح بخاری کی ایک سو دس حدیثوں پر جرح و تنقید کی ہے ان میں سے بتیس[۳۲] حدیثیں ایسی ہیں جن کو امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح مسلم میں روایت کیا ہے۔ اٹھہتر[۷۸] حدیثوں کے روایت کرنے میں امام بخاری منفرد ہیں (یعنی صرف بخاری نے ہی روایت کیا ہے) ان ایک سو دس[۱۱۰] حدیثوں کے بارے میں بھی حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

> ان حدیثوں کی علتیں (عیوب) بھی سب ہی زیادہ سنگین (اور مانع صحت) نہیں ہیں بلکہ اکثر کا جواب ظاہر ہے (اور ہر حدیث و رجال کے فن سے واقف شخص پر واضح ہے) اور ان حدیثوں پر اعتراضات کے جوابات بھی دیئے جا سکتے ہیں ہاں ان میں سے بعض حدیثوں کے جوابات میں احتمال ہے (یعنی بحث کی گنجائش ہے) اور بہت ہی تھوڑی ایسی حدیثیں ہیں جن کا جواب صرف سخن سازی کا مصداق ہے۔

جو شخص بھی ان حدیثوں کی مراجعت کرے جن پر تنقید کی گئی ہے اور اس تنقید پر غور کرے جو اُن پر کی گئی ہے وہ بآسانی محسوس کر سکے گا کہ اس تنقید کا اثر حدیث کی اصل صحت پر مطلق نہیں پڑتا یہ محض معروضی تنقید ہے جو علماء حدیث کی انتہائی احتیاط اور بیدار مغزی پر مبنی ہے مثلاً کسی حدیث پر ناقدین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ حدیث تو مُرسل ہے۔ حالانکہ صورتاً تو وہ حدیث بیشک مُرسل ہے لیکن حقیقت میں مُرسل نہیں ہے بلکہ متصل ہے محدثین کے نزدیک اس کا متصل ہونا معروف ہے یا مثلاً کسی حدیث کو بعض راوی تو مُرسل روایت کرتے ہیں۔ لیکن اِنہی کے دوسرے ساتھی اسی حدیث کو متصل روایت کر رہے ہیں امام بخاری دونوں روایتوں کو ذکر کر دیتے ہیں تاکہ پہلی روایت کے مُرسل ہونے کا جو وہم ہوتا تھا وہ دور ہو جائے اور بتلا دیا جائے کہ اس حدیث کی یہ علت (ارسال) مانع صحت عیب نہیں ہے (کیونکہ اصل میں یہ حدیث متصل ہے)

یہ اس تنقید اور حرف گیری کی چند مثالیں ہیں جو صحیح بخاری کی احادیث پر کی گئی ہے۔ ان احادیث پر حافظ ابن حجر نے اپنے مقدمہ فتح الباری میں تفصیل سے بحث کی ہے (اور جواب دیئے ہیں) صحیح بخاری کے رجال (یعنی راویوں) میں سے تقریباً اسّی راویوں کو حفاظ حدیث نے ضعیف

کہا ہے لیکن ان میں سے اکثر وبیشتر (راوی) امام بخاری کے وہ اساتذہ ہیں جن سے شخصی طور پر وہ ملے ہیں ان کے ساتھ اُٹھے بیٹھے ہیں ان کے حالات . . . . اور ان کی احادیث سے وہ شخصی طور پر باخبر ہیں اس لئے امام بخاری ان اساتذہ سے اور ان کے حالات سے ناقدین کی بہ نسبت زیادہ واقف اور باخبر ہیں (اس لئے امام بخاری کی رائے ان کے متعلق ناقدین کی رائے کے مقابلہ پر زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہو سکتی ہے)

اس بات کا ثبوت کہ اس تنقید سے ــــ خواہ وہ صحیح بخاری کی حدیثوں پر ہو خواہ رجال (راویوں) پر ــــ صحیح بخاری کی علمی قدر و قیمت پر مطلق اثر نہیں پڑا یہ ہے کہ اہل علم نے (اس تنقید کے باوجود) صحیح بخاری کو بالاتفاق قبول کیا اور صحیح تسلیم کیا ہے۔ جمہور اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ کتاب اللہ (قرآن) کے بعد صحیح بخاری سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے ہاں اس امر میں اہل علم کے درمیان ضرور اختلاف رہا ہے کہ اس کتاب میں جو حدیثیں ہیں ان کی صحت کی بنا پر ان سے علم قطعی (یقینی) حاصل ہوتا ہے یا نہیں ؟ ابن الصلاح یقین کے ساتھ کہتے ہیں :

صحیح بخاری کی حدیثیں قطعیت کے لئے مفید ہیں (یعنے ان سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے .

امام نووی نے ابن الصلاح کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے :

یہ صحیح بخاری کی حدیثیں بھی (اخبار آحاد ہی ہیں اور خبر واحد یقین کے لئے مفید نہیں ہوتی بلکہ ظن غالب کے لئے مفید ہوتی ہے لہٰذا یہ) ظن غالب کے لئے ہی مفید ہیں اگر چہ یہ صحت کے اعلیٰ مرتبہ پر ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی جمہور محدثین کا مذہب ہے (۱)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔

یہ بحث اپنی جگہ، باقی اس میں شک نہیں کہ کتاب اللہ کے بعد علماء اسلام نے اور کسی بھی کتاب کا اتنا اہتمام نہیں کیا جتنا صحیح بخاری کا کیا ہے چنانچہ جن لوگوں نے صحیح بخاری کی شرحیں لکھیں ،

---

(۱) ماخوذ از مقدمہ فتح الباری ۱۲ مترجم

تلخیصیں کیں اور رجال بخاری کے حالات پر کتابیں لکھیں ان مصنفین کی تعداد بہت ہی بڑی ہے اس کتاب کی عظمت اور جلالت شان کا اندازہ کرنے کے لئے یہی بہت کافی ہے کہ صحیح بخاری کی صرف شرحوں کی تعداد بیاسی ۸۲ تک پہونچ چکی ہے جیسا کہ کشف الظنون کے مصنف نے بیان کیا ہے ان میں سے چار شرحیں تو بہت ہی مشہور و معروف ہیں۔

(۱) بدر الدین زرکشی — متوفی ۷۹۴ھ — کی شرح التنقیح (۲) حافظ بدر الدین عینی حنفی — متوفی ۸۵۵ھ — کی شرح عمدۃ القاری (۳) حافظ جلال الدین السیوطی — متوفی ۹۱۱ھ کی شرح التوشیح (۴) اور حافظ ابن حجر العسقلانی — متوفی ۸۵۲ھ — کی شرح فتح الباری یہ چار شرحیں بہت ہی مفصل اور مبسوط شرحیں ہیں اور یہی سب سے زیادہ مشہور و مفید ہیں۔

امام مسلمؒ

۲۰۴ ——— ۲۶۱ھ

امام مسلم کا پورا نام مسلم بن الحجاج القشیری ہے۔ آپ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ حدیث کے مشہور ائمہ اور حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ ۲۰۴ھ میں نیشاپور ہی میں پیدا ہوئے، صغر سنی میں ہی علم حاصل کرنا شروع کر دیا تھا بڑے ہو کر (تحصیل علم کی غرض سے) اسلامی ملکوں کے بہت سے سفر کئے چنانچہ عراق، حجاز، شام اور مصر گئے اور ان ملکوں کے مشائخ حدیث سے حدیثیں حاصل کیں مسلم کے ان مشائخ (اور اساتذہ) میں امام بخاری کے مشائخ بھی شامل ہیں۔ امام بخاری سے مسلم کو بڑی محبت تھی اور ان کے بڑے قدرشناس اور قدردان تھے۔ چنانچہ مسلم نے صحیح مسلم کی تالیف میں امام بخاری کا ہی اتباع کیا ہے۔ آخر میں دونوں کے درمیان کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی ۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

امام مسلم نے اپنی صحیح احادیث کی کتاب جو صحیح مسلم کے نام سے معروف ہے بڑے اہتمام کے ساتھ (سولہ سال میں) مرتب کی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کے ساتھ صحیح مسلم بھی حدیث کی عظیم تر اور صحیح تر... کتابوں میں شمار ہوتی ہے لیکن اکثر علما، حدیث امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر حسب ذیل وجوہ کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں۔

(۱) پہلی وجہ! امام بخاری نے (کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لئے) راوئی حدیث کی (اپنے شیخ سے) ملاقات کو شرط قرار دیا ہے صرف معاصرت (ہم زمانہ ہونے) پر اکتفا نہیں کرتے۔ اس کے برعکس امام مسلم راوی اور شیخ کے ہم زمانہ ہونے کو ہی (صحت حدیث کے لئے) کافی

قرار دیتے ہیں۔

(۲) **دوسری وجہ !** امام بخاری کی فقہی باریک بینی اور دقت نظر ہے جس کے نتیجہ میں صحیح بخاری ایسے فقہی استنباطات پر حاوی ہے جن سے صحیح مسلم یکسر خالی ہے (بالفاظ دیگر صحیح بخاری بیک وقت حدیث اور فقہِ حدیث دونوں پر مشتمل ہے اور صحیح مسلم میں صرف احادیث ہیں اور بس)

(۳) **تیسری وجہ !** امام بخاری نے رجال حدیث کے معاملہ میں انتہا درجہ چھان بین اور تلاش و جستجو سے کام لیا ہے۔ چنانچہ حفاظ حدیث نے صحیح بخاری کے جن راویوں پر کلام کیا ہے۔ اگرچہ ان میں بھی کافی بحث کی گنجائش ہے تاہم ـــ ان کی تعداد کل اسّی ہے۔ اس کے برعکس صحیح مسلم کے جن رجال حدیث پر تنقید کی گئی ہے ان کی تعداد ایک سو ساٹھ ہے۔ علاوہ ازیں امام بخاری نے اُن راویان حدیث کی حدیثیں زیادہ روایت نہیں کی ہیں جن پر تنقید کی گئی ہے نیز ان میں سے بیشتر وہ مشائخ ہیں جن سے امام بخاری شخصی طور پر واقف ہیں اور ان کے اچھے بُرے حالات سے ناقدین کی بہ نسبت زیادہ باخبر تھے (لہٰذا ان کے متعلق امام بخاری کی رائے ناقدین کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہے)

(۴) **چوتھی وجہ !** شاذ یا معلّل ہونے کے لحاظ سے صحیح بخاری کی جن احادیث پر کلام کیا گیا ہے ان کی تعداد صحیح مسلم کی ایسی ہی متکلم فیہ احادیث کی بہ نسبت بہت کم ہے چنانچہ ایسی احادیث جو صرف بخاری کے ہاں ہیں اور اُن پر کلام کیا گیا ہے صرف اسّی حدیثیں ہیں اس کے برعکس صحیح مسلم میں ایسی متکلم فیہ احادیث کی تعداد ایک سو تیس ہے انہی وجوہ کی بنا پر اکثر علماء حدیث نے صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر فوقیت اور ترجیح دی ہے اور اس پر تو سب ہی محدثین متفق ہیں کہ خود امام بخاری امام مسلم سے علم بالحدیث میں اور مہارت فنِ حدیث و رجالِ حدیث میں بہت بلند مرتبہ اور قدر و منزلت کے مالک تھے چنانچہ خود امام مسلم نے اس فوقیت کا اعتراف کیا ہے علاوہ ازیں امام مسلم نے امام بخاری سے حدیثیں بھی روایت کی ہیں (گویا امام بخاری کے شاگرد ہیں) اس کے برعکس امام بخاری نے امام مسلم سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔

لیکن بعض فنی امور میں جن کا تعلق تالیف و تدوین کتاب سے ہے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر

نمایاں فوقیت حاصل ہے چنانچہ امام مسلم نے صحیح مسلم میں نہ حدیثوں کے ٹکڑے کئے ہیں اور نہ ہی اسنادوں کو مکرر سہ کرر بیان کیا ہے بلکہ ہر حدیث جتنے طرق اور جتنے الفاظ کے ساتھ مروی ہے اور امام مسلم نے اپنے معیار کے مطابق ان کو پسند کیا ہے ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اس لحاظ سے صحیح مسلم میں ہر حدیث کے مختلف الفاظ اور متعدد سندیں یکجا موجود ہیں اس طریق تالیف کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ حدیث ڈھونڈنے والے کو صحیح بخاری کے مقابلہ میں صحیح مسلم کے اندر ہر حدیث اس کے مختلف الفاظ اور سندیں نہایت آسانی کے ساتھ ایک جگہ مل جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے :-

(۱) وقالوا المسلم فضل   قلت البخاری اعلیٰ

ترجمہ: لوگوں نے کہا: مسلم کو برتری حاصل ہے ۔۔۔ میں نے کہا: بخاری ان سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہیں۔

(۲) قالوا المکرر فیہ   قلت المکرر احلیٰ

ترجمہ: لوگوں نے کہا: بخاری میں تو مکرر حدیثیں ہیں ۔۔۔ میں نے کہا: تو مکرر تو زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں مکرر احادیث چھوڑ کر چار ہزار (۴۰۰۰) حدیثیں اور مکرر سمیت سات ہزار دو سو چھتر (۷۲۷۵) حدیثیں ہیں۔ بہت سے ائمہ وحفاظ حدیث نے صحیح مسلم کی شرحیں لکھی ہیں ان میں سب سے مشہور و معروف شرح حافظ ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی الشافعی کی شرح ہے متعدد علماء حدیث نے صحیح مسلم کی تلخیصیں بھی لکھی ہیں ان مختصرات میں سب سے مشہور مختصر اور اس مختصر کی شرح احمد بن عمر القرطبی۔ متوفی ۶۵۶ھ کی تصنیف ہے دوسری مشہور مختصر حافظ زکی الدین عبدالعظیم المنذری۔ متوفی ۶۵۶ھ کی ہے (۱)

---

(۱) تہذیب الاسماء للنووی ج ۲ ص ۸۹ اور مفتاح السنۃ ص ۴۶۔

امام نسائیؒ اور اُن کی سنن

۲۱۵ ــــــــــــــــ ۳۰۳ھ

امام نسائی کا پورا نام اور کنیت ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب الخراسانی ہے۔ امام نسائی اپنے زمانہ میں حدیث کے مسلّم حافظ اور امام تھے۔ جرح و تعدیلِ رواۃ کے فن میں تو سب کے پیشوا تھے ۲۱۵ھ میں خراسان کے مشہور شہر نسا میں پیدا ہوئے۔ ممالک اسلامیہ خراسان، حجاز، عراق، مصر، شام اور جزیرہ کے (سفر کیے اور ان تمام ممالک کے) ائمہ و مشائخ حدیث سے حدیثیں سُنیں اور حاصل کیں) آپ بڑے محتاط اور پرہیزگار تھے، علوم حدیث میں بڑی فوقیت کے مالک تھے، حدیث کے مسلّم حافظ اور انتہائی محتاط و پختہ کار محدث تھے حتیٰ کہ حافظ ذہبی تو کہتے ہیں: نسائی امام مسلم سے بھی زیادہ حافظ حدیث تھے، امام نسائی نے رملہ کے مقام پر ۳۰۳ھ میں انتقال فرمایا امام نسائیؒ نے اول اپنی مشہور کتاب السنن الکبریٰ تالیف کی اس میں صحیح اور معلول دونوں قسم کی حدیثیں جمع کی تھیں اس کے بعد (حاکم رملہ کی درخواست پر) اس کو سنن صغریٰ میں مختصر کیا اور اس کا نام المجتبیٰ رکھا۔ صحیحین (صحیح بخاری و صحیح مسلم) کے بعد اسی کتاب کا درجہ ہے اس لئے کہ صحیحین کے بعد اسی کتاب میں سب سے کم ضعیف حدیثیں ہیں (بلکہ حسن کے درجہ سے کم تو ایک حدیث بھی نہیں ہے)

امام جلال الدین السیوطی نے اس کتاب کی مختصر شرح لکھی اور اس کا نام زہر الربیٰ علی المجتبیٰ رکھا ہے اسی طرح سندھ کے محدث ابوالحسن محمد بن عبدالہادی نے اس کتاب کی شرح لکھی اور اس میں صرف ان چیزوں کے بیان پر اکتفا کیا جن کی ایک حدیث پڑھنے والے طالب علم یا مدرس حدیث کو ضرورت پیش آتی ہے یعنی الفاظ کو ضبط کرنا اور غریب (نامانوس) الفاظ کی تشریح کرنا۔

امام ابوداؤد اور اُن کی سُنن

۲۰۲ھ ——————— ۲۷۵ھ

ابوداؤد کا پورا نام ونسب یہ ہے: سُلیمان بن الاشعث بن اسحاق الاسدی السجستانی۔ آپ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ طلب علم کے لئے عراق، شام، مصر اور خراسان کے سفر کئے اور اُن ملکوں کے مشائخ سے حدیثیں حاصل کیں۔ امام ابوداؤد نے امام بخاری و امام مسلم کے مشائخ مثلاً امام احمد، ابن ابی قتیبہ اور قتیبہ بن سعید سے بھی حدیثیں سُنی (اور حاصل کی) ہیں۔ (اس لحاظ سے ابوداؤد امام بخاری و مسلم کے شریک استاد یعنے استاد بھائی ہیں) اور نسائی وغیرہ ائمۂ حدیث نے ابوداؤد سے حدیثیں سُنی ہیں (یعنے ابوداؤد کے شاگرد ہیں)۔

امام ابوداؤد کے حافظہ کی، علم وفہم حدیث کی اور اسی کے ساتھ پرہیزگاری و دینداری کی علما وائمہ حدیث نے بہت کچھ تعریفیں کی ہیں۔ چنانچہ ابوعبداللہ الحاکم کہتے ہیں:۔

امام ابوداؤد اپنے زمانہ میں بغیر کسی اختلاف کے حدیث کے مُسلّم امام تھے۔

امام ابوداؤد نے ۲۷۵ھ میں (عراق کے مشہور شہر) بصرہ میں وفات پائی۔

امام ابوداؤد نے پانچ لاکھ حدیثوں میں سے اپنی سنن کا انتخاب کیا ہے جس میں احادیث کی کل تعداد چار ہزار آٹھ سو ہے (یعنے پانچ لاکھ میں سے صرف ۴۸۰۰ حدیثیں انتخاب کی ہیں اس لئے کہ) ابوداؤد نے اپنی سنن میں صرف احکام سے متعلق حدیثوں کو جمع کرنے پر اکتفا کیا ہے اس لحاظ سے ابوداؤد، مصنفینِ صحاح وسنن میں پہلے شخص ہیں جس نے صرف احکام سے متعلق احادیث پر کتاب تالیف کی ہے۔

امام ابوداؤد نے سنن ابی داؤد میں ان تمام حدیثوں کے جمع کر دینے کا اہتمام کیا ہے جن سے بلادِ اسلامیہ کے (مختلف المسلک) ائمہ و فقہا نے (احکام شرعیہ میں) استدلال کیا ہے اور اُن پر احکام فقہیہ کی بنیاد رکھی ہے اسی لئے امام سلیمان الخطابی معالم السنن میں فرماتے ہیں :-

معلوم ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرمائیں۔ کہ ابوداؤد کی سنن ایک نہایت شریف کتاب ہے، علم دین (اور بیان احکام شرعیہ) میں اس جیسی کتاب اب تک تصنیف نہیں ہوئی (علما و فقہا کے) تمام طبقوں میں اس کتاب کو قبولیت کا شرف بخشا گیا ہے اسی لئے علما، و فقہا کے طبقوں میں ۔ مذاہب کے اختلاف کے باوجود۔ اس کتاب نے (ایک فیصلہ کُن) حاکم کی حیثیت حاصل کر لی ہے چنانچہ اس چشمہ پر ہر (علم کا) پیاسا آتا ہے اور سیراب ہوتا ہے۔ اہل عراق، اہل مصر، بلاد مغرب کے باشندے اور ان کے علاوہ بہت سے ملکوں کے فقہا نے اسی کتاب پر (اپنی اپنی فقہ کے دلائل کے بارے میں) اعتماد کیا ہے ہاں اہل خراسان میں سے اکثر و بیشتر علامہ محمد بن اسمٰعیل بخاری مسلم بن حجاج قشیری اور انہی جیسے مصنفین کے بہت زیادہ دلدادہ اور فریفتہ ہیں جنہوں نے احادیث کے جمع کرنے ترتیب دینے اور پرکھنے میں ان (شیخین بخاری و مسلم) کی شرائط کا التزام کیا ہے لیکن امام ابوداؤد کی کتاب ترتیب میں ان (صحیحین) سے بہتر اور فقہی احکام اخذ کرنے کے لحاظ سے ان سے زیادہ جامع و نافع ہے، ابوعیسیٰ ترمذی کی کتاب (جامع ترمذی) بھی اسی لحاظ سے اچھی کتاب ہے۔

امام ابوداؤد نے اپنی کتاب (سنن ابوداؤد) میں احادیث جمع کرنے کے طریق کار کو خود بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ابن الصلاح نے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے ابوداؤد فرماتے ہیں :-

میں نے اس کتاب میں صحیح احادیث اور جو ان سے ملتی جلتی اور قریب قریب ہیں وہ بھی سب جمع کر دی ہیں اور جو کوئی ایسی حدیث آگئی ہے جس (کی صحت) میں کوئی سنگین کمزوری ہے تو اسکو میں نے (واشگاف لفظوں میں) ظاہر کر دیا ہے اور جس حدیث کے بارے میں میں نے کچھ نہیں کہا وہ ٹھیک ہے (عمل کے قابل ہے) یہ ضرور ہے کہ بعض حدیثیں بعض سے زیادہ صحیح ہیں[1]

---

(۱) ص ۱۸ مقدمہ ابن الصلاح ۱۲ -

ابن مندہ ابوداؤد کے طریق کار کے بارے میں کہتے ہیں :

> ابوداؤد ضعیف اسناد (والی حدیث) اس وقت لاتے ہیں جب اس باب میں اس کے علاوہ اور کوئی (صحیح اسناد والی حدیث) ان کے پاس موجود نہیں ہوتی اس لئے کہ ابوداؤد کے نزدیک فقہا کی (اجتہادی) رائے سے ضعیف حدیث بھی زیادہ قوی ہے (۱)

یہ بحث اپنی جگہ، باقی بہت سے اہل علم نے سنن ابوداؤد کی شرحیں لکھی ہیں ان میں خطابی قطب الدین یمنی شافعی (متوفی ۷۵۲ھ) شہاب الدین رملی (متوفی ۸۴۴ھ) کی شرحیں زیادہ مشہور ہیں۔ حافظ منذری (متوفی ۶۵۶ھ) نے سنن ابوداؤد کو مختصر کیا ہے اور حافظ ابن قیم (متوفی ۷۵۱ھ) نے اس کی تہذیب کی ہے (زوائد حذف کرکے خلاصہ نکالا ہے) ابوداؤد کے معاصرین میں سے شیخ محمود خطاب سبکی نے اس کتاب کی بہت مفصل شرح لکھی ہے۔

---

(۱) حال میں قاہرہ سے امام ابوداؤد کا ایک مکتوب اہل مکہ کے نام شائع ہوا ہے اس میں بھی ابوداؤد نے خود اپنی سنن کی تالیف کے طریق کار اور انتخاب احادیث کے معیار کا ذکر کیا ہے ۱۲

امام ترمذی اور ان کی جامع

۲۰۰ھ ـــــــــــ ۲۷۹ھ

امام ترمذی کا پورا نام و کنیت و نسب یہ ہے ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ السلمی الترمذی (خراسان کے شہر، ترمذ میں ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ تیسیر الوصول کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ: امام ترمذی کی ولادت ۲۰۰ھ میں ہوئی تھی۔ امام ترمذی نے بہت سے ائمہ و مشائخ حدیث سے حدیثیں حاصل کی ہیں جن میں قتیبہ بن سعید، اسحٰق بن موسیٰ، سفیان بن وکیع، محمد بن اسمٰعیل بخاری کے نام (خاص طور پر) قابل ذکر ہیں۔

امام ترمذی نے (حدیثیں حاصل کرنے کی غرض سے) تمام اطراف عالم کے سفر کئے ہیں، خراسانی، عراقی اور حجازی مشائخ حدیث سے حدیثیں سنی ہیں (اور حاصل کی ہیں) تاآنکہ خود حدیث کے امام بن گئے۔ (ایک محدث کی اہم صفات) تدین، پرہیزگاری، حفظ حدیث میں کمال، روایت حدیث میں ثقہ ہونا وغیرہ سب صفات امام ترمذی میں جمع تھیں۔ چنانچہ ابو یعلیٰ خلیلی کہتے ہیں:

> ترمذی ثقہ ہیں آپ کی توثیق کے لئے یہی بہت کافی ہے کہ امام المحدثین امام محمد بن اسمٰعیل بخاری ترمذی پر (حدیث کے بارے میں) بھروسہ کیا کرتے تھے اور ان سے حدیث قبول بھی کر لیا کرتے تھے۔

امام ترمذی کی وفات (بھی آپ کے مولد) ترمذ میں ۲۷۹ھ میں ہوئی۔

امام ترمذی نے اپنی جامع کو فقہی اور غیر فقہی تمام ابواب پر مرتب کیا ہے (اسی لئے ان کی کتاب سنن کے بجائے "جامع" کہلاتی ہے) اس کتاب میں صحیح، حسن، ضعیف سب طرح کی حدیثیں ہیں۔

اسی لئے امام ترمذی نے ہر حدیث کے "درجہ" کو بھی بتلایا ہے اور اس کے ضعف کی وجہ بھی بیان کر دی ہے، جن فقہی مسائل پر امام ترمذی نے ابواب قائم کئے ہیں ان مسائل سے متعلق صحابہ کے مذاہب اور مختلف شہروں کے فقہا کے مذاہب و اقوال بھی بیان کر دیئے ہیں۔

اس کتاب جامع ترمذی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں "علل حدیث" سے متعلق ایک مستقل فصل (کتاب العلل کے نام سے) اضافہ کی ہے۔ جس میں (احادیث و اسانید اور رُوات حدیث سے متعلق) اہم قاعدے اور ضابطے بھی جمع کر دیئے ہیں۔

بہت سے علماء حدیث نے جامع ترمذی کی شرحیں لکھی ہیں ان میں ابوبکر بن العربی (متوفی ۵۴۶ھ) کی، حافظ جلال الدین سیوطی کی اور ابن رجب حنبلی (متوفی ۷۹۵ھ) کی شرحیں قابلِ ذکر ہیں۔

امام ابن ماجہ اور ان کی سنن

۲۰۷ ھ ——————— ۲۷۳ ھ

ابن ماجہ کا پورا نام اور کنیت یہ ہے ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجۃ۔

امام ابن ماجہ حافظ حدیث تھے ۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا اور طلب حدیث میں (تمام مراکز حدیث کے) سفر کئے تا آنکہ ابن ماجہ نے امام مالک اور امام لیث کے (بلا واسطہ) شاگردوں سے بھی حدیثیں سنیں (اور حاصل کیں) خود امام ابن ماجہ سے بھی بہت سے محدثین نے حدیثیں روایت کی ہیں چنانچہ ابو یعلی الخلیلی القزوینی کہتے ہیں :-

ابن ماجہ حدیث کے بلند پایہ عالم تھے بہت سی تصانیف (اپنی یادگار) چھوڑی ہیں ان میں آپ کی "تاریخ" اور "سنن" (خاص طور پر) مشہور ہیں اور عراق عرب، عراق عجم، مصر اور شام (وغیرہ مراکز حدیث) کے سفر کئے ہیں۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں :-

ابن ماجہ، مشہور سنن ابن ماجہ کے مصنف ہیں اس کتاب سے ابن ماجہ کے علم، عمل، تبحر، وسعت معلومات اور اصول و فروع میں اتباع سنت (کے جذبہ) کا پتہ چلتا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں بتیس (۳۲) کتابیں ہیں جن کے تحت ایک ہزار پانچ سو (۱۵۰۰) ابواب ہیں ان ابواب کے تحت چار ہزار (۴۰۰۰) حدیثیں جمع کی ہیں سوائے چند حدیثوں کے اور سب حدیثیں جید (اور کھری) ہیں۔

۲۷۳ھ میں امام ابن ماجہ نے وفات پائی۔

امام ابن ماجہ کی سنن کا درجہ

بہت سے متقدمین اور متاخرین علما حدیث کتب حدیث کے ذیل میں پانچ کتابیں بنیادی بتلاتے رہے ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی، سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی لیکن بعض علمار متاخرین نے ان کتب حدیث کے ساتھ سنن ابن ماجہ کا بھی اضافہ کیا ہے (اسی بنا پر ان کو صحاح ستہ چھ صحیح کتابیں کہا جاتا ہے) اس لئے کہ ان علما نے فقہی اعتبار سے ابن ماجہ کی کتاب کو بہت زیادہ مفید پایا ہے۔ حافظ ابوالفضل طاہر مقدسی (متوفی ۵۰۷ھ) نے سب سے پہلے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے لیکن بعض علما حدیث نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ: امام دارمی کی کتاب سنن دارمی کو (سنن ابن ماجہ کے بجائے) حدیث کی چھٹی کتاب قرار دینا چاہیے کیونکہ ابن ماجہ نے (اپنی سنن میں) ایسے راویوں کی حدیثین نے بھی روایت کی ہیں جن پر جھوٹ بولنے اور احادیث چرانے کا بھی الزام ہے۔

کچھ محدثین کی رائے ہے کہ صحت اور جلالت شان کے لحاظ سے حدیث کی چھٹی کتاب موطا امام مالک کو ہونا چاہیئے۔

ابن ماجہ کی سند تینوں سنتوں (سنن نسائی، سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی) کے مقابلہ میں درجہ اور رتبہ کے لحاظ سے بھی کمتر ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی مجتبیٰ کی شرح میں لکھتے ہیں:-

> (اس کتاب (سنن ابن ماجہ) میں ابن ماجہ ایسے راویوں سے حدیثیں روایت کرنے میں منفرد (اکیلے) ہیں جن پر جھوٹ بولنے اور حدیثوں کی چوری کرنے کا الزام ہے چنانچہ ان میں سے بعض حدیثیں ایسی ہیں کہ محدثین اُن سے بجز حبیب بن ابی حبیب کاتب مالک، علاء بن زید، داؤد بن المجر اور عبدالوہاب بن الضحاک جیسے راویوں کے اور کسی بھی (ثقہ راوی کے) ذریعہ سے واقف نہیں ہیں (اور یہ سب انتہائی مجروح و مردود راوی ہیں)

ابن ماجہ کی سنن کی بہت سے محدثین نے شرحیں لکھی ہیں ان میں محمد بن موسیٰ دمیری (متوفی ۸۰۸ھ) اور جلال الدین سیوطی کے نام قابل ذکر ہیں سیوطی کی شرح کا نام مصباح الزجاجہ علی سنن ابن ماجہ ہے۔

کتاب السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی کی یہ تالیف وتدوین جو پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے یہ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق واعانت کا ثمرہ ہے اس لئے اُسی کے لئے تمامتر حمد وثنا سزاوار ہے ابتداء میں بھی اور انتہا میں بھی۔ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ والحمد للہ رب العالمین۔

ضمیمہ

①

قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ استاذ ابوریہ پر تنقید کے سلسلہ میں کہیں کہیں ہم نے ایک بات کو جو ہم کسی دوسری جگہ لکھ چکے ہیں، مکرر لکھدیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب کے اس ایڈیشن کے لئے جو مقدمہ "ابوریہ کی کتاب" پر اجمالی تنقید کے طور پر ہم نے لکھا ہے وہ حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں ابوریہ کے موقف" پر مفصل تنقید لکھنے سے چند ماہ پہلے لکھا گیا تھا اور لکھنے کے فوراً بعد ہی طباعت کے لئے قاہرہ بھیجدیا گیا تھا اور ہمارے پاس اس کی کوئی نقل بھی نہ تھی اب جو ہم حضرت ابوہریرۃ سے متعلق علیحدہ اور مستقل فصل لکھنے بیٹھے تو جو باتیں ہم اس مقدمہ میں لکھ چکے ہیں نہ ان کی کوئی نقل (کاپی) تھی اور نہ وہ باتیں پوری طرح ذہن میں محفوظ تھیں (اس لئے کچھ باتیں مکرر لکھی گئیں)

اسی بیان سے ان ماخذوں کی تکرار کا راز بھی کھل جاتا ہے جن سے ابوریہ نے اپنی کتاب میں اُن مسائل کے بارے میں سندیں (اور دلیلیں) پیش کی ہیں جن میں اُنھوں نے جمہور علما کی رائے اور تحقیق سے خلاف وانحراف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ہماری مجبوری وہی ہے جو ہم بتلا چکے ہیں۔ (یعنی نقل کا موجود نہ ہونا اور تفصیل یاد نہ رہنا)

②

سابق میں ہم نے اُن ماخذوں کی فہرست میں ـــــ جن کے متعلق ابوریہ کا دعوٰی ہے کہ ان میں

شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں ـــ ابن عساکر کی تاریخ ابونعیم کی حلیۃ الاولیاء اور خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد بھی شامل ہیں ابوریہ کے اس دعوے کی تردید کے ذیل میں ہم نے بتایا ہے کہ ان جیسے ماخذوں کے متعلق یہ دعویٰ ہرگز درست نہیں کہ ان میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں۔

مزید وضاحت کے لئے ہم یہاں اس بات کا اور اضافہ کردینا چاہتے ہیں کہ خطیب بغدادی، ابونعیم اور ابن عساکر اگرچہ اپنے زمانہ کے بلند پایہ حفاظ ہیں مگر انھوں نے اپنی مذکورہ بالا کتابوں میں صرف انہی روایات کے ذکر کرنے کا التزام نہیں کیا جو صحیح سندوں سے ثابت ہوں بلکہ انھوں نے اپنی ان کتابوں میں تو ہر اس چیز کو جمع کردینے کا التزام کیا ہے جو موضوع کتاب یعنے تاریخ سے متعلق ان کو پہونچی ہے قطع نظر اس سے کہ اس کی سند صحیح ہے یا ضعیف اور وہ خبر سچی ہے یا جھوٹی، اسی لئے انھوں نے ہر روایت کی سند ساتھ ساتھ ذکر کردی ہے تاکہ اس سند کو اور راویوں کے حالات کو پیش نظر رکھ کر قاری خود اس روایت کی حقیقت کو پہچان لے۔ اور اسی لئے ان مذکورہ بالا کتابوں میں بہت سی حدیثیں اور خبریں ایسی بھی موجود ہیں جو جھوٹی ہیں یا واہیات چنانچہ علما نے ان میں سے بہت سی روایتوں میں اس کی تصریح کی ہے (کہ یہ روایتیں جھوٹی اور بے اصل ہیں)

(۳)

حضرت ابوہریرہ رضؓ پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ہم نے کہا ہے کہ "اسکافی اور ابن ابی الحدید شیعہ علما میں سے ہیں" لیکن اس (شیعہ ہونے) سے اس امر کی نفی نہیں ہوتی کہ یہ دونوں "معتزلی" بھی تھے جیساکہ تذکرہ نگاروں نے ان دونوں کے حالات میں بیان کیا ہے۔

اس لئے کہ معتزلہ تو عام اہل سنت والجماعۃ مسلمانوں سے "عدل الٰہی" کے مسئلہ میں ہی الگ ہو جاتے ہیں نیز انسان کے افعال کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ ہے کہ انسان اس قدرت کے تحت جو اللہ تعالیٰ نے اس کو دی ہے اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ اسی طرح عقائد سے متعلق کچھ اور بھی مسائل ہیں جن میں معتزلہ عام مسلمانوں سے مختلف عقیدہ رکھتے ہیں۔

(یہ عقائد تو تمام معتزلہ میں مشترک ہیں) ان کے بعد پھر معتزلہ متعدد فرقوں، گروہوں اور مختلف

علمی مکاتب فکر میں بٹ جاتے ہیں چنانچہ ان میں سے کچھ تو حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علی رضی اللہ عنہم، سمیت تمام ہی صحابہ پر حملے کرتے (اور تہمتیں لگاتے) ہیں جیسا کہ ہم نظام معتزلی پر بحث کے دوران نقل کر چکے ہیں اور کچھ ان میں سے شیعہ ہیں (جو حضرت علی اور ائمہ اہل بیت کے علاوہ باقی تمام صحابہ پر طعن تشنیع کرتے ہیں) جیسا کہ اسکافی اور ابن ابی الحدید وغیرہ باقی فقہی احکام و مسائل میں تو ان میں سے کچھ کیا بلکہ سب ہی حنفی مذہب کے پیرو ہوئے ہیں۔

ان معتزلی فرقوں کے نظریات میں اختلاف اور تضاد کی ایک روشن مثال شریف رضی ہیں جو اپنے زمانہ میں (ایک طرف) طالبین (شیعوں) کے مقتدیٰ اور سر کردہ امام تھے اور (دوسری طرف) قضاء و قدر کے مسئلہ میں پکے معتزلی تھے۔ جیسا کہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے شریف رضی کی کتابوں اور مقالات کا مطالعہ کیا ہے۔

(۴)

کتاب کے مقدمہ میں بیان کر چکا ہوں کہ اس مقدمہ کے لکھنے کے وقت میرے پاس شیخ عبدالحسین شرف الدین کی کتاب ابوھریرہ موجود نہ تھی لیکن (اس کے بعد جب) مولف کی زندگی ہی میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو میں بھی اس کتاب کا ایک نسخہ خرید سکا اور اس کو پورا پڑھنے کے بعد جو کچھ میں اس کتاب کے مقدمہ میں شیخ شرف الدین کی اس کتاب کے متعلق لکھ چکا تھا اس کی توثیق ہو گئی بلکہ جتنا میرا خیال تھا اس سے کچھ زیادہ ہی پایا کیونکہ اس کتاب کو مؤلف نے اس پر ختم کیا ہے۔

ابوھریرۃ (العیاذ باللہ) منافق تھا، کافر تھا اور خود رسول نے اس کے متعلق خبر دی ہے کہ ابوھریرۃ جہنمی ہے (لعنۃ اللہ علی الکاذبین)

پروفیسر ابوریہ نے چونکہ اس کتاب کی اور اس کے مؤلف کی بہت کچھ تعریفیں کی ہیں اس کے معنی لازمی طور پر یہ ہیں کہ وہ بھی ابوھریرۃ کے بارے میں اسی نتیجہ پر پہونچے ہیں (اور ابوہریرۃ کے متعلق وہی رائے ابوریہ کی بھی ہے جو شیخ شرف الدین کی ہے۔)

نعوذ باللہ من الخذلان وسوء المصیر اللہ کی پناہ اس رسوائی اور انجام بد سے

(مؤلف)

اس کتاب کے اہم ماخذ

(اور حوالہ کی کتابیں)

نمبر شمار	نام مصنف	نام تصنیف	مطبع یا قلمی
۱	ابن جریر الطبری	تفسیر الطبری	مطبوعہ قاہرہ
۲	جلال الدین السیوطی	الدر المنثور	"
۳	"	الاتقان فی علوم القرآن	"
۴	ابن حجر عسقلانی	فتح الباری شرح صحیح بخاری	"
۵	"	مقدمہ فتح الباری	
۶	القسطلانی	قسطلانی شرح بخاری	"
۷	الکرمانی	الکرمانی شرح بخاری	"
۸	النووی	شرح مسلم	"
۹	الخطابی	معالم السنن (شرح ابوداؤد)	حلب
۱۰	عبدالرحمن الساعاتی	الفتح الربانی علی مسند احمد	قاہرہ
۱۱	الباجی	شرح مؤطا مالک	"
۱۲	النسائی	سنن نسائی	"
۱۳	ابن ماجہ	سنن ابن ماجہ	"
			"

نمبرشمار	نام مصنف	نام تصنیف	مطبع یا قلمی
۱۴	الزیلعی	نصب الرایہ	قاہرہ
۱۵	ابن قتیبہ	تاویل مختلف الحدیث	"
۱۶	شبیراحمد عثمانی	فتح الملہم (شرح مسلم)	ہندوستان
۱۷	الخوارزمی	جامع المسانید (مسانید ابوحنیفہ)	"
۱۸	ابن القیم	زادالمعاد فی ہدی خیر العباد	"
۱۹	الحازمی	شروط الائمۃ الخمسۃ	قاہرہ
۲۰	ابن حجر العسقلانی	القول المسدد فی الذب عن مسند احمد	ہندوستان
۲۱	عبدالعزیز خولی	مفتاح السنۃ	قاہرہ
۲۲	محمود حمزہ مفتی شام	اسباب ورود الحدیث	دمشق
۲۳	الشافعی	الرسالۃ	قاہرہ
۲۴	"	کتاب الام	"
۲۵	السرخسی	المبسوط	"
۲۶	الشاطبی	الموافقات	"
۲۷	شیخ الاسلام برہان الدین المرغینانی	الہدایہ	"
۲۸	مرتضیٰ زبیری	الدرر المنیفہ	"
۲۹	الآمدی	الاحکام فی اصول الاحکام	"
۳۰	ابن حزم	الاحکام فی اصول الاحکام	"
۳۱	ابن قیم	اعلام الموقعین	"
۳۲	الشعرانی	المیزان	"
۳۳	ابن فرحون مالکی	تبصرۃ الحکام	"
۳۴	الغزالی	المستصفیٰ	"

نمبر شمار	نام مصنف	نام تصنیف	مطبع یا قلمی
۳۵	جمال الدین الاسنوی	شرح المنہاج	مطبوعہ قاہرہ
۳۶	ابن امیر الحاج	التقریر شرح التحریر	قاہرہ
۳۷	امیر بادشاہ البخاری	التیسیر شرح التحریر	"
۳۸	محب اللہ بہاری	مسلم الثبوت اور شرح مسلم الثبوت	"
۳۹	الشوکانی	ارشاد الفحول	"
۴۰	شاہ ولی اللہ دہلوی	حجۃ اللہ البالغہ	"
۴۱	الکوثری	النکت الطریفہ	"
۴۲	الرازی	المحصول	قلمی
۴۳	محمد الخضری	اصول الفقہ	قاہرہ
۴۴	"	تاریخ التشریع الاسلامی	"
۴۵	السایس، السبکی والبربری	تذکرۃ تاریخ التشریع الاسلامی	"
۴۶	علی حسن عبد القادر	نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی	"
۴۷	الحاکم نیشاپوری	معرفۃ علوم الحدیث	"
۴۸	ابن الصلاح	مقدمہ علوم الحدیث	ہندوستان
۴۹	ابن کثیر	الباعث الحثیث	مصر
۵۰	العراقی	طرح التثریب شرح التقریب	"
۵۱	"	فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث	"
۵۲	جلال الدین السیوطی	تدریب الراوی	"
۵۳	"	مفتاح الجنۃ	"
۵۴	شیخ طاہر الجزائری	توجیہ النظر	"
۵۵	القاسمی	قواعد التحدیث	دمشق

نمبرشمار	نام مصنف	نام تصنیف	مطبع یا قلمی
۵۶	عبدالحی لکھنوی	الرفع والتکمیل	دمشق
۵۷	حافظ ابن حبان	الثقات	قلمی (دار الکتب المصریہ)
۵۸	ابن ابی حاتم الرازی	الجرح والتعدیل	مصر
۵۹	الذہبی	میزان الاعتدال	〃
۶۰	النووی	تہذیب الاسماء واللغات	〃
۶۱	جلال الدین السیوطی	طبقات المحدثین	قلمی (مکتبۃ الازہر)
۶۲	ابن حجر	تہذیب التہذیب	ہندوستان
۶۳	ابن حجر	الاصابہ فی تمیز الصحابہ	
۶۴	ابن عبدالبر	الاستیعاب	مصر
۶۵	الذہبی	تذکرۃ الحفاظ	〃
۶۶	ابن الجوزی	الموضوعات	〃
۶۷	جلال الدین السیوطی	اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ	قلمی (مکتبۃ الازہر)
۶۸	ملا طاہر پٹنی	تذکرۃ الموضوعات	مصر
۶۹	〃	قانون الموضوعات	〃
۷۰	ابن عبدالبر	جامع بیان العلم وفضلہ	〃
۷۱	ابن عساکر	تاریخ دمشق	دمشق
۷۲	الذہبی	تاریخ الاسلام	قلمی (مکتبۃ الازہر ودار الکتب)
۷۳	ابن سعد	الطبقات الکبری	〃
۷۴	ابن کثیر	البدایہ والنہایہ	بیروت
۷۵	خطیب بغدادی	تاریخ بغداد	مصر
۷۶	ابن خلدون	مقدمہ	〃

نمبر شمار	نام مصنف	نام تصنیف	مطبع یا قلمی
۷۷	ابن عبدربہ	العقد الفرید	مطبوعہ مصر
۷۸	ابن خلکان	وفیات الاعیان	"
۷۹	ابن حجر الہیثمی	الخیرات الحسان	"
۸۰	الموفق المکی	مناقب ابی حنیفہ	"
۸۱	ابن عبدالبر	الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہا	"
۸۲	الکوثری	تانیب الخطیب	"
۸۳	"	حسن التقاضی فی سیرۃ ابی یوسف القاضی	"
۸۴	"	بلوغ الامانی فی سیرۃ محمد بن الحسن الشیبانی	"
۸۵	ابن ابی الحدید	شرح نہج البلاغۃ	"
۸۶	احمد امین	فجر الاسلام	"
۸۷	"	ضحی الاسلام	"
۸۸	ابن تیمیہ	منہاج السنۃ	"
۸۹	البغدادی	الفرق بین الفرق	"
۹۰	روندلڈسن	عقیدۃ الشیعہ	"
۹۱	سید رشید رضا	مجلۃ المنار	"
۹۲		دائرۃ المعارف الاسلامیہ	"
۹۳	السرخسی	اصول السرخسی	"
۹۴	عبدالرحمن المعلمی	الانوار الکاشفۃ لما فی کتاب اضواء علی السنۃ من الزلل والتضلیل والمجازفۃ	"
۹۵	محمد عبدالرزاق حمزہ	ظلمات ابی ریہ امام اضواء السنۃ المحمدیہ	"
۹۶	ابوداؤد	رسالۃ ابی داؤد فی وصف تالیفہ لکتاب السنن	"